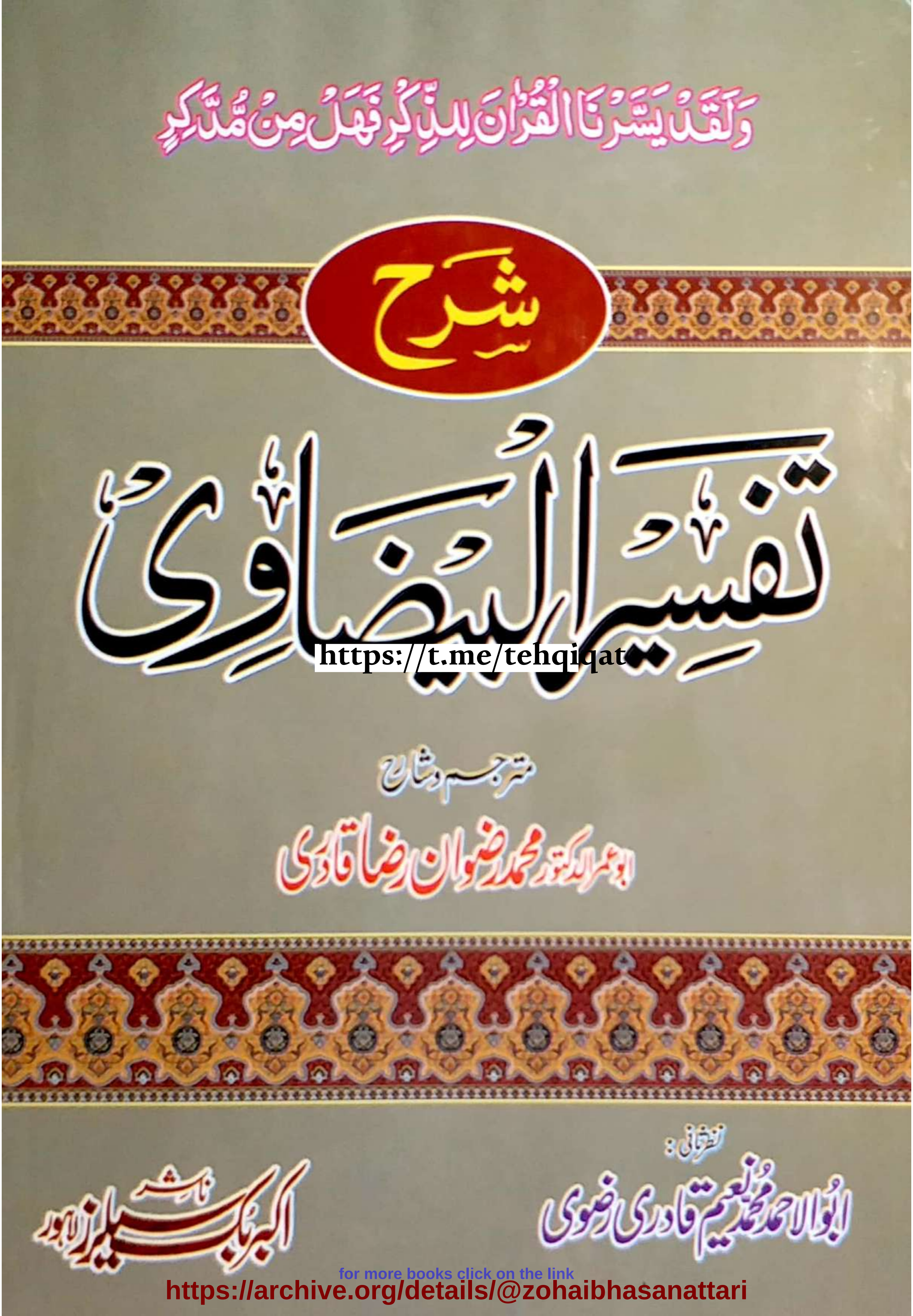

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

شرح

تفسیر البیضاوی

https://t.me/tehqiqat

مترجم وشارح

ابو عمر الدکتور محمد رضوان رضا قادری

نظرثانی:

ابو الاحمد محمد نعیم قادری رضوی

ناشر

اکبر بک سیلرز لاہور

خوشخبری

علماء اہلسنت کی کتب PDF میں
حاصل کرنے کیلئے
تحقیقات چینل ٹیلیگرام جوائن
کریں
https://t.me/tehqiqat
گوگل سے ڈاؤن لوڈ کرنے لئے
https://
@zohaibhasanattari

طالب دعا زوہیب حسن عطاری

for more books click on the link

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

نام کتاب ---- شرح تفسیر البیضاوی

مترجم وشارح ---- ابو عمر الدکتور محمد رضوان رضا قادری

فاضل ومدرس جامعہ قادریہ عالیہ نیک آباد مراڑیاں شریف گجرات

پروف ریڈنگ ---- علامہ فخر الزمان قادری

نظر ثانی ---- ابو احمد محمد نعیم قادری رضوی

تعداد ---- ۶۰۰

صفحات ---- ۶۸۸

ناشر ---- محمد اکبر قادری

قیمت ---- 700/- روپے

ناشر
اکبر بک سیلرز
زبیدہ سنٹر
اردو بازار لاہور

الانتساب

الحقت ذالك المختصر الى اشرف الانبياء صلى الله عليه وسلم

احقر اس قابل تو نہیں لیکن برادرِ مکرم ، والدین ، اساتذہ کرام (جامعہ قادریہ عالمیہ نیک آباد گجرات ، پاکستان) اور صوفی بزرگ الحاج محمد لطیف قادری مدظلہ العالی کی نگاہِ شفقت اور دعاؤں سے اتنا کچھ کر سکا۔ میں اپنی اس کاوش کو دلوں کی جان بلکہ تمام جہانوں کی جان حضور نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں بصد ہدیہ وعقیدت پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ کریم اس حقیر سی خدمت کو قبول فرمائے اور امت محمدیہ کے لئے ذریعہ بخشش ومغفرت بنائے۔

آمین بجاہ النبی الامین۔

احقر

ابوعمر الدکتور محمد رضوان رضا قادری عفی عنہ

فاضل جامعہ قادریہ عالمیہ نیک آباد گجرات

حمد باری تعالیٰ

اے خداوند جہاں! اے خالق لیل و نہار
ہو نہیں سکتی تری حمد و ثنا ہے بے شمار
تو دو عالم کا حقیقی مالک و مختار ہے
ذرے ذرے پر ترا چلتا ہے حکم و اقتدار
تو نے بخشی ہے فلک کے چاند تاروں کو چمک
تیری قدرت سے گل وغنچہ پہ آتا ہے نکھار
رحمت عالم کے دامان کرم کا واسطہ!
بخش دے میرے گناہوں کو ہوں نادم شرمسار
کھول دے میری دعاؤں کے لئے باب قبول
عرض کرتا ہوں ترے آگے بچشم اشکبار

نعت شریف

اے شافعِ اُمَم شہِ ذی جاہ لے خبر
لِلّٰہ لے خبر مری لِلّٰہ لے خبر
دریا کا جوش ، ناؤ نہ بیڑا نہ
ناخدا میں ڈوبا تو کہاں ہے مرے شاہ لے خبر
منزل کڑی ہے رات ، اندھیری میں نابلد
اے خضر لے خبر ، مری اے ماہ لے خبر
پہنچے پہنچنے والے تو منزل مگر شہا
ان کی جو تھک کے بیٹھے سرِراہ لے خبر
جنگل درندوں کا ہے میں بے یار شب قریب
گھیرے ہی چار سمت سے بد خواہ لے خبر
منزل نئی عزیز جدا لوگ ناشناس
ٹوٹا ہے کوہِ غم میں پرِ کاہ لے خبر
مجرم کو بارگاہِ عدالت میں لائے ہیں
تکتا ہے بے کسی میں تری راہ لے خبر
اہلِ عمل کو ان کے عمل کام آئیں گے
میرا ہے کون تیرے سوا آہ لے خبر
وہ سختیاں سوال کی وہ صورتیں مُہیب
اے غمزدوں کے حال سے آگاہ لے خبر
پُر خار راہ برہنہ پا تشنہ آب دُور
مولیٰ پڑی ہے آفتِ جانکاہ لے خبر
باہر زبانیں پیاس سے ہیں آفتاب گرم
کوثر کے شاہ کَثَّرَہُ اللّٰہ لے خبر
مانا کہ سخت مجرم و ناکارہ ہے رضاؔ
تیرا ہی تو ہے بندہ درگاہ لے خبر

(اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ترتیب

ابواب — صفحہ

تفسیرِ قرآن کی تاریخ ۲۱
دورِ اوّل ۲۲
دورِ ثانی ۲۲
دورِ ثالث ۲۳
مشہور مفسرین کے اسمائے گرامی ۲۳
دورِ چہارم ۲۴
مشہور عربی تفاسیر کے نام ۲۴
تفسیر اور تاویل کی تعریف ۲۵
تفسیر اور تاویل کا شرعی حکم ۲۵
مفسّر کے لئے ضروری علوم ۲۵
حضرت حسن بصری کا قول ۲۶
درجاتِ تفسیر ۲۶
قرآن مجید کا اصلی ماخذ ۲۷
ضرورت واہمیت تفسیر ۲۸
قرآن فہمی ۲۹
تعارف مفسّرِ بیضاوی ۲۹
خُطْبَةُ الْكِتَاب ۳۰
ترجمہ خطبہ ۳۱

سورۃ الفاتحۃ

[سورۃ الفاتحۃ (1): آیۃ 1] ۴۴
لفظِ عوذ کی تحقیق ۴۴
لفظِ الٰہ اور لفظِ اللہ کی مفصل تحقیق ۴۴
لفظِ شطن کی تحقیق ۴۶
لفظِ رجم کی تحقیق ومعانی ۴۶
لفظِ اسم کی تحقیق واقوال ۴۷
اسم کی اقسام ۴۷
رجم کی لفظی تحقیق ۴۹
[سورۃ الفاتحۃ (1): آیۃ 2] ۵۰
لفظِ حمد کی تحقیق اور حمد وشکر میں فرق ۵۴
لفظِ رب کی عمدہ تحقیق ۵۵
اس امت کا عالم ربانی ۵۶
رابہ کا معنی ۵۷
الرباب کا معنی ۵۸
العالم کا معنی ومفہوم ۵۸
عالم کی اقسام ۵۹
[سورۃ الفاتحۃ (1): الآیات 3 الی 4] ۶۰
لفظ رحمٰن اور رحیم میں فرق ۶۲
تحقیق لفظِ مالک ۶۳
یوم کی تعریف ۶۳
یَوْمِ الدِّیْنِ سے مراد ۶۴
[سورۃ الفاتحۃ (1): آیۃ 5] ۶۴
العبودیۃ کا مفہوم ۷۰
عبادت کی اقسام ۷۰
الاستعانۃ ۷۰

ابواب	صفحہ
[سورۃ الفاتحۃ (1): آیۃ 6]	۷۱
الهدایۃ کا معنی ومفہوم	۷۴
[سورۃ الفاتحۃ (1): آیۃ 7]	۷۵
تحقیق لفظ صراط	۷۷
صراط اور سراط میں فرق	۷۷
قولِ ابو تمام	۷۸
مفہومِ استقامت	۷۸
نعمت کا معنی	۸۱
لفظِ غیر کا معنی	۸۱
لفظِ غضب کا معنی	۸۲
ضالین کے معانی	۸۵
اقسامِ ضلالت	۸۵

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ

ابواب	صفحہ
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 1]	۸۷
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 2]	۱۰۲
ذالک کی تحقیق	۱۱۰
ذاک اور ذالک میں فرق	۱۱۱
کتاب کا معنی	۱۱۱
حرف لا کے معانی واقسام	۱۱۱
غروب سے پہلے افطار	۱۱۳
ریب کی حقیقت	۱۱۴
ہدایت کیا ہے؟	۱۱۴
چار طرف سے ہدایت	۱۱۵
تقویٰ کی تعریف اور اصل معنی	۱۱۵
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 3]	۱۱۷
ایمان کی تعریف	۱۲۷
لفظِ غیب کا معنی	۱۲۷
تحقیقِ اقامت	۱۲۸
المقام:	۱۲۹
صلوٰۃ کے معانی	۱۳۰
رزق کی تعریف	۱۳۱
انفاق کے معانی	۱۳۱
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 4]	۱۳۱
لفظِ "ما" کی تحقیق مع اقسام	۱۳۶
ماحرفی کی اقسام	۱۳۸
نزول کے معنی اور انزال وتنزیل میں فرق	۱۴۰
لفظِ آخر کا مفہوم اور اس کا مدمقابل	۱۴۱
معرفتِ یقین	۱۴۱
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 5]	۱۴۲
تنبیہ	۱۴۷
متقین کو ان انعامات کے ساتھ خاص کرنے کی وجوہات	۱۴۷
ہدایت کی چار اقسام	۱۴۷
نوٹ	۱۴۸
فلاح کے معنی	۱۴۸
اقسامِ فلاح	۱۴۹
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 6]	۱۵۰
سوالِ عدول	۱۵۷
جواب	۱۵۷
امام بیضاوی اور تکلیف مالایطاق کا جواز	۱۵۹
کفار کو ڈرانے کا حکم کیوں؟	۱۶۰
مفہومِ کفر	۱۶۱
سب سے بڑا کفر	۱۶۱
مساواۃ کی تحقیق	۱۶۱
تحقیق الانذار اور انذار و نذیر میں فرق	۱۶۲

ابواب صفحہ

النذیر کا معنی ۱۶۲
ام کا استعمال ۱۶۲
ایمان کے معانی ۱۶۲
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 7] ۱۶۳
مفرد کلمات کے معانی ۱۶۴
ختم اور غشاوۃ کو اللہ کی طرف منسوب کرنے میں اختلاف ۱۶۶
اصحاب ظاہر کا نظریہ ۱۶۶
معتزلہ کا نظریہ ۱۶۷
الختم کا مفہوم ۱۷۲
قول جبائی ۱۷۴
مسک کی مہر ۱۷۴
معنی قلب ۱۷۴
معنی سماعت ۱۷۵
معنی بصارت ۱۷۵
بصر اور بصیرت ۱۷۶
لفظ غشاوۃ کا معنی ۱۷۶
عذاب کا مفہوم ۱۷۶
عظیم کا لغوی و اصطلاحی معنی ۱۷۶
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 8] ۱۷۷
معنوی تعلق ۱۷۸
پہلا گروہ مومنین ۱۷۹
دوسرا گروہ کافرین ۱۷۹
تیسرا گروہ منافقین ۱۷۹
اعرابی تعلق ۱۷۹
الناس کی لغوی تحقیق ۱۸۰
پہلا احتمال ۱۸۰
دوسرا احتمال ۱۸۰
تیسرا احتمال ۱۸۰
اس کا مادہ اشتقاق ۱۸۰
اعتراض ۱۸۲
با کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ ۱۸۳
لفظ یوم کی تحقیق ۱۸۳
لفظ الناس کی اصل ۱۸۴
تحقیق لفظ قول ۱۸۴
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 9] ۱۸۵
لفظ خدع کی مفصل تحقیق ۱۸۸
گوہ اور بچھو ۱۸۹
حرف الا کا استعمال ۱۹۰
مفہوم نفس ۱۹۰
معرفت شعور ۱۹۱
یشعرون اور یعقلون میں فرق ۱۹۱
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 10] ۱۹۱
معنی قلب ۱۹۵
لفظ مرض کی تحقیق ۱۹۵
زیادۃ کی تعریف ۱۹۶
عذاب کا معنی ۱۹۶
لفظ عذاب کے معنی میں اختلاف ۱۹۷
لفظ الم کا مفہوم ۱۹۷
استعمال کذب ۱۹۷
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 11] ۱۹۸
فساد کی تحقیق ۱۹۹
حرف اذا کا معنی ۲۰۰
اذا کی مختلف صورتیں ۲۰۰
فساد کا معنی ۲۰۱

ابواب	صفحہ
ارض کا صیغہ	۲۰۱
صلح کا مفہوم	۲۰۱
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 12]	۲۰۱
حرف الآ	۲۰۲
نوٹ	۲۰۳
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 13]	۲۰۳
توبہ زندیق	۲۰۵
سفاہت کا مفہوم	۲۰۵
علم کا معنی	۲۰۶
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 14]	۲۰۷
لفظِ لقوا کی تحقیق	۲۱۱
تحقیق لفظِ خلا	۲۱۲
الی حرف جار کی تحقیق	۲۱۳
مفہومِ استہزاء	۲۱۴
استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسا؟	۲۱۴
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 15]	۲۱۵
مد کا معنی اور استعمال	۲۱۹
مفہومِ طغیان	۲۲۱
یعمہون کا معنی	۲۲۱
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 16]	۲۲۲
بیع اور شراء کا مفہوم	۲۲۴
لفظِ تجارت کی تحقیق	۲۲۵
تحقیق لفظِ ربح	۲۲۵
اهتداء کی تحقیق	۲۲۶
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 17]	۲۲۸
مثل کی تحقیق	۲۲۹
مثل کی تعریف	۲۳۵

ابواب	صفحہ
وقود کا معنی	۲۳۵
نار کا معنی	۲۳۶
لما کا معنی اور استعمال	۲۳۶
ضیاء ہے کیا؟	۲۳۶
لفظِ حول کا معنی	۲۳۷
لفظِ ذھب کا معنی	۲۳۷
نور کا مفہوم	۲۳۸
لفظِ ترک کا معنی	۲۳۸
لفظِ ظلم کی تحقیق	۲۳۸
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 18]	۲۳۹
اصم کا معنی	۲۴۲
صم کا معنی	۲۴۳
بکم کا معنی	۲۴۳
عمی کا معنی	۲۴۳
رجوع کا اصل معنی	۲۴۴
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 19]	۲۴۴
مفہومِ سماء	۲۵۰
مفہومِ ظُلَم	۲۵۱
رعد کا معنی	۲۵۱
رعد، فرشتے کا نام	۲۵۲
برق کا مفہوم	۲۵۲
جعل کا معنی	۲۵۲
اصبع کیا ہے؟	۲۵۲
اذن کا معنی	۲۵۲
تحقیق لفظِ صاعقہ	۲۵۳
صاعقہ کی اقسام	۲۵۳
حذر کا معنی	۲۵۳

ابواب صفحہ

خوف کا معنی ۲۵۴
موت کا معنی ۲۵۴
موت کی اقسام ۲۵۴
المحائط کا مطلب ۲۵۶
کفر کے معانی ۲۵۶
کفر کا اصطلاحی معنی ۲۵۶
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 20] ۲۵۶
قادر اور قدیر میں فرق ۲۶۲
تنبیہ ۲۶۶
کاد کی تحقیق ۲۶۷
خطف کی تحقیق ۲۶۸
تنبیہ ۲۶۸
مفہومِ ضوء ۲۶۸
مشی کا معنی ۲۶۹
نوٹ ۲۷۰
شئی کی عمدہ تحقیق ۲۷۰
تنبیہ ۲۷۱
إنّ اور أنّ کی تحقیق ۲۷۱
شئی کی بعض کے نزدیک تعریف ۲۷۳
قدیر کسے کہتے ہیں؟ ۲۷۳
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 21] ۲۷۴
خلق کا معنی ۲۸۰
تحقیقِ لعل ۲۸۰
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 22] ۲۸۲
تنبیہ ۲۹۱
لفظِ فرش کی تحقیقِ عمیق ۲۹۲
معنی سماء ۲۹۳

ابواب صفحہ

لفظِ بنیٰ کی تحقیق ۲۹۳
ثمر کا اصل معنی ۲۹۴
مفہوم نزول ۲۹۴
ماء کی اصل ۲۹۵
خرج کا معنی ۲۹۵
اندادا کا معنی ۲۹۵
علم کا معنی ۲۹۶
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 23] ۲۹۶
تحقیق لفظ عبد ۳۰۴
اتیان کی عمدہ تحقیق بالتفصیل ۳۰۶
لفظِ سورۃ سے کیا مراد ہے؟ ۳۰۸
لفظِ دعا کا معنی ۳۰۹
تحقیق لفظِ شہید ۳۰۹
صدق کا معنی ۳۱۲
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 24] ۳۱۲
حرف لَن کی تحقیق ۳۱۵
حرف لَم کا استعمال ۳۱۷
فعل کا معنی ۳۱۸
لفظِ وقی کا مفہوم ۳۱۸
نار کی تعریف ۳۱۹
حجر کسے کہتے ہیں؟ ۳۱۹
تحقیق لفظ عدو ۳۱۹
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 25] ۳۲۰
بشریٰ کی مفصل تحقیق ۳۳۰
بشارۃ اور بشریٰ ۳۳۱
عمل کا معنی ۳۳۱
لفظِ صالح کا استعمال ۳۳۲

ابواب صفحہ

جنت کا معنی ۳۳۲
اقسامِ جنت اور ان کے نام ۳۳۲
تحقیق جریٰ یجری ۳۳۲
لفظِ تحت کا مفہوم ۳۳۳
تحت اور اسفل میں فرق ۳۳۴
نہر کی تعریف ۳۳۴
تشبیہ کا مفہوم ۳۳۴
لفظِ زوج کی تحقیقِ عمیق ۳۳۵
لفظِ طہارت کا معنی اور اقسام ۳۳۷
مفہومِ خلود ۳۳۷
نوٹ ۳۳۸
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ26] ۳۳۸
گناہِ کبیرہ کے درجات ۳۵۰
معنیٔ حیاۃ ۳۵۱
ضرب المثل کی تعریف ۳۵۱
بعوضۃ ۳۵۲
تحقیقِ فوق ۳۵۲
حرف اَمّا کا استعمال ۳۵۳
علم کا مفہوم ۳۵۴
علم کی اقسام ۳۵۴
تحقیقِ حق ۳۵۵
القول اور القیل کا معنی ۳۵۶
مفہومِ ارادہ ۳۵۶
اسمِ اشارہ ذا کا استعمال ۳۵۶
تعریفِ مثل ۳۵۷
محاورہ ۳۵۷
معنیٔ کثرت ۳۵۷
تحقیقِ فسق ۳۵۸
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ27] ۳۵۸
لفظِ نقض کی تحقیق ۳۶۲
لفظِ عہد کی تحقیق ۳۶۳
میثاق کا معنی ۳۶۳
المیثاق کی تحقیق ۳۶۴
الموثق کا معنی ۳۶۴
لفظِ قطع کی تعریف ۳۶۴
تحقیقِ امر ۳۶۴
اتصال کا معنی ۳۶۵
فسد کا معنی ۳۶۵
تحقیقِ خسارہ ۳۶۵
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ28] ۳۶۶
اشکال اور اس کا جواب ۳۷۱
کیف کی کیفیات ۳۷۱
مفہومِ رجوع ۳۷۲
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ29] ۳۷۲
جمع کی تعریف ۳۷۷
استواء کا معنی ۳۷۷
آسمان کسے کہتے ہیں؟ ۳۷۸
مساواۃ اور تسویہ کا معنی ۳۷۸
تحقیقِ سبع ۳۷۸
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ30] ۳۷۹
اقسامِ ملائکہ ۳۸۳
خلیفہ ۳۸۴
خلیفہ سے کون ہستی مراد ہے؟ ۳۸۴
خلیفہ کہنے کی وجہ ۳۸۴

ابواب	صفحہ
خلیفہ بنانے کی ضرورت	۳۸۵
لفظِ ملائکہ کا اصل معنیٰ	۳۹۰
تحقیق لفظِ خلیفہ	۳۹۰
سفک کا معنیٰ	۳۹۰
دم کا اصل معنیٰ	۳۹۱
تحقیق لفظِ سبح	۳۹۱
تقدیس کا معنیٰ	۳۹۲
حظیرۃ القدس	۳۹۲
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 31]	۳۹۳
لفظِ آدم عربی ہے یا عجمی؟	۳۹۴
لفظِ تعلیم کی تحقیق	۳۹۶
لفظِ آدم کی تحقیقِ اعظم	۳۹۷
عرض کا معنیٰ	۳۹۸
لفظِ انباء کا مفہوم	۳۹۸
صدق کا مفہوم	۳۹۹
سچ کی فضیلت	۳۹۹
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 32]	۳۹۹
سبحان کی تعریف	۴۰۱
حکمت کیا ہے؟	۴۰۱
حکمت ودانائی کی باتیں	۴۰۲
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 33]	۴۰۳
بدا کا اصل معنیٰ	۴۰۵
تحقیق لفظِ کتم	۴۰۶
قولِ ابن عباس رضی اللہ عنہ	۴۰۶
قولِ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ	۴۰۷
تنگدستی چھپانا	۴۰۷
علمِ دین کو چھپانا گناہ ہے	۴۰۷
دوران نماز منہ اور ناک چھپانا	۴۰۷
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 34]	۴۰۸
سجدہ کا معنیٰ اور اس کی اقسام	۴۰۹
سجدہ کی فضیلت میں تین احادیثِ مبارکہ	۴۱۲
سجدے میں قُربِ الٰہی	۴۱۲
اقسام سجدہ	۴۱۲
حرفِ لام کی مفصل تحقیق	۴۱۶
(1) لام للتعدیہ	۴۱۶
(2) لام بمعنیٰ ملک اور استحقاق	۴۱۶
(3) لام ابتداء	۴۱۸
(4) لام جو ان کے بعد آتا ہے	۴۱۸
(5) لام مخففہ	۴۱۹
(6) لام قسم	۴۱۹
(7) لو کی خبر پر داخل ہونے والا لام	۴۱۹
(8) وہ لام جو مدعا کے لئے استعمال ہو	۴۲۰
(9) لام امر	۴۲۰
سجد کا معنیٰ	۴۲۰
سجود اختیاری	۴۲۱
سجود تسخیری	۴۲۱
لفظِ ابلیس کا معنیٰ	۴۲۱
لفظِ ابیٰ کا مفہوم	۴۲۲
مفہوم کبیر	۴۲۲
مفہوم استکبار	۴۲۲
کان کی مفصل تحقیق	۴۲۳
تکبر کرنے والا پکڑا گیا	۴۲۵
تکبر کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا	۴۲۵
بُولَس اور طِینَۃُ الخَبَال	۴۲۵

ابواب	صفحہ
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ35]	۴۲۵
سکون کی تعریف	۴۲۸
زوج کا معنی	۴۲۹
اکل کا لغوی ومجازی معنی	۴۳۱
تحقیق لفظِ رغد	۴۳۱
مرغاد کسے کہتے ہیں؟	۴۳۲
حیث کا استعمال	۴۳۲
لفظِ قرب کی تحقیق	۴۳۲
شجر کی تعریف	۴۳۳
مشجر کسے کہتے ہیں؟	۴۳۴
ایک عجیب وغریب درخت	۴۳۴
مبارک درخت	۴۳۴
ظلم کا لغوی معنی	۴۳۴
ظلم کی اقسام	۴۳۴
(1) پہلی قسم	۴۳۵
(2) دوسری قسم	۴۳۵
(3) تیسری قسم	۴۳۵
حکایت	۴۳۵
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ36]	۴۳۶
الزلۃ کی تحقیق	۴۳۹
حدیث پاک	۴۴۰
التزلزل کا معنی	۴۴۰
لفظِ خرج کا مفہوم	۴۴۱
لفظِ ہبوط کی مفصل تحقیق	۴۴۱
محاورہ	۴۴۲
لفظِ بعضکا معنی	۴۴۲
عدوّ کی تعریف	۴۴۲
استقر کا معنی ومفہوم: ۔	۴۴۳
تحقیق لفظِ متاع	۴۴۳
حین کا مطلب	۴۴۳
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ37]	۴۴۴
تحقیق تلقی	۴۴۶
کلم کی تعریف	۴۴۶
توبہ کا معنی	۴۴۶
ابن سینا کی توبہ	۴۴۷
توبہ کرنے والے سے اللہ عزوجل خوش ہوتا ہے	۴۴۷
اعتذار کی صورتیں	۴۴۷
پہلی صورت	۴۴۷
دوسری صورت	۴۴۷
تیسری صورت	۴۴۸
شرعاً توبہ	۴۴۸
تواب کا معنی	۴۴۸
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ38]	۴۴۹
جمع کا معنی	۴۵۲
تحقیق لفظِ تبع	۴۵۲
خوف کی تعریف اور اس کا استعمال	۴۵۳
حزن کی تعریف	۴۵۳
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ39]	۴۵۳
لفظِ آیت کا معنی	۴۶۱
لفظِ صاحب کی تحقیق ومعنی	۴۶۱
نار کی تعریف	۴۶۳
خلد کیا ہے؟	۴۶۳
شعر	۴۶۳
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ40]	۴۶۴

ابواب	صفحہ
ذکر کی تحقیق	۴۶۸
پانچ باتوں کی وحی	۴۶۸
ذکر کی فضیلت	۴۶۹
رفیق اعلیٰ میں بندے کا ذکر	۴۶۹
نعمت کسے کہتے ہیں؟	۴۶۹
لفظ اوفوا تحقیقِ	۴۶۹
عہد کا مفہوم	۴۷۰
ایفائے عہد کی بہترین مثال	۴۷۰
عہد شکنی کی وعید	۴۷۰
عہد توڑنے والے پر لعنت	۴۷۱
تحقیق لفظ رھب	۴۷۱
دلچسپ حکایت	۴۷۱
ترھب کا معنی	۴۷۲
رھبانیۃ کی تعریف	۴۷۲
الارھاب کا معنیٰ	۴۷۲
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 41]	۴۷۲
ثمن کی تعریف	۴۷۵
معنیٰ قلت	۴۷۶
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 42]	۴۷۶
لبس کا معنیٰ	۴۷۷
تحقیق لفظِ حق	۴۷۸
لفظ حق کا استعمال	۴۷۸
تحقیقِ باطل	۴۷۹
لفظِ کتم کا معنی با تحقیق	۴۷۹
حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول	۴۸۰
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 43]	۴۸۱
تحقیق لفظ اقامت	۴۸۲
لفظ المقام کا معنی	۴۸۳
الصلوٰۃ کا معنی	۴۸۴
الصلوٰۃ فی اللغت	۴۸۴
باجماعت نماز کی فضیلت	۴۸۵
لفظِ زکوٰۃ کی تحقیق	۴۸۵
میاں مٹھو	۴۸۷
گرم سکہ	۴۸۸
لفظِ رکوع کا مفہوم	۴۸۸
شعر	۴۸۹
صحابہ کرام اور رکوع	۴۸۹
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 44]	۴۸۹
تحقیق حرفِ الف بالتکلّف	۴۹۱
پہلی قسم	۴۹۱
دوسری قسم	۴۹۳
تیسری قسم	۴۹۳
چوتھی قسم	۴۹۳
پانچویں قسم	۴۹۳
امر کا معنیٰ	۴۹۴
لفظِ برّ کا مفہوم	۴۹۴
بررۃ اور البریر	۴۹۶
بلی اور چوہا	۴۹۶
لفظِ نسیان کی تحقیق	۴۹۶
حدیث پاک	۴۹۷
لفظِ تلا (تلاوت) کا معنیٰ	۴۹۸
تلاوت قرآن کی فضیلت	۴۹۸
تلاوت نہ کرنے والے کا انجام	۴۹۸
قرآن اور دوست کا میسج	۴۹۹

ابواب صفحہ

موسیقی کے ساتھ قرآن کی تلاوت ۴۹۹
عقل کی تعریف ۴۹۹
عقل کے معانی ۴۹۹
پہلا معنی ۴۹۹
دوسرا معنی ۵۰۰
آدمی دنیا سے زیادہ عقل ۵۰۰
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ45] ۵۰۰
استعانۃ ۵۰۲
صبر کی تعریف ۵۰۲
حدیث پاک ۵۰۲
تحقیقِ خشوع ۵۰۳
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ46] ۵۰۴
لفظِ ظن کا مفہوم ۵۰۵
گمان ۵۰۵
بدگمانی کی حرمت کا سبب ۵۰۵
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ47] ۵۰۵
الذکریٰ کا معنی ۵۰۶
تحقیق لفظِ فضل ۵۰۷
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ48] ۵۰۸
تعریف لفظِ یوم ۵۱۰
لفظِ جزاء کا معنی ۵۱۰
الجزاء کا معنی ۵۱۱
قبل وتقبل کی تحقیق ۵۱۱
لفظِ شفاعۃ کی عمدہ تحقیق ۵۱۲
حدیث پاک ۵۱۳
شَفْعَۃٌ اور شَفَّعَہ کا معنی ۵۱۳
لفظِ اخذ کی تحقیق ۵۱۴
تحقیق عمیق للفظ العدل ۵۱۴
عدل مطلق ۵۱۵
عدل شرعی ۵۱۵
نصرت کا معنی ۵۱۷
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ49] ۵۱۷
نجو کا مفہوم ۵۲۰
لفظِ فرعون کا معنی ۵۲۰
لفظِ ساء کی عمدہ تحقیق ۵۲۱
لفظِ ذبح کا اصل معنی ۵۲۳
سعد الذابح ۵۲۳
تحقیق لفظِ الابن ۵۲۳
حضرت لوط علیہ السلام کا قوم سے خطاب ۵۲۵
لفظِ حیاء کا مفہوم ۵۲۵
بوڑھا مسلمان ۵۲۵
لفظِ نساء کا مفہوم ۵۲۵
تحقیقِ بلی ۵۲۶
عظم کا معنی ۵۲۶
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ50] ۵۲۷
لفظِ فرقنا کی تحقیق ۵۳۰
لفظِ بحر کی تحقیق ۵۳۰
غرق کا معنی ۵۳۱
لفظِ نظر کا مفہوم ۵۳۱
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ51] ۵۳۲
تحقیق لفظِ وعدہ ۵۳۳
لیل کا معنی ۵۳۳
لفظِ عجل کا معنی ۵۳۴
معجل کسے کہتے ہیں؟ ۵۳۴

الابواب	صفحہ
[سورۃ البقرۃ (2): الآیات 52 الی 53]	۵۳۴
لفظِ عفو کی تحقیق	۵۳۶
المعافی کسے کہتے ہیں؟	۵۳۷
شکر کا معنی	۵۳۷
شکر کی قسمیں	۵۳۸
الفرقان کی تحقیق	۵۳۸
لفظ اھتداء کی تحقیق باتفصیل	۵۳۹
المھتدی کی تعریف	۵۴۰
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 54]	۵۴۱
لفظِ قوم کا معنی	۵۴۴
اخذ اور اتخاذ کا معنی	۵۴۴
توبہ کا معنی اور اقسام	۵۴۵
پہلی صورت	۵۴۵
دوسری صورت	۵۴۵
تیسری صورت	۵۴۵
شرعاً توبہ	۵۴۵
لفظِ الباری کی تعریف	۵۴۵
قتل کا معنی	۵۴۶
تحقیق خیر و شر	۵۴۶
خیر مطلق	۵۴۶
خیر و شر مقید	۵۴۶
لفظِ تواب کس پر بولا جائے گا؟	۵۴۶
تحقیق لفظِ رحم	۵۴۷
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 55]	۵۴۸
تحقیق لفظِ الرؤیۃ	۵۵۰
اقسام رؤیت	۵۵۰
جہر کا معنی	۵۵۱
التفصیل الآخر للفظ الاخذ	۵۵۱
الصاعقۃ کی تحقیق مع صقع اور صعق میں فرق	۵۵۲
اقسامِ صاعقۃ	۵۵۲
اوّل	۵۵۲
دوم	۵۵۲
سوم	۵۵۲
[سورۃ البقرۃ (2): الآیت 56]	۵۵۳
تحقیق لفظِ بعث	۵۵۳
بعث کی اقسام	۵۵۴
بعث بشری	۵۵۴
بعث الٰہی	۵۵۴
[سورۃ البقرۃ (2): الآیت 57]	۵۵۵
لفظِ ظلل کا مفہوم	۵۵۷
ظلل اور فئی میں فرق	۵۵۷
لفظِ غم کی تحقیق	۵۵۷
من و سلویٰ کیا تھا؟	۵۵۸
اکل کا معنی	۵۵۸
مفہومِ طاب	۵۵۹
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 58]	۵۵۹
دخول کی تحقیق	۵۶۲
قریہ کی تعریف	۵۶۲
حیث کا استعمال	۵۶۳
تحقیق لفظِ باب	۵۶۳
تعریف سجدہ	۵۶۴
اقسام سجود	۵۶۴
سجود اختیاری	۵۶۴
سجود تسخیری	۵۶۵

ابواب	صفحہ
لفظِ حط کا مفہوم	۵۶۵
لفظِ غفر کا معنیٰ	۵۶۵
تحقیق لفظِ خطا	۵۶۵
پہلی صورت	۵۶۶
دوسری صورت	۵۶۶
تیسری صورت	۵۶۶
الخطیئة	۵۶۶
مفہومِ احسان	۵۶۷
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 59]	۵۶۸
چوبیس ہزار ہلاک	۵۶۹
لفظِ بدل کی عمدہ تحقیق	۵۶۹
البادلہ کسے کہتے ہیں؟	۵۷۱
لفظِ غیر کی تعریف	۵۷۱
تحقیق لفظِ رجز	۵۷۱
راجز، رجاز اور رجازۃ	۵۷۱
رجازۃ کسے کہتے ہیں؟	۵۷۲
لغی کی تحقیق	۵۷۲
رجع اور رجوع میں فرق	۵۷۲
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 60]	۵۷۳
استسقاء کا معنیٰ	۵۷۶
لفظِ ضرب کی عمدہ تحقیق	۵۷۶
ضرب اللبن	۵۷۸
مضاربۃ	۵۷۹
اضطراب	۵۷۹
لفظِ عصا کا معنیٰ	۵۷۹
حجر کی تعریف	۵۸۰
تعریفِ فجر	۵۸۱

ابواب	صفحہ
فجر کی وجہ تسمیہ	۵۸۱
فجر کی اقسام	۵۸۱
تحقیق بالتفصیل للفظ العین	۵۸۲
پہلا معنیٰ	۵۸۲
دوسرا معنیٰ	۵۸۲
تیسرا معنیٰ	۵۸۳
چوتھا معنیٰ	۵۸۳
پانچواں معنیٰ	۵۸۳
شراب کی تعریف	۵۸۴
المشرب کی تعریف	۵۸۵
فساد کی تعریف	۵۸۶
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 61]	۵۸۶
تعریفِ صبر	۵۹۱
لفظِ طعام کی بہترین تحقیق	۵۹۲
تحقیق لفظِ نبت	۵۹۴
تعریف لفظِ بقل	۵۹۴
المبقلة	۵۹۵
قثائھا کی تعریف	۵۹۵
فوم کی تعریف	۵۹۵
عدس کی تعریف	۵۹۵
بصل کی تعریف	۵۹۶
حرف الف کی مفصل تحقیق	۵۹۶
اوّل	۵۹۶
دوم	۵۹۸
سوم	۵۹۸
چہارم	۵۹۸
پنجم	۵۹۸

ابواب صفحہ
لفظِ دنیٰ کا معنیٰ ۵۹۹
مصر کی تعریف ۶۰۰
سوال کا معنیٰ ۶۰۱
ضرب المثل ۶۰۱
ذلت کیا ہے؟ ۶۰۱
تحقیقِ سکن ۶۰۲
البواء کی مفصل تحقیق ۶۰۳
محاورہ ۶۰۴
الباءۃ کا معنیٰ ۶۰۴
تحقیقِ لفظِ نبی ۶۰۴
النبوۃ والنباوۃ کے معنی ۶۰۵
لفظِ حق کا معنیٰ ۶۰۵
لفظِ عدد کی تحقیق ۶۰۶
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 62] ۶۰۷
لفظِ یہود کا معنی ۶۱۰
لفظِ نصاریٰ کا معنیٰ ۶۱۱
تحقیقِ لفظِ صبی ۶۱۱
الصائبین کا معنیٰ ۶۱۲
تعریف العمل ۶۱۲
تعریف لفظ صالح ۶۱۲
لفظِ اجر کی تحقیق ۶۱۳
محاورہ ۶۱۴
عند کا استعمال ۶۱۴
خوف کی تعریف ۶۱۵
التخویف کا معنیٰ ۶۱۵
حزن کی تعریف ۶۱۵
[سورۃ البقرۃ(2): الآیات 63] ۶۱۶

ابواب صفحہ
تحقیق لفظِ فوق ۶۱۷
پہلی قسم ۶۱۷
دوسری قسم ۶۱۸
تیسری قسم ۶۱۸
چوتھی قسم ۶۱۸
پانچویں قسم ۶۱۸
پانچویں قسم ۶۱۹
لفظِ طور کی تحقیق ۶۱۹
الطور سے کون سا پہاڑ مراد ہے؟ ۶۱۹
[سورۃ البقرۃ(2): الآیات 64] ۶۲۰
لفظِ ولی کی تحقیق ۶۲۱
حرف لولا کا استعمال ۶۲۲
تحقیقِ فضل ۶۲۲
لفظِ خسران کا معنیٰ ۶۲۳
[سورۃ البقرۃ(2): الآیات 65] ۶۲۳
السبت کی تحقیق ۶۲۵
قردۃ کی تحقیق ۶۲۵
القراد کا معنیٰ ۶۲۶
لفظِ خساء کا مفہوم ۶۲۶
[سورۃ البقرۃ(2): الآیات 66] ۶۲۷
لفظِ نکل کا مفہوم ۶۲۷
حدیث پاک ۶۲۸
تحقیقِ بین ۶۲۸
خلف کا معنیٰ ۶۲۹
لفظِ وعظ کی تحقیق ۶۲۹
[سورۃ البقرۃ(2): آیۃ 67] ۶۳۰
مال دار بوڑھا ۶۳۱

ابواب صفحہ

لفظ بقر کی تعریف ۶۳۲
لفظ استہزاء کی تعریف ۶۳۳
جہالت اور اس کی اقسام ۶۳۳
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 68] ۶۳۳
لفظِ بیان کی تحقیق ۶۳۵
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 69] ۶۳۷
تحقیقِ لون ۶۳۸
صفرۃ کیا ہے؟ ۶۳۹
نحاس، سفار، صفیر اور پیٹ کا سانپ ۶۴۰
ماہ صفر کی وجہ تسمیہ ۶۴۰
لفظِ فقع کا مفہوم ۶۴۰
فقع اور فقاع کا معنیٰ ۶۴۰
پانی کا بلبلہ ۶۴۰
سرور کیا ہے؟ ۶۴۰
السریر ۶۴۱
سریر المیت ۶۴۱
سجن المومن ۶۴۲
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 70] ۶۴۲
لفظ شبہ کی تحقیق ۶۴۳
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 71] ۶۴۳
تثیر کا معنیٰ ۶۴۷
ارض کسے کہتے ہیں؟ ۶۴۷
لفظِ سقی کا مفہوم ۶۴۷
لفظ حرث کی تعریف و تحقیق ۶۴۸
شیۃ کا مفہوم اور اس کی اصل ۶۴۹
لفظِ جاء کی تحقیق ۶۴۹
تعریفِ الفعل ۶۵۰

ابواب صفحہ

[سورۃ البقرۃ (2): الآیات 72] ۶۵۰
نفس کا معنیٰ ۶۵۱
تحقیق لفظ درء ۶۵۱
حدیث پاک ۶۵۲
ادارأتم کا معنیٰ ۶۵۲
لفظِ کتمان کی تحقیق ۶۵۲
[سورۃ البقرۃ (2): الآیات 73] ۶۵۳
لفظِ بعض کا معنیٰ ۶۵۶
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 74] ۶۵۶
تحقیق قست ۶۵۸
قلب کا معنیٰ ۶۵۹
حجر کی تعریف ۶۵۹
شدّ کا معنیٰ ۶۵۹
لفظِ شق کا معنیٰ ۶۵۹
خشیۃ کی تعریف ۶۶۰
غفلت کی تعریف ۶۶۱
غفلت شرمندگی ۶۶۱
بڑی حسرت ۶۶۱
شعر ۶۶۱
حکایت ۶۶۱
[سورۃ البقرۃ (2): آیۃ 75] ۶۶۲
فریق کی تعریف ۶۶۳
کلام کا معنیٰ ۶۶۳
محاورہ ۶۶۳
الحرف ۶۶۴
[سورۃ البقرۃ (2): الآیات 76] ۶۶۴
خلاء کی لغوی و اصطلاحی تحقیق ۶۶۶

ابواب	صفحہ
حدوث کی تعریف	۲۶۷
لفظ الفتح کی عمدہ تحقیق	۲۶۸
قسمِ اوّل	۲۶۸
قسمِ دوم	۲۶۹
الفاتحہ کسے کہتے ہیں؟	۲۶۹
لفظِ حاجّہ کی تحقیق	۲۷۰
لفظ حج کا معنی	۲۷۱
عند کا استعمال	۲۷۱
[سورۃ البقرۃ(2):الآیات77]	۲۷۲
تحقیقِ اسرار	۲۷۲
سارۃ کا معنی	۲۷۳
سرۃ البطن کا معنی	۲۷۴
لفظِ علانیہ کی تعریف	۲۷۵
[سورۃ البقرۃ(2):الآیات78]	۲۷۵
لفظِ امّی کی تحقیق	۲۷۷
فرّاء کا نظریہ	۲۷۷
اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ	۲۷۸
التمنی کی تحقیق	۲۷۸
امنیہ کا معنی	۲۷۹
قول عثمان غنی رضی اللہ عنہ	۲۷۹
ظن کا معنی	۲۸۰
[سورۃ البقرۃ(2):الآیات79]	۲۸۰
ویل اور ویس کی تحقیق	۲۸۲
الید کا معنی	۲۸۲
قلّت کا مفہوم	۲۸۳
لفظِ کسب کی تحقیق	۲۸۳
حدیث پاک	۲۸۴
[سورۃ البقرۃ(2):آیۃ80]	۲۸۵
لفظِ مس اور لمس کی تحقیق	۲۸۷
نار کی تعریف	۲۸۷
آگ سے ڈرو	۲۸۷
لفظِ عہد کا مفہوم	۲۸۷
وعدہ خلافی کرنے والا ملعون	۲۸۸
خلف کا معنی	۲۸۸

جمع قرآن کی تاریخ

حقیقی طور پر قرآنِ عظیم کو جمع فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ" (سورۃ قیامہ آیت نمبر 17)

بیشک اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔

حضور سیدُ المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مقدس زمانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بیان کے مطابق قرآنِ مجید کو لوحِ محفوظ کی ترتیب کے مطابق صحابہ کرام کو بیان فرمایا اور اس کی صورت یہ تھی کہ قرآنِ مجید 23 سال کے عرصے میں حالات وواقعات کے حساب سے جدا جدا آیتیں ہوکر نازل ہوا، کسی سورت کی کچھ آیتیں نازل ہوتیں پھر دوسری سورت کی کچھ آیتیں اترتیں، پھر پہلی سورت کی آیتیں نازل ہوتیں، حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر بار ارشاد فرماتے کہ یہ آیات فلاں سورت کی ہیں لہٰذا اسے فلاں آیت کے بعد اور فلاں آیت سے پہلے رکھا جائے، چنانچہ وہ آیات اسی سورت میں اور اسی جگہ پر رکھ دی جاتیں۔ اسی ترتیب کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں اور تلاوت کے دوران قرآنِ مجید پڑھتے۔

اس دور میں سارا قرآنِ عظیم کتابی شکل میں ایک جگہ جمع نہیں تھا بلکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں محفوظ تھا اور مُتفرق کاغذوں، پتھر کی تختیوں، بکری دنبے کی کھالوں، اونٹوں کے شانوں اور پسلیوں کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا۔ جب حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نبوت کے جھوٹے دعوے دار ملعون مُسیلمہ کذّاب سے جنگ ہوئی تو اس میں بہت سے حفاظ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر گزارش کی کہ اس لڑائی میں بہت سے وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے ہیں جن کے سینوں میں قرآنِ عظیم تھا، اگر اسی طرح جہادوں میں حفاظ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوتے گئے اور قرآنِ عظیم کو ایک جگہ جمع نہ کیا گیا تو قرآنِ مجید کا بہت سا حصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہنے کا اندیشہ ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ اس بات کا حکم دیں کہ قرآنِ مجید کی سب سورتیں ایک جگہ جمع کرلی جائیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

”جو کام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ کیا وہ ہم کیسے کریں؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کام نہ کیا لیکن خدا کی قسم! یہ کام بھلائی کا ہے۔ آخر کار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی رائے پسند آگئی اور آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت انصاری

اور دیگر حفاظ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس عظیم اور اہم ترین کام کا حکم دیا اور کچھ ہی عرصے میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہ سارا قرآنِ عظیم ایک جگہ جمع ہو گیا، ہر سورت ایک جدا صحیفے میں تھی اور وہ صحیفے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حینِ حیات آپ رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، ان کے بعد امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہا کے پاس رہے۔

عرب میں چونکہ بہت سے قبیلے رہتے تھے اور ہر قوم اور قبیلے کی زبان کے بعض الفاظ کا تلفظ اور لہجے مختلف تھے اور حضور پرنور ﷺ کے مقدس زمانے میں قرآنِ عظیم نیا نیا اترا تھا اور ہر قوم و قبیلہ کو اپنے مادری لہجے اور پرانی عادات کو یک دم بدلنا دشوار تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان پر یہ آسانی فرمادی گئی تھی کہ عرب میں رہنے والی ہر قوم اپنی طرز اور لہجے میں قرآنِ مجید کی قراءت کرے اگرچہ قرآنِ مجید ''لغت قریش'' پر نازل ہوا تھا۔ زمانۂ نبوت کے بعد چند مختلف قوموں کے بعض افراد کے ذہنوں میں یہ بات جم گئی کہ جس لہجے اور لغت میں ہم پڑھتے ہیں اسی میں قرآنِ کریم نازل ہوا ہے، اس طرح کوئی کہنے لگا کہ قرآن اس لہجہ میں ہے اور کوئی کہنے لگا نہیں بلکہ دوسرے لہجے میں ہے یہاں تک کہ امیرُ المؤمنین حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ نوبت آ گئی کہ لوگ اس معاملے میں ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب امیرُ المؤمنین حضرت عثمانِ غنی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو اس بات کی خبر پہنچی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

''ابھی سے تم میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو آئندہ تم سے کیا امید ہے؟

چنانچہ امیرُ المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے کے مطابق یہ طے پایا کہ اب ہر قوم کو اس کے لب و لہجہ کی اجازت میں مصلحت نہ رہی بلکہ اس سے فتنہ اٹھ رہا ہے لہٰذا پوری امت کو خاص ''لغتِ قریش'' پر جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے جمع کر دینا اور باقی لغتوں سے باز رکھنا چاہئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو صحیفے جمع فرمائے تھے وہ اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے منگوا کر ان کی نقلیں لی جائیں اور تمام سورتیں ایک مصحف میں جمع کر دی جائیں، پھر وہ مصاحف اسلامی شہروں میں بھیج دیئے جائیں اور سب کو حکم دیا جائے کہ وہ اسی لہجے کی پیروی کریں اور اس کے خلاف اپنے اپنے طرزِ ادا کے مطابق جو صحائف یا مصاحف بعض لوگوں نے لکھے ہیں فتنہ ختم کرنے کے لئے وہ تلف کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اسی درست رائے کی بناء پر امیرُ المؤمنین حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے وہ صحائف منگوائے اور ان کی نقلیں تیار کر کے تمام شہروں میں بھیج دی گئیں۔ اسی عظیم کام کی وجہ سے امیرُ المؤمنین حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو ''جامع القرآن'' کہا جاتا ہے۔ (فتاوی رضویہ، ۲۶/۴۳۹-۴۵۲، ملخصا)

تفسیرِ قرآن کی تاریخ:

تفسیرِ قرآن کی تاریخ تقریباً چار ادوار پر مشتمل ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

دورِ اوّل:

قرآنِ مجید روشن عربی زبان میں اور لغتِ عرب کے اسلوب اور بیان کے مطابق نازل ہوا، اس لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس عظیم کلام کو سمجھ لیتے اور انہیں اس کے اغراض و مقاصد معلوم ہو جاتے لیکن چونکہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم علمی اور عقلی اعتبار سے ایک جیسے نہ تھے بلکہ علم و فہم کے لحاظ سے اُن کے مَراتب میں فرق تھا اس لئے جب کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو قرآنِ مجید کے کسی لفظ کے معنی سمجھنے میں دشواری ہوتی تو وہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کر دیتے اور نبی کریم ﷺ اس کے معنی بیان فرما کر ان کی تشفّی فرما دیتے، اسی طرح بعض اوقات نبی کریم ﷺ خود ہی قرآنی آیات کے معنی بیان فرما دیتے اور یہی وہ دور ہے جس میں قرآنِ مجید کی تفسیر بیان کرنے کی ابتداء ہوئی۔

اس مرحلے میں سب سے پہلے قرآنِ مجید کی تفسیر اور اس کے معانی اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے بیان فرمائے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی مراد کو سب سے زیادہ جانتا ہے اور اس کے بعد تاجدارِ رسالت ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے قرآنِ عظیم کی تفسیر بیان فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے اس منصب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ "(سورۃ نحل آیت نمبر 44)

اور اے حبیب! ہم نے تمہاری طرف یہ قرآن نازل فرمایا تا کہ تم لوگوں سے وہ بیان کر دو جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے۔

اور ارشاد فرماتا ہے:

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ "(سورۂ جمعہ آیت نمبر 2)

وہی (اللہ) ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتا ہے اور بیشک وہ اس سے پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔

دورِ ثانی:

جب سرکارِ دو عالم ﷺ نے وصال فرمایا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقدس زمانہ آیا اور یہ وہ مبارک ہستیاں ہیں جنہوں نے براہِ راست سیدُ المرسلین ﷺ سے قرآنِ عظیم کی تعلیم حاصل کی، ان میں سے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ایسے تھے جنہوں نے اس کام کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ انہوں نے اہلِ زبان ہونے اور نزولِ قرآن کے ماحول سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود اپنی زبان دانی پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ رسول اللہ ﷺ سے قرآن مجید سیکھا اور اس کے

اَسرار و رُموز کی معلومات حاصل کیں۔ مشہور تابعی عالم حضرت ابو عبد الرحمن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جو حضرات ہمیں قرآن عظیم کی تعلیم دیا کرتے تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے اور اس وقت تک ان سے آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ہم ان آیات کی تمام علمی اور عملی باتوں کا علم حاصل نہ کرلیں۔

(مصنف ابن ابی شیبه، کتاب فضائل القرآن، فی تعلیم القرآن کم آیة، ۷/۱۵۲، الحدیث: ۱)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب کوئی شخص (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے) سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران پڑھ لیتا تو وہ ہماری نظروں میں بہت قابلِ احترام ہوجاتا تھا۔ (شرح السنہ، کتاب الفضائل، باب علامات النبوۃ، ۷/۷۶، الحدیث: ۳۶۱۹)

دورِ ثالث:

اس دور میں جب لوگوں کو قرآنی آیات کے معنی سمجھنے میں مشکل ہوئی تو انہوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بارگاہ میں حاضری دی اور چشمۂ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضیاب ہونے والی ان ہستیوں سے مطالبِ مفسر تابعین:

مشہور مفسرین کے اسمائے گرامی:

تابعین میں سے چند مشہور مفسرین کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(1) حضرت ابن المُسَیَّب رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(2) حضرت عروہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(3) حضرت سالم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(4) حضرت عمر بن عبد العزیز رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(5) حضرتِ سلیمان بن یسار رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(6) حضرت عطاء بن یسار رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(7) حضرت زید بن اسلم رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(8) حضرت ابن شہاب زہری رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(9) حضرت حسن بصری رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(10) حضرت مجاہد بن جُبیر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(11) حضرت سعید بن جُبیر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(12) حضرت علقمہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(13) حضرت قتادہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔
(14) حضرت امام ابن سیرین رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

(15) حضرت ابراہیم نخعی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

(16) حضرت امام شعبی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

دور چہارم:

تابعین کے بعد اموی اور عباسی خلفاء کے دور میں تفسیرِ قرآن پر بہت کام ہوا اور اس وقت سے لے کر اب تک مختلف زبانوں میں اور مختلف اقسام میں کثیر تفاسیر لکھی گئی ہیں۔

مشہور عربی تفاسیر کے نام:

عربی کی شہرہ آفاق تفاسیر میں سے بیضاوی شریف کے علاوہ چند مشہور تفاسیر یہ ہیں:

نمبر شمار	تفسیر کا نام	مصنف کا نام
1	جَامِعُ الْبَیَانِ فِیْ تَأْوِیْلِ الْقُرْآن	ابو جعفر محمد بن جریر طبری رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
2	بَحْرُ الْعُلُوْم فقیہ ابولیث	نصر بن محمد سمرقندی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی
3	تَفْسِیْرُ الْقُرْآنِ الْعَظِیْم	حافظ عبد الرحمن بن محمد، ابن ابی حاتم رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
4	تَأْوِیْلَاتُ اَہْلِ السُّنَّۃ	ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
5	اَلنُّکَتُ وَالْعُیُوْن	ابو الحسن علی بن محمد ماوردی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
6	اَلْوَجِیْزُ فِیْ تَفْسِیْرِ الْکِتَابِ الْعَزِیْز	ابو الحسن علی بن احمد واحدی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
7	اَحْکَامُ الْقُرْآن	ابو بکر احمد بن علی جصاص رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
8	اَحْکَامُ الْقُرْآن	ابو بکر احمد بن حسین بیہقی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
9	اَحْکَامُ الْقُرْآن	ابو بکر محمد بن عبد اللّٰہ، ابنِ عربی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
10	مَعَالِمُ التَّنْزِیْل فِیْ تَفْسِیْرِ الْقُرْآن	ابو محمد حسین بن مسعود بغوی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
11	زَادُ الْمَسِیْرِ فِیْ عِلْمِ التَّفْسِیْر	امام جمال الدین عبد الرحمن بن علی بغدادی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
12	اَلتَّفْسِیْرُ الْکَبِیْر	ابو عبد اللّٰہ محمد بن عمر رازی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
13	اَلْجَامِعُ لِاَحْکَامِ الْقُرْآن	ابو عبد اللّٰہ محمد بن احمد قرطبی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
14	اَنْوَارُ التَّنْزِیْل وَاَسْرَارُ التَّأْوِیْل	ناصر الدین ابو سعید عبد اللّٰہ بن عمر بیضاوی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
15	مَدَارِکُ التَّنْزِیْل وَحَقَائِقُ التَّأْوِیْل	ابو البرکات عبد اللّٰہ بن احمد نسفی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
16	لُبَابُ التَّأْوِیْل فِیْ مَعَانِی التَّنْزِیْل	علاء الدین علی بن محمد خازن رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ

17 اَلْبَحْرُ الْمُحِيْط	ابو حیان محمد بن یوسف اندلسی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
18 تَفْسِيْرُ اللُّبَاب فِيْ عُلُوْمِ الْكِتَاب	ابو حفص سراج الدین عمر بن علی دمشقی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
19 تَفْسِيْرُ الْقُرْآنِ الْعَظِيْم	ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
20 اَلدُّرُّ الْمَنْثُوْر فِي التَّاْوِيْلِ بِالْمَاْثُوْر	عبد الرحمن بن ابی بکر، جلال الدین سیوطی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
21 تَفْسِيْرُ الْجَلَالَيْن	جلال الدین محلی و جلال الدین سیوطی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
22 اِرْشَادُ الْعَقْلِ السَّلِيْم	ابو السعود محمد بن محمد عمادی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
23 رُوْحُ الْبَيَان	شیخ اسماعیل حقی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
24 رُوْحُ الْمَعَانِي	شہاب الدین سیّد محمود آلوسی بغدادی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
25 حَاشِيَةُ الْجُمَل عَلَى الْجَلَالَيْن	شیخ سلیمان الجمل رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ
26 حَاشِيَةُ الصَّاوِي عَلَى الْجَلَالَيْن	علامہ احمد صاوی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ

تفسیر اور تاویل کی تعریف:

مفسرین نے تفسیر اور تاویل کی مختلف تعریفات کی ہیں، ان میں سے تفسیر کی ایک تعریف یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے وہ احوال بیان کرنا جو عقل سے معلوم نہ ہوسکیں بلکہ ان میں نقل کی ضرورت ہو جیسے آیات کا شانِ نزول یا آیات کا ناسخ و منسوخ ہونا بیان کرنا۔ تاویلِ قرآن کی ایک تعریف یہ ہے کہ قرآنی آیات کے مضامین اور ان کی باریکیاں بیان کی جائیں اور صرفی و نحوی قواعد اور دیگر علوم کے ذریعے قرآنی آیات سے طرح طرح کے نکات نکالے جائیں۔

تفسیر اور تاویل کا شرعی حکم:

قرآنِ مجید کی تفسیر اپنی رائے سے بیان کرنا حرام ہے اور اپنے علم و معرفت سے قرآن کی جائز تاویل بیان کرنا اہل علم کے لئے جائز اور باعث ثواب ہے۔ حضرت علامہ سلیمان جمل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''شرائط کے ساتھ تاویل بِالرّائے یعنی رائے سے تاویل کے جواز جبکہ تفسیر بالرائے یعنی رائے سے تفسیر کے ناجائز ہونے میں راز یہ ہے کہ تفسیر تو اللہ تعالیٰ پر گواہی دینا اور اس بات کا یقین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلمہ کے یہ ہی معنی مراد لئے ہیں اور یہ بغیر بتائے جائز نہیں، اسی لئے امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے فیصلہ کر دیا کہ صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے اور تاویل چند احتمالات میں سے بعض کو یقین کے بغیر ترجیح دینے کا نام ہے (اس لئے یہ بغیر بتائے اہل علم کے لئے جائز ہے۔)'' (جمل، مقدمۃ، ۱/ ۳)

مفسّر کے لئے ضروری علوم:

علماء کرام نے مفسر کے لئے جن علوم کو ضروری قرار دیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

(1) لغت کا علم۔ (2) نحو کا علم۔ (3) صرف کا علم۔ (4) اشتقاق کا علم۔ (7،6،5) معانی، بیان اور بدیع کا علم۔ (8) قرائتوں کا علم۔ (9) اصولِ دین کا علم۔ (10) اصولِ فقہ کا علم۔ (11) اسبابِ نزول کا علم۔ (12) ناسخ اور منسوخ کا علم۔ (13) مجمل اور مبہم کی تفسیر پر مبنی احادیث کا علم۔

اِن علوم کو سامنے رکھتے ہوئے اُن خواتین و حضرات کو اپنے طرزِ عمل پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی حاجت ہے جو قرآن مجید کا صرف اردو ترجمہ اور تفاسیر کی اردو کتب پڑھ کر ترجمہ و تفسیر کرنا اور اس کے معانی و مطالب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک اقدام ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص از خود میڈیکل کی کتابیں پڑھ کے اپنا کلینک کھول لے اور مریضوں کا علاج کرنا اور ان کے آپریشن کرنا شروع کر دے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ نازک قرآنِ مجید کے ترجمہ و تفسیر کا معاملہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام کا معنیٰ و مفہوم اور اس کی مراد بیان کرنی ہوتی ہے اور یہ کام سیکھے بغیر کرنا اور علم کے بغیر کرنا جہنم میں پہنچا دے گا۔ اس لئے اگر کسی کو تفسیر بیان کرنے کا شوق ہے تو اسے چاہیے کہ باقاعدہ علومِ دینیہ سیکھ کر اس کا اہل بنے۔

حضرت حسن بصری کا قول:

امام حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

عجمیوں کو اس بات نے ہلاک کر دیا کہ ان میں سے کوئی قرآنِ مجید کی آیت پڑھتا ہے اور وہ اس کے معانی سے جاہل ہوتا ہے تو وہ اپنی اس جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا شروع کر دیتا ہے۔

(البحر المحیط، مقدمۃ المؤلف، الترغیب فی تفسیر القرآن، ۱۱۹-۱۱۸/۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”جس شخص نے قرآنِ مجید میں بغیر علم کچھ کہا اسے اپنا ٹھکانہ دوزخ سمجھ لینا چاہئے۔

(ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیہ، ۴۳۹/۴، الحدیث: ۲۹۵۹)

درجاتِ تفسیر:

تفسیرِ قرآن کے متعدد درجات ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(1)... تَفْسِیْرُ الْقُرْآنِ بِالْقُرْآنِ

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی تفسیر قرآنی آیات سے کی جائے کیونکہ قرآنِ مجید میں بعض جگہ ایک حکم بیان کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس حکم کی مدت کے اختتام کا ذکر ہوتا ہے، اسی طرح ایک مقام پر کوئی بات مُبہم ذکر کی جاتی ہے اور دوسری جگہ اس اِبہام کو دور کر دیا جاتا ہے، اس لئے تفسیرِ قرآن کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی تفسیر خود اس کی آیات سے کی جائے۔

(2) تَفْسِیْرُ الْقُرْآنِ بِالْحَدِیْث

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی تفسیر تاجدارِ رسالت ﷺ کی احادیث سے کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو قرآن مجید کے معانی، احکام اور تمام اسرار و رموز سکھا دیئے ہیں، اس لئے جب قرآنِ مجید کی تفسیر قرآنی آیت سے نہ ملے تو حضور پرنور ﷺ کی احادیث سے ان کی تفسیر بیان کی جائے۔

(3) تَفْسِيْرُ الْقُرْآنْ بِآثَارِ الصَّحَابَه۔

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی تفسیر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے کی جائے کیونکہ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے براہِ راست حضور پرنور ﷺ سے قرآنِ عظیم کی تعلیم حاصل کی اس لئے جب قرآنِ مجید کی تفسیر قرآنی آیات اور نبی کریم ﷺ کی احادیث سے نہ ملے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی روشنی میں آیاتِ قرآنی کی تفسیر بیان کی جائے۔

(4) تَفْسِيْرُ الْقُرْآنْ بِآثَارِ التَّابِعِيْن۔

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر تابعین کے اقوال کی روشنی میں کی جائے کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآنِ مجید کی تفسیر سیکھی اس لئے جب قرآنی آیات، احادیث اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے تفسیر نہ ملے تو تابعین کے اقوال سے تفسیر بیان کی جائے البتہ اس میں یہ لحاظ رہے کہ تابعی اگر کسی صحابی سے تفسیر نقل کر رہے ہیں تو اس کا حکم وہی ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ تفسیر کا ہے اور اگر تابعین کا اجماعی قول ہے تو وہ حجت ہے ورنہ نہیں۔

(5) تَفْسِيْرُ الْقُرْآنْ بِاللُّغَّةِ الْعَرَبِيَّه۔

قرآنِ مجید کی بعض آیات ایسی ہیں جن کے مفہوم میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں بلکہ ان کا مفہوم بالکل واضح ہے، ایسی آیات کی تفسیر کے لئے عربی لغت اور عربی قواعد ہی کافی ہیں البتہ وہ آیات جن کا مفہوم واضح نہیں یا جن سے فقہی احکام اخذ کئے جا رہے ہوں تو ان آیات کی تفسیر ما قبل مذکور چاروں ماخذ سے کی جائے گی اور ان کے بعد لغت عرب کو بھی سامنے رکھا جائے گا کیونکہ عربی زبان میں اس قدر وسعت ہے کہ اس میں ایک لفظ کے بسا اوقات کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کا اصلی ماخذ:

قرآن مجید کا اصلی ماخذ اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی وحی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ "(سورۃ الاعراف آیت نمبر52)

اور بیشک ہم ان کے پاس ایک کتاب لائے جسے ہم نے ایک عظیم علم کی بنا پر بڑی تفصیل سے بیان کیا، (وہ) ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

اور ارشاد فرمایا: "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى "(سورۃ النجم آیت نمبر 3-4)

اور وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتے۔ وہ وحی ہی ہوتی ہے جو انہیں کی جاتی ہے۔

اس لئے قرآنِ مجید کی وہ اصطلاحات جن کے معنی ومفہوم کو قرآن اور صاحبِ قرآن کی وضاحت کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے جیسے ایمان، اسلام، نفاق، شرک، کفر، روح، نفس، بَعث، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صوم، رِبا، صدقہ اور اِنفاق وغیرہ،

ان سب کا معنی نہ تو عربی لغت سے متعین کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی سمجھا جا سکتا ہے بلکہ ان کے معنی ومفہوم کے تعین کے لئے حضورِ پرنور ﷺ کی طرف رجوع کرنا بہر صورت لازمی ہے اور ان کا جو معنی ومفہوم آپ ﷺ نے بیان فرمایا ہے اسے بلا تَرَدُّد تسلیم کرنا ضروری ہے اور جو لوگ قرآنِ مجید کی ان اصلاحات کے معاملے میں صراطِ مستقیم سے بہک گئے ان کے بہکنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے وحیِ ربانی کی بجائے لغتِ عرب کو قرآنِ عظیم کا اصلی ماخذ قرار دیا اور لغت میں ان اصطلاحات کا جو معنی مذکور تھا وہی ان کے لئے متعین کر دیا۔

ضرورت و اہمیت تفسیر:

امام جلال الدین سیوطی شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جس زمانے میں قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اس وقت عربی کی فصاحت و بلاغت کے ماہرین موجود تھے، وہ اس کے ظاہر اور اس کے احکام کو تو جانتے تھے لیکن اس کی باطنی باریکیاں ان پر بھی غور وفکر کرنے اور نبی کریم ﷺ سے سوالات کرنے کے بعد ہی ظاہر ہوتی تھیں جیسے جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

"اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ"

تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی ”ہم میں سے ایسا کون ہے جو اپنی جان پر ظلم نہیں کرتا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی تفسیر بیان کی کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے اور اس پر اس آیت،

"اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ"

سے استدلال فرمایا۔ اسی طرح جب حضور اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

"مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ"

یعنی جس سے اعمال کے حساب کے معاملے میں جرح کی گئی تو وہ عذاب میں گرفتار ہو جائے گا۔

تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات،

"فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 8)

اس سے عنقریب سہل حساب لیا جائے گا اور اپنے گھر والوں کی طرف شاد شاد پلٹے گا۔

کے بارے میں حضور پرنور ﷺ سے دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”یہ تو صرف اعمال کا پیش ہونا ہے۔ (یعنی یہ وہ مناقشہ نہیں ہے جو حدیث میں فرمایا گیا ہے) (جب میدانِ فصاحت و بلاغت کے شہسواروں کو قرآن کے معانی سمجھنے کے لئے الفاظِ قرآنی کی تفسیر کی حاجت ہوئی) تو ہم تو اُس چیز کے زیادہ محتاج

ہیں جس کی انہیں ضرورت پڑی بلکہ ہم تو سب لوگوں سے زیادہ اس چیز کے محتاج ہیں کیونکہ ہمیں بغیر سیکھے لغت کے اسرار ورموز اوراس کے مراتب معلوم نہیں ہوسکتے۔

(الاتقان فی علوم القرآن، النوع السابع والسبعون، فصل وانا وجہ الحاجۃ الیہ۔۔۔الخ، ۲/ ۵۴۶۔۵۴۷ ملخصا)

قرآن فہمی:

قرآن فہمی بہت بڑی عبادت وسعادت ہے، لہٰذا تلاوتِ قرآن کے ساتھ مستند تفاسیر کے ذریعے معانیِ قرآن بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حضرت اِیاس بن معاویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جولوگ قرآنِ مجید پڑھتے ہیں اور وہ اس کی تفسیر نہیں جانتے ان کی مثال اُن لوگوں کی طرح ہے جن کے پاس رات کے وقت ان کے بادشاہ کا خط آیا اوران کے پاس چراغ نہیں جس کی روشنی میں وہ اس خط کو پڑھ سکیں تو ان کے دل ڈر گئے اورانہیں معلوم نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا ہے؟ اور وہ شخص جو قرآن پڑھتا ہے اوراس کی تفسیر جانتا ہے اس کی مثال اس قوم کی طرح ہے جن کے پاس قاصد چراغ لے کر آیا تو انہوں نے چراغ کی روشنی سے خط میں لکھا ہوا پڑھ لیا اور انہیں معلوم ہوگیا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ (تفسیر قرطبی، باب ماجاء فی فضل تفسیر القرآن واہلہ، ۱/ ۴۱، الجزء الاول، ملخصا)

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو قرآنِ مجید سمجھ کر پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین

تعارف مفسّرِ بیضاوی:

پیدائش: 1282ء

آپ کا نام عبداللہ بن عمر، آپ رحمۃ اللہ علیہ بیضا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اتابک ابوبکر بن سعید زنگی کے زمانے میں فارس کے قاضی القضاۃ تھے۔ آپ نے قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور شیراز کے قاضی مقرر ہوئے۔ پھر تبریز میں مقیم ہوگئے اور وہیں انتقال کیا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی تفسیر، انوار التنزیل واسرار التاویل، ہے اسے عموماً تفسیر بیضاوی کہتے ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک یہ بڑے پائے کی تفسیر ہے۔ اور درس نظامی میں شامل ہے۔ دوسری اہم تصانیف منہاج الوصول فقہ میں ہے اور تیسری نظام التاریخ ہے جس میں آپ نے آدم کے زمانے سے اپنے زمانے تک کے حالات قلم بند کیے تھے۔

خُطْبَةُ الْكِتَاب

الحمد لله الذی نَزَّلَ الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا، فتحدی بأقصر سورة من سورة مصاقع الخطباء من العرب العرباء فلم یجد به قدیرا، وأفحم من تصدی لمعارضته من فصحاء عدنان وبلغاء قحطان حتی حسوا أنهم سحروا تسحیرا، ثم بین لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ حسبما عن لهم من مصالحهم لیدبروا آیاته ولیتذکر أولو الالباب تذکیرا، فکشف لهم قناع الانغلاق عن آیات محکمات هن أم الکتاب، وأخر متشابهات هن رموز الخطاب تأویلا وتفسیرا، وأبرز غوامض الحقائق ولطائف الدقائق، لیتجلی لهم خفایا الملك والملکوت وخبایا قدس الجبروت لیتفکروا فیها تفکیرا، ومهد لهم قواعد الاحکام وأوضاعها من نصوص الآیات وألماعها، لیذهب عنهم الرجس ویطهرهم تطهیرا، فمن کان له قلب اَوْ اَلْقَى السمع وَهُوَ شهید، فهو فی الدارین حمید وسعید، ومن لم یرفع إلیه رأسه وأطفأ نبراسه، یعش ذمیما ویصل سعیرا فیا واجب الوجود، ویا فائض الجود، ویا غایة کل مقصود، صل علیه صلاة توازی غناءه، وتجازی غناءه، وعلی من أعانه وقرر تبیانه تقریرا، وأفض علینا من برکاتهم واسلك بنا مسالك کراماتهم، وسلم علیهم وعلینا تسلیمًا کثیرًا.

وبعد، فإن أعظم العلوم مقدارا وأرفعها شرفا ومنارا، علم التفسیر الذی هو رئیس العلوم الدینیة ورأسها، ومبنی قواعد الشرع وأساسها، لا یلیق لتعاطیه والتصدی للتکلم فیه إلا من برع فی العلوم الدینیة کلها أصولها وفروعها، وفاق فی الصناعات العربیة والفنون الادبیة بأنواعها.

ولطالما أحدث نفسی بأن أصنف فی هٰذَا الفن کتابا یحتوی علی صفوة مما بلغنی من عظماء الصحابة، وعلماء التابعین، ومن دونهم من السلف الصالحین، وینطوی علی نکت بارعة، ولطائف رائعة، استنبطتها أنا ومن قبلی من أفاضل المتأخرین، وأماثل

المحققين، ويعرب عن وجوه القراءات المشهورة المعزوّة إلى الائمة الثمانية المشهورين، والشواذ المروية عن القراء المعتبرين.

إلا أن قصور بضاعتي يثبطني عن الإقدام، ويمنعني عن الانتصاب في هٰذا المقام حتى سنح لي بعد الاستخارة ما صمم به عزمي على الشروع فيما أردته، والإتيانُ بما قصدته، ناويا أن أسميه بعد أن أتممه أنوار التنزيل وأسرار التأويل.

فها أنا الآن أشرع وبحسن توفيقه، أقول وهو الموفق لكل خير ومعطي كل مسؤول.

ترجمہ خطبہ:

ساری تعریفیں اس اللہ کریم کے لئے ہیں جس نے فرقان کو اپنے بندے پر نازل کیا تا کہ وہ جہان والوں کے لئے ڈرانے والا ہو جائے۔ پس چیلنج کیا (اس اللہ یا عبد نے) فرقان کی صورتوں میں سے سب سے چھوٹی سورت کے ساتھ خالص عربوں کے بڑے بڑے خطباء کو اس (چیلنج یا سب سے چھوٹی سورت) پر کسی کو قادر نہیں کیا۔ اور اس شخص کو اس (اللہ یا عبد) نے خاموش کر دیا جو اس (عبد خاص یا قرآن) کے معارضہ کے در پے ہوا، قبیلہ عدنان کے فصیح لوگوں اور قبیلہ قحطان کے بلیغ لوگوں میں سے حتی کہ انہوں نے اس بات کا گمان کیا کہ ان پر کسی قسم کا جادو کر دیا گیا ہے۔

پھر نازل شدہ کو لوگوں کی طرف بیان کر دیا، اسی کے موافق جو ان کو مصلحتیں پیش آئیں تا کہ وہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور عقل والے نصیحت پکڑیں۔ پس ان کے لئے ان آیات محکمات سے جو امّ الکتاب ہیں، کے ذریعے پیچیدگیوں کے پردوں کو کھول دیا گیا۔ اور دوسری آیات متشابہات ہیں جو تاویل اور تفسیر کے اعتبار سے خطاب خداوندی کے خفیہ راز ہیں۔ اور پوشیدہ حقیقتوں اور باریک نکتوں کو ظاہر کیا تا کہ عالم شہود اور عالم غیب کی مخفی چیزیں اور اللہ کریم کی صفات جمالیہ اور جلالیہ کی مخفی چیزیں ان کے لئے روشن ہو جائیں تا کہ وہ ان میں خوب غور و فکر کریں۔ اور احکام کے قوائد اور ان کی علّتوں کو ان کے لئے مقرر کیا وہ قوائد و علل جو نصوص آیات اور اشارات آیات سے مستنبط ہیں، تا کہ ان سے گندگی کو دور کر دے اور ان کو خوب پاک کر دے۔ پس وہ آدمی جس کا دل کامل ہو یا وہ آدمی جس نے حاضر النفس ہونے کی حالت میں کان لگائے ہوں وہ دنیا و آخرت میں محمود اور خوش بخت ہے۔ اور وہ شخص جس نے اپنے سر کو اس کی طرف نہیں اٹھایا اور اپنے نورِ فطرت کو بجھا دیا وہ ذلیل ہو کر زندگی گزارے گا اور عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ پس اے واجب الوجود ذات اور اے فیضانِ سخاوت اور ہر مقصود کی انتہا آپ حضور نبی کریم ﷺ پر ایسی رحمت نازل فرما جو ان کے نفع کے برابر ہو اور ان کی مشقت کے مساوی ہو اور ان لوگوں پر رحمت کا نزول فرما جنہوں نے آپ ﷺ کی مدد کی اور آپ ﷺ کے بیان کردہ

احکامات کو راسخ کیا۔ اور ہم پر بھی ان کی برکتوں سے فیضانِ رحمت عطا فرما۔ اور ہم کو ان کی کرامات کے راستے پر چلا اور ہم سب پر بہت زیادہ سلامتی عطا فرما۔

اور حمد و صلوٰۃ کے بعد پس بے شک أعظم العلم مرتبے کے اعتبار سے اور شان رفعت و عظمت کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ علم، علمِ تفسیر ہے، جو تمام علومِ دینیہ کا سردار اور اصل ہے۔ اور قوائد شرعیہ کی بنیاد اور اساس ہے۔ اس علم کو حاصل کرنے اور اس میں کلام کرنے کے لائق نہیں ہے مگر وہ شخص جو تمام علوم دینیہ کے اصول و فروع میں فائق ہو۔ اور تمام صناعات عربیہ اور فنونِ ادبیہ میں ماہر ہو اور بسا اوقات میرے دل میں یہ بات پیدا ہوتی تھی کہ میں اس فن میں ایک ایسی کتاب تصنیف کروں جو خالص ان چیزوں پر مشتمل ہو جو مجھ تک پہنچی ہیں، بڑے جلیل القدر صحابہ کرام، تابعین اور ان سے جو مرتبہ میں کم ہیں ان سے سلف صالحین میں سے۔

وہ کتاب عجیب و غریب نکتوں پر اور ایسے خوش کن لطائف پر مشتمل ہو جن کو میں نے مستنبط کیا ہے اور مجھ سے پہلے کے متاخرین فضلاء اور ہم عصر محققین نے اکٹھا کیا ہے، اور وہ کتاب ان وجوہ قراۃ مشہورہ کو ظاہر کر دے جو آٹھ (8) مشہور آئمہ کی طرف منسوب ہیں۔ اور قرات شاذہ جو معتبر قراء سے مروی ہے لیکن میری کم مائیگی نے مجھے اس خیال پر عمل کرنے سے روک دیا اور مجھے اس مقاپ پر کھڑا ہونے سے روک دیا۔ حتیٰ کہ میرے لئے استخارہ کے بعد وہ چیز ظاہر ہو گئی جس کی وجی سے میرا عزم پختہ ہو گیا۔ اس چیز کے شروع کرنے پر جس کا میں نے ارادہ کیا تھا اور اس چیز کے لانے پر جس کا میں نے قصد کیا تھا، اس حال میں کہ میں اس کو پورا کرنے کے بعد نیت کرنے والا تھا۔

اس کا نام انوار التنزیل و اسرار التاویل رکھوں گا۔ پس بیدار رہو! اب میں شروع کر رہا ہوں اور اسی کی حسنِ توفیق سے کہتا ہوں اور وہی ہر بھلائی کی توفیق دینے والا اور ہر سائل کو عطا کرنے والا ہے۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ

مكية وآيها سبع آيات بسم الله الرحمن الرحيم. وتسمى أم القرآن، لأنها مفتتحة ومبدؤه فكأنها أصله ومنشؤه، ولذلك تسمى أساسا. أو لأنها تشتمل على ما فيه من الثناء على الله سبحانه وتعالى، والتعبد بأمره ونهيه وبيان وعده ووعيده. أو على جملة معانيه من الحكم النظرية، والاحكام العملية التى هى سلوك الطريق المستقيم والاطلاع على مراتب السعداء ومنازل الاشقياء. وسورة الكنز والوافية والكافية لذلك. وسورة الحمد والشكر والدعاء. وتعليم المسألة لاشتمالها عليها والصلاة لوجوب قراءتها أو استحبابها فيها. والشافية والشفاء

لقوله عليه الصلاة والسلام: »هى شفاء من كل داء والسبع المثانى« لأنها سبع آيات بالاتفاق، إلا أن منهم من عد التسمية دون أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، ومنهم من عكس، وتثنى فى الصلاة، أو الإنزال إن صح أنها نزلت بمكة حين فرضت الصلاة، وبالمدينة حين حولت القبلة، وقد صح أنها مكية لقوله تعالى: وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي، وهو مكى بالنص.

ترجمہ:

یہ سورت مکی ہے اور اس کی سات (7) آیات ہیں۔ اور اس سورت کو امّ القرآن کہا گیا ہے کیونکہ قرآن کی ابتداء اسی سے ہے، تو گویا وہ قرآن مجید کی اصل اور بنیاد ہے اسی وجہ سے اس کو اساس بھی کیا جاتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ یہ ان مضامین پر مشتمل ہے جو قرآن مجید میں ہیں یعنی اللہ کریم کی حمد وثنا اور اس کے احکامات کی پیروی، منہیات سے رکنا اور اس کے وعدہ وعید کا بیان، یا اس کے تمام مقاصد یعنی ان احکامات نظریہ واحکام عملیہ پر جو کہ صراطِ مستقیم پر چلنا ہے۔ اور نیک بختوں کے مراتب اور بد بختوں کے ٹھکانوں پر اطلاع ہے۔ اسی وجہ سے اس سورت کا نام سورت الکنز، سورت الوافیہ اور سورت الکافیہ رکھا گیا ہے۔

اور سورت الحمد اور الشکر اور الدعاء اور تعلیم المسئلہ اس کے ان سب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نام دیا گیا ہے۔ اور اس سورت کا نام سورت الصلوٰۃ بھی ہے کیونکہ نماز میں اس سورت کو پڑھنا واجب یا مستحب ہے۔ نیز اس سورت کا نام سورت شافیہ اور سورت الشفاء بھی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ سورت ہر بیماری کی شفاء ہے اور السبع المثانی بھی، کیونکہ اس

سورت کی بالاتفاق سات (7) آیات ہیں۔ بعض نے "بسم اللہ" کو ایک آیت شمار کیا اور "انعمت علیھم" کو بھی اور بعض نے اس کا عکس کہا اور نماز میں اس کو دوبار پڑھا جاتا ہے، یا یہ کہ نازل کرنے میں دو دفعہ ہوا، اگر یہ صحیح ہو کہ یہ پہلی دفعہ مکہ میں نماز فرض ہوتے وقت نازل ہوئی اور دوسری دفعہ مدینہ میں تبدیلی قبلہ کے وقت نازل ہوئی اور یہ صحیح ہے، کہ یہ سورت مکی ہے کیونکہ اللہ کریم کا قول،

ولقد اتيناك سبعًا من المثانى

جو اس سورت کے بارے میں ہے وہ آیت مکی ہے۔

[سورة الفاتحة (1) : آية 1]

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمنِ الرَّحِيمِ (1)

ترجمہ:

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمنِ الرَّحِيمِ

من الفاتحة، ومن كل سورة، وعليه قراءة مكة والكوفة وفقهاؤهما وابن المبارك رحمه الله تعالى والشافعي. وخالفهم قراء المدينة والبصرة والشام وفقهاؤها ومالك والاوزاعي، ولم ينص أبو حنيفة رحمه الله تعالى فيه بشيء فظن أنها ليست من السورة عنده.

وسئل محمد بن الحسن الشيباني عنها فقال: ما بين الدفتين كلام الله تعالى

.ولنا أحاديث كثيرة: منها

ما روى أبو هريرة رضي الله تعالى عنه، أنه عليه الصلاة والسلام قال: »فاتحة الكتاب سبع آيات أولاهن بسم الله الرحمن الرحيم۔

وقول أم سلمة رضي الله عنها قرأ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم الفاتحة وعد بسم الله الرحمن الرحيم الحمد للهِ رَبِّ العالمين« آية

ومن أجلهما اختلف في أنها آية برأسها أم بما بعدها، والإجماع على أن ما بين الدفتين كلام الله سبحانه وتعالى، والوفاق على إثباتها في المصاحف مع المبالغة في تجريد القرآن حتى لم تكتب آمين.

"بسم اللہ الرحمان الرحیم" سورۃ فاتحہ کا جزو ہے اور اسی پر مکہ اور کوفہ کے قراء اور ان کے فقہاء اور ابن مبارک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیھم اور قراء مدینہ، بصرہ اور شام اور ان کے فقہاء اور امام مالک اور امام اوزاعی نے مخالفت کی ہے کہ "بسم اللہ

"سورۃ فاتحہ کا جزو نہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کسی بھی چیز کی تصریح نہیں فرمائی۔ چنانچہ گمان ہوا کہ امام صاحب کے نزدیک سورۃ فاتحہ کا جزو نہیں اور امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے جزئیت فاتحہ کے متعلق سوال کیا گیا۔

تو آپ نے جواب کچھ یوں دیا "ما بين الدفتين كلام الله" امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی دلیل میں چند احادیث مبارکہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب کی سات آیتیں ہیں ان میں پہلی آیت مبارکہ "بسم اللہ الرحمان الرحیم" ہے اور حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور "بسم اللہ الرحمان الرحیم الحمد للہ رب العالمین" کو ایک آیت شمار کیا اور یہ روایات ہی وجہِ اختلاف بنیں، اس بات میں کہ "بسم اللہ" تام ہے غیر تام ہے۔ اور اجماع اس بات پر ہے کہ ما بین الدفتین اللہ کا کلام ہے، اور "بسم اللہ" کے مصاحف پر ثابت کرنے پر اتفاق ہے باوجود تجرید قرآن میں مبالغہ کے حتی کہ آمین بھی نہیں لکھا جاتا ہے۔

متن:

والباء متعلقة بمحذوف تقديره:

بسم الله أقرأ لأن الذى يتلوه مقروء. وكذلك يضمر كل فاعل ما يجعل التسمية مبدأ له. وذلك أولى من أن يضمر أبدأ لعدم ما يطابقه ويدل عليه. أو ابتدائى لزيادة إضمار فيه. وتقديم المعمول هاهنا أوقع كما فى قوله:

بِسْمِ اللهِ مَجْرَاهَا

وقوله: إِيَّاكَ نَعْبُدُ لأنه أهم وأدل على الاختصاص، وأدخل فى التعظيم وأوفق للوجود فإن اسمه سبحانه وتعالى مقدم على القراءة. كيف لا وقد جعل آلة لها من حيث إن الفعل لا يتم ولا يعتد به شرعًا ما لم يصدر باسمه تعالى

لقوله عليه الصلاة والسلام كل أمر ذى بال لا يبدأ فيه ببسم الله فهو أبتر

، وقيل الباء للمصاحبة، والمعنى متبركاً باسم الله تعالى اقرأ. وهٰذا وما بعده إلى آخر السورة مقول على ألسنة العباد ليعلموا كيف يتبرك باسمه، ويحمد على نعمه، ويُسأل من فضله.

وإنما كسرت ومن حق الحروف المفردة أن تفتح، لاختصاصها باللزوم الحرفية والجر، كما كسرت لام الامر ولام الإضافة داخلة على المظهر للفصل بينهما وبين لام الابتداء

ترجمہ:

اور باء فعلِ محذوف کے متعلق ہے، اس کی تقدیر عبارت یہ ہوگی "بسم اللہ اقرا" اس لئے جو چیزیں بعد میں آ رہی ہیں وہ ازقبیلہ مقروٌ ہیں، اور ایسے ہی ہر تسمیہ کرنے والا مقدر مانے ایسے لفظ کو کہ جس کے لئے تسمیہ کو مبدا بنایا جائے اور یہ لفظ اقرا کو مقدر ماننا اولیٰ ہے بمقابلہ لفظ "ابدءُ" کو مقدر ماننے کے، بوجہ نہ ہونے اس فعل کے جو لفظ ابدءُ کے مطابق ہو۔ یعنی ایسا فعل نہیں پایا جاتا جو اس پر صادق آئے اور نہ کوئی ایسا لفظ پایا جاتا جو اس "ابدءُ" پر دال ہو اور اقرا کو مقدر ماننا اولیٰ ہے بمقابلہ ابتدائی کے، کیونکہ ابتدائی مقدر ماننے میں زیادہ اضمار ہے۔

اور تسمیہ کے موقع پر معمول کو مقدم کرنا زیادہ وقیع ہے جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان "بسم اللہ مجریہا" اور "ایاک نعبد" میں مقدم ہے اس لئے کہ تقدیم اہم ہے اور اختصاص پر زیادہ دلالت کرتی ہے، اور تعظیم میں اس کو دخل ہے اور وجودِ اسم کے موافق ہے، کیونکہ باری تعالیٰ کا نام قرات پر مقدم ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ اسم باری کو آلہ قرار دیا گیا ہے قرات کے لئے اس لئے حیثیت سے کہ فعل اس وقت تک شرعاً معتبر اور تام ہی نہیں ہوتا جب تک کہ اسمِ باری سے اس کی ابتداء نہ کی جائے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر وہ مہتم بالشان کام جس کی ابتداء اللہ کریم کے نام سے نہ کی جائے وہ ناقص اور بے برکت ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا کہ باء مصاحبت کے لئے ہے اور اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میں پڑھ رہا ہوں اس حال میں کہ میں ملتبس ہوں "علی قصد التبرک" اللہ کے نام کے ساتھ اور "بسم اللہ" سے لے کر آخر سورۃ فاتحہ تک بندوں کی زبانی کہلا دیا گیا ہے تاکہ بندے یہ جان لیں کہ اللہ کریم کے نام کے ساتھ برکت کیسے حاصل کی جاتی ہے اور اس کی نعمتوں پر اس کی تعریف کیسے کی جاتی ہے، اور اس کے فضل کا سوال کیونکر کیا جائے۔

اور باء کو کسرہ دیا گیا حالانکہ حروفِ مفردہ کا حق یہ تھا کہ ان کو فتحہ دیا جاتا، کسرہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ باء لزومِ حرفیت اور حرفِ جر ہونے کی لزومیت کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح کہ لامِ امر کو کسرہ دیا گیا اور لامِ اضافت کو جب کہ وہ مظہر پر داخل ہو کسرہ دیا گیا۔ لامِ امر اور لامِ ابتداء اور لامِ اضافت اور لامِ تاکید کے درمیان فرق کرنے کے لئے۔

متن:

والاسم عند أصحابنا البصريين من الاسماء التي حذفت أعجازها لكثرة الاستعمال، وبنيت أوائلها على السكون، وأدخل عليها مبتدأ بها همزة الوصل، لأن من دأبهم أن يبتدئوا بالمتحرك ويقفوا على الساكن. ويشهد له تصريفه على أسماء وأسامي وسمي وسميت ومجيء سمى كهدى لغة فيه قال:

والله أسماك سمًا مُبارکاً... آثرك الله بهِ إيثَارکا

والقلب بعيد غير مطرد. واشتقاقه من السمو لأنه رفعة للمسمى وشعار له.

ومن السمة عند الكوفيين، وأصله وسم حذفت الواو وعوضت عنها همزة الوصل ليقل إعلاله.

ورد بأن الهمزة لم تعهد داخلة على ما حذف صدره في كلامهم. ومن لغاته سم وسم قال:

بِسْمِ الذي في كُلِّ سُورةٍ سِمُهُ

والاسم إن أريد به اللفظ فغير المسمى، لأنه يتألف من أصوات متقطعة غير قارة. ويختلف باختلاف الامم والاعصار، ويتعدد تارة ويتحد أخرى. والمسمى لا يكون كذلك. وإن أريد به ذات الشيء فهو المسمى لكنه لم يشتهر بهٰذَا المعنى وقوله تعالى: تَبارَكَ اسْمُ رَبِّكَ وسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ المراد به اللفظ لأنه كما يجب تنزيه ذاته سبحانه وتعالى وصفاته عن النقائص، يجب تنزيه الالفاظ الموضوعة لها عن الرفث وسوء الادب. أو الاسم فيه مقحم كما في قول الشاعر:

إلى الحولِ ثُم اسمُ السلامِ عليكُما وإن أريد به الصفة. كما هو رأى الشيخ أبي الحسن الاشعرى، انقسم انقسام الصفة عنده: إلى ما هو نفس المسمى، وإلى ما هو غيره. وإلى ما ليس هو ولا غيره.

ترجمہ:

اور بصریوں کے نزدیک اسم ان اسماء میں سے ہے جن کے آخری حرف کو کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور ابتدائی حرف کو ساکن رکھا گیا ہے پھر ابتداء کرنے کی وجہ سے شروع میں ہمزہ وصل کا اضافہ کیا گیا کیونکہ اہلِ عرب کا یہی طریقہ ہے کہ وہ حرفِ متحرک سے ابتداء کرتے اور حرفِ ساکن پر ٹھہرتے ہیں اور بصریوں کے مسلک کے لئے شاہد اسم کی وہ گردان ہے جو اسماء واسامی وسمّی اور سمیت کے وزن پر آتی ہے اور سمی جو ہدی کے وزن پر ہے اسم کے معنی میں اسم کی ایک لغت بن کر استعمال ہونا بھی مسلکِ بصریین کے شواہد میں سے ہے شاعر کا قول ملاحظہ ہو،

والله أسماك سمًا مُبارکاً... آثرك الله بهِ إيثَارکا

اے ممدوح خدا نے تمہارا نام منتخب کرنے میں تجھ کو دوسرے لوگوں پر ترجیح دی جس طرح فضیلت بخشنے میں تیری ذات کو خدا نے دوسروں کی ذات پر ترجیح دی مطلب یہ ہے کہ جس طرح تجھ کو خدا نے با فضل بنایا ہے اسی طرح تیرا نام بھی عمدہ منتخب کیا ہے۔ اور اسم کے سابقہ اوزان میں قلب کا واقع ہونا مستبعد بات ہے جو اس قدر عام نہیں اور اسم مشتق ہے "سمو" سے اس لئے ہے کہ اسم مسمی کے لئے موجب رفعت اور طرہ امتیاز ہے۔

اور کوفیوں کے نزدیک اسم "سمة" سے مشتق ہے اور اس کی اصل "وسم" ہے واؤ کو حذف کر کے ہمزہ وصل اس کے

عوض میں لے آئے تا کہ اعلال کم ہوں اور تردید بایں طور کی گئی ہے کہ یہ بات نہیں پہچانی گئی کہ اوّل سے حذف کر کے ہمزہ کو داخل کیا جائے اور ان کے کلام میں اور اسم کی لغات میں سِم اور سُم بھی ہے جیسا کہ قول شاعر یعنی اس ذات کے نام سے شروع کرتا ہے جس کا نام ہر سورت کے شروع میں ہے۔

پس اسم سے اگر لفظ مراد لیا جائے تو اسم غیر مسمّٰی ہے اس لئے کہ اسم مرکب ہوتا ہے ایسے اصوات سے جو ٹکڑے ٹکڑے ہیں، غیر مجتمع ہیں اور امتوں اور زمانوں کے اختلاف سے مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اور کبھی اسماء مختلف ہوتے رہتے ہیں اور کبھی مختلف نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی اسم ہوتا ہے اور مسمّی ایسا نہیں ہوتا اور اگر ذات سے شئی مراد لی جائے تو اسم عین مسمی ہے لیکن اس معنی کے ساتھ مشہور نہیں اور اللہ کریم کا قول،

تبارك اسم ربّك

اور

سبح اسم ربّك

اس سے مراد لفظ ہے اس لئے کہ جس طرح سے ذات وصفات کو نقائص سے پاک کرنا واجب ہے اسی طرح ان الفاظ کو جو ان کے لئے وضع کئے گئے ہیں، پاک کرنا واجب ہے۔ فحش چیزوں اور سوء ادبی سے۔ یا اسم اس آیت میں زائد ہے جیسا کہ شاعر کے شعر میں لفظ اسم زائد ہے،

إلى الحولِ ثُم اسمُ السلامِ عليكُما

اور اگر صفت مراد لی جائے جیسا کہ شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے تو اسم منقسم ہوگا جیسا کہ ان کے نزدیک صفت منقسم ہوی ہے ایک وہ جو عین مسمّٰی ہے دوم جو غیر مسمّٰی ہے سوم جو نہ عین مسمّٰی ہے اور نہ غیر مسمّٰی ہے۔

متن:

وإنما قال بسم الله ولم يقل بالله، لأن التبرك والاستعانة بذكر اسمه. أو للفرق بين اليمين والتيمن. ولم تكتب الالف على ما هو وضع الخط لكثرة الاستعمال وطولت الباء عوضاً عنها.

والله أصله إله، فحذفت الهمزة وعوض عنها الالف واللام ولذلك قيل:

يا الله، بالقطع إلا أنه مختص بالمعبود بالحق. والإله فى الاصل لكل معبود، ثم غلب على المعبود بالحق.

واشتقاقه من أله ألهة وألوهة وألوهية بمعنى عبد، ومنه تأله واستأله. وقيل من أله إذا تحير لأن العقول تتحير فى معرفته. أو من ألهت إلى فلان أى سكنت إليه، لأن القلوب تطمئن بذكره،

والارواح تسكن إلى معرفته.

أو من أله إذا فزع من أمر نزل عليه وآلهة غيره أجاره إذ العائذ يفزع إليه وهو يجيره حقيقة أو بزعمه. أو من أله الفصيل إذا ولع بأمه. إذ العباد يولعون بالتضرع إليه فى الشدائد أو من وله إذا تحير و تخبط عقله.

وكان أصله ولاه فقلبت الواو همزة لاستثقال الكسرة عليها استثقال الضمة فى وجوه فقيل إله كإعاء وإشاح ويرده الجمع على آلهة دون أولهة. وقيل أصله لاه مصدر لاه يليه ليها ولاها. إذا احتجب وارتفع لأنه سبحانه وتعالى محجوب عن إدراك الابصار، ومرتفع على كل شىء وعما لا يليق به ويشهد له قول الشاعر:

كَحِلفةٍ من أبي رباحٍ ... يُشهِدُهَا لاهَهُ الكِبارُ

ترجمہ:

اور قرآن مجید میں "بسمِ اللّٰہ" اسم کے اضافہ کے ساتھ آئی ہے، "باللہ" نہیں ذکر کیا گیا وہ اس لئے کہ برکت حاصل کرنے اور مدد طلب کرنے کی جرات لفظِ اسم کے اضافہ کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ یا "باءِ یمین اور باءِ یمین" میں فرق کرنے کے لئے اور بسم اللہ شریف کے الف کو کتابت میں نہیں لایا گیا باوجود اس کے کہ رسم الخط کا قانون یہی تھا کہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے لایا جاتا۔ اور اس الفِ محذوف کے بدلے بسم اللہ شریف کی باء کو "الباء" کر کے لکھا گیا۔

لفظِ اللہ اصل میں "الہ" ہے حذفِ ہمزہ کے عوض الف لام لایا گیا (اور چونکہ الف لام عوضی ہے تعریف کا نہیں) اس لئے بوقتِ نداء "یا اللّٰہ" ہمزہ قطعی کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ اللہ معبودِ برحق کے ساتھ خاص ہے اور لفظِ الہ اپنے اصلی معنی کے اعتبار سے ہر معبود پر بولا جاتا ہے، پھر اکثر اطلاق اس کا معبود برحق پر ہونے لگا۔

اور لفظ الہ مشتق ہے، اَلَہ اِلٰہۃ و الوہۃ و الوہیۃ سے جو "عَبَدَ" کے معنی میں ہے اور انہیں مصادر سے تالہ اور استالہ مشتق ہے، اور بعض نے کہا کہ الہ مشتق ہے "اَلِہَ" عین کے کسرہ کے ساتھ، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی حیرت میں پڑھ جائے (پس الہ کی وجہ اشتقاق یہ ہوگی) اس لئے کہ عقول اللہ کریم کی کما حقہ، معرفت حاصل کرنے میں متحیر ہیں یا لفظ الہ ماخوذ ہے "الہت الی فلانٍ" سے جس کے معنی ہیں کہ میں نے فلان کے پاس جا کر سکون حاصل کیا۔ خدا کو الہ اس لئے کہتے ہیں کہ مومنین کے دل اس کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں اور روحوں کو اللہ کریم کی معرفت سے سکون ملتا ہے۔ یا مشتق ہے الہ و الہ وغیرہ سے (الہ اس وقت بولتے ہیں) جب کوئی آدمی آنے والی مصیبت سے گھبرائے جب کہ اس گھبرائے ہوئے کو دوسرا پناہ دے دے تو اس صورت میں خدا کو خدا اس لئے کہا جاتا ہے کہ پناہ ڈھونڈنے والے اس کے پاس گھبرا کر جاتے ہیں، اور وہ ان کو حقیقتاً یا پناہ گزیں کے خیال کے مطابق پناہ دیتا ہے۔ یا لفظ الہ مشتق ہے "الہ الفصیل" سے جس کا معنی یہ ہے

کہ اونٹنی کا بچہ اپنی ماں سے چمٹ گیا۔ (خدا کو اللہ اس لئے کہا جاتا ہے) کہ بندے مصائب میں گڑگڑا کر خدا سے چمٹتے ہیں یا لفظ الہ مشتق ہے "وَلہ" سے جس کا معنی مخبوط العقل ہو جانا ہے۔

اور اس صورت میں الہ کی اصل ولاہ ہوگی واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا اس لئے کہ واؤ پر کسرہ ثقیل ہے جس طرح وجوہ کے واؤ پر ضمہ ثقیل ہے پھر تبدیلی کے بعد الاہ ہمزہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے جس طرح کہ اعام اور اشاح ہمزہ کے ساتھ مستعمل ہیں۔ اور اس قول کی تردید اس بات سے ہوتی ہے کہ الہ کی جمع "الھة" ہوتی ہے نہ کہ اولھة۔ اور بعض کا قول ہے کہ الہ کی اصل "لاہ" ہے جو مصدر ہے لَاہ یلیہ، لیہاً و لاہاً کا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی پوشیدہ اور بالاتر ہو اس صورت میں خدا کو الہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ نگاہوں کے ادراک سے پوشیدہ اور ہر چیز پر فائق اور نامناسب صفات سے بالاتر ہے اور اس قول کے لئے شاہد شاعر کا شعر ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ابوریاح کی اس ایک دفعہ کی قسم کے مانند جس کو اس کا بڑا معبود سن رہا ہے۔

متن:

وقيل علم لذاته المخصوصة لأنه يوصف ولا يوصف به، ولأنه لا بد له من اسم تجرى عليه صفاته ولا يصلح له مما يطلق عليه سواه، ولأنه لو كان وصفاً لم يكن قول: لا إله إلا الله، توحيداً مثل: لا إله إلا الرحمن، فإنه لا يمنع الشركة.

والاظهر أنه وصف فى أصله لكنه لما غلب عليه بحيث لا يستعمل فى غيره وصار له كالعلم مثل: الثريا والصعق أجرى مجراه فى إجراء الاوصاف عليه، وامتناع الوصف به، وعدم تطرق احتمال الشركة إليه،

لأن ذاته من حيث هو بلا اعتبار أمر آخر حقيقي أو غيره غير معقول للبشر، فلا يمكن أن يدل عليه بلفظ،

ولأنه لو دل على مجرد ذاته المخصوصة لما أفاد ظاهر قوله سبحانه وتعالى: وَهُوَ اللهُ فِي السَّمَاوَاتِ معنى صحيحاً، ولأن معنى الاشتقاق هو كون أحد اللفظين مشاركاً للآخر فى المعنى والتركيب، وهو حاصل بينه وبين الاصول المذكورة.

وقيل أصله لاها بالسريانية فعرب بحذف الالف الاخيرة، وإدخال اللام عليه، وتفخيم لامه إذا انفتح ما قبله أو انضم سنة، وقيل مطلقاً.

وحذف ألفه لحن تفسد به الصلاة، ولا ينعقد به صريح اليمين، وقد جاء لضرورة الشعر:

أَلاَ لا بَارَكَ اللهُ فى سُهيلٍ … إذا ما اللهُ بَارَكَ فى الرِّجَال

ترجمہ:

اور بعض کا کہنا ہے کہ لفظِ اللہ خدا کی ذاتِ مخصوصہ کا علم ہے اس لیے کہ یہ لفظ خود تو موصوف بن جاتا ہے لیکن صفت نہیں بنتا اور اس لئے بھی کہ ذاتِ واجب کے لئے کوئی ایسا اسم ہونا ضروری ہے جس پر تمام صفات واجب کا اجراء ہو سکے اور اس بات کی صلاحیت لفظِ اللہ کے سوا جتنے بھی خدا کے اسماءِ حسنیٰ ہیں ان میں سے کسی میں بھی نہیں، نیز اس لئے اگر لفظِ اللہ کو معنیٰ وصفی مانتے ہو (تو چونکہ وصف میں عموم ہوتا ہے اس لئے) "لا الہ الا اللہ" توحید کا فائدہ نہیں دے گا۔ جس طرح کہ "لا الہ الا الرحمان" توحید کا فائدہ نہیں دیتا کیونکہ وصف مانع شرکت نہیں ہوتا۔

اور اظہر یہ ہے کہ لفظِ اللہ درحقیقت وصف ہے لیکن جب غلبہ ذاتِ باری کے لئے اس طور پر استعمال ہونے لگا کہ غیر کے اندر بالکل مستعمل نہیں۔ اور علم کے مشابہ ہو گیا جس طرح کہ لفظ ثریا اور صعق ہیں۔ (کہ درحقیقت معنیٰ وصفی رکھتے ہیں مگر غلبہ کالعلم ہو گئے۔) تو اس کو علم کے قائم مقام کر دیا گیا (تین چیزوں میں) تمام صفات کا موصوف بننے میں اور خود کے صفت نہ بننے میں اور اشتراک کا احتمال نہ رکھنے میں۔

اس لئے کہ ذاتِ خداوندی ذاتِ خداوندی ہونے کی حیثیت سے انسان کی عقل میں نہیں آسکتی جب تک کہ ذات کے علاوہ کسی دوسرے لفظ کا لحاظ نہ کیا جائے، وہ وصف حقیقی ہو یا غیر حقیقی پس ممکن نہیں کہ ذات من حیث الذات کسی لفظ کا مدلول بنے۔

اور اس لئے کہ اگر لفظِ اللہ محض ذاتِ مخصوص پر دلالت کرے تو فرمان باری "وھو اللہ فی السمٰوٰت" کی ظاہری عبارت ایسے معنیٰ کا افادہ نہیں کرے گی جو (عقیدہ اہلسنت والجماعت کے پیش نظر) صحیح ہوں اور اس لئے کہ اشتقاق کی حقیقت یہ ہے کہ دو لفظوں میں سے ایک دوسرے کے معنیٰ اور ترکیب میں شریک ہو اور یہ بات لفظِ اللہ اور ذکر کردہ اصول کے درمیان موجود ہے۔

اور بعض نے کہا کہ اصل "لاھا" ہے جو سریانی زبان کا لفظ ہے، پھر اس کو عربی اس طرح بنایا گیا کہ آخری الف کو حذف کر دیا گیا اور شروع میں الف لام داخل کر دیا گیا۔ اور لفظ اللہ کے لام کو پُر پڑھنا، جبکہ اللہ کا ماقبل مفتوح یا مضموم ہو، یہ اسلاف قراء کا طریقہ ہے۔ اور بعض نے کہا کہ لفظِ اللہ کے لام کو ہمیشہ پُر پڑھا جائے گا۔

اور لفظِ اللہ کے الف کو حذف کر کے پڑھنا ایسی غلطی ہے کہ اس سے نماز فاسد ہو جائے گی، اور اس سے صریح یمین بھی منعقد نہیں ہوگی اور شاعر کا قول "الا لا بارک اللہ فی سہیلِ الخ" میں الف کا حذف کرنا ضرورت شعری کی وجہ سے ہے۔

شعر کا ترجمہ

آگاہ رہو اللہ کریم برکت عطا نہ کرے سہیل نامی کے حق میں، جبکہ اللہ کریم تمام لوگوں کے حق میں برکت کا فیضان کرے۔

متن:

والرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ اسمان بنيا للمبالغة من رحم، كالغضبان من غضب، والعليم من علم، والرحمة في اللغة: رقة القلب، وانعطاف يقتضي التفضل والإحسان،

ومنه الرَّحِم لانعطافها على ما فيها. وأسماء الله تعالى إنما تؤخذ باعتبار الغايات التي هي أفعال دونِ المبادي التي تكون انفعالات. والرَّحْمٰنِ أبلغ من الرَّحِيمِ، لأن زيادة البناء تدل على زيادة المعنى كما في قَطَعَ وقَطَّعَ و كُبَار و كُبَّار، وذلك إنما يؤخذ تارة باعتبار الكمية، وأخرى باعتبار الكيفية، فعلى الاول قيل: يا رحمن الدنيا

لأنه يعم المؤمن والكافر، ورحيم الآخرة لأنه يخص المؤمن، وعلى الثاني قيل: يا رحمن الدنيا والآخرة، ورحيم الدنيا، لأن النعم الاخروية كلها جسام، وأما النعم الدنيوية فجليلة وحقيرة،

"والرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ" دو اسم ہیں جو مبالغہ کے لئے بنی ہیں، اور ماخوذ ہیں "رحم" سے جیسے غضبان ماخوذ ہے غضب سے اور علیم مشتق ہے علم سے۔ اور رحمت لغت میں اس رقّتِ قلب اور مِیِ نفسانی کو کہتے ہیں جو فضل واحسان کا مقتضی ہو۔

اور رحم (بچہ دانی) بھی اسی سے مشتق ہے کیونکہ وہ رحم بھی اس چیز پر نرم ہوتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے، اور اللہ کریم کے اسمائے حسنیٰ اپنے ان نتائج وآثار کے اعتبار سے ملحوظ ہیں جو از قبیلِ تاثیرات ہیں۔ اور مبادی اور اسباب کے اعتبار سے نہیں جو از قبیل تاثرات ہیں۔

اور رحمان میں، رحیم کے مقابلہ میں زیادہ مبالغہ ہے کیونکہ الفاظ کی زیادتی معنیٰ کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ قطع بالتخفیف اور قطّع بالتشدید اور کبار بالتشدید کی مثالوں میں واضح ہے اور اس زیادتی کا کبھی کمیت کے اعتبار سے لحاظ کیا جاتا ہے اور کبھی کیفیت کے اعتبار سے پہلے لحاظ پر "یا رحمان الدنیا" کہا جائے گا۔

اس لئے کہ رحمتِ دنیا مومن وکافر دونوں کو عام ہے اور رحیم الآخرۃ (رحیم کی آخرت کی طرف اضافت کرتے ہوئے) کہا جائے گا، اس لئے کہ رحمتِ آخرت صرف مومن کے لئے ہے اور دوسرے لحاظ کے مطابق "یا رحمٰن الدنیا والآخرۃ (باضافۃ الرحمان الیہما) اور رحیم الآخرۃ (باضافۃ الرحیم الی الآخرۃ فقط) کہا جائے گا۔ اس لئے کہ اخروی نعمتیں سب کی سب بڑی ہیں اور دنیاوی نعمتیں سو وہ چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔

متن:

وإنما قدم والقياس يقتضي الترقي من الادنى إلى الاعلى، لتقدم رحمة الدنيا، ولأنه صار كالعلم من حيث إنه لا يوصف به غيره لأن معناه المنعم الحقيقي البالغ في

الرحمة غايتها. وذلك لا يصدق على غيره لأن من عداه فهو مستعيض بلطفه وإنعامه يريد به جزيل ثواب أو جميل ثناء أو مزيح رقة الجنسية أو حب المال عن القلب. ثم إنه كالواسطة في ذلك لأن ذات النعم ووجودها. والقدرة على إيصالها. والداعية الباعثة عليه. والتمكن من الانتفاع بها. والقوى التي بها يحصل الانتفاع. إلى غير ذلك من خلقه لا يقدر عليها أحد غيره. أو لأن الرحمن لما دل على جلائل النعم وأصولها ذكر الرحيم ليتناول ما خرج منها. فيكون كالتتمة والرديف له. أو للمحافظة على رؤوس الآي.

والاظهر أنه غير مصروف وإن حظر اختصاصه بالله تعالى أن يكون له مؤنث على فعلى أو فعلانة إلحاقاً له بما هو الغالب في بابه.

وإنما خص التسمية بهذه الاسماء ليعلم العارف أن المستحق لأن يستعان به في مجامع الامور. هو المعبود الحقيقي الذي هو مولى النعم كلها عاجلها وآجلها. جليلها وحقيرها. فيتوجه بشَرَاشِرِهِ إلى جناب القدس. ويتمسك بحبل التوفيق. ويشغل سره بذكره والاستعداد به عن غيره.

اور رحمٰن کو مقدم کیا گیا حالانکہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ادنیٰ صفت سے اعلیٰ صفت کی طرف ترقی کی جائے اس لئے کہ رحمتِ دنیا مقدم ہے اور اس لئے بھی کہ لفظ رحمٰن لفظِ اللہ کے مشابہ ہے اس حیثیت سے کہ غیر اللہ کی صفت نہیں بنتا کیونکہ رحمان کے معنیٰ اس تنعمِ حقیقی کے ہیں جو رحمت کے انتہائی مقام کو پہنچا ہوا ہو اور یہ معنیٰ غیر اللہ پر صادق نہیں آتے اس لئے کہ خدا کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں وہ اپنے لطف وانعام کے بدلہ کے خواہاں رہتے ہیں۔ خواہ وہ بدلِ آخرت میں ثوابِ کثیر ہو یا مخلوق کے منہ سے تعریف کرانا مقصود ہو، یا وہ رقّت زائل کرنا پیشِ نظر ہو جو ہم جنس کی بناء پر پیدا ہوتی ہے یا اپنے دل کو مال کی محبت سے خالی کرنا مقصود ہو اور آدمی اپنے لطف کے اندر ایک واسطہ سا ہے اس لئے کہ خود نعمتوں کی ذات یا ان کا وجود اور غیر کو دینے پر قدرت دینا، اور وہ داعیہ جو بندہ کو دینے پر ابھارتا ہو اور نعمتوں سے منتفع ہونے کی قدرت دینا اور وہ قوّتیں عطا کرنا جن کے ذریعہ سے انسان فائدہ حاصل کر سکے اور اس کے علاوہ بہت سی چیزیں یہ سب اللہ کریم کے پیدا کرنے سے ہی ہیں۔ خدا کے علاوہ ان چیزوں کی کوئی دوسرا قدرت نہیں رکھتا یا اس لئے کی رحمان جب اللہ کریم کی بڑی بڑی نعمتوں اور ان کے اصول پر دلالت کرتا ہے تو رحیم کو ذکر کیا تا کہ ان نعمتوں کو بھی شامل ہو جائے جو لفظِ رحمٰن سے نکل گئی تھیں۔ پس ذکرِ رحیم بطور تتمّہ اور ردیف کے ہوگا یا رؤس الآیات کی حفاظت کی وجہ سے رحیم کو مؤخر ذکر کیا گیا۔

اور اظہر یہ ہے کہ لفظِ رحمٰن غیر منصرف ہے اگرچہ اس کا خدا کے ساتھ مختص ہونا اس بات سے مانع ہے کہ اس کا مؤنث

"فعلی یا فلانۃ" کے وزن پر آئے (مگر پھر بھی غیر منصرف ہے کیوں کہ) ان کلمات کے ساتھ لاحق کر دینے کی وجہ سے جن کے باب میں غیر منصرف ہونا غالب ہے۔

اور تسمیہ میں خاص طور پر انہیں اسماء کو ذکر کیا گیا تا کہ عارف اس بات کو جان لے کہ اس بات کے لائق کہ جس سے تمام امور میں مدد طلب کی جائے صرف وہی ذات ہے جو معبودِ حقیقی ہو اور تمام نعمتوں کو عطا کرنے والا ہو، خواہ وہ نعمتیں فوری ہوں یا بعد میں ملنے والی چھوٹی ہوں یا بڑی، پس عارف اس بات کو سمجھ کر اپنے پورے دل و دماغ کے ساتھ اللہ کریم کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کی توفیق کی رسی کو مضبوط پکڑے اور وہ دل سے اللہ کریم کی عبادت میں مستغرق ہو جائے اور صرف اللہ کریم سے ہی مدد طلب کرے۔

لفظِ عوذ کی تحقیق:

العوذ (ن)

کے معنی ہیں کسی کی پناہ لینا اور اس سے چمٹے رہنا۔ جیسا کہ محاورہ ہے: عاذ فلان بفلان فلاں نے اس کی پناہ لی اس سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (البقرۃ آیت نمبر 67)

کہ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں۔

لفظ الٰہ اور لفظ اللہ کی مفصل تحقیق:

(الٰہ) اللہ

اس میں چند اقوال ہیں:

(1) بعض کا قول ہے کہ اللہ کا لفظ اصل میں الٰہ ہے ہمزہ (تخفیفاً) حذف کر دیا گیا ہے اور اس پر الف لام (تعریف) لا کر باری تعالیٰ کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اسی تخصیص کی بناء پر فرمایا:

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (سورۃ مریم آیت نمبر 65)

کیا تمہیں اس کے کسی ہم نام کا علم ہے۔ الٰہ کا لفظ عام ہے اور ہر معبود پر بولا جاتا ہے (خواہ وہ معبود برحق ہو یا معبود باطل) اور وہ سورج کو الاھۃ کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ انہوں نے اس کو معبود بنا رکھا تھا۔ الٰہ کے اشتقاق میں مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ الہ (ف) یالہ فلاو ثالہ سے مشتق ہے جس کے معنی پرستش کرنا کے ہیں اس بنا پر الٰہ کے معنی ہوں گے معبود اور بعض نے کہا ہے کہ یہ الِہ (س) بمعنی تحیر سے مشتق ہے اور باری تعالیٰ کی ذات و صفات کے ادراک سے چونکہ عقول متحیر اور درماندہ ہیں اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے۔

کل دون صفاته تحبیر الصفات وضل هناك تصاریف للغات۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من خاک برفرق من وتمثیل من اس لئے کہ انسان جس قدر صفات الیہ میں غور وفکر کرتا ہے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہے اس بناء پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے،

تفکروا فی آلاء الله ولا تفکروا فی الله

کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کیا کرو اور اس کی ذات کے متعلق مت سوچا کرو۔

(2) بعض نے کہا ہے کہ الاصل میں ولاہ ہے واؤ کو ہمزہ سے بدل کر الاہ بنالیا ہے اور ولہ (س) کے معنی عشق ومحبت میں وارفتہ اور بے خود ہونے کے ہیں اور ذات باری تعالیٰ سے بھی چونکہ تمام مخلوق کو والہانہ محبت ہے اس لئے اللہ کہا جاتا ہے اگرچہ بعض چیزوں کی محبت تسخیری ہے جیسے جمادات اور حیوانات اور بعض کی تسخیری اور ارادی دونوں طرح ہے جیسے بعض انسان اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے ذات باری تعالیٰ تمام اشیاء کو محبوب ہے اور آیت کریمہ:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (سورۃ الاسراء آیت نمبر 44)

مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

(3) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں لاہ یلوہ لیاھا سے ہے جس کے معنی پردہ میں چھپ جانا کے ہیں اور ذات باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور اور محجوب ہے اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (سورۃ الانعام آیت نمبر 103)

وہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔ نیز آیت کریمہ؛

وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (سورۃ الحدید آیت نمبر 3)

میں الباطن کہہ کر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الہ یعنی معبود درحقیقت ایک ہی ہے اس لئے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس کی جمع نہ لائی جائے، لیکن اہل عرب نے اپنے اعتقاد کے مطابق بہت سی چیزوں کو معبود بنا رکھا تھا اس لئے الہۃ صیغہ جمع استعمال کرتے تھے۔ قرآن میں ہے؛۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 43)

کیا ہمارے سوا ان کے اور معبود ہیں کہ ان کو مصائب سے بچالیں۔

وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 127)

اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔ ایک قراءت میں والاھتک ہے جس کے معنی عبادت کے ہیں الاہ انت۔ یہ اصل میں للہ انت ہے ایک لام کو تخفیف کے لئے خذف کر دیا گیا ہے۔

اللھم بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یا اللہ کے ہیں اور اس میں میم مشدد یا (حرف ندا کے عوض میں آیا ہے اور بعض کا

قول یہ ہے کہ یہ اصل میں یا اللہ امنا بخیر (اے اللہ تو خیر کے ساتھ ہماری طرف توجہ فرما) ہے (کثرت استعمال کی بنا پر) ۔۔۔حی ھلا کی طرح مرکب کر کے اللھم بنا لیا گیا ہے۔ (جیسے ھلم)

لفظِ شطن کی تحقیق:

الشیطان

اس میں نون اصلی ہے اور یہ شطن سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں اور بئر شطون بمعنی بہت گہرا کنواں شطنت الدار گھر کا دور ہونا غربۃ شطون بمعنی بطن سے دوری وغیرہ محاورات اسی سے مشتق ہیں بعض نے کہا ہے کہ لفظ شیطان میں نون زائدہ ہے اور یہ شاط یشیط سے مشتق ہے جس کے معنی غصہ سے سوختہ ہو جانے کے ہیں۔ اور شیطان کو بھی شیطان اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے جیسا کہ آیت:

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَار (سورۃ الرحمٰن آیت نمبر 15)

اور جنات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا،

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ وہ جن وانس سے ہو یا دیگر حیوانات سے۔ قرآن میں ہے:

شَیَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (سورۃ الانعام آیت نمبر 112)

شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو۔

لفظِ رجم کی تحقیق و معانی:

الرجام پتھر اسی سے الرجیم ہے جس کے معنی سنگسار کرنا کے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے رجمۃ اسے سنگسار کیا اور جسے سنگسار کیا گیا ہو اسے مرجوم کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے؛

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یَا نُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ (سورۃ الشعراء آیت نمبر 116)

کہ تم ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

اِنَّهُمْ اِنْ یَّظْهَرُوْا عَلَیْكُمْ یَرْجُمُوْكُمْ (سورۃ الکھف آیت نمبر 20)

کیونکہ تمہاری قوم کے لوگ تمہاری خبر پائیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ پھر استعارہ کے طور پر رجم کا لفظ جھوٹے گمان توہم، سب وشتم اور کسی کو دھتکار دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے رَجْمًاۢ بِالْغَیْبِ یہ سب غیب کی باتوں میں اٹکل کے تکے چلاتے ہیں۔

وما ھو عنھا بالحدیث المرکم اور لڑائی کے متعلق یہ بات محض اندازے سے نہیں ہے۔ اور شیطان کو رجیم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ خیرات اور ملائم اعلیٰ کے مراتب سے راندہ ہوا ہے قرآن میں ہے:

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (سورۃ النحل آیت نمبر 98)

توشیطان مردود کے وسواس سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (سورۃ الحجر آیت نمبر 34)

تو بہشت سے نکل جا کہ راندہ درگاہ ہے۔ اور شہب (ستاروں) کو رجوم کہا گیا ہے قرآن میں ہے:

رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ (سورۃ الملک آیت نمبر 5)

اور انہیں شیطانوں کے لئے مار کیا۔

رجمۃ ورجمۃ۔ قبر کا پتھر جو بطور نشان اس پر نصب کیا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

لفظِ اسم کی تحقیق واقوال:

الاسم

کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ یہ اصل میں سموٗ ہے کیونکہ اس کی جمع اسماء اور تصغیر سمی آتی ہے۔ اور اسم کو اسم اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے مسمی کا ذکر بلند ہوتا ہے اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:

ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرَاهَا (سورۃ الھود آیت نمبر 41)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کریم کا نام لے کر (کہ اس کے ہاتھ میں) اس کا چلنا (ہے) سوار ہو جاؤ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ (سورۃ النمل آیت نمبر 30)

وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور مضمون یہ ہے اللہ کا نام لے کر شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

اور آیت: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 31)

اور اس آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔ میں اسماء سے یہاں الفاظ ومعانی دونوں مراد ہیں۔ خواہ مفرد ہوں خواہ مرکب اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

اسم کی اقسام:

لفظ اسم دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ایک اصطلاحی معنی میں اور اس صورت میں ہمیشہ مخبر عنہ بنتا ہے۔ جیسے رجل و فرس دوم وضع اول کے لحاظ سے اس اعتبار سے (کلمہ کی) انواع ثلاثہ یعنی مخبر عنہ (اسم) خبر اور رابطہ (حرف) تینوں سے یہی معنی مراد ہیں۔ کیونکہ آدم (علیہ السلام) نے جس طرح اسماء کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی طرح افعال وحروف کا علم بھی انہیں حاصل ہو گیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کی ذات کا علم حاصل نہ ہو محض نام کے جاننے سے انسان اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا ہے مثلا

اگر ہم ہندی یا رومی زبان میں چند چیزوں کے نام حفظ کرلیں تو ان چیزوں کے اسماء کے جاننے سے ہم ان کے مسمیات کو نہیں پہچان سکیں گے۔ بلکہ ہمارا علم انہیں چند اصوات تک محدود رہے گا اس سے ثابت ہوا کہ اسماء کی معرفت مسمیات کی معرفت کو مستلزم نہیں ہے اور نہ ہی محض اسم سے مسمی کی صورت ذہن میں حاصل ہوسکتی ہے۔ لہٰذا آیت:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 31)

میں اسماء سے کلام کی انواع ثلاثہ اور صورۃ مسمیات مع ان کی ذوات کے مراد ہیں اور آیت،

ما تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ اِلَّا اَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا (سورۃ یوسف آیت نمبر 40)

جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے رکھ لئے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جن اسماء کی تم پرستش کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اصنام ان اوصاف سے عاری تھے۔ جن کا وہ ان اسماء کے اعتبار سے ان کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے۔

اور آیت: وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ (سورۃ الرعد آیت نمبر 33)

اور ان لوگوں نے خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں۔ ان سے کہو کہ (ذرا) انکے نام تو لو، اس میں سموھم سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات، عزی وغیرہ ان کے نام بیان کرو بلکہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن کو تم الاۃ (معبود) کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق کر کے یہ تو بتاؤ کہ آیا ان میں ان اسماء کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ تم انہیں موسوم کرتے ہو (یعنی نہیں) اسی لئے اس کے بعد فرمایا

اَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ (سورۃ الرعد آیت نمبر 33)

یا اسے وہ بتاتے ہو جو اس کے علم میں ساری زمین میں نہیں یا یوں ہی اوپری بات۔

اور آیت: تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ (سورۃ الرحمن آیت نمبر 78)

تمہارے پروردگار۔۔ کا نام بڑا بابرکت ہے۔، اس میں اسم رب کے بابرکت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صفات۔ الکریم، العلیم، الباری، الرحمن الرحیم کے ذکر میں برکت اور نعمت پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى (سورۃ الاعلی آیت نمبر ۱)

اپنے رب کے نام کی پاکی بولو جو سب سے بلند ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (سورۃ الاعراف آیت نمبر 180)

اور اللہ کریم کے نام سب اچھے ہی اچھے ہیں۔ اور آیت:

اسْمُهُ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا (سورۃ المریم آیت نمبر 7)

جن کا نام یحییٰ ہے اس کے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی نہ کیا۔

اس آیت میں سمیا کے معنی ہم نام کے ہیں اور آیت:

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (سورة المریم آیت نمبر 65)

بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔

میں سمیا کے معنی نظیر کے ہیں یعنی کیا اس کی کوئی نظیر ہے جو اس نام کی مستحق ہو اور حقیقتا اللہ کی صفات کے ساتھ متصف ہو اور اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کیا تم کسی کو بھی پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو کیونکہ ایسے تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر اللہ پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان سے معانی بھی وہی مراد ہوں جو اللہ تعالیٰ پر اطلاق کے وقت ہوتے ہیں۔ اور آیت:

لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثَى (سورة النجم آیت نمبر 27)

اور وہ فرشتوں کو (خدا کی) لڑکیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ فرشتوں کو لڑکیوں کے نام سے موسوم کرنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ فرشتوں کو بنات اللہ کہتے ہیں۔

نوٹ: لفظِ اللہ کی تحقیق گزر گئی ہے۔

رحم کی لفظی تحقیق:

(ر ح م) الرحم۔

الرحمة وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔ اسی معنی میں نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے،

انه لما خلق الله الرحم قال له انا الرحمن وانت الرحم شفقت اسمك مين اسمی فمن وصلك وصلته ومن قطعت قطعتة۔

کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس سے فرمایا: تیں رحمان ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے۔ پس جو تجھے ملائے گا۔ (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کریگا میں اسے پارہ پارہ کردوں گا۔

اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کردی ہے احسان کو اپنے لئے خاص کرلیا ہے۔ تو جس طرح لفظ رحم رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنی جو لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس معنی سے ماخوذ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنی میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے: یہ دونوں فعلان و فعیل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں

جیسے ندمان وندیم پھر رحمن کا اطلاق ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سما لیا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنی بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:ō

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 182) بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کے متعلق فرمایا:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 128)

بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان۔

بعض نے رحمن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمن کا لفظ دنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت کریمہ:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 156)

اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے تو عنقریب میں نعمتوں کو ان کے لئے لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں۔

جو پرہیز گاری اختیار کریں گے۔ میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الٰہی عام ہے اور مومن و کافروں دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت مومنین کے ساتھ مختص ہوگی اور کفار اس سے کلیۃ محروم ہوں گے)

[سورة الفاتحة (1) : آية 2]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (2)

''سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا''۔

متن:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الحمد:

هو الثناء على الجميل الاختياري من نعمة أو غيرها، والمدح: هو الثناء على الجميل مطلقاً. تقول حمدت زيداً على علمه و كرمه، ولا تقول حمدته على حسنه، بل مدحته. وقيل هما أخوان. والشكر: مقابلة النعمة قولاً و عملاً واعتقاداً قال:

أفادَتْكُمُ النَّعْمَاءُ مِني ثَلاثَةً ... يَدِي ولِساني والضَّمِيرَ المُحَجَّبا

فهو أعم منهما من وجه، وأخص من آخر

ولما كان الحمد من شعب الشكر أشيع للنعمة، وأدل على مكانها لخفاء الاعتقاد، وما في آداب الجوارح من الاحتمال جعل رأس الشكر والعمدة فيه

فقال عليه الصلاة والسلام الحمد رأس الشكر، وما شكر الله من لم يحمده.

والذم نقيض الحمد والكفران نقيض الشكر.

ورفعه بالابتداء وخبره لله وأصله النصب وقد قرء به. وإنما عدل عنه إلى الرفع ليدل على عموم الحمد وثباته له دون تجدده وحدوثه. وهو من المصادر التي تنصب بأفعال مضمرة لا تكاد تستعمل معها.

والتعريف فيه للجنس ومعناه: الإشارة إلى ما يعرف كل أحد أن الحمد ما هو؛ أو للاستغراق، إذ الحمد في الحقيقة كله له، إذ ما من خير إلا وهو موليه بوسط أو بغير وسط كما قال تعالى:

وَما بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ

وفيه إشعار بأنه تعالى حي قادر مريد عالم. إذ الحمد لا يستحقه إلا من كان هٰذا شأنه.

وقرء الحمد لله بإتباع الدال اللام وبالعكس تنزيلاً لهما من حيث إنهما يستعملان معًا منزلة كلمة واحدة.

ترجمہ:

حمد کا معنیٰ یہ ہے کہ افعالِ جمیلہ اختیاریہ پر زبان سے تعریف کرنا چاہے یہ تعریف نعت کے مقابلے میں ہو یا نہ ہو۔ اور مدح مطلقاً افعالِ جمیلہ پر تعریف کرنا خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری آپ

حمدت زيداً على علمه و كرمه

تو کہہ سکتے ہیں مگر

حمدت زيداً على حسنه

نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس موقع پر "مدحت" کہیں گے۔ اور بعض مفسرین نے کہا کہ حمد و مدح دونوں بھائی بھائی ہیں اور شکر بمقابلہِ نعمت ہے چاہے وہ شکر قولاً، عملاً یا اعتقاداً ہو۔ قولِ شاعر ملاحظہ ہو،

أفادَتْكُمُ النَّعْمَاءُ منى ثلاثَةً ... يَدِى ولسانى والضَّميرَ المُحجَّبا

تمہاری نعمتوں نے میری طرف سے تمہارے لئے تین چیزوں کا افادہ کیا، میرے ہاتھ کا، میری زبان کا اور میرے چھپے ہوئے دل کا، پس شکر و حمد و مدح سے من وجہ عام اور من وجہ خاص ہے۔

اور چونکہ حمد شکر کی دیگر اقسام کے مقابلہ میں نعمتوں کو زیادہ واشگاف کرنے والی اور ان کے وجود پر زیادہ رہنمائی کرنے والی تھی کیونکہ اعتقاد مخفی ہے۔ اور اعضاء جوارح کے آداب میں دوسری چیز کا بھی احتمال ہوسکتا ہے اس لئے حدیث پاک،

الحمد راس الشکر ما شکر اللہ من الم یحمدہ

میں حمد کو شکر کی اصل اور عمدہ ترین قسم قرار دیا گیا ہے، اور ذم نقیض ہے حمد کی اور کفران نقیض ہے شکر کی۔

اور الحمد مرفوع ہے مبتداء ہونے کی وجہ سے اور "للہ" اس کی خبر ہے اور الحمد کی اصل حالت نصب ہے چنانچہ ایک قرات نصب کی بھی ہے اور نصب سے رفع کی طرف عدول اس لئے کیا گیا تا کہ جملہ عموم حمد اور اثباتِ حمد پر دلالت کرے، نہ کہ حدوث وتجدد پر، اور الحمد مصادر کے ایسے قبیل سے ہے جو افعالِ محذوفہ کی وجہ سے منصوب ہوتے ہیں اور افعال کے ساتھ مذکور ہوکر استعمال نہیں ہوتے۔

اور "لا" تعریفِ جنس کے لئے ہے اور الف لام سے مقصود اس حقیقتِ حمد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے کہ حمد کی حقیقت یہ ہے، اور بعض نے کہا کہ الف لام استغراقی ہے کیونکہ تمام افراد حمد اللہ کریم ہی کے لئے ہیں اس لئے کہ تمام بھلائیوں کا عطا کرنے والا ہے چاہے وہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ (سورۃ النحل آیت نمبر 53)

اور تمہارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے۔

اور الحمد کے جملہ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کریم "حی" ہے، قادر ہے اور بالا رادہ کام کرتا ہے، اور عالم بھی ہے، کیونکہ حمد کی مستحق وہی ذات ہے جو ان تمام صفات کی جامع ہے۔ اور "الحمد للہ" بکسر الاوّل بھی پڑھا گیا ہے۔ دال کو لام جارہ کے تابع کرتے ہوئے، اور اس کے برعکس لام کو دال کے تابع کرتے ہوئے "الحمد للہ" بضم اللام بھی پڑھا گیا ہے۔ ان دونوں کو کلمہ واحدہ کے منزلہ میں اتار لینے کی وجہ سے کیونکہ یہ دونوں ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔

متن:

رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

الرب فی الاصل مصدر بمعنی التربية: وهي تبليغ الشيء إلى كماله شيئاً فشيئاً. ثم وصف به للمبالغة كالصوم والعدل. وقيل: هو نعت من رَبّه يربه فهو رب، كقولك نم ينم فهو نم. ثم سمي به المالك لأنه يحفظ ما يملكه ويربيه. ولا يطلق على غيره تعالى إلا مقيداً كقوله: ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ

رب دراصل بمعنی تربیت ہے۔ اور تربیت کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے کمال تک آہستہ آہستہ پہونچانا پھر اس کو مبالغۃً اللہ کی صفت بنا دیا گیا جس طرح صوم وعدل میں مبالغۃً حمل ہوتا ہے اور بعض نے کہا کہ "رب" صفت کا صیغہ ہے اور

رتّہ، یرتّہ فھو ربّ سے مشتق ہے جیسا کہ آپ کا قول نمّ، ینمّ فھو نمّ۔ پھر مالک کا نام رب رکھ دیا گیا کیونکہ وہ اپنی مملوکہ چیز کی حفاظت اوت تربیت کرتا ہے۔ اور لفظِ رب غیر اللہ پر صرف اضافت کے ساتھ بولا جاتا ہے جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان،

ارجع الی ربّك

اپنے رب (بادشاہ) کے پاس پلٹ جا۔ (سورۃ یوسف آیت نمبر 50)

متن:

والعالم اسم لما يعلم به، كالخاتم والقالب، غلب فيما يعلم به الصانع تعالى، وهو كل ما سواه من الجواهر والاعراض، فإنها لإمكانها وافتقارها إلى مؤثر واجب لذاته تدل على وجوده، وإنما جمعه ليشمل ما تحته من الاجناس المختلفة، وغلب العقلاء منهم فجمعه بالياء والنون كسائر أوصافهم.

وقيل: اسم وضع لذوى العلم من الملائكة والثقلين، وتناوله لغيرهم على سبيل الاستتباع. وقيل: عنى به الناس ههنا فإن كل واحد منهم عالم من حيث إنه يشتمل على نظائر ما فى العالم الكبير من الجواهر والاعراض يُعْلَمُ بها الصانع كما يعلم بما أبدعه فى العالم الكبير، ولذلك سوى بين النظر فيهما، وقال تعالى: وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ.

وقرء رَبِّ الْعَالَمِيْنَ بالنصب على المدح، أو النداء، أو بالفعل الذى دل عليه الحمد، وفيه دليل على أن الممكنات كما هى مفتقرة إلى المحدث حال حدوثها فهى مفتقرة إلى المبقى حال بقائها.

ترجمہ:

اور عالم اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم ہو جیسے خاتم اور قالب پھر غلبۃً ان چیزوں میں استعمال ہونے لگا جن کے ذرریعے صانع کا علم ہو۔ (اور عالم کا مصداق) وہ تمام اشیاء ہیں جو صانع کے علاوہ ہیں خواہ وہ اعراض کے قبیلے سے ہوں یا جواہر کے، اس لئے یہ اشیاء اپنے امکان اور اپنے احتیاج الی المؤثر کی وجہ سے صانع کی وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ اور عالم کو جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ تمام مختلف اجناس کو شامل ہو جائے جو اس کے تحت آسکتی ہیں اور ان اجناسِ مختلفہ میں عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے عالم کی "یا" "" نون" کے ساتھ جمع لائے ہیں جس طرح عقلاء کے دوسرے اوصاف کی یا نون کے ساتھ جمع آتی ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا کہ عالم تام ہے، جن وانس کا جوذوی العقول ہیں، اور اس صورت میں عالم ان تین مخلوقات کے علاوہ مخلوقات کو تبعًا اور التزامًا شامل ہوگا۔ اور بعض مفسّرین کا کہنا ہے کہ آیت کریمہ میں عالمین سے مراد انسان ہیں بوجہ اس کے کہ ہر فرد بشر ایک عالم ہے اس حیثیت سے کہ انسان ان جیسی چیزوں پر مشتمل ہے جو عالمِ کبیر یعنی دنیا میں پائی جاتی ہیں یعنی جواہر واعراض کہ ان کے ذریعہ صانع کا علم ہوتا ہے جس طرح کہ عالم کبیر کی انہیں ایجادات کی وجہ سے صانع کا علم ہوتا ہے اور اسی وجہ سے عالمِ کبیر کے اندر نظرِ عبرت ڈالنے اور انسان کا خود اپنی ذات میں غور کرنے کو مساوی درجہ میں رکھا گیا ہے، اللہ کریم کا ارشاد ہے،

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ. وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین والوں کو اور خود تم میں تو کیا تمہیں سوجھتا نہیں۔ (سورۃ الذاریات آیت نمبر 21)

اور "رب العالمین" کو "امدح" کا مفعول ہونے کی وجہ سے یا منادیٰ ہونے یا اس فعلِ مقدر کا مفعول ہونے کی وجہ سے جس پر "الحمد" دلالت کرتا ہے، منصوب بھی پڑھا گیا ہے، اور یہ آیت اس سلسلہ میں دلیل ہے کہ ممکنات کس طرح اپنے موجود ہونے میں ایک ایسی ذات کی طرف محتاج ہیں جو انہیں باقی رکھے۔

لفظِ حمد کی تحقیق اور حمد وشکر میں فرق:

(ح م د) (Praise)

الحمدللہ (تعالیٰ) کے معنی اللہ تعالے کی فضیلت کے ساتھ اس کی ثناء بیان کرنے کے ہیں۔ یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے کیونکہ مدح ان افعال پر بھی ہوتی ہے جو انسان سے اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ان اوصاف پر بھی جو پیدائشی طور پر اس میں پائے جاتے ہیں چنانچہ جس طرح خرچ کرنے اور علم وسخا پر انسان کی مدح ہوتی ہے اس طرح اسکی درازی قدوقامت اور چہرہ کی خوبصورتی پر بھی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن حمد صرف افعال اختیاریہ پر ہوتی ہے۔ نہ کہ اوصاف اضطراری پر اور شکر تو صرف کسی کے احسان کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ہر شکر حمد ہے، مگر ہر حمد شکر نہیں ہے اور ہر حمد مدح ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے۔ اور جس کی تعریف کی جائے اسے محمود کہا جاتا ہے۔ مگر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو نیز جب کوئی شخص محمود ثابت ہو تو اسے بھی محمود کہہ دیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ؛

اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ (سوۃ الھود آیت نمبر 73)

وہی ہے سب خوبیوں والا عزت والا۔

میں حمید بمعنی محمود بھی ہوسکتا ہے اور حامد بھی حمادا کہ ان تفعل کذا یعنی ایسا کرنے میں تمہارا انجام بخیر ہے۔

اور آیت کریمہ:

وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (سورۃ الصف آیت نمبر 6)

اوران رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے ان کا نام احمد ہے۔

میں لفظ احمد سے حضرت محمد ﷺ کی ذات کی طرف اشارہ ہے اوراس میں تنبیہ ہے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ کا نام احمد ہوگا اسی طرح آپ اپنے اخلاق واطوار کے اعتبار سے بھی محمود ہوں گے اور عیسٰی علیہ السلام کا اپنی بشارت میں لفظ احمد (صیغہ تفضیل) بولنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپ ﷺ حضرت مسیح علیہ السلام اوران کے بیشتر و جملہ انبیاء سے افضل ہیں اور آیت کریمہ:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (سورۃ الفتح آیت نمبر 29)

محمد اللہ کے رسول ہیں۔

میں لفظ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گو من وجہ حضرت محمد ﷺ کا نام ہے لیکن اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف حمیدہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِ اسْمُهٗ يَحْيٰى (سورۃ مریم آیت نمبر 7)

ہم تجھے خوشی سناتے ہیں ایک لڑکے کی جن کا نام یحییٰ ہے۔

میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا یہ نام معنی حیات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اس کے مقام پر مذکور ہے۔

لفظِ رب کی عمدہ تحقیق:

(رب ب) الرب (ن)

کے اصل معنی تربیت کرنا یعنی کس چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا کے ہیں اور ربہ وربّاہ وربّبہ تینوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے:

لان یربنی رجل من قریش احب الی من ان یربنی رجل من ھوازن.

کہ کسی قریشی کا سردار ہونا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے کہ بنی ہوازن کا کوئی آدمی مجھ پر حکمرانی کرے۔

ربّ کا لفظ اصل میں مصدر ہے اور استعارۃً بمعنی فاعل استعمال ہوتا ہے اور مطلق (یعنی اضافت اور لام تعریف سے خالی) ہونے کی صورت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو جملہ موجودات کے مصالح کا کفیل ہے، اور کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے:

بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ (سورۃ سبا آیت نمبر 15)

پاکیزہ شہر اور بخشنے والا رب۔

نیز فرمایا:

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا (سورۃ آل عمران آیت نمبر 80)

اور نہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرالو۔

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور دوسروں پر بھی۔ چنانچہ فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (سورۃ الفاتحۃ آیت 1)

ہر طرح کی حمد خدا ہی کو (سزاوار) ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ آبَائِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (سورۃ الصافات آیت نمبر 126)

اللہ کو جو رب ہے تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادا کا۔

رب الفرس گھوڑے کا مالک اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:

اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (سورۃ یوسف آیت نمبر 42)

اس سے کہا اپنے رب (بادشاہ) کے پاس میرا ذکر کرنا تو شیطان نے اسے بھلا دیا کہ اپنے رب (بادشاہ) کے سامنے یوسف کا ذکر کرے۔

اللہ کریم کا ارشاد، ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ (سورۃ یوسف آیت 50)

اپنے سردار کے پاس لوٹ جاؤ۔

اور آیت:

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْ اَحْسَنَ مَثْوَايَ (سورۃ یوسف آیت نمبر 23)

کہا اللہ کی پناہ وہ عزیز تو میرا رب یعنی پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ربی سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور بعض نے عزیز مصر مراد لیا ہے۔ لیکن پہلا قول انسب معلوم ہوتا ہے۔ ربانی بقول بعض یہ ربان (صیغہ صفت) کی طرف منسوب ہے۔ لیکن عام طور پر فعلان (صفت) فعل سے آتا ہے۔ جیسے عطشان سکران اور فعل۔ (فتحہ عین سے بہت کم آتا ہے) جیسے نعسان (من نعس) بعض نے کہا ہے کہ یہ رب (مصدر) کی طرف منسوب ہے اور ربانی وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسے حکیم (یعنی جو حکمت کو فروغ دے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رب مصدر کی طرف ہی منسوب ہے اور ربانی وہ ہے۔ جو علم سے اپنی پرورش کرے۔ درحقیقت یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں کیونکہ جس نے علم کی پرورش کی تو اس نے علم کے ذریعہ اپنی ذات کی بھی تربیت کی اور جو شخص اس کے ذریعہ اپنی ذات کی تربیت کرے گا وہ علم کو بھی فروغ بخشے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ رب بمعنی اللہ کی طرف منسوب ہے اور ربانی بمعنی الٰہی ہے (یعنی اللہ والا) اور اس میں الف نون زائدتان ہیں جیسا کہ جسم ولحی کی نسبت میں جسمانی ولحیانی کہا جاتا ہے۔

اس امّت کا عالم ربانی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: انا ربانی ھذہ الامۃ میں اس امت کا عالم ربانی ہوں۔

اس کی جمع ربانیون ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 63)

انہیں کیوں نہیں منع کرتے اُن کے پادری اور درویش۔

كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ (سورۃ آل عمران آیت نمبر 79)

ہاں یہ کہے گا کہ اللہ والے ہو جاؤ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ربانی اصل میں سریانی لفظ ہے اور یہی قولِ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عربی زبان میں یہ لفظ بہت کم پایا جاتا ہے اور آیت:

رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ (آل عمران آیت نمبر 146) بہت سے اللہ والوں نے۔

میں ربی بمعنی ربانی ہے۔ یہ دونوں مصدر ہیں، لیکن اللہ تعالٰی کے لئے ربوبیۃ اور دوسروں کے لئے ربابیۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

الرب (صیغہ صفت) جمع ارباب۔

قرآن مجید میں ہے:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورۃ یوسف آیت نمبر 39)

کیا جدا جدا رب اچھے یا ایک اللہ جو سب پر غالب۔

اصل تو یہ تھا کہ رب کی جمع نہ آتی۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہ لفظ خاص کر ذات باری تعالٰی کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن عقیدہ کفار کے مطابق بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے اور ارباب کے علاوہ اس کی جمع اربۃ و ربوب بھی آتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے:

(بسیط) كانت اربتهم بهز وغرهم عقد الجوار وكانوا معشرا غدرا

ان کے ہم عہد بنی بہز تھے جنہیں عقد جوار نے مغرور کر دیا اور در حقیقت وہ غدار لوگ ہیں۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے:

وكنت امرءا افضت اليك ربابتي وقبلك ربني فضعت ربوب

تم آدمی ہو جس تک میری سرپرستی پہنچتی ہے تم سے پہلے بہت سے میرے سرپرست بن چکے ہیں مگر میں ضائع ہو گیا ہوں۔

رابہ کا معنی:

عہد و پیان یا اس چیز کو کہتے ہیں جس میں قمار بازی کے تیر لپیٹ کر رکھے جاتے ہیں۔

رابۃ وہ بیوی جو پہلے شوہر سے اپنی اولاد کی تربیت کر رہی ہو۔ اس کا مذکر راب ہے۔ لیکن وہ اولاد جو پہلے شوہر سے ہو اور دوسرے شوہر کی زیر تربیت ہو یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی کی آغوش میں پرورش پا رہی ہو۔ اسے ربیب یا ربیبۃ کہا جاتا ہے اس کی جمع ربائب آتی ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ (سورۃ النساء آیت نمبر 23)

اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری گود میں ہیں۔

ربیت الادیم بالسمن میں نے چمڑے کو گھی لگا کر نرم کیا۔ ربیت الدواء بالعسل میں نے شہد سے دوا کی اصلاح کی سقاء مربوب پانی مشک جسے تیل لگا کر نرم کیا گیا ہو۔

شاعر نے کہا ہے: فکونی له کالسمن ربت له الادم

اس کے لئے ایسی ہو جاؤ جیسے رب لگا ہوا چمڑا گھی کے لئے ہوتا ہے۔

الرباب کا معنی:

الرباب:

بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ نباتات کی پرورش کرتا اور اسے بڑھاتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے مطر کو (دودھ) اور بادل کو تشبیہا القوح (یعنی دودھیلی اونٹنی) کہا جاتا ہے محاورہ ہے۔ اربت السحابۃ بدلی متواتر برستی رہی اور اُس کے اصل معنی ہیں بدلی صاحب تربیت ہوگئی اس کے بعد اس سے ٹھہرنے کا معنی لے کر یہ لفظ کسی جگہ پر مقیم ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے ارب فلان بمکان کذا اس نے فلاں جگہ پر اقامت اختیار کی۔

رب تقلیل کے لئے آتا ہے اور کبھی تکثیر کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا:

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (سورۃ الحجر آیت نمبر 2)

بہت آرزوئیں کریں گے کافر۔

العالم کا معنی و مفہوم:

العالم فلك الافلاك

اور جن جواہر و اعراض پر حاوی ہے سب کو العالم کہا جاتا ہے دراصل یہ فاعل کے وزن پر ہے جو اسم آلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے طابع بہ۔ مایطبع بہ خاتم مایختتم بہ وغیرہ اسی طرح عالم بھی ہے جس کے معنی ہیں ماعلم بہ یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ کسی شے کا علم حاصل کیا جائے اور کائنات کے ذریعہ بھی چونکہ خدا کا علم حاصل ہوتا ہے اس لئے جملہ کائنات العالم کہلاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت کے سلسلہ میں کائنات پر غور کرنے کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ اللہ کریم کا فرمان،

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 185)

کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت پر غور نہیں کیا۔ اور العالم کی جمع (العالمون) اس لئے بناتے ہیں کہ کائنات کی ہر نوع اپنی جگہ ایک مستقل عالم عالم کی حیثیت رکھتی ہے مثلاً عالم لاانسان؛ عالم الماء و عالمالنا وغیرہ نیز ایک روایت میں ہے۔

ان اللہ بضعتہ عشر الف عالم

کہ اللہ تعالیٰ نے دس ہزار سے کچھ اوپر عالم پیدا کئے ہیں، باقی رہا یہ سوال کہ (واؤنون کے ساتھ) اسے جمع سلامت کے وزن پر کیوں لایا گیا ہے (جو ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ عالم میں چونکہ انسان بھی شامل ہیں اس لئے اس کی جمع جمع سلامت لائی گئی ہے کیونکہ جب کسی لفظ میں انسان کے ساتھ دوسری مخلوق بھی شامل ہو تو تغلیباً اس کی جمع واؤنون کے ساتھ بنالیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ لفظ عالم سے خلائق کی خاص قسم یعنی فرشتے جن اور انسان ہی مراد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس لئے اس کی جمع واؤنون کے ساتھ لائی گئی ہے۔

عالم کی اقسام:

امام جعفر بن محمد کا قول ہے کہ عالمین سے صرف انسان مراد ہیں اور ہر فرد بشر کو ایک عالم قرار دے کر اسے جمع لایا گیا ہے۔

نیز انہوں نے کہا ہے کہ عالم دو قسم پر ہے:

(1) العالم الکبیر بمعنی فلک و مافیہ (2) العالم الصغیر یعنی انسان

کیونکہ انسان کی تخلیق بھی ایک مستقل عالم کی حیثیت سے کی گئی ہے اور اس کے اندر قدرت کے وہ دلائل موجود ہیں جو عالم کبیر میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (سورۃ الحجر آیت نمبر 70)

ہم نے تمہیں منع نہ کیا تھا کہ اوروں کے معاملہ میں دخل نہ دو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سوۃ الفاتحۃ آیت نمبر 1)

سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔

اور آیت کریمہ:

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 47)

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ تم یعنی بنی اسرائیل کو ان کی ہمعصر اقوام پر فضیلت دی اور بعض نے اس دور کے فضلا مراد لئے ہیں جن میں سے ہر ایک نوازشات الٰہی کی بدولت بمنزلہ ایک عالم کے تھا اور ان کو عالم سے موسوم کرنا ایسے ہی ہے،

جیسا کہ آیت کریمہ:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً (سورۃ النحل آیت نمبر 120)

بیشک ابراہیم ایک امام تھا، میں حضرت ابراہیم کو امۃ کہا ہے۔

[سورة الفاتحة (1) : الآيات 3 الى 4]

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ (3) مالِكِ يَوْمِ الدِّينِ (4)

متن:

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ كرره للتعليل على ما سنذكره.

مالِكِ يَوْمِ الدِّينِ قراءة عاصم والكسائى ويعقوب ويعضده قوله تعالى: يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئاً وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ. وقرأ الباقون: مَلِكِ. وهو المختار لأنه قراءة أهل الحرمين ولقوله تعالى: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ؟. ولما فيه من التعظيم. والمالك هو المتصرف فى الاعيان المملوكة كيف يشاء من الملك. والملك هو المتصرف بالامر والنهى فى المأمورين من الملك. وقرء ملك بالتخفيف وملك بلفظ الفعل. ومالكا بالنصب على المدح أو الحال، ومالك بالرفع منوناً ومضافاً على أنه خبر مبتدأ محذوف. وملك مضافاً بالرفع والنصب.

ويوم الدين يوم الجزاء ومنه كما تدين تدان وبيت الحماسة:

ولم يَبْقَ سِوَى العدوا ... نِ دِناهُمْ كما دَانُوا

أضاف اسم الفاعل إلى الظرف إجراء له مجرى المفعول به على الاتساع كقولهم: يَا سَارِقَ اللَّيْلَةَ أَهْلَ الدار، ومعناه. ملك الامور يوم الدين على طريقة وَنَادى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ. أوله الملك فى هٰذَا اليوم، على وجه الاستمرار لتكون الإضافة حقيقية معدة لوقوعه صفة للمعرفة. وقيل: الدِّينِ الشريعة. وقيل: الطاعة.

والمعنى يوم جزاء الدين، وتخصيص اليوم بالإضافة: إما لتعظيمه، أو لتفرده تعالى بنفوذ الامر فيه. وإجراء هذه الاوصاف على الله تعالى من كونه موجداً للعالمين رباً لهم منعماً عليهم بالنعم كلها ظاهرها وباطنها عاجلها وآجلها،

مالكاً لأمورهم يوم الثواب والعقاب، للدلالة على أنه الحقيق بالحمد لا أحد أحق به

منه بل لا يستحقه على الحقيقة سواه. فإن ترتب الحكم على الوصف يشعر بعليته له. وللإشعار من طريق المفهوم على أن من لم يتصف بتلك الصفات لا يستأهل لأن يحمد فضلاً عن أن يعبد، فيكون دليلاً على ما بعده. فالوصف الاول لبيان ما هو الموجب للحمد، وهو الإيجاد والتربية.

والثاني والثالث للدلالة على أنه متفضل بذٰلك مختار فيه. ليس يصدر منه لإيجاب بالذات أو وجوب عليه قضية لسوابق الاعمال حتى يستحق به الحمد. والرابع لتحقيق الاختصاص فإنه مما لا يقبل الشركة فيه بوجه ما. وتضمين الوعد للحامدين والوعيد للمعرضين.

ترجمہ:

جونہایت مہربان اور بڑا رحیم ہے۔ "الرحمٰن، الرحیم "کو استحقاقِ حمد کی علت بیان کرنے کے لئے مکرر ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ عنقریب ذکر ہوگا۔ جو روزِ جزا کا مالک ہے، عاصم اور کسائی اور یعقوب نے مالک کو الف کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی تائید میں اللہ کریم کا قول پیش کیا ہے،

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ

جس دن کوئی جان کسی جان کا کچھ اختیار نہ رکھے گی اور سارا حکم اس دن اللہ کا ہے۔ (سورۃ الانفطار آیت نمبر 19)

اور باقی تمام قراء نے "ملک" کو بغیر الف کے پڑھا ہے اور اسی کو پسند کیا گیا ہے، کیونکہ اہلِ حرم کی قراءت یہی ہے نیز اس لئے بھی کہ اللہ کریم کا ارشاد،

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کس کی بادشاہی ہے۔ (سورۃ المومن آیت نمبر 16)

اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں تعظیم زیادہ ہے۔ اور مالک اس کو کہا جاتا ہے جو اعیانِ مملوکہ میں اپنی مرضی کا تصرف کرے۔ اور "مالک "مشتق ہے "مِلک" سے بکسرِ المیم۔ اور ملک وہ ہے جو محکومین کے اندر حکم چلاتا ہو۔ یا یہ ملک بضم المیم سے مشتق ہے۔ اور ملک کی ایک قراءت یہ بھی ہے کہ اس میں لام کے سکون کے ساتھ پڑھا جائے، تخفیف کی وجہ سے، اور یہ ماضی کے صیغہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ نیز مالک کو بحالتِ نصب بر بنائے حال یا مدح بھی پڑھتے ہیں۔ اور مالک رفع کے ساتھ بھی ہے، نیز رفع کی دو صورتیں ہیں یا تو تنوین کے ساتھ یا پھر مضاف قرار دے کر ضمہ کے ساتھ مالک کا مرفوع ہونا مبتداء محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور "ملک" الف کے بغیر بھی رفع اور نصب دونوں طریقوں سے پڑھا گیا ہے لیکن ان دونوں صورتوں میں "ملک "مضاف ہوگا۔

اور یوم الدین، یوم الجزاء ہے اور اسی قبیل سے (مشہور مثال) "کما تدین تدان" (جیسا کروگے ویسا بھروگے)

اورحماسہ کا شعر،

ولم يَبْقَ سِوَى العدوا ...نِ دِناهُمْ كما دَانُوا

جب برائی کو پورے طور پر اس نے ظاہر کردیا اور سوائے ظلم وصبر کرنے اور کوئی مرحلہ باقی نہ رہا تو ہم نے بھی ان کو ایسا ہی بدلہ دیا جس طرح انہوں نے ہمارے ساتھ کیا۔

اور یوم کو اضافت کے لئے مخصوص کرنا یا تو خود یوم کی عظمت کی وجہ سے ہے اور یا اس لئے کہ یوم الدین ہی ایسا موقع ہے جہاں صرف ظاہراً اور باطناً خدا کا حکم نافذ ہوگا۔

اور اللہ کریم کے لئے اس موجد للعالمین ہونے اور تمام انعامات کے منعم ہونے کو خواہاں وہ انعامات ظاہرہ ہوں یا باطنہ ،فوری ہوں یا بعد میں ملنے والے اور تمام امور کا یوم جزاء میں مالک ہونے کے اوصاف کا ذکر کرنا اس لئے ہے کہ یہ اوصاف اس بات پر دلالت کریں کہ حمد کا اللہ کریم سے زیادہ کوئی مستحق نہیں۔

دراصل سرے سے ہی اللہ کریم کے سوا کوئی بھی حمد کا مستحق نہیں اس لئے کہ حکم کا وصف پر مرتب ہونا یہ بتاتا ہے کہ یہ وصف حکم کے لئے علت ہے نیز اس لئے بھی اوصاف کو ذکر کیا گیا کہ بطورِ مفہوم مخالف کے یہ معلوم ہو جائے کہ جو ان صفات کے ساتھ متصف نہیں وہ حمد کا مستحق نہیں اور جب وہ حمد کا مستحق نہیں تو عبادت کا مستحق کیسے ہوگا۔ اور جب بطورِ مفہوم مخالف کے غیر سے عبادت کی نفی ہوگئی۔ تو پھر یہ آیات "ایاک نعبد" کے لئے جو بعد میں آرہا ہے بطورِ دلیل کے ہو جائیں گی۔ پس وصف اول اس چیز کو بیان کرنے کے لئے جو حمد کا موجب ہے یعنی اللہ کریم کی ایجاد اور تربیت اور دوسری اور تیسری صفت اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ اللہ کریم یہ انعام اپنے اختیار سے بطورِ تفضّل واحسان کرتا ہے۔ یہ انعام اس سے اضطراراً صادر نہیں ہوئے (جیسا کہ فلاسفہ کی رائے ہے) اسی طرح بندہ کے سابقہ اعمال کے تقاضے میں اللہ کریم سے یہ انعام وجوباً بھی صادر نہیں ہوئے (اور ہم نے خدا کو متفضّل اور مختار کیوں مانا) تا کہ ان انعامات کی وجہ سے ذات باری تعالیٰ مستحق حمد ٹھہرے، اور چوتھی صفت یعنی "مالک یوم الدین" ذات باری کے ساتھ اختصاص حمد کو ثابت کرنے کے لئے ہے، کیونکہ یومِ جزاء کی بادشاہت ان چیزوں میں سے ہے جو اپنے اندر شرکت کو قبول نہیں کرتیں۔ نیز یہ صفت اس لئے بھی ذکر کی گئی ہے تا کہ اس کے ضمن میں حامدین کے لئے ثواب کا وعدہ اور حمد سے اعراض کرنے والوں کے لئے عذاب کی وعید ہو جائے۔

لفظ رحمٰن اور رحیم میں فرق:

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

یہ دونوں نام رحمۃ سے مشتق ہیں، دونوں میں مبالغہ ہے رحمٰن کے معنی میں رحیم کی نسبت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اس میں رحیم کی نسبت ایک حرف زائد ہے اور زیادة اللفظ تدل علی زیادة المعنی یعنی زائد حروف زیادۃ معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ رحمٰن کا لفظ اللہ کی طرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اور اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

قل ادعوا اللہ اوادعوا الرحمن ایاما تدعوا فلہ الاسمآء الحسنی

تم فرماؤ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر جو کہہ کر پکارو سب اسی کے اچھے نام ہیں۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 110)

بخلاف اس کے رحیم کا لفظ ماسوی اللہ کے لئے بھی مستعمل ہے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤف رحیم، کہا گیا ہے آیۃ کریمہ ہے،

لقد جآء کم رسول من انفسکم عزیزٌ علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رءوف الرحیم۔ (سورۃ التوبہ آیت نمبر 128)

بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان۔

بعض کے نزدیک اللہ کریم دنیا میں رحمن اور آخرت میں رحیم ہے کہ دنیا میں مومن اور کافر سب اس کی رحمت سے متمتع ہوتے ہیں اور آخرت میں رحمت سے فائدہ اٹھانے والے صرف مومن ہوں گے۔

تحقیق لفظِ مالک:

ملک کے معنی زیر تصرف چیز پر بذریعہ حکم کنٹرول کرنے کے ہیں اور ملک بمنزلہ جنس کے ہیں لہٰذا ہر ملک کو ملک تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر ملک ملک نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے:

وَلا یَمْلِکُونَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَلا نَفْعًا وَلا یَمْلِکُونَ مَوْتًا وَلا حَیاۃً وَلا نُشُورًا

اور خود اپنی جانوں کے بھلے برے کے مالک نہیں اور نہ مرنے کا اختیار نہ جینے کا نہ اٹھنے کا۔ (سورۃ الفرقان آیت نمبر 3)

اور فرمایا:

اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (سورۃ یونس آیت نمبر 31)

یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا۔

قُلْ لا اَمْلِکُ لِنَفْسِی نَفْعًا وَّلا ضَرًّا (سورۃ الاعراف آیت نمبر 188)

تم فرماؤ میں اپنی جان کے بھلے برے کا خود مختار نہیں۔

یوم کی تعریف:

(ی و م) الیوم (Day)

(ن) یہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے اور عربی زبان میں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ زمانہ (ایک دن کا ہو یا ایک سال اور صدی کا یا ہزار سال کا ہو) کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو، قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ (سورۃ آل عمران آیت نمبر 155)
بے شک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں۔

یَوْمِ الدِّیْن سے مراد:

علامہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

یَوْمِ الدِّیْنِ قیامت کا دن ہے۔
دین، جزاء اور بدلے کو کہتے ہیں اور
کَمَا تُدِیْنُ تُدَانُ

دین ہی سے مشتق ہے یعنی جیسے تو فعل کرے گا ویسا ہی بدلہ لے گا۔۔ یا لفظ دین سے اسلام اور اطاعت مراد ہے کیونکہ وہ ایسا دن ہے کہ جس میں اسلام اور اطاعت کے سوا کوئی چیز نفع نہیں دیگی۔ مجاہد کہتے ہیں کہ

یَوْمِ الدِّیْنِ بمعنی یَوْمُ الْحِسَاب
ہے چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے:

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ یعنی یہ سیدھا حساب ہے۔

[سورة الفاتحة (1) : آية 5]

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (5)
''ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں''۔

متن:

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

ثم إنه لما ذكر الحقيق بالحمد، ووصف بصفات عظام تميز بها عن سائر الذوات وتعلق العلم بمعلوم معين خوطب بذلك، أى: يا من هذا شأنه نخصك بالعبادة والاستعانة، ليكون أدل على الاختصاص،

وللترقى من البرهان إلى العيان والانتقال من الغيبة إلى الشهود، فكأن المعلوم صار عياناً والمعقول مشاهداً والغيبة حضوراً،

بنى أول الكلام على ما هو مبادى حال العارف من الذكر والفكر والتأمل فى أسمائه والنظر فى آلائه والاستدلال بصنائعه على عظيم شأنه وباهر سلطانه، ثم قفى بما هو

منتهى أمره وهو أن يخوض لجة الوصول ويصير من أهل المشاهدة فيراه عياناً ويناجيه شفاهاً.

اللهم اجعلنا من الواصلين للعين دون السامعين للأثر.

ومن عادة العرب التفنن في الكلام والعدول من أسلوب إلى آخر تطرية له وتنشيطاً للسامع، فيعدل من الخطاب إلى الغيبة، ومن الغيبة إلى التكلم وبالعكس، كقوله تعالى: حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ وقوله: وَاللهُ الَّذِي اَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيْرُ سَحَاباً فَسُقْنَاهُ وقول امرء القيس:

تطاوَلَ ليلُكَ بالإِثمِدِ ... ونامَ الخليُّ ولم تَرْقُدِ
وباتَ وباتَتْ له ليلة ... كَلَيْلَةِ ذي العائرِ الارْمَدِ
وَذٰلِكَ مِنْ نَبَأٍ جاءَنى ... وَخبِرْتهُ عَنْ اَبِى الاَسْوَدِ

وإيا ضمير منصوب منفصل، وما يلحقه من الياء والكاف والهاء حروف زيدت لبيان التكلم والخطاب والغيبة لا محل لها من الإعراب، كالتاء في أنتَ والكاف في أرأيتك.

وقال الخليل: إيا مضاف إليها، واحتج بما حكاه عن بعض العرب إذا بلغ الرجل الستين فإياه وإيا الشواب، وهو شاذ لا يعتمد عليه. وقيل: هي الضمائر، وإيا عمدة فإنها لما فصلت عن العوامل تعذر النطق بها مفردة فضم إليها إيا لتستقل به. وقيل: الضمير هو المجموع.

وقرء اَيَّاكَ بفتح الهمزة وهياك بقلبها هاء.

والعبادة: أقصى غاية الخضوع والتذلل ومنه طريق معبَّد أي مذلل، وثوب ذو عبدة إذا كان في غاية الصفاقة، ولذلك لا تستعمل إلا في الخضوع لله تعالى.

ترجمہ:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

پھر جب ماقبل میں اس ذات کا ذکر ہو چکا جو حمد کے لائق ہے اور اس ذات کی ایسی اعلیٰ صفات ذکر کی گئی جن کی وجہ سے وہ ذات دوسری ذوات سے ممتاز ہو گئی اور مخاطب کا علم ایک معلوم معیّن کے ساتھ وابستہ ہو گیا تو اب اُس ذات کو خطاب کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا یعنی اے وہ ذات جس کی شان یہ ہے کہ ہم عبادت اور استعانت کو اسی کے ساتھ خاص کرتے ہیں، اور خطاب کا صیغہ اس لئے لایا گیا کہ اختصاص پر دلالت کرے۔

وللترقی من البرهان...الخ

نیز اس لئے کہ ترقی من البرہان اور انتقال من الغیبة الی الشهود پر دلالت کرے تو گویا جو چیز درجہ معلوم و معقول اور غیبت میں تھی، اب مشاہدہ اور حضور میں آگئی۔

بنی أول الکلام علی ما هو...الخ

آغازِ کلام کی بنیاد ان کی کیفیات پر تھی جو عارف کے ابتدائی حالات تھے یعنی ذکر وفکر اور صفاتِ باری اور اس کی نعمتوں میں غور وخوض کرنا اور اللہ کریم کی کاریگری سے اس کی عظمت وشان اور اس کی غالب بادشاہت پر استدلال کرنا، پھر ابتدائی حالات کے بعد ان حالات کو بیان فرمایا جو عارف کے درجات کا منتہی ہے یعنی وصول الی اللہ کے حضور میں گھس جانا اور مشاہدین میں سے ہو جانا۔ تو عارف اس مقام پر پہنچ کر اللہ کریم کی زیارت اپنی آنکھوں سے کرتا ہے اور بالمشافہ سرگوشی بھی کرتا ہے۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل کردے جو اس کی ذات تک پہنچے ہوئے ہیں اور ان سے دور رکھ جنہوں نے صرف تیری خبر سن رکھی ہے۔ (اور وہ تیری زیارت سے محروم ہیں۔)

ومن عادة العرب التفنن...الخ

اور اہل عرب کی عادت قسم بہ قسم کلام کرنے کی اور ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل ہونے کی ہے، اور یہ تفنن اور اسلوب کی تبدیلی کلام میں نئی زندگی پیدا کرنے اور سامع کو متوجہ کرنے کے لئے ہوتی ہے، چنانچہ خطاب سے غیبت کی طرف اور غیبت سے تکلم کی طرف اور ان کے برعکس عدول کیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان،

حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ

یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہو اور وہ اچھی ہوا سے انہیں لے کر چلیں۔ (سورۃ یونس آیت نمبر 22)

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ (سورۃ الفاطر آیت نمبر 9)

اور اللہ ہے جس نے بھیجیں ہوائیں کہ بادل ابھارتی ہیں پھر ہم اسے کسی مردہ شہر کی طرف رواں کرتے ہیں۔

نیز امرءالقیس شاعر کا قول بھی اس کی تائید کرتا ہے،

تطاوَلَ ليلُكَ بالاِثمِدِ... ونامَ الخلِيُّ ولم تَرْقُدِ

اے جان تیری رات مقام اثمد میں طویل ہوگئی اور جو شخص عشق سے خالی ہے، وہ سو گیا، اور تمہیں نیند نہیں آئی۔

وباتَ وباتَتْ له ليلة ... كَلَيْلَةِ ذي العائِرِ الارْمَدِ

اور تم نے رات گزار دی اور رات گزر بھی گئی مگر اس کرب و بے چینی کے ساتھ کہ جس طرح آشوبِ چشم کے مریض کی رات گزرتی ہے۔

وَذٰلِكَ مِنْ نَبَأٍ جاءنی... وَخبرْتهُ عَنْ اَبِي الْاَسْوَدِ

اور یہ سب بے چینی اور بیداری کا سبب وہ منحوس خبر تھی جو مجھ تک پہنچی یعنی مجھے ابوالاسود کی موت کی خبر دی گئی۔

وأیّا ضمیر منصوب منفصل۔۔۔الخ

اور ایّا ضمیر منفصل ہے اور جو اس کے آخر میں یاء اور کاف اور ہاء لگتے ہیں وہ حرف ہیں، تکلم، خطاب اور غائب کو بیان کرنے کے لئے زیادہ کر دیئے گئے ہیں، نیز ان کا کوئی بھی محلِ اعراب نہیں۔ جس طرح "انت" کی تاء اور "أیتک" کے کاف کا کوئی محلِ اعراب نہیں۔ اور خلیل نے کہا کہ "ایّا" ان چیزوں کی طرف مضاف ہے اور ان کا استدلال اس مقولہ سے ہے جس کو بعض عربیوں سے نقل کیا گیا ہے،

إذا بلغ الرجل الستین فإیاہ وإیا الشواب

جب آدمی ساٹھ سال کا ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو نوجوان عورتوں سے دور رکھے اور جوان عورتوں کو اپنے پاس آنے سے منع کر دے۔

یہ حکایت شاذ اور ناقابلِ استعمال ہے، اور بعض مفسرین نے کہا کہ حروف لواحق ضمیریں ہیں اور "ایّا" ان کے لئے سہارا ہے اس لئے کہ یہ ضمیریں جب اپنے عوامل سے جدا کر دی گئیں، تو ان کا تنہا استعمال متعذر ہو گیا۔ لہٰذا "ایّا" کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا، تا کہ اس کے ساتھ مل کر مستقل ہو جائیں۔ اور بعض مفسّرین نے کہا کہ دونوں چیزوں کا مجموعہ ضمیر ہے، اور بعض مفسّرین نے "ایّاک" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور ہیّاک ہمزہ کو ہاء کے ساتھ بدل کر پڑھا ہے۔

والعبادۃ: أقصی غایۃ الخضوع۔۔۔الخ

عبادت نام ہے انتہائی درجہ کے خضوع اور تذلل کا، اسی سے طریق معبد مشتق ہے جس کے معنی مستعمل وذلیل کردہ راستہ، اور اسی سے ثواب ذو عبدۃٍ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کپڑا سخت بناوٹ والا ہو اور چونکہ عبادت کے معنیٰ انتہائی خضوع کے ہیں اسی لئے لفظ عبادت صرف اس خضوع وخشوع کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ذات باری تعالیٰ کے لئے ہو۔

متن:

والاستعانۃ: طلب المعونۃ وھی: إما ضروریۃ، أو غیر ضروریۃ. والضروریۃ ما لا یتأتی الفعل دونہ کاقتدار الفاعل وتصورہ وحصول آلۃ ومادۃ یفعل بہا فیہا وعند استجماعہا یوصف الرجل بالاستطاعۃ ویصح أن یکلف بالفعل. وغیر الضروریۃ تحصیل ما یتیسر بہ الفعل ویسہل کالراحلۃ فی السفر للقادر علی المشی، أو یقرب الفاعل إلی الفعل ویحثہ علیہ، وھٰذا القسم لا یتوقف علیہ صحۃ التکلیف

والمراد طلب المعونۃ فی المہمات کلہا، أو فی أداء العبادات، والضمیر المستکن فی الفعلین للقارء ومن معہ من الحفظۃ، وحاضری صلاۃ الجماعۃ. أو لہ ولسائر الموحدین.

أدرج عبادته فی تضاعيف عبادتهم وخلط حاجته بحاجتهم لعلها تقبل ببركتها ويجاب إليها ولهذا شرعت الجماعة

وقدم المفعول للتعظيم والاهتمام به والدلالة على الحصر ولذلك قال ابن عباس رضی الله عنهما (معناه نعبدك ولا نعبد غيرك) وتقديم ما هو مقدم فی الوجود والتنبيه على أن العابد ينبغي أن يكون نظره إلى المعبود أولاً وبالذات، ومنه إلى العبادة لا من حيث إنها عبادة صدرت عنه بل من حيث إنها نسبة شريفة إليه ووصلة سنية بينه وبين الحق، فإن العارف إنما يحق وصوله إذا استغرق فی ملاحظة جناب القدس وغاب عما عداه، حتى إنه لا يلاحظ نفسه ولا حالاً من أحوالها إلا من حيث إنها ملاحظة له ومنتسبة إليه، ولذلك فضل ما حكى الله عن حبيبه حين قال: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا. على ما حكاه عن كليمه حين قال: إِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ.

و كرر الضمير للتنصيص على أنه المستعان به لا غير. وقدمت العبادة على الاستعانة ليتوافق رؤوس الآی، ويعلم منه أن تقديم الوسيلة على طلب الحاجة أدعى إلى الإجابة.

وأقول: لما نسب المتكلم العبادة إلى نفسه أو هم ذلك تبجحاً واعتداداً منه بما يصدر عنه، فعقبه بقوله:

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ليدل على أن العبادة أيضاً مما لا يتم ولا يستتب له إلا بمعونة منه وتوفيق، وقيل: الواو للحال والمعنى نعبدك مستعينين بك. وقرء بكسر النون فيهما وهی لغة بنی تميم فإنهم يكسرون حروف المضارعة سوى الياء إذا لم ينضم ما بعدها.

ترجمہ:

اور استعانت نام ہے مدد طلب کرنے کا اور معونت ضروری ہوگی یا غیر ضروری۔ اور ضروری وہ ہے کہ جس کے بغیر فعل حاصل نہ ہو جیسے فاعل کا قادر ہونا اور فاعل کو اس فعل کا علم ہونا اور اس آلہ اور مادہ کا حاصل ہونا کہ جس آلہ کے ذریعے فعل اس مادہ میں انجام پائے گا۔ اور ان معونات ضروریہ کے اکٹھے ہونے کے وقت آدمی کو اس فعل کا مستطیع قرار دیا جائے گا اور اس کو مکلف بنانا صحیح ہوگا۔ معونت غیر ضروریہ ان چیزوں کے بھی فراہم کرنے کا نام ہے۔ جو فاعل کو فعل کے قریب کر دے اور اس کو فعل پر ابھارے اور اس قسم پر سخت تکلیف کا مدار نہیں۔

والمراد طلب المعونة فی المهمات...الخ

اور "ایّاک نستعین" میں استعانت سے مقصود تمام اہم اور مشکل کاموں میں طلب کرنا ہے یا بالخصوص ادائے عبادت کے سلسلہ میں، اور "نعبد" اور "نستعین" میں جو ضمیر متکلم پوشیدہ ہے اس سے خود پڑھنے والا اور فرشتے جو اس پر نگران مقرر ہیں اور حاضرین جماعت مراد ہیں۔ یا خود پڑھنے والا اور جمیع مومنین مراد ہیں۔ قاری نے اپنی عبادت کو تہوں میں شامل کر دیا اور اپنی حاجت کو ان کی حاجت کے ساتھ ملا دیا۔ عجب نہیں کہ اس کی عبادت ان کی عبادات کی برکت سے قبول کر لی جائے اور ان کی حاجات کے ساتھ اس کی حاجات پوری کر دی جائے اور اسی حکمت کے پیشِ نظر نمازِ با جماعت مشروع ہوئی۔

وقدم المفعول للتعظيم والاهتمام...الخ

اور مفعول یعنی "ایّاک" کو تعظیم کے لئے مقدم کیا گیا یا مہتم بالشان ہونے کی وجہ سے۔ اور د لالت علی الحصر کی غرض سے اور اسی وجہ سے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے "ایاک نعبد" کے معنی "نعبدک ولا نعبدغیرک" سے کئے ہیں۔ نیز "ایاک" کو مقدم کیا گیا اس چیز کو پہلے لانے کے لئے جو وجود واقعی میں سب سے پہلے ہے اور عابد کو اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ اس کی نظرِ اوّل میں بلا واسطہ معبود کی طرف ہونا چاہئے اور پھر معبود سے عبادت کی طرف، لیکن نظر الی العبادت اس حیثیت سے نہیں کہ وہ ایک عبادت ہے جو اس سے صادر ہوئی بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ایک شریف نسبت ہے جس کا منتہی ذاتِ باری ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ عابد اور اللہ کریم کے درمیان ایک تعلق ہے اس لئے کہ عارف باللہ کا وصول الی اللہ اس وقت ثابت ہوگا جب کہ وہ اللہ کریم کے علاوہ ہر ایک سے غائب ہو کر صرف اللہ کریم کی ذات میں مستغرق ہو جائے یہاں تک کہ اپنی ذات اور اپنے احوال کی بھی پرواہ نہ کرے، اور اگر پرواہ کرے بھی تو اس حیثیت سے کہ یہ نفس اور حال اللہ کریم کے ملاحظہ کا ذریعہ ہیں، اور اس کی طرف منسوب ہیں۔ اور اسی لئے اس کلام کو جسے اللہ کریم نے اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے جب کہ انہوں نے کہا تھا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (سورہ التوبہ آیت نمبر 40)

اس کلام پر فضیلت دی گئی ہے جس کو اللہ کریم نے اپنے کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نقل کیا ہے جب کہ انہوں نے کہا تھا۔

ان معی ربّی سیھدین

بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے اب راہ دیتا ہے۔ (سورۃ الشعراء آیت نمبر 62)

وکرر الضمیر للتنصیص...الخ

اور "ایّاک" ضمیر کو مکرر لایا گیا اس بات کی تصریح کے لئے کہ قابل استعانت صرف اللہ کریم کی ذات ہے اس کے علاوہ کوئی بھی لائقِ استعانت نہیں۔ اور عبادت کو استعانت پر مقدم کرنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ آیتوں کے سرے ایک جیسے ہو جائیں

، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پتہ چل جائے کہ ضرورت وحاجت کے سوال سے پہلے وسیلہ بھیج دینا قبولیت کے لئے داعی ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ جب متکلم نے عبادت کی نسبت اپنی طرف کی تو اس نسبت نے اس کے دل میں ایک زعم اور اپنے صادر ہونے والی عبادت کا وزن بطریقِ وہم پیدا کر دیا گیا تو اللہ کریم نے اس کے بعد "نستعین" ذکر فرمایا، تا کہ اس بات پر رہنمائی ہو جائے کہ عبادت بھی انہی چیزوں میں سے ہے جو اللہ کریم کی مدد کے بغیر مکمل اور درست نہیں ہو سکتیں۔ اور بعض مفسّرین کا کہنا ہے کہ "وایاک نستعین" میں واؤ حالیہ ہے اور آیت کے معنیٰ "نعبدک مستعینین بک" یعنی اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اس حال میں کہ تجھ ہی سے مدد بھی چاہتے ہیں۔ اور بعض مفسّرین نے "نعبدو نستعین" کے نون کو مفتوح پڑھنے کی بجائے مکسور پڑھا ہے اور یہ لغت بنی تمیم کی ہے، کیونکہ یہ لوگ یاء کے علاوہ باقی علاماتِ مضارع کو جب کہ ان کا مابعد مضموم نہ ہو کسرہ دیتے ہیں۔

العبودیۃ کا مفہوم:

(ع ب د)

کے معنی ہیں کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا مگر العبادۃ کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکساری ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ معنوی اعتبار سے العبادۃ کا لفظ العبودیۃ سے زیادہ بلیغ ہے لہٰذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے جو بے حد صاحب افضال و انعام ہو اور ایسی ذات صرف ذات الٰہی ہی ہے اسی لئے فرمایا:

اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ (سورۃ الاسراء آیت نمبر 23) کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

عبادت کی اقسام:

عبادۃ دو قسم پر ہے،

(1) عبادت بالتسخیر جسے ہم سجود کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں۔

(2) عبادت بالاختیار اس کا تعلق صرف ذوی العقول کے ساتھ ہے یعنی ذوی العقول کے علاوہ دوسری مخلوق اس کی مکلف نہیں۔

آیت کریمہ: اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 21) اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔
وَاعْبُدُوا اللّٰہَ (سورۃ النساء آیت نمبر 36) اور اللہ کی بندگی کرو۔

میں اسی دوسری قسم کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔

الاستعانہ:

اس کا معنیٰ مدد طلب کرنا ہے،

قرآن مجید میں ہے، اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 45)
صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔

[سورة الفاتحة (1) : آية 6]

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (6)

ترجمہ: ''ہم کو سیدھا راستہ چلا''۔

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

بيان للمعونة المطلوبة فكأنه قال: كيف أعينكم فقالوا اهْدِنَا. أو إفراد لما هو المقصود الاعظم.

والهداية دلالة بلطف ولذلك تستعمل فی الخير وقوله تعالی: فَاهْدُوهُمْ إِلى صِراطِ الْجَحِيمِ وارد على التهكم. ومنه الهداية وهوادی الوحش لمقدماتها، والفعل منه هدى، وأصله أن يعدى باللام، أو إلى، فعومل معاملة اختار فی قوله تعالی:

وَاخْتارَ مُوسى قَوْمَهُ

وهداية الله تعالى تتنوع أنواعًا لا يحصيها عد كما قال تعالى: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لاَ تُحْصُوها ولكنها تنحصر فی أجناس مترتبة:

الاول: إفاضة القوى التي بها يتمكن المرء من الاهتداء إلى مصالحه كالقوة العقلية والحواس الباطنة والمشاعر الظاهرة.

الثانی: نصب الدلائل الفارقة بين الحق والباطل والصلاح والفساد وإليه أشار حيث قال: وَهَدَيْناهُ النَّجْدَيْنِ وقال: وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْناهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمى عَلَى الْهُدى.

الثالث: الهداية بإرسال الرسل وإنزال الكتب، وإياها عنى بقوله: وَجَعَلْناهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنا وقوله:

إِنَّ هذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ.

الرابع: أن يكشف على قلوبهم السرائر ويريهم الاشياء كما هی بالوحی، أو الإلهام والمنامات الصادقة، وهذا قسم يختص بنيله الانبياء والاولياء وإياه عنى بقوله: أُولئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُداهُمُ اقْتَدِهْ. وقوله:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا.

فالمطلوب إما زيادة ما منحوه من الهدى، أو الثبات عليه، أو حصول المراتب المرتبة عليه. فإذا قاله العارف بالله الواصل عني به: أرشدنا طريق السير فيك لتمحو عنا ظلمات أحوالنا، وتميط غواشي أبداننا، لنستضيء بنور قدسك فنراك بنورك.

والامر والدعاء يتشاركان لفظاً ومعنى ويتفاوتان بالاستعلاء والتسفل، وقيل: بالرتبة.

والسراط: من سرط الطعام إذا ابتلعه فكأنه يسرط السابلة، ولذلك سمي لقماً لأنه يلتقمهم. والصِّرَاطَ من قلب السين صاداً ليطابق الطاء في الإطباق، وقد يشم الصاد صوت الزاي ليكون أقرب إلى المبدل منه. وقرأ ابن كثير برواية قنبل عنه، ورويس عن يعقوب بالاصل، وحمزة بالإشمام، والباقون بالصاد وهو لغة قريش، والثابت في الإمام وجمعه سُرُط ككتب وهو كالطريق في التذكير والتأنيث.

والْمُسْتَقِيمَ المستوي والمراد به طريق الحق، وقيل: هو ملة الإسلام.

ترجمہ:

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ...الخ

اس آیت کریمہ میں اس معونت کی وضاحت ہے جو "نستعین" میں طلب کی گئی ہے، تو گویا اللہ کریم نے بندوں سے پوچھا کہ میں تمہاری کس قسم کی مدد کروں بندے نے "اهدنا الصراط المستقيم" کے ساتھ جواب دیا کہ سیدھے راستہ پر چلا دیجئے اور مقصود اعظم کو اس آیت کریمہ سے علیحدہ بیان کر دیا گیا۔ اور ہدایت واسباب اطاعت کو پیدا کر کے رہنمائی کرنے کا نام ہے اور اسی وجہ سے ہدایت کا استعمال صرف خیر میں ہوتا ہے اور باقی رہا اللہ کریم کا فرمان،

فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ   ان سب کو ہانکو راہ دوزخ کی طرف۔ (سورۃ الصافات آیت نمبر 23)

جس میں شر کے معنی موجود ہیں، لہٰذا وہ استہزاء پر محمول ہے اور اسی ہدایت سے ہدیہ بمعنی تحفہ اور ہودی الوحش گلوں کے پیش رو جانور ماخوذ ہیں۔

اور ہدایت کا فعل اس کی ماضی "ہدیٰ" ہے اور اس کا اصل استعمال یہ ہے کہ (اپنے مفعول ثانی کی طرف) لام یا الی کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہو لیکن آیت میں اس کے صلہ کو حذف کر کے بغیر واسطہ کے متعدی کر دیا گیا، جس طرح کہ اللہ کریم کے فرمان،

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا

اور موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر مرد ہمارے وعدہ کے لئے چنے۔ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 155)
میں "اختار" کے صلہ من کو حذف کر کے "قومہ" کی طرف بلا واسطہ متعدی کر دیا گیا۔

وهداية الله تعالى تتنوع أنواعاً...الخ

اور اللہ کریم کی ہدایت مختلف قسموں پر مشتمل ہے جن کا شمار ممکن نہیں، البتہ اس کی اجناس محدود ہیں جن میں وہ منحصر ہے اور ان جنسوں میں ترتیب ہے یعنی بعد والی جنس پہلی پر مرتب ہو رہی ہے۔ پہلی جنس ان قوتوں کا فیضان ہے کہ جن کی وجہ سے انسان اپنے مصالح تک راستہ تلاش کرنے پر قادر ہو جاتا ہے جیسا کہ قوت عقلیہ اور حواسِ باطنہ کا فیضان اور دوسری جنس ان دلائل کا قائم کرنا ہے جو حق و باطل اور درستگی و بگاڑ کے درمیان امتیاز پیدا کریں اور اور اللہ کریم نے اسی قسم کی طرف اپنے اس فرمان سے اشارہ کیا،

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ

اور

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى.

اور تیسری جنس یہ کہ اللہ کریم نے رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر رہنمائی فرمائی، اور اللہ کریم کے مندرجہ ذیل اقوال میں اسی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

اور اللہ کریم کا دوسرا قول،

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ.

اور ہدایت کی چوتھی جنس یہ ہے کہ اللہ کریم لوگوں کے دلوں پر راز کی باتیں منکشف کر دے اور اشیاء کی حقیقتوں پر ان کو با خبر کر دے اب یہ کشفِ حقائق اور اشیاء کا دیکھنا خواہ یہ بذریعہ وحی ہو یا یا الہام اور سچے خوابوں کے ذریعے ہو، اس چوتھی جنس کی تحصیل حضرات انبیاء و اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور اللہ کریم کا فرمان اسی کی تائید کرتا ہے،

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰاهُمُ اقْتَدِهْ.

اور

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا.

(تو اللہ کریم کی حمد و ثناء کرنے والے بندے) کا "اهدنا الصراط المستقيم" سے مقصود اس ہدایت پر اضافہ اور ثابت قدمی طلب کرنا ہے جو اسے اللہ کریم کی طرف سے عطا کی گئی ہے یا ہدایت کے جس درجہ پر فائز ہے اس پر مرتب ہونے والے اگلے مدارج کا حصول مقصود ہے پس جب عارف واصل "اهدنا" کہے گا تو اس کی مراد یہ ہوگی کہ "اے اللہ مجھے سیر فی

اللہ" کے راستے پر لگا دیجئے تاکہ ہمارے اعمال کی تیرگی ہم سے ختم ہو جائے اور ہمارے جسمانی حجابات اٹھ جائیں تاکہ ہم آپ کی پاکیزگی کے نور سے روشنی حاصل کریں اور پھر آپ کو آپ ہی کے نور سے دیکھیں۔

والامر والدعاء یتشارکان لفظاً ...الخ

اور امر و دعا لفظاً و معنیً ایک ہی طرح کے ہیں مگر ان میں استعلاء اور تسفل کے اعتبار سے فرق ہے۔ بعض مفسّرین نے کہا کہ ان میں رتبہ و اقعی کے اعتبار سے فرق ہے۔ اور "سراط" "سرِط الطعام" سے لیا گیا ہے، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کھانے والا نگل لے تو گویا راستہ بھی قافلہ کو نگل لیتا ہے اور اسی وجہ سے راستہ کو "لقم" کہتے ہیں کیونکہ وہ راہگیروں کو لقمہ بنا لیتا ہے۔ اور "صراط" کا صاد سین سے بدلا ہوا ہے، اور یہ تبدیلی اس لئے ہوئی تاکہ صاد حروفِ مطبقہ ہونے میں طاء کے موافق ہو جائے اور کبھی صاد کی ادائیگی میں زاء کی آواز کی بُو پیدا کی جاتی ہے، تاکہ صاد اپنے مبدل عنہ یعنی سین سے قریب تر ہو جائے اور ابنِ کثیر نے بروایت قنبل اور رویس نے بروایت یعقوب سین کے ساتھ پڑھا ہے، اور حمزہ نے اشمام کے ساتھ اور باقی قراء نے صاد کے ساتھ اور قریش کی قراءت بھی یہی ہے۔ اور مصحفِ عثمانی میں بھی یہی ہے اور "سراط" کی جمع "سرط" ہے جیسا کہ کتاب کی جمع "کتب"۔ اور صراط مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے جس طرح لفظِ طریق دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اور مستقیم کے معنی سیدھے راستے کے ہیں، اور آیتِ کریمہ میں اس سے مراد راہِ حق ہے اور بعض مفسّرین نے اس سے ملتِ اسلامیہ مراد لیا ہے۔

الھدایتہ کا معنی و مفہوم:

(ھ د ی) ھدی

ہدایت کے معنی لطف و کرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرف سے ہدایت کیا ہے۔

(1) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے کی ہے اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔ چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد ہے:

رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 50)

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی پھر راہ دکھائی۔

(2) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ تجارت کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ آیت کریمہ:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 73)

اور ہم نے انہیں امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلاتے ہیں،

اس میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(3) سوم بمعنی توفیق

خاص ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (سورۃ محمد آیت نمبر 17)

اور جنہوں نے راہ پائی اللہ نے ان کی ہدایت اور زیادہ فرمائی۔

(4) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ اللہ کریم نے فرمایا:

سَیَهْدِیْهِمْ وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ (سورۃ محمد آیت نمبر 5)

جلد انہیں راہ دے گا، اور ان کا کام بنا دے گا۔

اور آیت کریمہ:

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 43)

اور ہم نے ان کے سینوں میں سے کینے کھینچ لئے۔

[سورة الفاتحة (1) : آية 7]

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (7)

ترجمہ: ''راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا، نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا،،

متن:

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ

بدل من الاول بدل الكل، وهو فى حكم تكرير العامل من حيث إنه المقصود بالنسبة. وفائدته التوكيد والتنصيص على أن طريق المسلمين هو المشهود عليه بالاستقامة على آكد وجه وأبلغه لأنه جعل كالتفسير والبيان له فكأنه من البين الذى لا خفاء فيه أن الطريق المستقيم ما يكون طريق المؤمنين.

وقيل: الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ الانبياء، وقيل: النبى صلّى الله عليه وسلّم وأصحابه وقيل: أصحاب موسى وعيسى عليهما الصلاة والسلام قبل التحريف والنسخ. وقرى صراط مَنْ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ

والإنعام: إيصال النعمة، وهى فى الاصل الحالة التى يستلذها الإنسان فأطلقت لما

يستلذه من النعمة وهي اللين، ونعم الله وإن كانت لا تحصى كما قال: وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لَا تُحْصُوهَا تنحصر في جنسين: دنيوي وأخروي.

والاول قسمان: موهبي و كسبي والموهبي قسمان: روحاني كنفخ الروح فيه وإشراقه بالعقل وما يتبعه من القوى كالفهم والفكر والنطق، وجسماني كتخليق البدن والقوى الحالة فيه والهيئات العارضة له من الصحة و كمال الاعضاء والكسبي تزكية النفس عن الرذائل وتحليتها بالاخلاق السنية والملكات الفاضلة، وتزيين البدن بالهيئات المطبوعة والحلى المستحسنة وحصول الجاه والمال.

والثاني: أن يغفر له ما فرط منه ويرضى عنه ويبوئه في أعلى عليين مع الملائكة المقربين أبد الآبدين.

والمراد هو القسم الاخير وما يكون وصلة إلى نيله من الآخرة فإن ما عدا ذلك يشترك فيه المؤمن والكافر.

ترجمہ:

صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ...الخ

یہ عبارت "صراط الذین" سے بدل الکل ہے۔ اور بدل کل تکرار عامل کے حکم میں ہوتا ہے اس حیثیت سے کہ فعل کی نسبت اس کی طرف مقصود ہوتی ہے اور بدل الکل کا فائدہ تاکید اور اس بات کی تصریح کرنا ہے کہ مسلمانوں کا راستہ ہی وہ راستہ ہے جس کے مستقیم ہونے کی گواہی دی جا چکی ہے کیونکہ یہ کلمات ماقبل کے لئے تفسیر اور بیان کے درجہ میں مؤکد اور بلیغ طریقہ پر ہیں۔ (تو گویا بدل کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ) یہ بار روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس میں کوئی خفاء نہیں کہ طریقِ مستقیم وہی ہے جو مومنین کا راستہ ہے۔

وقیل: الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ الانبياء...الخ

بعض مفسّرین نے کہا کہ "انعمت علیھم" سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔ اور بعض مفسرین نے کہا کہ اس سے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے وہ اصحاب ہیں اپنے ادیان میں منسوخ وتحریف سے پہلے تھے۔ اور ایک قراءت میں "صراط الذین" کی بجائے "صراط من انعمت علیھم" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

والإنعام: إيصال النعمة، وهي في الاصل..الخ

انعام نعمت پہنچانے کا نام ہے، اور اصل میں ایسی کیفیت کا نام ہے جس کو آدمی لذیذ پاتا ہے۔ پھر اس کا استعمال ان اشیاء میں ہونے لگا جو اس کیفیت کا سبب بنتی ہیں۔ اور یہ نعمت بکسر نون نعمت بفتح نون سے مشتق ہے۔ جس کا معنی نرمی ہے، اور اللہ کریم

کی نعمتوں کے افراد اگرچہ شمار میں نہیں آسکتے جیسا کہ خود اللہ کریم کا ارشاد ہے،

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا

اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو انہیں شمار نہ کرسکو گے۔ (سورۃ النحل آیت نمبر 18)۔

جنسی اعتبار سے نعمت دو قسموں پر ہے دنیاوی اور اخروی، پھر دنیاوی کی دو قسمیں ہیں وہبی یعنی اللہ کریم کی عطا کردہ اور دوسری کسبی۔ پھر وہبی کی دو قسمیں ہیں روحانی جیسے کہ انسان کی ذات میں روح کا پھونکنا اور اس روح کو عقل سے اور عقل کے بعد جو باطنی قوتیں حاصل ہوتی ہیں، ان سے روشن کرنا اور باطنی قوتیں یعنی فہم وفکر ونطق ہیں اور جسمانی ڈھانچے کو پیدا کرنا، اور ان قوتوں کو پیدا کرنا جو اس ڈھانچے میں سموئی ہوئی ہیں، اور ان کیفیات کو پیدا کرنا جو اس بدن کو عارض ہیں یعنی صحت اور اعضاء کا کمال۔ اور کسبی نعمت سے مراد نفس کو رذائل سے پاک کرنا اور اس کو اخلاق اور عمدہ صلاحیتوں سے مزین کرنا۔ اور بدن کو اچھے اور خوبصورت زیورات سے سجانا اور مال ومرتبہ کا حاصل ہونا ہے،

اور اخروی نعمت یہ ہے کہ اللہ کریم اس کی غلطیوں کو معاف کردے اور اس سے راضی ہوکر اعلیٰ علیین میں مقرب فرشتوں کے ساتھ ہمشگی عطا فرمائے اور آیتِ کریمہ میں اخروی نعمتوں اور ان کے وسائل مراد ہیں کیونکہ اس کے سوا دوسری نعمتوں میں تو مومن وکافر دونوں شامل ہیں۔

تحقیق لفظ صراط:

(ص ر ط) الصراط (Right path)

بمعنی سیدھی راہ، قرآن مجید میں ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا (سورۃ الانعام آیت نمبر 153)

اور یہ کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ۔

صراط اور سراط میں فرق:

اسے سراط (بسین مھملہ) پڑھا جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

(س ر ط) السراط

کے معنی آسان راستہ، کے آتے ہیں اور اصل میں سرطت الطعام وزاردتہ سے مشتق ہے جس کے معنی طعام کو نگل جانے کے ہیں۔ اور راستہ کو صراط اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راہرو کو گویا نگل لیتا ہے یا راہرو اس کو نگلتا ہوا چلا یا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔

قتل ارضا عالها وقتلت ارض جاهلها

کہ واقف کار ہو تو زمین کو مار ڈالتا ہے لیکن ناواقف کو زمین ہلاک کردیتی ہے۔

قولِ ابوتمام:

ابوتمام نے کہا ہے:

رعته الفيافي بعد ما كان حقبة رعاها اذا ما المزن ينهل ساكبه

اس کے بعد کو اس نے ایک زمانہ دراز تک سرسبز جنگلوں میں گھاس کھائی اب اس کو جنگلات نے کھالیا یعنی دبلا کر دیا۔ اسی طرح راستہ کو لقم اور ملتقم بھی کہا جاتا ہے اس لحاظ سے کہ گویا راہرو اس کو لقمہ بنالیتا ہے۔

مفہوم استقامت:

الاستقامة (استفعال)

کے معنی راستہ خط مستقیم کی طرح سیدھا ہونے کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر راہ حق کو بھی صراط مستقیم کہا گیا ہے چنانچہ اللہ کریم نے فرمایا:

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (سورۃ الفاتحۃ آیت نمبر 6)

ہم کو سیدھا راستہ چلا۔

اور کسی انسان کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (سورۃ فصلت آیت نمبر 13)

بیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے۔

متن:

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ

بدل من الَّذِينَ على معنى أن المنعم عليهم هم الذين سلموا من الغضب والضلال. أو صفة له مبينة أو مقيدة على معنى أنهم جمعوا بين النعمة المطلقة. وهي نعمة الإيمان وبين السلامة من الغضب والضلال

وذلك إنما يصح بأحد تأويلين، إجراء الموصول مجرى النكرة إذا لم يقصد به معهود كالمحلى في قوله:

وَلَقَدْ اَمُرُّ على اللَّئِيمِ يَسُبُّنِي وقولهم: إني لأمر على الرجل مثلك فيكرمني. أو جعل غير معرفة بالإضافة لأنه أضيف إلى ماله ضد واحد وهو المنعم عليهم، فيتعين تعين

الحركة من غير السكون.

وعن ابن كثير نصبه على الحال من الضمير المجرور والعامل أنعمت. أو بإضمار أعني. أو بالاستثناء إن فسر النعم بما يعم القبيلين.

والغضب: ثوران النفس إرادة الانتقام. فإذا أسند إلى الله تعالى أريد به المنتهى والغاية على ما مر. وعليهم في محل الرفع لأنه نائب مناب الفاعل بخلاف الاول. ولا مزيدة لتأكيد ما في غير من معنى النفي. فكأنه قال: لا المغضوب عليهم ولا الضالين ولذلك جاز أنا زيداً غير ضارب. كما جاز أنا زيداً لا ضارب. وإن امتنع أنا زيدا مثل ضارب. وقرء وَغَيْرُ الضالين

والضلال: العدول عن الطريق السوي عمداً أو خطأ. وله عرض عريض والتفاوت ما بين أدناه وأقصاه كثير.

قيل: الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ اليهود لقوله تعالى. فيهم: مَنْ لَعَنَهُ اللهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ. والضَّالِّيْنَ النصارى لقوله تعالى: قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوا كَثِيراً. وقد روى مرفوعاً. ويتجه أن يقال: المغضوب عليهم العصاة والضالين الجاهلون بالله. لأن المنعم عليه من وفق للجمع بين معرفة الحق لذاته والخير للعمل به. وكان المقابل له من اختل إحدى قوتيه العاقلة والعاملة. والمخل بالعمل فاسق مغضوب عليه لقوله تعالى في القاتل عمداً وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ. والمخل بالعقل جاهل ضال لقوله: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ.

ترجمہ:

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ... الخ

یہ کلام "الذین۔۔الخ" کا بدل الکل ہے اس معنی میں کہ منعم علیہم ہی لوگ ہیں جو اللہ کریم کے غضب اور گمراہی سے دور ہیں، یا یہ عبارت ماقبل کے لئے صفتِ کاشفہ یا صفتِ مقیدہ ہے اس معنی میں کہ منعم علیہم نعمتِ مطلقہ یعنی ایمان و نعمت کاملہ یعنی اللہ کریم کے غضب اور گمراہی سے سلامتی کے جامع ہیں۔

وذلك إنما يصح بأحد تأويلين.. الخ

اس عبارت کو صفت بنانا دو تاویلوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ ہی صحیح ہو سکتا ہے۔ پہلی یہ کہ اسم موصول کو نکرہ کے درجہ میں رکھا جائے جب کہ اس سے کسی معہود خارجی کا قصد نہ کیا جائے، جس طرح معرف باللام یعنی لفظِ اللئیم شاعر کے قول میں

"القد امرء۔۔الخ میں نکرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔شعر ملاحظہ ہو،

ولَقَدْ أمرُّ علی اللئیمِ یَسُبُّنِی وقولھم: إنی لأمر علی الرجل مثلك فیکرمنی

میں اتنے کمینے انسان کے پاس سے گزرتا ہوں جو مجھے برا بھلا کہتا رہتا ہے تو میں وہاں سے یہ کہتا ہوا گزر جاتا ہوں کہ گالیاں دینے والے کی مراد میں نہیں ہوں۔اور جس طرح معرف باللام عرب کے قول "إنی لأمر علی الرجل مثلك فیکرمنی" میں نکرہ کی حیثیت رکھتا ہے یا یہ تاویل کی جائے کہ غیر کو مضاف ہونے کہ وجہ سے معرفہ بنالیا جائے اس لئے کہ اس کی اضافت ایسے اسم کی طرف کی گئی ہے جو اس کا واحد مد مقابل ہے یعنی منعم علیھم، لہٰذا غیر میں یک گونہ تعین آگیا جیسا کہ غیر السکون سے حرکت کے معنی متعین ہوجاتے ہیں۔

اور علامہ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ "غیر المغضوب۔۔الخ "انعمت علیھم" کی ضمیر مجرور سے حال واقع ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں انعمت عامل ہے یا منصوب ہے تقدیر اعنی کی وجہ سے یا استثناء کہ وجہ سے، مگر استثناء کی صورت اس وقت درست ہوسکے گی جب کہ انعمت میں ایسی نعمتیں مراد لی جائیں وہ دنیاوی اور اخروی نعمتوں دونوں کا شامل ہے۔

والغضب: ثوران النفس إرادة ...الخ

خونِ دل کے جوش مارنے کو غضب کہا جاتا ہے پھر جب اس کی نسبت اللہ کریم کی طرف کی جائے تو اس کا انجام کار یعنی انتقام مراد ہوتا ہے جیسا کہ "رحمٰن و رحیم" کی بحث میں گزر چکا۔اور "المغضوب علیھم" میں "علیھم مغضوب" کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے محلِ رفع میں واقع ہے۔اس کے برخلاف وہ "علیھم" جو "انعمت" کے بعد واقع ہے کہ وہ منصوب یعنی محلِ نصب میں واقع ہے۔

اور "لا" اس معنیٰ نفی کی تاکید کے لئے بڑھایا ہے جو غیر میں موجود ہیں۔تو گویا اللہ کریم نے بالفاظِ دیگر یوں فرمایا،

لا مغضوب علیھم ولا الضالین۔

اور اسی وجہ سے (کہ غیر حرف نفی کے معنی میں ہے)۔

انا زیدا غیر ضاربٍ بتقدیم زیدًا

اگرچہ

انا زیدا مثل ضاربٍ بتقدیم زیدًا

ممتنع ہے، اور ایک قراءت "غیر الضالین" کی بھی ہے۔

والضلال: العدول عن الطریق السوی ...الخ

ضلال کا معنی راہِ راست سے جان بوجھ کر یا غلطی سے بھٹک جانا ہے، اور ضلال ایک کشادہ میدان ہے اس کے اعلیٰ

اور ادنیٰ درجہ کے درمیان بہت فرق ہے۔ بعض مفسّرین نے کہا کہ "مغضوب علیہم" سے مراد یہود ہیں، کیونکہ اللہ کریم نے ان کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے،

فمنهم من لعنة الله و غضب عليهم

اور "الضالین" سے مراد نصاریٰ ہیں کیونکہ اللہ کریم نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا

جو پہلے گمراہ ہو چکے اور بہتوں کو گمراہ کیا۔ (سورۃ المائدہ آیت نمبر 77)

اور ایک مرفوع روایت میں بھی اس قول کی تائید کی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ "مغضوب علیہم" سے نافرمان اور "ضالین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کریم کی معرفت سے کورے ہیں اس لئے منعم علیہ وہ ہے جسے حق اور خیر دونوں کی معرفت عطا کی گئی ہو۔ حق کی معرفت تو برائے حق، اور خیر کی معرفت اس پر عمل کرنے کے لئے، تو اب منعم علیہ کا مقابل وہ ہوگا جس کی دونوں قوتوں یعنی عاقلہ و عاملہ میں سے کوئی ایک مختل ہو گئی ہو چنانچہ جس نے قوتِ عمل کو مختل کر دیا وہ فاسق مغضوب علیہ ہے۔ اس لئے کہ اللہ کریم نے عمداً قتل کرنے والے آدمی کے بارے میں،

وغضب الله عليه

فرمایا ہے اور جس نے قوتِ عاقلہ کو مختل کر دیا وہ جاہل و گمراہ ہے، کیونکہ اللہ کریم نے "فما ذا بعد الحق الا الضلال" فرمایا ہے۔

نعمت کا معنیٰ:

(ن ع م) النعمة (Blessing)

اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اور یہ فعلة کے وزن پر ہے جو کسی حالت کے معنیٰ کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے:

جلسة و ركبة وغيره ذالك۔

اور نعمة کے معنیٰ تنعم یعنی آرام و آسائش کے ہیں اور یہ فعلة کے وزن پر ہے جو مرة ہے جو مرة کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے: ضربة و شتمة اور نعمة کا لفظ اسم جنس ہے جو قلیل و کثیر کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لَا تُحْصُوهَا (سورۃ النحل آیت نمبر 18)

اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔

لفظِ غیر کا معنیٰ:

(غ ی ر) غیر (Stranger)

اور غیر محض نفی کے لئے یعنی اس سے کسی دوسرے معنیٰ کا اثبات مقصود نہیں ہوتا جیسے مررت برجل غیر قائم یعنی میں ایسے

آدمی کے پاس سے گزرا جو کھڑا نہیں تھا۔ قرآن میں ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (سورۃ القصص آیت نمبر 50)

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون جو اپنی خواہش کی پیروی کرے اللہ کی ہدایت سے جدا۔

لفظِ غضب کا معنیٰ:

(غ ض ب) الغضب (Violence)

انتقام کے لئے دل میں خون کا جوش مارنا اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے،

اتقو ا الغضب فانه جمرة توقدئ قلب ابن ادم الم ترو الى امتقاخ اوداجه وحمرتة عينيه

کہ غصہ سے بچو بیشک وہ انسان کے دل میں دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح ہے تم اس کی رگوں کے پھولنے اور آنکھوں کے سرخ ہوجانے کو نہیں دیکھتے، لیکن غضب الٰہی سے مراد انتقام (اور عذاب) ہوتا ہے، قرآن مجید میں ہے۔

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 90)

تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (سورۃ آل عمران آیت نمبر 112)

اور غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے۔

وَمَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْهِ غَضَبِیْ (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 81)

اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا۔

غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (سورۃ المجادلۃ آیت نمبر 14)

اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا۔

اور آیت کریمہ:

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (سورۃ الفاتحۃ آیت نمبر 7)

نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا۔

میں بعض نے کہا کہ مغضوب علیھم سے یہود مراد ہیں اور غضبۃ کے معنی سخت چٹان کے ہیں۔

المغضوب بہت زیادہ غصے ہونے والا یہ سانپ اور تیز مزاج اونٹنی پر بھی بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فلاں غضبۃ کے معنی ہیں فلاں بہت جلد غصے ہونے والا ہے۔ بعض نے بیان کیا ہے کہ غضبت لفلان کے معنی کسی زندہ شخص کی حمایت میں ناراض ہونا ہیں اور غضبت بہ کے معنی کسی مردہ شخص کی حمایت کے لئے غضب ناک ہونا۔

متن:

وقرئ: ولا الضألين بالهمزة على لغة من جد فى الهرب من التقاء الساكنين.

-آمين- اسم الفعل الذى هو استجب.

وعن ابن عباس قال سألت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم عن معناه فقال: "افعل بنى على الفتح كأين لالتقاء الساكنين"

وجاء مد ألفه وقصرها قال:

ويرحَمُ الله عبداً قالَ آمِينا وقال:

أمينَ فزادَ الله ما بيننا بُعدا وليس من القرآن وفاقا. لكن يسن ختم السورة به لقوله عليه الصلاة والسلام »علمنى جبريل آمين عند فراغى من قراءة الفاتحة وقال إنه كالختم على الكتاب«

.وفى معناه

قول على رضى الله عنه: آمين خاتم رب العالمين، ختم به دعاء عبده

يقوله الإمام ويجهر به فى الجهرية لما

روى عن وائل بن حجر »أنه عليه الصلاة والسلام كان إذا قرأ ولا الضالين قال آمين ورفع بها صوته«.

وعن أبي حنيفة رضى الله عنه أنه لا يقوله: والمشهور عنه أنه يخفيه كما رواه عبد الله بن مغفل وأنس، والمأموم يؤمن معه

لقوله عليه الصلاة والسلام إذا قال الإمامِ وَلاَ الضالين فقولوا آمين فإن الملائكة تقول آمين فمن وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه.

وعن أبي هريرة رضى الله عنه أن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال لأبيّ ألا أخبرك بسورة لم يُنَزَّلْ فى التوراة والإنجيل والقرآن مثلها. قال: قلت بلى يا رسول الله.

قال: فاتحة الكتاب إنها السبع المثانى والقرآن العظيم الذى أوتيته«.

وعن ابن عباس رضى الله عنهما قال بينا رسول الله صلّى الله عليه وسلّم جالس إذ أتاه ملك فقال: أبشر بنورين أوتيتهما لم يؤتهما نبى قبلك: فاتحة الكتاب، وخواتيم سورة البقرة، لن تقرأ حرفاً منهما إلا أعطيته.

وعن حذیفة بن الیمان أن رسول الله صلّی الله علیه وسلّم قال: "إن القوم لیبعث الله علیهم العذاب حتمًا مقضیًا فیقرأ صبی من صبیانهم فی الکتاب: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ فیسمعه الله تعالی فیرفع عنهم بذلك العذاب أربعین سنة

ترجمہ:

اور "ولاالضَالین" کی ایک قراءت ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ بھی ہے، اویہ ان لوگوں کی لغت پر مبنی ہے جو اجتماع ساکنین سے بھاگنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ "آمین" فعل "استجب" کا نام ہے، اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ سے اس کے معنی پوچھے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا، اس کے معنی "افعل" کے ہیں۔ یعنی اے میرے اللہ کریم میرا کام کر دے۔ اور یہ لفظ آمین اجتماع ساکنین کی وجہ سے مبنی برفتحہ ہے جیسا کہ "اینَ" اور "آمینَ" الف ممدودہ و مقصورہ دونوں کے ساتھ کلامِ عرب میں وارد ہے۔ (الف ممدودہ) شاعر کے قول میں،

ویرحَمُ الله عبداً قالَ آمِینا

اور مقصورہ

أمینَ فزادَ الله ما بیننا بُعدا

اور لفظ آمین بالاتفاق جزوِ قرآن نہیں لیکن آمین کہہ کر سورۃ فاتحہ کو ختم کرنا سنت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ مجھے جبریلِ امین نے میرے قراءتِ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد آمین کہنے کی تعلیم دی، اور یہ کہا کہ آمین بحیثیت خط کی مہر کے ہے اور اسی حدیث کے ہم معنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا ارشاد ہے، فرماتے ہیں،

کہ آمین "رب العالمین" کی مہر ہے، اس نے اپنے بندے کی دعا اس پر مکمل کی۔

یقوله الإمام ویجهر به فی الجهریة لما...الخ

امام بھی آمین کہے گا، جہری نماز میں بآوازِ بلند کہے گا، کیونکہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ "ولاالضالین" پڑھنے کے بعد آمین کہتے تھے، اور بوقتِ آمین آواز بلند رکھتے تھے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ امام آمین نہ کہے اور ان کی مشہور روایت یہ ہے کہ امام آمین کہے لیکن آہستہ آواز کے ساتھ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مغفل اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ثابت ہے اور مقتدی بھی امام کے ساتھ آمین کہے گا اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ جب امام "ولاالضَالین" کہے تو تم آمین کہو، اس لئے کہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں، پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

اور حضرت ابوھریرہ رضی الہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو فرمایا، تم کو ایسی سورت نہ بتاؤں جس کی مثل تورات، انجیل، اور قرآن میں نازل نہیں ہوئی، میں نے عرض کیا ضرور یارسول اللہ ﷺ تو آپ ﷺ

نے فرمایا سورہ فاتحۃ الکتاب۔ تحقیق کہ یہی "السبع المثانی" اور قرآن پاک ہے جسے تنہا میں ہی دیا گیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے اچانک ایک فرشتہ آیا اور کہا آپ دو نور کی خوشخبری حاصل کیجئے، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی نبی کو بھی عطا نہیں کئے گئے، ان میں سے ایک سورۃ الفاتحہ اور دوسرا نور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں ہیں، ان میں سے ہر ہر لفظ کی تلاوت پر آپ کو نور عطا کیا جائے گا۔

اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کریم کسی قوم پر لازمی طور پر عذاب نازل کرنے ارادہ فرماتا ہے، دریں اثناء اس قوم میں ایک بچہ قرآن سے "الحمد للہ رب العالمین" پڑھتا ہے، تو اللہ کریم اس کو سنتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس قوم سے عذاب کو چالیس سال کے لئے دور کر دیتے ہیں۔

ضالین کے معانی:

(ض ل ل) الضلال (Abhorrencey)

کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے ہیں۔ اور یہ ہدایۃ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (سورۃ الاسراء آیت نمبر 15)

جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے سے اختیار کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا۔

اور ضلال کا لفظ ہر قسم کی گمراہی پر بولا جاتا ہے یعنی وہ گمراہی قصداً یا سہواً معمولی ہو یا زیادہ کیونکہ طریق مستقیم، جو پسندیدہ راہ ہے، پر چلنا نہایت دشوار امر ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

استقیموا ولن تحصوا

کہ استقامت اختیار کرو اور تم پورے طور پر اس کی نگہداشت نہیں کر سکو گے۔

حکماء نے کہا ہے کہ صحت و راستی کی راہ تو صرف ایک ہی ہے مگر گمراہی کے متعدد راستے ہیں کیونکہ استقامت اور صواب کی مثال تیر کے ٹھیک نشانہ پر بیٹھ جانے کی ہے اور صحیح نشانہ کے علاوہ ہر جہت کا نام ضلالت ہے۔ ہمارے اس قول کی تائید بعض صالحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس فرمان کے کیا معنی ہیں شیبتنی سورۃ ھود واخواتھا کہ سورۃ ہود اور اس کی ہم مثل دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سورۃ ھود کی جس آیت نے مجھے بوڑھا کر دیا:

فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ ہے یعنی اے پیغمبر ٹھیک اسی طرح سیدھے رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

اقسام ضلالت:

ایک دوسرے اعتبار سے ضلالۃ کی دو قسمیں ہیں

(1) علوم نظریہ توحید و نبوت وغیرہما کی معرفت میں غلطی کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا

(سورۃ النساء ایت نمبر 136)

اور جو نہ مانے اللہ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور قیامت کو تو وہ ضرور دور کی گمراہی میں پڑا۔

میں اس قسم کی گمراہی کو ضلالا بعیدا کہا گیا ہے۔

(2) علوم عملیہ میں ضلالۃ ہے جس کے معنی ہیں احکام شرعیہ یعنی عبادات (اور معاملات) کی معرفت میں غلطی کرنا اور آیت مذکورہ میں ضلالا بعیدا سے اس کے کفر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت کے ابتداء ومن یکفر اور آیت:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (سورۃ النساء آیت نمبر 167)

وہ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا بے شک وہ دور کی گمراہی میں پڑے۔

اور آیت: فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ (سورۃ سبا آیت نمبر 8)

عذاب اور دور کی گمراہی میں ہیں۔

میں بھی معنی مراد ہیں اور فی کے معنی یہ ہیں کہ اس گمراہی کی سزا میں گرفتار ہوں گے اور یہی معنی آیت:

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ (سورۃ الملك آیت نمبر 9)

تم تو نہیں مگر بڑی گمراہی میں۔

میں مراد ہیں۔ نیز فرمایا:

قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 77)

جو (خود بھی) پہلے گمراہ ہوئے اور بھی اکثروں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔

اور آیت کریمہ: ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 10)

کے معنی یہ ہیں کہ جب مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائیں گے۔ اور آیت:

وَلَا الضَّآلِّيْنَ (سورۃ الفاتحۃ آیت نمبر 7)

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 52)

کے معنی ہیں: یعنی میرے پروردگار کو کوئی چیز غافل نہیں کرتی۔

اور آیت: اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ (سورۃ الفیل آیت نمبر 2)

کیا ان کی تدبیر کو ضائع نہیں کیا (گیا) میں فی تضلیل کے معنی ضائع کر دینا اور غلط راہ لگا دینا کے ہیں۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

مدنيّة وآياتها مائتان وسبع ثمانون

[سورة البقرة (2) : آية 1]

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

متن:

الم (1)

الم وسائر الالفاظ التي يتهجى بها، أسماء مسمياتها الحروف التي ركبت منها الكلم لدخولها في حد الاسم، واعتوار ما يخص به من التعريف والتنكير والجمع والتصغير ونحو ذلك عليها، وبه صرح الخليل وأبو علي، وما

روى ابن مسعود رضي الله تعالى عنه أنه عليه الصلاة والسلام قال: »من قرأ حرفاً من كتاب الله فله حسنة والحسنة بعشر أمثالها لا أقول الم حرف بل ألف حرف ولام حرف وميم حرف«

فالمراد به غير المعنى الذي اصطلح عليه، فإن تخصيصه به عرف مجدّد بل المعنى اللغوي، ولعله سماه باسم مدلوله.

ولما كانت مسمياتها حروفاً وحداناً وهي مركبة، صدرت بها لتكون تأديتها بالمسمى أول ما يقرع السمع، واستعيرت الهمزة مكان الالف لتعذر الابتداء بها وهي ما لم تلها العوامل موقوفة خالية عن الإعراب لفقد موجبه ومقتضيه. لكنها قابلة إياه ومعرضة له إذ لم تناسب مبنى الاصل ولذلك قيل: ص وق مجموعًا فيهما بين الساكنين ولم تعامل معاملة أين وهؤلاء.

ترجمہ:

الم اور اس کی مثل سارے الفاظ، جن کے ساتھ کلمات کے ہجے کئے جاتے ہیں ان کو اسماء کہتے ہیں۔ اور ان کے

مدلولات اور مسمیات وہ حروف مبانی ہیں جن سے کلمات مرکب ہوتے ہیں۔ (جیسے ا، ب، ت وغیرہ) کیونکہ وہ اسم کی تعریف میں داخل ہیں اور اسم کے خواص اور علامات ان پر صادق آتے ہیں۔ جیسا کہ معرفہ ونکرہ ہونا اور جمع ومصغر ہونا وغیرہ۔ صرف کے امام ابوعلی فارسی اور نحو کے امام خلیل نے ان کے اسم ہونے کی تصریح کی ہے۔

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے قرآن مجید سے ایک حرف پڑھا اس کو ایک نیکی ملے گی اور آخرت میں اس نیکی کا ثواب دس نیکیوں کے برابر ہوگا۔ (آپ نے فرمایا) میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف، لام دوسرا حرف اور میم علیحدہ حرف ہے۔ تو گویا جس نے الم پڑھا اس نے تین حرف پڑھے اور اس آخرت میں تیس نیکیاں ملیں گی اس حدیث پاک میں حرف سے مراد وہ حرف نہیں جو اسم اور فعل کے مقابلے میں آتا ہے۔ اس کا لغوی معنی طرف یا کنارہ ہے، کیونکہ حرف کا اصطلاحی معنیٰ بہت پرانا نہیں ہے یہ اسلام کے اول زمانہ سے سو سال کے بعد وضع کی گئی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدلول بول کر دال مراد لیا ہو۔

اور جبکہ ان اسماء کے مسمیات الگ الگ حروف ہیں اور وہ اسماء انہیں حروف سے مرکب ہیں اس لئے ان حروف کے ساتھ اسماء کا آغاز کیا گیا ہے۔ تاکہ جو بات سب سے پہلے سننے والے کی سماعتوں کے نظر ہو وہ اسماء کے مسمیات کو ادا کرتا ہو۔ اور استعارہ کے طور پر الف کی جگہ ہمزہ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ الف ساکن ہوتا ہے اور ساکن حرف سے ابتداء ممکن نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ اسماء عوامل کے ساتھ متصل نہیں (یعنی ان سے پہلے عامل کوئی نہیں) اس لئے ان پر وقف کیا جاتا ہے۔ اور یہ اعراب سے خالی ہوتے ہیں کیونکہ موجب اعراب اور مقتضی یعنی عامل ان سے پہلے نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تمام اسم اعراب قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے قابل بھی ہیں اور یہ مبنی الاصل کے مشابہ نہ ہونے کی وجہ سے ص اور ق پر سکون کے ساتھ وقف کیا جاتا ہے۔ اور اس میں دو ساکن جمع ہو جاتے ہیں۔ (باوجود اس کے کہ اجتماع ساکنین جائز نہیں) اور این اور ھولاء والا معاملہ ان کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔

متن:

ثم إن مسمياتها لما كانت عنصر الكلام وبسائطه التي يتركب منها. افتتحت السورة بطائفة منها إيقاظاً لمن تحدى بالقرآن وتنبيهاً على أن أصل المتلو عليهم كلام منظوم مما ينظمون منه كلامهم. فلو كان من عند غير الله لما عجزوا عن آخرهم مع تظاهرهم وقوة فصاحتهم عن الإتيان بما يدانيه. وليكون أول ما يقرع الاسماع مستقلاً بنوع من الإعجاز. فإن النطق بأسماء الحروف مختص بمن خط ودرس. فأما من الامي الذي لم يخالط الكتاب فمستبعد مستغرب خارق للعادة كالكتابة والتلاوة سيما۔

ترجمہ:

پھر ان اسماء کے مسمیات جو اصل الکلام اور اس کے بسیط حروف ہیں جن سے کلام مرکب کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے اس سورت کے آغاز میں، ان میں سے چند ذکر کئے گئے ہیں، ان لوگوں کو جگانے اور چوکنا کرنے کے لئے جن کو قران پاک کے مقابلے میں کلام لانے کا چیلنج کیا گیا ہے، اور ان کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ جو قرآن ان کو سنایا جارہا ہے وہ اسی قسم کے حروف سے مرکب ہے جن کے ذریعے وہ اپنا کلام کرتے ہیں اور اگر یہ کتاب اللہ کی بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتی تو وہ تمام کے تمام باوجود باہمی تعاون اور قوت فصاحت کے، ایسا کلام لانے سے عاجز نہ آتے، جو اس کے قریب تک بھی پہنچ سکتا ہو اور (اسی وجہ سے بھی ان کو سورۃ کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے) تاکہ سب سے پہلی بات جو کانوں کے پردوں پر دستک دے وہ اعجاز کی ایک مستقل قسم ہو۔ کیونکہ اس آدمی کے ساتھ حروف کے اسماء کا تلفظ کرنا خاص ہو جس نے لکھنا یا پڑھنا سیکھا ہو۔ لیکن ایسی ذات کا ان اسماء کے ساتھ تلفظ کرنا جس نے کبھی بھی کسی سکول میں استاذ کی شاگردی نہ کی ہو یہ بہت عجیب، بعید از قیاس اور عادت کے خلاف ہے۔ خاص طور پر لکھنا اور تلاوت کرنا استاذ کی رہنمائی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

متن:

وقد راعى فى ذلك ما يعجز عنه الاديب الاريب الفائق فى فنه. وهو أنه أورد فى هذه الفواتح أربعة عشر اسماً هى نصف أسامى حروف المعجم، إن لم يعد فيها الالف حرفاً برأسها فى تسع وعشرين سورة بعددها إذا عد فيها الالف الاصلية مشتملة على أنصاف أنواعها،

فذكر من المهموسة وهى ما يضعف الاعتماد على مخرجه ويجمعها (ستشحثك خصفه) نصفها الحاء والكاف والهاء والصاد والسين والكاف. ومن البواقى المجهورة نصفها يجمعه (لن يقطع أمر) . ومن الشديدة الثمانية المجموعة فى (أجدت طبقك) أربعة يجمعها (أقطك) . ومن البواقى الرخوة عشرة يجمعها «خمس» على نصره. ومن المطبقة التى هى الصاد والضاد والطاء والظاء نصفها، ومن البواقى المنفتحة نصفها، ومن القلقلة وهى: حروف تضطرب عند خروجها ويجمعها (قد طبج) نصفها الاقل لقلتها، ومن اللينتين الياء لأنها أقل ثقلاً، ومن المستعلية وهى التى يتصعد الصوت بها فى الحنك الاعلى، وهى سبعة القاف والصاد والطاء والخاء والغين والضاد والظاء نصفها الاقل، ومن البواقى المنخفضة نصفها،

ترجمہ:

خاص طور پر اس تلفظ میں اللہ کریم نے ایسی چیزوں کا لحاظ رکھا ہے جس سے بڑے بڑے ادیب، ماہر عالم اور اس فن کے ماہرین بھی عاجز آجاتے ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ حروف تہجی کے چودہ اسماء جو ان سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں وہ حروف تہجی کے اسماء کا نصف ہیں، اس شرط پر کہ الف کو مطلقاً ان حروف میں شمار نہ کیا جائے اور یہ قرآن مجید کی انتیس (29) سورتوں کے آغاز میں بیان کئے گئے ہیں جو کہ حروف تہجی کی مجموعی تعداد کے مطابق ہیں۔ بشرطیکہ کہ الف کو مستقل حرف شمار کیا جائے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان حروف کی اقسام میں سے نصف نصف یعنی نصف اکثر یا نصف مساوی یا نصف اقل ان سورتوں کے آغاز میں بیان کئے گئے ہیں۔

حروف مہموسہ میں سے نصف حروف سورتوں کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائے ہیں جن کی کل تعداد دس (10) ہے ان میں سے درج ذیل پانچ (5) سورتوں کے آغاز میں ذکر کئے گئے ہیں،

حا، ھا، ص، س، اور ق

حروف مہموسہ کا مجموعہ مندرجہ ذیل ہے،

ستشحثك خصفه (عنقریب حفصہ تجھ سے اصرار وزاری کرے گی)

اس کے علاوہ سورتوں کے آغاز میں حروف مجہورہ ذکر کئے گئے ہیں جن کی تعداد اٹھارہ (18) اور ان کے نصف کا مجموعہ مندرجہ ذیل ہے،

لن یقطع أمر امر ہرگز قطعی نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ حروف شدیدہ ہیں جن کی مجموعی تعداد آٹھ (8) اور مجموعہ یہ ہے،

اجدت طبقك

اور ان میں سے چار (4) سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں،

اقطك حروف شدیدہ کے علاوہ باقی سارے حروف رخوہ ہیں ان کی کل تعداد بیس (20) ہے اور ان میں سے دس (10) سورتوں کے شروع میں ذکر کئے گئے ہیں۔ ان دس کا مجموعہ ملاحظہ ہو۔

خمس علی نصرہ. وہ اس کی مدد پر بہادر ہے۔

ان کے علاوہ حروف مطبقہ ہیں، ان کی کل تعداد چار (4) ہے،

ص.ض.ط.ظ جبکہ سورتوں کے آغاز میں نصف لائے گئے اور وہ یہ ہیں

ص.ط ان کے علاوہ حروف منفتحة ہیں ان کو بھی نصف سورتوں کے آغاز میں لایا گیا ہے۔

ان کے علاوہ حروف قلقلہ ہیں جو مخرج میں اضطراب سے ادا ہوتے ہیں، یہ چھ (6) ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں،

قد طمیح ان کا نصف اقل سورتوں کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے بوجہ ان کی قلت کے۔ یعنی دو (2) کا،

اور حرف لین دو (2) ہیں جو نرمی سے ادا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں،

و، ی ان دو میں سے ی کو ذکر کیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ حروف مستعلیہ ہیں جن کو ادا کرتے وقت آواز میں گونج پیدا ہوتی ہے اور وہ حنک اعلیٰ کی طرف بلند ہوتی ہے یہ سات (7) ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ق، ص، ط، ح، ض، ظ ان کا بھی نصف اقل ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ باقی حروف منخفضہ ہیں یہ بائیس (22) ہیں ان میں سے بھی گیارہ (11) حروف ذکر کیے گئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں،

الف، ل، ذ، ک، ہ، ی، ع، س، ج اور ن

ومن حروف البدل وهی أحد عشر علی ما ذکره سیبویه، واختاره ابن جنی ویجمعها (أجد طویت) منها الستة الشائعة المشهورة التی یجمعها (أهطمین) وقد زاد بعضهم سبعة أخری وهی اللام فی (أصیلال) والصاد والزای فی (صراط وزراط) والفاء فی (أجداف) والعین فی (أعن) والثاء فی (ثروغ الدلو) والباء فی »باسمك« حتی صارت ثمانیة عشر وقد ذکر منها تسعة الستة المذکورة واللام والصاد والعین۔

ترجمہ:

سیبویہ اور ابن جنی کے مختار قول کے مطابق حروف بدل گیارہ (11) ہیں۔ اور ان کا مجموعہ درج ذیل ہے۔

أجد طویت منها

ان میں سے چھ (6) حروف مشہور ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا مجموعہ یہ ہے: اهطمین

بعض نے ان کے علاوہ مزید سات (7) کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں، لام اصیل اور اصیلال میں ہے۔

ص، ز جو صراط اور زراط اور جو جدف میں ہیں اور عین جو اَعِن میں ہے اور ث جو ثروغ الدلو میں ہے اور ب جو باسمک میں ہے یہاں تک کہ ان کی تعداد اٹھارہ (18) ہو گئی ان میں سے نو (9) سورتوں کے آغاز میں ذکر کیے گئے ہیں۔ چھ مذکورہ بالا ہیں اور تین یہ ہیں۔

ل، ص، ع

متن:

ومما یدغم فی مثله ولا یدغم فی المقارب وهی خمسة عشر: الهمزة والهاء والعین والصاد والطاء والمیم والیاء والخاء والغین والضاد والفاء والظاء والشین والزای

والواو نصفها الاقل. ومما يدغم فيهما وهي الثلاثة عشر الباقية نصفها الاكثر: الحاء والقاف والكاف والراء والسين واللام والنون لما في الإدغام من الخفة والفصاحة. ومن الاربعة التي لا تدغم فيما يقاربها ويدغم فيها مقاربها وهي: الميم والزاي والسين والفاء نصفها.

ترجمہ:

اوروہ حروف جو اپنی ہم مثل (ہم مخرج) میں مدغم ہوتے ہیں لیکن اپنے قریب المخارج حروف میں مدغم نہیں ہوتے، ان کی تعداد پندرہ (15) ہے اور وہ درج ذیل ہیں،

ء،ہ،ع،ص،ط،م،ی،خ،غ،ض،ظ،ش،ز،ف،و

ان کا نصف اقل سورتوں کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور ایسے حروف جو اپنے مخرج اور قریب المخرج دونوں میں مدغم ہوتے ہیں ان کی تعداد تیرہ (13) ہے اور ان کا نصف اکثر سورتوں کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے،

خ،ق،ك،ر،س،ل،ن

کیونکہ ادغام میں فصاحت اور خفت ہوتی ہے۔ اور وہ حروف جو اپنے قریب المخارج حروف میں مدغم نہیں ہوتے لیکن ان کے قریب المخارج ان میں مدغم ہوتے ہیں ان کی تعداد چار (4) ہے اور وہ درج ذیل ہیں۔

ر،ش،ف۔م

ان میں سے نصف یعنی دو (2) سوتوں کی ابتداء میں لائے گئے ہیں جو ذیل میں مذکور ہیں۔

م،ر

متن:

ولما كانت الحروف الذلقية التي يعتمد عليها بذلق اللسان وهي ستة يجمعها (رب منفل) والحلقية التي هي الحاء والخاء والعين والغين والهاء والهمزة. كثيرة الوقوع في الكلام ذكر ثلثيهما. ولما كانت أبنية المزيد لا تتجاوز عن السباعية ذكر من الزوائد العشرة التي يجمعها (اليوم تنساه) سبعة أحرف منها تنبيهاً على ذلك. ولو استقريت الكلم وتراكيبها وجدت الحروف المتروكة من كل جنس مكثورة بالمذكورة

ترجمہ:

اور حروف ذلقیہ وہ ہیں جن کی ادائیگی کے وقت زبان کی نوک کا سہارہ لیا جاتا ہے۔ یہ چھ ہیں جن کا مجموعہ درج ذیل ہے

رب منفل

اور حروف حلقیہ بھی ایسے ہی ہیں یعنی ان کا مخرج بھی حلق ہے وہ بھی چھ (6) ہیں۔

ح، خ، ع، غ، ہ، ء

ان دونوں قسموں کے حروف بہت زیادہ مستعمل ہیں جس کی وجہ سے ان کی مجموعی تعداد کے دو (2) ثلث سے سورتوں کا آغاز کیا گیا ہے، اور چونکہ مزید کا صیغہ سات حروف سے زائد نہیں ہوتا اس لئے ان حروف کو زائدہ کہتے ہیں ان کا مجموعہ یہ ہے۔

الیوم تنساہ

ان میں سے سات حروف سے سورتوں کا آغاز کیا گیا ہے۔ تا کہ تنبیہ ہو جائے کہ مزید فیہ کا وزن سات حروف سے تجاوز نہیں کرتا اگر آپ عربی کلام اور اسکی تراکیب کی چھان بین کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حروف کی ہر قسم سے جتنے حروف کو چھوڑا گیا ہے ان کی تعداد جو مذکور ہے ان کے مقابلے میں قلیل ہے۔

متن:

ثم إنه ذكرها مفردة وثنائية وثلاثية ورباعية وخماسية، إيذاناً بأن المتحدى به مركب من كلماتهم التى أصولها كلمات مفردة، ومركبة من حرفين فصاعداً إلى الخمسة، وذكر ثلاث مفردات فى ثلاث سور لأنها توجد فى الاقسام الثلاثة:

الاسم والفعل والحرف وأربع ثنائيات لأنها تكون فى الحرف بلا حذف (كبل)، وفى الفعل بحذف ثقل (كقل). وفى الاسم بغير حذف (كمن)، وبه (كدم) فى تسع سور لوقوعها فى كل واحد من الاقسام الثلاثة على ثلاثة أوجه: ففى الاسماء من وإذ وذو. وفى الافعال قل وبع وخف. وفى الحروف من وإن ومذ على لغة من جربها. وثلاث ثلاثيات لمجيئها فى الاقسام الثلاثة فى ثلاث عشرة سورة تنبيهاً على أن أصول الابنية المستعملة ثلاثة عشر، عشرة منها للأسماء، وثلاثة للأفعال، ورباعيتين وخماسيتين تنبيهاً على أن لكلِ منهما أصلاً: كجعفر وسفرجل، وملحقاً: كقردد وجحنفل،

ولعلها فرقت على السور ولم تعد بأجمعها فى أول القرآن لهذه الفائدة مع ما فيه من إعادة التحدى وتكرير التنبيه والمبالغة فيه.

والمعنى أن هذا المتحدى به مؤلف من جنس هذه الحروف. أو المؤلف منها، كذا

ترجمہ:

پھر اس کے بعد اللہ کریم نے حروف تہجی میں سے مفرد، ثنائی، ثلاثی، رباعی اور خماسی سے بھی سورتوں کا آغاز فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس قرآن کے مقابلہ میں انہیں کلام پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا ہے۔ وہ ایسے کلمات سے مرکب ہے جن کے اصول مفرد اور دو حرفوں سے مرکب اور اس سے زیادہ پانچ (5) حرفوں تک سے مرکب ہوتے ہیں، تین سورتوں کی ابتداء میں تین مفرد حروف ذکر کئے گئے ہیں۔ کیونکہ تین حروف کلمے کی تینوں قسموں اسم، فعل اور حرف میں پائے جاتے ہیں۔ اور چار دوحرفی کلمات ذکر کئے گئے ہیں کیونکہ دوحرفی کلمات صَرف میں بغیر حذف کے پائے جاتے ہیں۔ جیسے بَل۔ اور فعل میں حذف کے ساتھ جیسے قل۔ اور اسم میں بغیر حذف کے بھی جیسے من۔ اور ایک حرف کے حذف کے ساتھ بھی پائے جاتے ہیں جیسے دم اصل میں دموتھا۔ دوحرفی حروف نو سورتوں کی ابتداء میں ذکر کئے گئے ہیں۔ کیونکہ کلمہ کی تینوں اقسام میں یہ حروف تین طرح سے موجود ہیں اسماء میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ جیسے اذ، ضمہ کے ساتھ ذ جیسے ذُو اور میم کے فتحہ کے ساتھ جیسے من۔ اور افعال میں بھی اسی کی مثل پہلے حروف کے ضمہ، فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پائے جاتے ہیں جیسے قل، خف اور ربع۔

اسی طرح حروف میں بھی پہلے حرف کے فتحہ، ضمہ اور کسرہ سے مذکور ہیں، جیسے ان، من، اور مذ۔ ان لوگوں کی لغت کے مطابق جو مذ کو حرف جر مانتے ہوئے اس کے مابعد کو کسرہ دیتے ہیں اور اور تین ثلاثی یعنی تین حروف سورتوں کی ابتداء میں ذکر کئے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ ثلاثی کلمے تینوں قسموں میں پائے جاتے ہیں۔ تیرہ سورتوں کا آغاز ان سے کیا گیا ہے۔ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ کلمہ کے تیرہ (13) اوزان مستعمل ہوتے ہیں ان میں سے دس اسم کے اصول ہیں اور تین فعل کے اور رباعی اور خماسی میں سے دو دو ذکر کئے گئے ہیں۔ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ رباعی اور خماسی کی دو دو قسمیں ہیں۔ جیسے جعفر اس سفرجل اور ان کے ملحقات جیسے قردد اور جحنقل۔

اور شاید سورتوں کے آغاز میں حروف تہجی کو علیحدہ علیحدہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ ایک فائدہ یہ ہو کہ (قرآن پاک کا اعجاز ثابت ہو جائے) اور اس کے ساتھ ساتھ چیلنج کا اعادہ اور تنبیہ کا تکرار ہو جائے۔ یہ سورتیں اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہیں اس میں اگر اظہار مبالغہ بھی ہو جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس کلام کے مقابلہ میں عربوں کو کلام پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا وہ کلام انہی حروف سے مرکب ہے جن سے وہ اپنا کلام مرکب کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس جیسا کلام پیش نہ کر سکے۔

متن:

وقيل: هي أسماء للسور، وعليه إطباق الاكثر. سميت بها إشعاراً بأنها كلمات معروفة التركيب فلو لم تكن وحياً من الله تعالى لم تتساقط مقدرتهم دون معارضتها. واستدل عليه بأنها لو لم تكن مفهمة كان الخطاب بها كالخطاب بالمهمل والتكلم بالزنجي مع العربي، ولم يكن القرآن بأسره بياناً وهدى. ولما أمكن التحدي به وإن

كانت مفهمة. فإما أن يراد بها السور التی هی مستهلها علی أنها ألقابها. أو غير ذلك. والثانی باطل لأنه إما أن يكون المراد ما وضعت له فی لغة العرب فظاهر أنه ليس كذلك. أو غيره وهو باطل لأن القرآن نزل علی لغتهم لقوله تعالی: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ فلا يحمل علی ما ليس فی لغتهم.

ترجمہ:

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں اور اسی پر ہی اکثر کا اتفاق ہے ان کو سورتوں کے اسماء کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شعور دلایا جائے کہ وہ سورتیں ایسے کلمات سے مرکب ہیں جن کی ترکیب مشہور و معروف ہے۔ اور ہاں اگر یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہ ہوتا تو عرب اپنی فصاحت کے پیش نظر اس کلام کے مقابلہ میں کلام لانے سے عاجز نہ آتے۔ اور یہ دلیل بھی پیش کرتے کہ اگر ان کلمات کا کوئی مفہوم ہی نہ ہو (جیسا کہ بعض نے کہا) تو ان کے ساتھ خطاب کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے مہمل کلمات سے خطاب کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس طرح ہوگا جیسے حبشی زبان میں عربی النسل سے کلام کرنا۔ اور ساتھ ہی یہ کہ سارے کا سارا قرآن ہدایت اور بیان نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے ساتھ چیلنج کرنا ممکن ہوگا اور اگر ان کا معنی اور مفہوم ہے تو پھر یا تو یہ ان سورتوں کے اسماء ہوں گے جن کے شروع میں یہ الفاظ تہجی مذکور ہیں اور یہ ان کے القاب ہوں گے۔ اور یا ان سے سورتوں کے علاوہ کوئی اور معنی مراد لیا جائے گا تو یہ باطل ہوگا کیونکہ اس صورت میں ان سے یا تو وہ معنی مراد ہوگا جس کے لئے لغت عرب میں یہ وضع کئے گئے ہوں تو یہ بالکل واضح ہے کہ یہ کسی اور معنی کے لئے وضع نہیں کئے گئے یا ان سے مراد یہ ہوگا کہ یہ لغت عرب کے علاوہ کسی اور معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں تو یہ بھی باطل ہے کیونکہ قرآن کریم عربی لغت میں نازل کیا گیا ہے جیسے کہ فرمان باری تعالیٰ،

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ

متن:

لا يقال: لم لا يجوز أن تكون مزيدة للتنبيه؛ والدلالة علی انقطاع كلام واستئناف آخر؛ كما قاله قطرب، أو إشارة إلی كلمات هی منها اقتصرت عليها اقتصار الشاعر فی قوله:

قلتُ لها قفي فقالت قَافْ كما روی عن ابن عباس رضی الله تعالی عنهما قال: الالف آلاء الله، واللام لفظه، والميم ملكه. وعنه أن الر وحم ون مجموعها الرحمن. وعنه أن الم معناه: أنا الله أعلم ونحو ذلك فی سائر الفواتح. وعنه أن الالف من الله، واللام من جبريل، والميم من محمد أی: القرآن منزل من الله بلسان جبريل علی محمد عليهما

الصلاة والسلام، أو إلى مدد أقوام وآجال بحساب الجمل كما قال أبو العالية متمسكاً بما

روى أنه عليه الصلاة والسلام لما أتاه اليهود تلا عليهم الم البقرة. فحسبوه وقالوا: كيف ندخل في دين مدته إحدى وسبعون سنة. فتبسم رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فقالوا: فهل غيره. فقال: المص والر والمر. فقالوا: خلطت علينا فلا ندري بأيها نأخذ

فإن تلاوته إياها بهذا الترتيب عليهم وتقريرهم على استنباطهم دليل على ذلك. وهذه الدلالة وإن لم تكن عربية لكنها لاشتهارها فيما بين الناس حتى العرب تلحقها بالمعربات كالمشكاة والسجيل

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسا نہ کہا جائے کہ اگر ان حروف کو سورتوں کے اسماء نہ بنایا جائے تو ان کا عربی زبان میں کوئی ایسا معنی نہیں جس کے لئے یہ وضع کئے گئے ہوں۔ کیونکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حروف تہجی زائدہ ہوں اور تنبیہ، انقطاع، اور استیناف پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کئے گئے ہوں جیسے قطرب کی رائے جو کہ سیبویہ کا شاگرد تھا۔ یا پھر ان کے ذکر کرنے کا مقصد ایسے کلمات کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کے یہ مخفف ہیں۔ اور انہی حروف پر اقتصار کیا گیا ہو جیسے کوئی شخص اپنی محبوبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے اسے کہا ٹھہر جاؤ تو اس نے مجھے کہا کہ میں ٹھہر گئی گویا اس میں "قفت" کی جگہ اس مخفف قاف کہہ دیا جو کہ بمعنی قفت ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آلآئُ اللہ سے الف، اور لطف اللہ سے لام اور ملک اللہ سے میم مخفف ہیں اور آپ ہی سے مروی ہے کہ الر، حم اور ن کا مجموعہ الرحمان ہے اور آپ ہی کی روایت ہے کہ الم کا معنی انا اللہ اعلم (میں اللہ خوب جانتا ہوں) گویا کہ لفظ اللہ سے الف اور اعلم سے میم مخفف ہیں۔ اور اسی پر باقی سورتوں کے فواتح کو قیاس کر لیا جائے، یعنی الر انا اللہ ارا سے اور المر انا اللہ اعلم و ازی سے مخفف ہے۔ اور آپ ہی روایت کرتے ہیں کہ الف لفظ اللہ سے اور لام لفظ جبریل سے اور میم لفظ محمد ﷺ سے مخفف ہے۔ پس الف، لام اور میم کا معنی یہ ہوا کہ یہ کلام پاک اللہ کریم کی طرف سے حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطہ کے ساتھ حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا۔

نیز یہ حروف تہجی، حروف ابجد کے حساب سے قوموں کی بقاء اور ان کی عمروں کی طرف اشارہ ہیں۔ جیسا کہ ابو العالیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بتایا کہ نبی پاک ﷺ کے پاس یہودیوں کا ایک وفد حاضر ہوا (اور کلام مجید سننے کا مطالبہ کیا تو) آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورۃ البقرہ تلاوت فرمائی انہوں نے الم کے حروف

کے اعداد سے حساب لگا کر کہا کہ ہم اس دین کو کیسے قبول کریں جس کی مدت بقا صرف اکہتر (71) سال ہے۔ ان کا یہ استدلال دیکھ کر نبی کریم ﷺ مسکرائے تو انہوں نے عرض کیا کہ ان کے علاوہ بھی اگر کچھ حروف ہیں تو وہ بھی بیان کیجئے تو آپ ﷺ نے ان کو المص، المرٰ اور الرٰ پڑھ کر سنائے یہ سنتے ہی یہودی بول اٹھے کہ آپ نے تو ہم پر اپنے (دین کا) معاملہ خلط ملط کر دیا اب ہمیں نہیں معلوم کہ ہم آپ کی کون سی بات کو اختیار کریں (اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے) نبی کریم ﷺ کا اس طرح ان حروف کو ترتیب سے پڑھنا اور ان کے استنباط پر انہیں برقرار رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان حروف سے قوموں کی مدت بقاء اور ان کی عمروں کی طرف اشارہ کرنا ہے اگرچہ اس قسم کا استنباط نہ تو عربی ہے اور نہ ہی عرفی لیکن لوگوں کے علاوہ خاص طور پر عربوں میں بھی یہ اشارہ اور دلالت اتنی مشہور ہے کہ اس کو ملحق بمعرب کر دیا گیا ہے جیسے کہ مشکوٰۃ کا لفظ (جو کہ حبشی زبان کا لفظ ہے) جس کا معنی وہ طاق ہے جس میں چراغ رکھا جاتا ہے اور سجیل فارسی زبان کا لفظ، جس کا معنی مٹی کا پتھر ہے۔

متن:

والقسطاس، أو دلالة على الحروف المبسوطة مقسماً بها لشرفها من حيث إنها بسائط أسماء الله تعالى ومادة خطابه.

هٰذا وإن القول بأنها أسماء السور يخرجها ما ليس في لغة العرب، لأن التسمية بثلاثة أسماء فصاعداً مستكرهة عندهم ويؤدي إلى اتحاد الاسم والمسمى، ويستدعي تأخر الجزء عن الكل من حيث إن الاسم متأخر عن المسمى بالرتبة

لأنا نقول: إن هذه الالفاظ لم تعهد مزيدة للتنبيه والدلالة على الانقطاع والاستئناف يلزمها وغيرها من حيث إنها فواتح السور، ولا يقتضي ذلك أن لا يكون لها معنى في حيزها ولم تستعمل للاختصار من كلمات معينة في لغتهم. أما الشعر فشاذ وأما قول ابن عباس. فتنبيه على أن هذه الحروف منبع الاسماء ومبادء الخطاب وتمثيل بأمثلة حسنة. ألا ترى أنه عد كل حرف من كلمات متباينة لا تفسير، وتخصيص بهذه المعاني دون غيرها إذ لا مخصص لفظاً ومعنى ولا بحساب الجمل فتلحق بالمعربات، والحديث لا دليل فيه، لجواز أنه عليه الصلاة والسلام تبسم تعجباً من جهلهم. وجعلها مقسماً بها وإن كان غير ممتنع لكنه يحوج إلى إضمار أشياء لا دليل عليها. والتسمية بثلاثة أسماء إنما تمتنع إذا ركبت وجعلت اسماً واحداً على طريقة بعلبك، فأما إذا نثرت نثر أسماء العدد فلا. وناهيك بتسوية سيبويه بين التسمية

بالجملة والبيت من الشعر وطائفة من أسماء، حروف المعجم، والمسمى هو مجموع السورة والاسم جزؤها فلا اتحاد، وهو مقدم من حيث ذاته مؤخر باعتبار كونه اسماً، فلا دور لاختلاف الجهتين. والوجه الاول أقرب إلى التحقيق وأوفق للطائف التنزيل وأسلم من لزوم النقل ووقوع الاشتراك في الاعلام من واضع واحد فإنه يعود بالنقض على ما هو مقصود بالعلمية

ترجمہ:

اور قسطاس جواب ترازو کے معنی میں آتا ہے اور رومی زبان کا لفظ ہے۔ اب یہ تینوں کلمے انہی معانی میں عربی کلام میں بھی استعمال ہوتے ہیں، گویا ان کو معرب بنا دیا گیا۔ لہٰذا ان حروف تہجی سے قوموں کی مدت بقاء اور ان کی عمروں کی طرف اشارہ اور دلالت کو بھی معرب بنا دیا گیا ہوگا۔

یا یہ الفاظ تہجی ان حروف بسیطہ پر دلالت کرتے ہیں جن کے ساتھ قسم اٹھائی جاتی ہے جیسے و، ب، ت۔ چونکہ یہ رب تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے بسیط حروف اور رب تعالیٰ کے خطاب کے مادی حروف ہیں اس لئے ان کی بزرگی اور مرتبہ کی وجہ سے ان کے ساتھ قسم اٹھائی جاتی ہے۔

اور امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں یہ نہ کہا جائے کہ ان حروف تہجی کو سورتوں کے اسماء بنانا جائز نہیں کیونکہ عرب میں یہ رواج نہیں کہ ایک مسمی کا نام تین یا تین سے زائد اسمائی کے مجموعہ کے ساتھ رکھا جائے بلکہ وہ اس کو بے حد ناپسند کرتے ہیں۔

نیز اسم اور مسمی کا اتحاد لازم آتا ہے اگر ان الفاظ تہجی کو ان سورتوں کے اسما بنایا جائے۔ اور یہ اس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ جز کا وجود کل سے متاخر ہو حالانکہ جز مقدم ہوتا ہے۔ اور کل موخر ہوتا ہے۔ اور ان الفاظ کو سورتوں کے اسماء بنانے سے اس کا الٹ لازم آئے گا، کیونکہ باعتبار رتبہ مسمی مقدم ہوتا ہے اور اسم موخر۔ (اس لئے یہ سورتوں کے اسماء نہیں ہوں گے۔)

(مذکورہ بالا اعتراضات نہ کئے جائیں) کیونکہ یہ الفاظ تہجی اس اس معنی میں مشہور نہیں کہ یہ زائدہ ہوں اور کتاب اللہ پڑھنے اور سننے والوں کو بیدار کرنے اور خواب غفلت سے جگانے کے لئے ہوں۔ اور ایک سورت کے انقطاع اور دوسری سورت کے استیناف پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کئے گئے ہوں کیونکہ عربی لغت میں یہ حرف تنبیہ نہیں بلکہ وہ اور ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

الا، ھا، ما وغیرہ

اور انقطاع و استیناف تو ان سورتوں کا بھی ہوتا ہے جن کے آغاز میں یہ کلمات تہجی نہیں ہوتے۔ اس حیثیت سے کہ یہ ان سورتوں کے فواتح اور ابتدائیے ہیں۔

اور یہ کلمات تہجی عربی لغت میں کسی معین کلمہ مخففات بھی نہیں ہو سکتے اور وہ شعر جو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے وہ شاذ ہے (کیونکہ شذوذ سے لغات ثابت نہیں ہوتے) باقی رہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اقوال تو ان سے آپ کی مراد تنبیہ کرنا ہے کہ جو کلمات تہجی سورتوں کی ابتدا میں ذکر کئے گئے ہیں وہ اللہ کریم کے اسماء کا منبع ہیں اور اُس کے خطاب کے مبادی ہے اور مقصد خوبصورت مثالیں پیش کرنا ہے۔ کیا آپ نے اس امر کی طرف توجہ کی ہے کہ آپ نے ہر ہر حرف کو جدا جدا کلمات سے شمار کیا ہے جو نہ تو ان کلمات کی تفسیر ہے اور نہ ہی ان کو خواص معانی کے ساتھ مخصوص کرنا مطلوب ہے اس حیثیت سے کہ یہ حروف اور معنی پر دلالت ہی نہ کرتے ہوں کیونکہ یہاں ایسا کوئی بھی لفظی یا معنوی قرینہ موجود نہیں جو ان کو صرف ان معانی کے ساتھ خاص کرنے کا تقاضا کرتا ہو۔ اور یہ حروف بحساب جملہ اقوام کی مدت بقاء اور ان کی عمروں کا اندازہ لگانے کے لئے وضع کئے گئے ہیں کہ ان کو ملحق بمعربات کر دیا جائے اور ان کی دلالت کو معربات کے ساتھ خاص کرنے کے دعوٰی کو ثابت کرنے کے لئے جو روایت بطور دلیل پیش کی گئی ہے وہ بھی اس دلالت کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مسکرانا ان کی جہالت پر تعجب کی وجہ سے ہو نہ کہ اس وجہ سے کہ آپ ﷺ نے ان کے اس استنباط کو جائز سمجھا ہو۔ اور ان حروف کو اگرچہ مقسم بہا (وہ جن کے ساتھ قسم اٹھائی جاتی ہے) بنانا ممتنع نہیں لیکن اس کی وجہ سے بغیر ضرورت متعدد اشیاء مضمر ماننا پڑیں گی اور وہ چیزیں یہ ہوں گی فعل قسم، فاعل قسم اور حروف قسم اور جواب قسم مضمر مانا جائے گا (اور یہ جائز نہیں) اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر ان کو سورتوں کے اسماء بنایا جائے تو تین یا تین سے زائد اسماء کے ساتھ کسی چیز کا نام رکھنا درست ہو حالانکہ اہل عرب اس کو درست نہیں گردانتے کیونکہ ایسا کرنا اس وقت منع ہوتا ہے جب ان کو بعلبک کی طرح مرکب بنائی بنا کر کسی چیز کا نام رکھا جائے مگر جب ان کو بطور گنتی اسماء اعداد کی طرح الگ الگ شمار کیا جائے اور اس کے ساتھ کسی کا نام رکھا جائے تو منع نہیں بوجہ مروج ہونے کے، جیسا کہ پورے ایک جملہ اور شعر کے ایک مصرعے کو سیبویہ نے کسی چیز کا نام رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسے سُر۔مَن رَأی یہ ایک شہر کا نام ہے اور تَابطَ شراً یہ شاعر کا لقب اور اسی طرح انہوں نے حروف معجمہ کے ایک پورے حصے کے ساتھ، کسی کا نام رکھنے کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے ایک مسمی کے تین یا تین سے زائد اسماء کے ساتھ نام رکھنا جائز ہوگا۔ (اور یہ جو اعتراض کیا گیا ہے کہ ان حروف تہجی کو اگر سورتوں کے اسماء بنایا جائے تو اسم و مسمی کا اتحاد لازم آتا ہے اور کل کا جز پر تقدم بھی لازم آتا ہے۔ یہ درست نہیں، اس کا جواب ملاحظہ ہو) ساری کی ساری سورۃ مسمی ہے اور اس کا اسم اس کا جز ہے اس لئے اسم و مسمی میں کوئی اتحاد نہیں اور اسی طرح کل کا جز پر تقدم بھی لازم نہیں آتا۔

اور پہلی وجہ تحقیق کے زیادہ قریب ہے اور قرآن پاک جو کہ اللہ کریم کی طرف سے نازل کردہ ہے وہ لطائف کے زیادہ قریب ہے اور اعلام میں وقوع اشتراک اور لزوم نقل سے بھی زیادہ محفوظ ہے جبکہ اشتراک ایک ہی واضع کی طرف سے ہو کیونکہ اس سے مقصود بالعلمیت باطل ہو جاتا ہے اور مسمی کا امتیاز ہی نہیں ہوسکتا۔

متن:

وقیل: إنها أسماء القرآن ولذلك أخبر عنها بالكتاب والقرآن.
وقیل: إنها أسماء لله تعالى ویدل علیه
أن علیاً كرم الله وجهه كان یقول: یا كهیعص، ویا حمعسق،
ولعله أراد یا منزلهما.

ترجمہ:

بعض کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ تہجی قرآن کے اسماء ہیں اسی لئے اکثر سورتوں میں ان اسماء کی خبر کتاب یا قرآن آئی ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ اللہ تعالی کے اسماء ہیں اور اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل ہے کہ آپ ان کلمات کو دعائیہ انداز میں استعمال کرتے تو ان سے پہلے حروف نداء ذکر کرتے تھے۔ اور اس طرح پڑھتے

یا كهیعص، ویا حمعسق،

اس سے آپ رضی اللہ عنہ کی مراد یہ ہوتی ہو یا منزلھما کہ اے دونوں سورتوں کو اتارنے والے۔

متن:

وقیل الالف: من أقصى الحلق وهو مبدأ المخارج، واللام: من طرف اللسان وهو أوسطها، والمیم:
من الشفة وهو آخرها جمع بینها إیماء إلى أن العبد ینبغي أن یكون أول كلامه وأوسطه وآخره ذكر الله تعالى.
وقیل: إنه سر استأثر الله بعلمه وقد روی عن الخلفاء الاربعة وغیرهم من الصحابة ما یقرب منه، ولعلهم أرادوا أنها أسرار بین الله تعالى ورسوله ورموز لم یقصد بها إفهام غیره إذ یبعد الخطاب بما لا یفید.

ترجمہ:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ الم کا مطلب یہ ہے کہ الف کا مخرج حلق کا آخری حصہ ہے جو مخارج کا مبداء ہے اور لام زبان کی نوک سے ادا کیا جاتا ہے جو کہ اوسط المخرج ہے اور میم کا مخرج ہونٹ ہیں جو مخارج کا آخر ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تینوں کے مخارج کا اکٹھا کر دیا ہے تا کہ پتہ چل جائے کہ انسان کو یہی مناسب ہے کہ آغاز، درمیان اور آخر میں اللہ کریم کا ہی ذکر ہو۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ حروف تہجی جو سورتوں کے شروع میں ذکر کیے گئے ہیں یہ وہ راز ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے اسی کے موافق روایات خلفائے راشدین سے بھی مروی ہیں۔ اور دیگر صحابہ کرام سے بھی اسی کے مثل مرویات ہیں۔

اور بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کے درمیان ایسے اسرار ہیں جن کا دوسروں پر عیاں کرنا مقصود نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تو لازم آئے گا کہ ایسے کلام کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے خطاب کرنا، جو مفید نہیں تو یہ بعید از قیاس ہے۔

متن:

فإن جعلتها أسماء الله تعالى، أو القرآن، أو السور كان لها حظ من الإعراب إما الرفع على الابتداء، أو الخبر، أو النصب بتقدير فعل القسم على طريقة الله لأفعلن بالنصب أو غيره كما ذكر، أو الجر على إضمار حرف القسَم، ويتأتى الإعراب لفظاً والحكاية فيما كانت مفردة أو موازنة لمفرد كحم فإنها كهابيل، والحِكاية ليست إلا فيما عدا ذلك، وسيعود إليك ذكره مفصلاً إن شاء الله تعالى، وإن أبقيتها على معانيها فإن قدرت بالمؤلف من هذه الحروف كان فى حيز الرفع بالابتداء أو الخبر على ما مر، وإن جعلتها مقسماً بها يكون كل كلمة منها منصوباً أو مجروراً على اللغتين فى الله لأفعلن، وتكون جملة قسمية بالفعل المقدر له، وإن جعلتها أبعاض كلمات أو أصواتاً منزلة منزلة حروف التنبيه لم يكن لها محل من الإعراب كالجمل المبتدأة والمفردات المعدودة ويوقف عليها وقف التمام إذا قدرت بحيث لا تحتاج إلى ما بعدها. وليس شيء منها آية عند غير الكوفيين. وأما عندهم ف الم فى مواقعها، والمص و كهيعص وطه وطسم وطس ويس و حم آية، و حم عسق آيتان، والبواقى ليست بآيات وهذا توقيف لا مجال للقياس فيه.

ترجمہ:

اگر ان کلمات کو اللہ کریم، قرآن پاک اور سورتوں کے اسماء بنایا جائے تو ان کا اعراب میں لازماً حصہ ہوگا اس کی چند مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ مبتداء اور خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوں گے۔ دوسری یہ کہ منصوب ہوں گے فعل کے مقدر ہونے کہ وجہ سے۔ اور تیسری صورت یہ کہ حرف قسم کے مضمر ہونے کی وجہ مجرور ہوں گے جو کہ درج ذیل ہیں،

و، ب، ت

توان میں سے وہ کلمات جومفرد ہیں جیسے ص، ن، اور ق اور وہ کلمے جو مفرد کے ہم وزن ہیں جیسے حم بروزن ھابیل تو ان کا اعراب لفظی ہوگا اور جو مفرد اور اس کے ہم وزن کلموں کے علاوہ ہوں گے ان کا اعراب حکائی ہوگا یعنی وہ محل رفع، نصب یا جر میں ہوں گے ان کے آخر میں اعراب لفظوں میں ظاہر نہیں ہوتا، ان کا مفصل ذکر جلد آئیگا۔ اور اگر آپ انہیں اپنے اصلی اور حقیقی معنی میں رکھیں۔ اوران سے پہلے المولف من ھذہ الحروف مقدر مانیں تو یہ مبتداء یا خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہونگے جیسا کہ اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی المولف من جنس ھذہ الحروف ذالک الکتاب اور اگر انہیں مقسم بہا بنایا جائے تو ان میں ہر کلمہ منصوب یا مجرور ہوگا۔ یعنی اگر ان سے پہلے فعل قسم محذوف تصور کیا جائے تو مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہوں گے۔ اور اگر ان سے قبل حرف جر محذوف مانا جائے تو یہ مجرور ہوں گے۔ اور یہ اپنے ماقبل مقدر فعل کے ساتھ مل کر جملہ قسمیہ ہوں گے اور اگر ان کو بعض کلمات کے مخفف تسلیم کیا جائے، یا انہیں حرف تنبیہ مانا جائے تو ان کا اعراب میں کا‌ئی محل نہیں ہوگا جس طرح مستانفہ جملوں اور اور ان کلمات کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہوتا جو صرف گنتی کے لئے ذکر کئے جاتے ہیں۔ جیسے زید، عمر اور بکر وغیرہ اور ان پر جو وقف ہوگا اس کا نام وقف تام ہوگا اور یہ اپنے مابعد کے محتاج نہیں ہوں گے۔

[سورة البقرة (2) : آية 2]

ذٰلِكَ الْكِتابُ لا رَيْبَ فِيهِ هُدىً لِلْمُتَّقِينَ (2)

ترجمہ:

"وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں، اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو"۔

متن:

ذٰلِكَ الْكِتابُ ذلك إشارة إلى الم إن أول بالمؤلف من هذه الحروف أو فسر بالسورة أو القرآن فإنه لما تكلم به وتقضى، أو وصل من المرسل إلى المرسل إليه صار متباعداً أشير إليه بما يشار به إلى البعيد

وتذكيره، متى أريد ب الم السورة لتذكير الكتاب فإنه خبره أو صفته الذى هو هو، أو إلى الكتاب فيكون صفته والمراد به الكتاب الموعود إنزاله بنحو قوله تعالى: إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا. أو فى الكتب المتقدمة. وهو مصدر سمى به المفعول للمبالغة.

وقيل فعال بمعنى المفعول كاللباس، ثم أطلق على المنظوم عبارة قبل أن يكتب لأنه مما يكتب. وأصل الكتب الجمع ومنه الكتيبة.

ترجمہ:

ذالک اسم اشارہ للبعید ہے اور الم اس کا مشار الیہ ہے اگر اس سے مراد المولف من هذه الحروف یا سورۃ یا قرآن کریم ہو کیونکہ اس کے مراد وہ کلام ازلی ہوگا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ازل میں کلام فرمایا اور اسے لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کرنے کا فیصلہ کیا اور یا مرسل اور مرسل الیہ تک پہنچانے میں بعید ہوگیا اسی وجہ سے اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بعید کا اسم اشارہ ذکر فرمایا اور جب مراد الم سے سورۃ ہو تو اسم اشارہ کو مذکر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس کے بعد الکتاب مذکر ہے۔ اور وہ یا تو اس کی خبر ہے یا اس کی صفت اور اس سے مراد وہی ہوگا جو مذکور ہے یا اس کا مشار الیہ الکتاب ہے کیونکہ وہ اس کی صفت ہے تو اس سے مراد وہ کتاب ہے جس کا ذکر سورۃ مزمل میں کیا گیا ہے۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا

(ہم آپ کی طرف ایک وزنی قول القاء کریں گے)

یا اس سے مراد وہ کتاب ہوگی جس کے نازل کرنے کا کتب سماویہ میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اور کتاب مصدر ہے اور اسم مفعول کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے تاکہ مبالغہ پر دلالت کرے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ فعال کے وزن پر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس طرح لباس بمعنی ملبوس اور فراش بمعنی مفروش پھر اس کا اطلاق ایسی منظوم عبارت پر ہوگا جس کو لکھنے سے پہلے منظوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسی چیزوں میں سے ہے جو لکھی جائیں گی اور کتاب کا لغوی معنی ہے جمع کرنا اسی لئے وہ لشکر جس میں زیادہ لشکر جمع ہوں اس کو کتیبہ کہا جاتا ہے۔

متن:

لَا رَيْبَ فِيهِ

معناه أنه لوضوحه وسطوع برهانه بحيث لا يرتاب العاقل بعد النظر الصحيح في كونه وحياً بالغاً حد الإعجاز، لا أن أحداً لا يرتاب فيه، ألا ترى إلى قوله تعالى: وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا. الآية فإنه ما أبعد عنهم الريب بل عرفهم الطريق المُزيح له وهو أن يجتهدوا في معارضة نجم من نجومه ويبذلوا فيها غاية جهدهم حتى إذا عجزوا عنها تحقق لهم أن ليس فيه مجال للشبهة ولا مدخل للريبة.

وقيل: معناه لا ريب فيه للمتقين. وهدى حال من الضمير المجرور، والعامل فيه الظرف الواقع صفة للمنفي. والريب في الاصل مصدر رابني الشيء إذا حصل فيك الريبة، وهي قلق النفس واضطرابها، سمي به الشك لأنه يقلق النفس ويزيل الطمأنينة.

وفی الحدیث دع ما یریبك إلی ما لا یریبك

فإن الشك ریبة والصدق طمأنینة، ومنه ریب الزمان لنوائبه.

ترجمہ:

(اس میں کسی قسم کا شک نہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی واضح، روشن اور غالب دلیلوں کو ساتھ ساتھ فصاحت وبلاغت کے اس اعلیٰ مقام پر فائز ہے کہ کوئی بھی زیرک انسان اس میں تدبر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور حد اعجاز تک پہنچنے میں شک نہیں کرسکتا۔ کیا آپ نے رب تعالیٰ کے اس قول پر تدبر نہیں کیا جس میں عربوں کو چیلنج کیا ہے کہ اگر تمہیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا ہے تو لاؤ اس کی مثل کوئی ایک چھوٹی سی سورت۔ اللہ کریم نے ان کا شک دور نہیں کیا بلکہ وہ راستہ بتایا جس کے ذریعے ان کا شک زائل ہو جائے، اور وہ طریقہ یہی ہے کی اس کی مثل کوئی چھوٹی سی سورت لاؤ اور یہ بھی کہا کہ اپنی ساری کی ساری علمی طاقت صرف کرو اور جب وہ اس کی مثل لانے سے عاجز آجائیں گے تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں نہ تو شک وشبہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی یہ محل شک ہے۔

لا ریب فیہ کے متعلق بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام مجید میں متقین کے لئے شک وشبہ نہیں صورت میں ھُدیً اس ضمیر مجرور متصل سے حال ہے جو کہ فِیہ میں ہے اور اس حال کا عامل وہ منفی (ریب) کی صفت واقع ہو رہی ہے (اس صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی

لَا رَیبَ کَائِنًا فِیہ ھدیً لِلمتقِین

رَیبَ میں رابنی الشی کا مصدر ہے جس کا مطلب ہے کہ اس چیز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اور پریشان کر دیا۔ کیونکہ ریب کا معنی ہے نفس کا مضطرب اور پریشان ہونا اسی لئے ریب کو شک کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اطمینان کو زائل اور نفس کو پریشان کر دیتا ہے۔ اور حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ تو اس چیز کو چھوڑ دے جو تجھے پریشان کرتی ہے۔ اور وہ کام کر جو تجھے اضطراب میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ شک صرف اور صرف بے چینی اور پریشانی ہے جبکہ سچ اطمینان اور سکون ہے حادثات زمانہ اور مصیبتیں بھی انسان کو پریشان کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کو ریب الزماں کہا جاتا ہے۔

متن:

هُدیً لِلْمُتَّقِینَ

یهدیهم إلی الحق، والهدی فی الاصل مصدر كالسری والتقی ومعناه الدلالة.

وقیل: الدلالة الموصلة إلی البغیة لأنه جعل مقابل الضلالة فی قوله تعالی: اِنَّآ اَوْ اِیَّاکُمْ لَعَلٰی هُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ولأنه لا یقال مهدی إلا لمن اهتدی إلی المطلوب.

واختصاصه بالمتقین لأنهم المهتدون به والمنتفعون بنصه، وإن كانت دلالته عامة

لكل ناظر من مسلم أو كافر وبهذا الاعتبار قال تعالى: هُدًى لِلنَّاسِ. أو لأنه لا ينتفع بالتأمل فيه إلا من صقل العقل واستعمله فى تدبر الآيات والنظر فى المعجزات، وتعرف النبوات، لأنه كالغذاء الصالح لحفظ الصحة فإنه لا يجلب نفعًا ما لم تكن الصحة حاصلة، وإليه أشار بقوله تعالى: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَساراً. ولا يقدح ما فيه من المجمل والمتشابه فى كونه هدى لما لم ينفك عن بيان يعين المراد منه.

والمتقى اسم فاعل من قولهم وقاه فاتقى. والوقاية: فرط الصيانة. وهو فى عرف الشرع اسم لمن يقى نفسه مما يضره فى الآخرة، وله ثلاث مراتب:

الاولى: التوقى من العذاب المخلد بالتبرى من الشرك وعليه قوله تعالى: وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى.

الثانية: التجنب عن كل ما يؤثم من فعل أو ترك حتى الصغائر عند قوم وهو المتعارف باسم التقوى فى الشرع، وهو المعني بقوله تعالى: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا.

الثالثة: أن يتنزه عما يشغل سره عن الحق ويتبتل إليه بشراشره وهو التقوى الحقيقى المطلوب بقوله تعالى: يا اَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وقد فسر قوله: هُدًى لِلْمُتَّقِينَ هاهنا على الاوجه الثلاثة.

ترجمہ:

(ہدایت ہے ڈر والوں کو)

یہ کتاب رہنما الی الحق ہے، الھدیٰ اصل میں مصدر ہے اور اس کا مطلب رہنمائی کرنا یا منزل مقصود تک پہنچانا ہے۔ جیسا کہ سریٰ (رات کا سفر) اور التُقیٰ (بہت زیادہ پرہیز گار) اس کا یہ معنیٰ اسلئے کیا گیا ہے کیونکہ یہ کلام اللہ میں ضلال کے معنی میں آتا ہے۔ جس کا معنی سیدھے راستہ سے بھٹکنا ہے۔ کہ اللہ کریم کا فرمان ہے،

اِنّك لعلى هدىً اوفى ضَلالٍ مبين

اور اسی لئے وہ شخص جو منزل مقصود تک پہنچائے اس کو مھدی کہا جاتا ہے۔ اور قرآن پاک کو متقین کی ہدایت کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہی لوگ فائدہ اور ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ اور وہی لوگ اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے اور اس کی عظمت و کبریائی پر قائم کردہ دلائل سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ قرآن کی رہنمائی عام ہے لیکن ہدایت اس کو ملے گی

جو غور و فکر کرے گا چاہے وہ کافر ہو یا مسلم، اسی لئے قرآن میں فرمان مذکور ہے۔ هدی اللناس (تمام لوگوں کے لئے ہدایت) اور ہدایت کو متقین کے ساتھ خاص کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں تدبر کر کے وہی لوگ نفع حاصل کرتے ہیں جو گناہوں کی گندگی سے اپنے عقل کو پاک رکھتے ہیں اور معجزات میں غور و فکر کر کے نبوت اور دلائل نبوت کو پہچاننے کے لئے استعمال کیا ہو۔ کیونکہ قرآن پاک کی مثال ایسی ہی ہے جیسے صحت کے لئے اچھی خوراک کی، کہ صحت مند آدمی اچھی غذا سے صحیح فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس کی دلیل اللہ کریم کا قول،

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَاراً.

ہم قرآن نازل فرما رہے ہیں جو مومنین کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کے لئے خسارہ کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا۔

اور بعض آیات کا مجمل اور متشابہ ہونا، حصول ہدایت میں خلل کا باعث نہیں کیونکہ وہ معلوم المراد ہوتی ہیں اور اپنے معنی کی وضاحت سے خالی نہیں ہوتیں۔

المتقی مشتق ہے عربوں کے اس قول وقاہُ فاتقیٰ سے، اور یہ واحد مذکر اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے اس نے اس کو بچایا تو وہ بچ گیا۔ اور اگر وقایۃ کا معنی خطرناک چیز سے انتہائی کوشش کے بعد بچنا ہو تو متقی کا معنی یہ ہوگا کہ نقصان دہ اشیاء سے بچنے کے بھرپور کوشش کرنے والا۔ عرف شرع میں یہ نام اس آدمی کا ہے جو آخرت میں نقصان پہنچانے والی ہر چیز سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان کا شرک سے براءت حاصل کرنا اور توحید پر یقین رکھنا اللہ تعالیٰ کے قول کا یہی معنی ہے۔ والزمهم كلمة التقوىٰ کہ اس نے ان کے لئے تقوی کا کلمہ لازم کر دیا مطلب یہ کہ جس نے کلمہ طیبہ کا اقرار کیا وہ دائمی عذاب سے بچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ انسان ہر ایسے کام کو بجالانے سے بچے جس کی وجہ سے گنہگار ہو اور بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ وہ صغائر (چھوٹے گناہ) سے بھی بچے اور یہی معنی اصطلاح شریعت میں ہے۔ اور کلام اللہ بھی اسی کے ہم معنی ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا. لمثوبة من عند الله خير۔

(اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ان کے لئے اللہ کریم کی طرف سے بہت ہی ثواب ہوتا۔)

اور تیسرا درجہ یہ کہ انسان ایسی چیزوں سے بچے کہ جو اس کے باطن کو ذکر اللہ سے غافل کر دیں۔ اور تقوٰی کا یہی حقیقی درجہ ہے کہ بندہ اللہ کریم کی ذات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائے۔ اور اللہ کریم کے قول سے بھی یہی مراد ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ۔

(اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔

یہاں پر هُدًى لِلْمُتَّقِينَ
کی تفسیر بھی انہی تین طریقوں پر کی جائے گی۔

متن:

واعلم أن الآية تحتمل أوجهاً من الإعراب: أن يكون الم مبتدأ على أنه اسم للقرآن. أو السورة. أو مقدر بالمؤلف منها. وذلك خبره وإن كان أخص من المؤلف مطلقاً. والاصل أن الاخص لا يحمل على الاعم لأن المراد به المؤلف الكامل فى تأليفه البالغ أقصى درجات الفصاحة ومراتب البلاغة والكتاب صفة ذلك.

وأن يكون الم خبر مبتدأ محذوف وذٰلِكَ خبراً ثانياً. أو بدلاً والْكِتابُ صفته ولا رَيْبَ فى المشهورة مبني لتضمنه معنى من منصوب المحل على أنه اسم لا النافية للجنس العاملة عمل إنّ لأنها نقيضتها ولازمة للأسماء لزومها. وفى قراءة أبي الشعثاء مرفوع بلا التى بمعنى ليس وفيه خبره ولم يقدم كما قدم فى قوله تعالى: لَا فِيهَا غَوْلٌ لأنه لم يقصد تخصيص نفي الريب به من بين سائر الكتب كما قصد ثمة. أو صفته وللمتقين خبره. وهدى نصب على الحال. أو الخبر محذوف كما فى لا ضَيْرَ. فلذلك وقف على لَا رَيْبَ. على أن فيه خبر هدى قدم عليه لتنكيره والتقدير: لا ريب فيه. فيه هدى وأن يكون ذلك مبتدأ والْكِتابُ خبره على معنى: أنه الكتاب الكامل الذى يستأهل أن يسمى كتاباً. أو صفته وما بعده خبره والجملة خبر الم.

ترجمہ:

تو جان لے کہ یہ آیات ترکیب کے مختلف احتمال رکھتی ہے، پہلا یہ کہ الم مبتداء اور ذالک موصوف اور الکتاب اس کی صفت ہے موصوف صفت مل کر خبر، مبتداء اور خبر مل کر جملہ اسمیہ خبریہ اس صورت میں الم سے مراد یا تو سورتیں ہونگی یا پھر قرآن یا المولف من جنس ھزہ الحروف مراد ہوگا۔ اور اگر الم سے المولف من جنس ھذہ الحروف لیا جائے تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوگا الٓم بمعنی المولف من جنس ھذہ الحروف عام مطلق ہے اور ذالک الکتاب اخص مطلق ہے اور قاعدہ کے مطابق خاص مطلق کو عام مطلق پر محمول کرنا جائز نہیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ المولف من جنس ھذہ الحروف سے مراد عام کلام نہیں بلکہ وہ کلام ہے جو اپنی تالیف وتراکیب میں کامل اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہے۔ جس نے عربوں کو اپنے مقابلہ میں کلام لانے سے عاجز کر دیا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ الم مبتداء خبر ہے مبتداء محذوف کی۔ جو ھذا ہے اور ذالک اسم اشارہ موصوف الکتاب مشار الیہ صفت ہے، موصوف اور صفت مل کر اس کی خبر ثانی ہے اور یا الم سے بدل ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہوگا جب الم سے مراد قرآن یا سورت ہو تو اصل عبارت یوں ہوگی۔

هذا الٓمٓ ذٰلك الكتٰب

اور اگر الم سے مراد المولف من جنس هذه الحروف لیا جائے تو اس کا مبتدا المتحدی به من جنس هذه الحروف ہو گا اور الٓمٓ اس کی خبر ہوگی۔

ریب کا لفظ مشہور قرات میں لائے نفی جنس کا اسم ہے یہ نکرہ مفرد مبنی بر فتحہ ہے کیونکہ یہ اپنے ضمن میں من استغراقیہ کا معنی لئے ہوئے ہے اور بوجہ اسم لائے نفی جنس ہونے کے یہ منصوب المحل ہے۔ اور بھی حروف مشبہ بالفعل والا عمل کرتا ہے۔ یعنی اس کا اسم منصوب خبر مرفوع ہوتی ہے۔ اور یہ اِن کی ضد ہے کیونکہ لا کسی چیز کی جنس کی نفی کے لئے آتا ہے۔ جبکہ اِن کسی چیز کے ثبوت کے تحقق کے لئے آتا ہے۔ جس طرح اِن کا دو اسموں پر داخل ہونا لازمی ہوتا ہے اسی اس کا دخول بھی دو اسموں پر ہی ہوتا ہے۔

اور تابعین سے ابی شعثاء کی قرات کے مطابق لا بمعنی لیس ہے اور یہ اپنے اسم ریب کو رفع دیتا ہے اور فیہ اس کی خبر ہے۔

اس جملہ میں لا کی خبر کو اسم پر مقدم نہیں کیا گیا مثلاً لا فیھا غول میں فیھا کو مقدم کیا گیا ہے اور اس کا معنی ہے جنت کی شراب میں مدہوش کرنا نہیں۔ اس کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جنت کی شراب سے غیلان کی نفی اسی کے ساتھ خاص ہے جب کہ یہاں ریب کی نفی صرف قرآن کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سارے کا سارا کلام اللہ شک وشبہ سے بالاتر ہے اگر لفظ ریب سے خبر مقدم ہوتی تو ریب کی نفی صرف اسی کتاب مقدس کے ساتھ خاص ہو جاتی جو کہ خلاف مقصود ہے کیونکہ خبر کا مقدم ہونا تخصیص پر دلالت کرتا ہے۔ یا فیہ اپنے متعلق کائناً کے ساتھ مل کر ریب کی صفت ہے اور للمتقین خبرِ لا ہے۔ اور ھدیً بمعنی ھادی ہے اور اس میں فیہ محذوف ہے اس عبارت کچھ یوں ہے۔

لا ریب فيه. فيه هدىً للمتقين

تھا، اسی وجہ سے اس صورت میں لا ریب پر وقف تام ہوگا جیسا کہ لا ضمیر میں اور جب ھدیً کو مبتدا بنایا جائے اور اس کی خبر فیہ میں محذوف نکالی جائے یعنی عبارت اس طرح ہو۔

فيه هدى للمتقين

تو خبر کو مقدم کرنے کی وجہ، ھدیً کا نکرہ ہونا ہے۔ عبارت اصل میں کچھ یوں تھی،

لا ريب فيه. فيه هدىً للمتقين.

متن:

والاولى أن يقال إنها أربع جمل متناسقة تقرر اللاحقة منها السابقة ولذلك لم

يدخل العاطف بينها. ف الم، جملة دلت على أن المتحدى به هو المؤلف من جنس ما يركبون منه كلامهم، وذٰلِكَ الْكِتَابُ جملة ثانية مقررة لجهة التحدى، ولا رَيْبَ فِيهِ، جملة ثالثة تشهد على كماله بأن الكتاب المنعوت بغاية الكمال إذ لا كمال أعلى مما للحق واليقين، وهُدًى لِلْمُتَّقِينَ، بما يقدر له مبتدأ جملة رابعة تؤكد كونه حقاً لا يحوم الشك حوله بأنه هُدًى لِلْمُتَّقِينَ، أو تستتبع السابقة منها اللاحقة استتباع الدليل للمدلول، وبيانه أنه لما نبه أولاً على إعجاز المتحدى به من حيث أنه من جنس كلامهم وقد عجزوا عن معارضته، استنتج منه أنه الكتاب البالغ حد الكمال واستلزم ذلك أن لا يتشبث الريب بأطرافه إذ لا أنقص مما يعتريه الشك والشبهة، وما كان كذلك كان لا محالة هُدًى لِلْمُتَّقِينَ، وفى كل واحدة منها نكتة ذات جزالة ففى الاولى الحذف والرمز إلى المقصود مع التعليل، وفى الثانية فخامة التعريف، وفى الثالثة تأخير الظرف حذرا عن إيهام الباطل، وفى الرابعة الحذف والتوصيف بالمصدر للمبالغة وإيراده منكراً للتعظيم وتخصيص الهُدى بالمتقين باعتبار الغاية تسمية المشارف للتقوى متقياً إيجازاً وتفخيما لشأنه.

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ زیادہ مناسب یہی ہے کہ اس آیت میں ترکیبی احتمالات کے علیحدہ علیحدہ چار جملے بنائے جائیں۔ اور یہی قرآن کا مزاج ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ان کو علیحدہ علیحدہ چار جملے بنایا جائے تو پہلا جمہ موکد، دوسرا تاکید ہوگا، یا پہلا جملہ دلیل اور دوسرا مدلول ہوگا۔ ان جملوں کا آپس میں گہرہ تعلق ہے اور تغایر نہیں اسی لئے ان کے درمیان حرف عطف مذکور نہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ پہلا جملہ یعنی الٓمّ اپنی خبر محذوف یا مبتداء محذوف کے ساتھ مل کر قرآن کریم کے اعجاز پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کی فصاحت و بلاغت کا مظہر ہے۔ کیونکہ ان کلمات کو سورتوں کو آغاز میں ذکر کیا گیا اس کا مقصد یہ تھا کہ جس کلام کے کے مقابلے میں کلام لانے چیلنج کیا گیا ہے وہ کلام اسی قسم کے کلموں، جملوں اور ترکیبوں سے مرکب ہے۔ جن سے وہ اپنا کلام مرکب کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود بھی وہ ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز آ گئے اور چھوٹی سی سورت بھی نہ لا سکے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ اور ذالک الکتاب نے قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت پر تصدیق کی مہر لگا دی۔ کیونکہ اس میں مبتداء اور خبر معرفہ ہیں اور ان کا معرفہ ہونا ان کے مدلول کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔ تو لاریب فیہ کے جملہ نے ثابت کر دیا کہ اس کلام میں شک وشبہ کی گنجائش تک نہیں۔

تو مطلب یہ ہوا کہ اس کلام سے جنسِ شک کی نفی ہو گئی اور شک کا نہ ہونا حق ہونے کو مستلزم ہے۔ لہٰذا اس پر یقین کرنا لازم

ہے اور ھدیً للمتقین نے بیان کیا کہ متقین کے لئے باعث ہدایت ہے۔ یا پہلا جملہ پیچھے والے جملے کو اپنے پیچھے اسی طرح لاتا ہے جیسے دلیل کے بعد مدلول اسکو کچھ ایسے سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ کریم نے متحدی بہ کے اعجاز پر آگاہ فرمایا کہ یہ وہی کلام ہے جو ان کے کلام کی جنس سے مرکب ہے تو وہ اس کی مثل لانے سے عاجز آگئے تو اس سے نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ قرآن پاک ایسی عظیم کتاب ہے جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے اور شک وشبہ اس کے قریب واطراف میں پھٹک نہیں سکتا۔ کیونکہ جس کلام میں شک وشبہ کی گنجائش ہو، وہ کلام ناقص ہوتا ہے۔ اور جو کلام شک وشبہ سے خالی ہو، وہ لازماً متقین کے لئے ھدایت ہوگا۔

نیز ان چاروں جملوں میں سے ہر جملہ میں ایک عظیم نکتہ ہے جس کے اندر کئی نکتے پوشیدہ ہیں مثال کے طور پر پہلے جملے میں مبتداء یا خبر محذوف ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی وحی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ علت بھی بیان کر رہا ہے کہ دوسرے جملہ میں مبتداء اور خبر معرفہ ہیں جو اس کلام کی عظمت و کمال پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ جب مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو وہ اپنے مدلول کے کمال اور تخصیص کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور تیسرے جملہ میں جو خبر ہے "فیہ" اس کو اسم سے موخر کیا گیا تا کہ اس امر پر دلالت کرے کہ کلام اللہ میں کسی قسم کا باطل وہم نہیں گزر سکتا۔ اور چوتھے جملے میں مبتداء یا خبر محذوف ہے اور ھدیً مصدر کو اسم فاعل کے معنیٰ میں ذکر کر کے مبالغہ کا اظہار بھی ہے۔ اور مبتدا کا نکرہ ہونا کلام کی عظمت پر دال ہے۔ کیونکہ نکرہ کا کام ہی مدلول کی شان ظاہر کرنا ہے اور متقین کے ساتھ ہدایت کا مخصوص ہونا، اسی آخری درجہ کے اعتبار سے ہے کہ متقین کا آخری درجہ تقویٰ ہی ہے اس لئے وہ اس کی ہدایت سے نفع حاصل کرتے ہیں نیز اس جملہ میں ایسے لوگوں کو متقین کہا گیا ہے جو تقوٰی کے راستے پر چلتے ہیں، ابھی متقی نہیں۔ اس میں ان کی بلند شان کو بیان کرنا ہے اور کلام میں اختصار بھی ہے۔

ذالک کی تحقیق:

(ذا) ہاں ھذا میں ذا کا لفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ ھذہ وھذی وھاتا۔ ان میں سے صرف ھاتا کا تثنیہ ھاتانِ آتا ہے۔ ھذہ اور ھذی کا تثنیہ استعمال نہیں ہوتا قرآن میں ہے:

اَرَاَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ (سورۃ الاسراء آیت نمبر 62)

کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ (سورۃ ق آیت نمبر 53)

یہ ہے وہ جس کا تم وعدہ دیئے جاتے ہو۔

هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (سورۃ الذاریات آیت نمبر 14)

یہ وہی ہے جس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 63)

کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (سورۃ الطور آیت نمبر 14)

یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ (سورۃ الرحمٰن آیت نمبر 43)

یہ ہے وہ جہنم جسے مجرم جھٹلاتے ہیں۔

ذاک اور ذالک میں فرق:

ھذا کے بالمقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔ اس کے لئے ذاک اور ذالک استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا،

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 1-2)

وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن)۔

ذٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ (سورۃ الکھف آیت نمبر 17)

یہ اللہ کی نشانیوں سے ہے۔

یہ اس لئے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ہلاک کر دے۔

کتاب کا معنیٰ:

(ک ت ب) الکتب۔ (book)

الکتاب اصل میں مصدر ہے اور پھر مکتوب فیہ (یعنی جس چیز میں لکھا گیا ہو) کو کتاب کہا جانے لگا ہے دراصل الکتاب اس صحیفہ کو کہتے ہیں جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ:

يَسْئَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ (سورۃ النساء آیت نمبر 153)

اے محبوب اہل کتاب تم سے سوال کرتے ہیں کہ ان پر آسمان سے ایک کتاب اتاردو۔

اس میں ،، کتاب،، سے وہ صحیفہ مراد ہے جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔

حرفِ لا کے معانی واقسام:

لاریب

میں (حرف) لا یہ کبھی عدم محض کے لئے آتا ہے۔ جیسے: زید لا عالم یعنی زید جاہل ہے اور کبھی نفی کے لئے ہوتا ہے۔ اور اسم وفعل دونوں کے ساتھ ازمنہ ثلاثہ میں نفی کے معنی دیتا ہے لیکن جب زمانہ ماضی میں نفی کے لئے ہو تو یا تو اس کے بعد فعل کو ذکر

ہی نہیں کیا جاتا مثلاً اگر کوئی ھل خرجت کہے تو اس کے جواب میں صرف لا کہہ دینا کافی ہے یعنی لا خرجت اور اگر نفی فعل مذکور بھی ہوتا ہے تو شاذ و نادر اور وہ بھی اس وقت جب لا اور فعل کے درمیان کوئی فاعل آجائے۔ جیسے،

لا رجل ضربت ولا امرءة

(2) جب اس پر دوسرے فعل کا عطف ہو جیسے۔ لا خرجت و لا ضربت

اور یا،

(3) لا مکرر ہو جیسے:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى (سورة القیامۃ آیت نمبر 31)

تو اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی۔

اور یا،

(4) جملہ دعائیہ میں جیسے لا کان (خدا کرے ایسا نہ ہو) لا افلح وہ کامیاب نہ ہوا وغیرہ۔ اور زمانہ مستقبل میں نفی کے متعلق فرمایا:

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ (سورۃ سبا آیت نمبر 3)

ذرّہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔

اور کبھی لا کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے اور کلام محذوف کی نفی کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (سورۃ یونس آیت نمبر 61)

اور تمہارے رب سے ذرّہ بھر کوئی چیز غائب نہیں زمین میں نہ آسمان میں۔

اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی بعض نے لا کو اسی معنی پر حمل کیا ہے۔

لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (سورۃ القیامۃ آیت نمبر ۱)

روزِ قیامت کی قسم یاد فرماتا ہوں۔

فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغْرِبِ (سورۃ المعارج آیت نمبر 40)

تو مجھے قسم ہے اس کی جو سب پوربوں سب پچھموں کا مالک ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (سورۃ النساء آیت نمبر 65)

تمہارے پروردگار کی قسم یہ مومن نہیں ہوں گے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 75)

تو مجھے قسم ہے ان جگہوں کی جہاں تارے ڈوبتے ہیں۔

اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے:

لا وابیك ابنته العامری

نہیں تیرے باپ کی قسم اے عامری کی بیٹی۔

غروب سے پہلے افطار:

اور مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر نے یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہو گیا ہے روزہ افطار کر دیا اس کے بعد سورج نکل آیا تو آپ نے فرمایا:

"لا نقضیه ما تجالفنا الاثم فیه"

اس میں بھی لا کلام محذوف کی نفی کے لئے ہے یعنی اس غلطی پر جب لوگوں نے کہا کہ آپ نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اس کی نفی کے لئے انہوں نے لا فرمایا۔ یعنی ہم گنہگار نہیں ہیں۔ اس کے بعد نقضیہ سے از سر نو جملہ شروع کیا ہے۔ اور کبھی یہ لا نہی کے لئے آتا ہے جیسے اللہ کریم نے فرمایا:

"لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 11)

اے ایمان والو نہ مرد مردوں سے ہنسیں۔

"وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 11)

اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

اور آیت: **"يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ"** (سورۃ الاعراف آیت نمبر 27)

اے آدم کی اولاد خبردار تمہیں شیطان فتنہ میں نہ ڈالے۔

اور نیز: **"لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ"** (سورۃ النمل آیت نمبر 18)

ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں۔

میں بھی لا نہی کے لئے ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 83)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لا نافیہ یعنی خبر ہے یعنی وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اسی طرح آیت کریمہ:

"وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 84)

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں کشت و خون نہیں کرو گے۔ میں بھی لا نفی پر محمول ہے اور فرمان باری تعالیٰ،

"مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ "(سورۃ النساء آیت نمبر 75)
تمہیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں نہیں لڑتے۔

میں ہوسکتا ہے کہ لاتقاتلون موضع حال میں ہو۔ اور معنی یہ ہوگا مالکم غیر مقاتلین یعنی تمہیں کیا ہوا اور درآنحالیکہ لڑنے والے نہیں ہو۔ اور لا کے بعد اسم نکرہ آجائے تو وہ مبنی برفتحہ ہوتا ہے اور لانفی کے معنی دیتا ہے جیسے فرمایا: نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے۔

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 197)
اور کبھی دو متضاد معنوں کے درمیان لامکرر آجاتا ہے۔ اور دونوں کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے:

لا زید بمقیم ولا ظاعن نہ زید مقیم
ہے اور نہ ہی مسافر یعنی کبھی مقیم ہے اور کبھی سفر پر اور کبھی متضاد مقصود ہوتا ہے جیسے، لیس ابیض ولا اسود سے مراد ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں کے درمیان ہے یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا رنگ ہو چنانچہ آیت کریمہ:

لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ (سورۃ النور آیت نمبر 35)
یعنی زیتون کی نہ مشرق کی طرف منسوب اور نہ مغرب کی طرف کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ بیک وقت مشرقی بھی ہے اور غربی بھی۔ اور بعض نے اس کا افراط اور تفریط سے محفوظ ہونا مراد لیا ہے۔ کبھی لا محض سلب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس سے ایک شے کی نفی کر کے دوسری کا اثبات مقصود نہیں ہوتا مثلاً لا انسان کہہ کر صرف انسانیت کی نفی کا قصد کیا جائے اور عامی محاورہ لاحد بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

ریب کی حقیقت:

(ر ی ب)(Doubt)

اور ریب کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی طرح کا وہم ہو مگر بعد میں اس توہم کا ازالہ ہوجائے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 23)
اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اتارا۔

ہدایت کیا ہے؟

(ہ د ی) الھدایتہ (Instruction)

کے معنی لطف وکرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں۔

چار طرف سے ہدایت:

انسان کو اللہ کریم نے چار طرف سے ہدایت عطا کی ہے۔

(1) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے کی ہے۔

اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 50)

کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی پھر راہ دکھائی۔

(2) دوسری قسم ہدایت

کی وہ ہے جو اللہ تعالٰی نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ تجارت کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ

آیت کریمہ:

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 73)

اور ہم نے انہیں امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلاتے ہیں۔

اس میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(3) سوم بمعنی توفیق

یہ خاص قسم ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (سورۃ محمد آیت نمبر 17)

اور جنہوں نے راہ پائی اللہ نے ان کی ہدایت اور زیادہ فرمائی۔

(4) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

سَیَهْدِیْهِمْ وَ یُصْلِحُ بَالَهُمْ (سورۃ محمد آیت نمبر 5)

(بلکہ) وہ انہیں (منزل) مقصود تک پہنچا دے گا۔

اور آیت کریمہ: وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 43)

اور ہم نے ان کے سینوں میں سے کینے کھینچ لئے۔

تقویٰ کی تعریف اور اصل معنیٰ:

التقوٰی (Fear of GOD, Piety)

اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقوی اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے اور اصطلاح شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقوی ہے جو گناہوں کا موجب ہو۔ اور یہ بات محظورات شرعیہ کے ترک کرنے سے حاصل ہوجاتی ہے مگر اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لئے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

الحلال بین واحرام بین ومن وقع حول الحمی فحقیق ان یقع فیه

کہ حلال بھی بیّن ہے اور حرام بھی بیّن ہے اور جو شخص چراگاہ کے اردگرد چرائے گا تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہوجائے (یعنی مشتبہ چیزیں اگرچہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں لیکن ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی چھوڑ دیا جائے) قرآن پاک میں ہے:

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سورۃ الاعراف آیت نمبر 35)

تو جو پرہیز گاری کرے اور سنورے تو اس پر نہ کچھ خوف اور نہ کچھ غم۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (سورۃ النحل آیت نمبر 128)

بیشک اللہ ان کے ساتھ ہے جو ڈرتے ہیں۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (سورۃ الزمر آیت نمبر 73)

اور جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ان کی سواریاں گروہ گروہ جنت کی طرف چلائے جائیں گی۔

پھر تقویٰ کے چونکہ بہت سے مدارج ہیں اس لئے آیات،

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 281)

اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھرو گے۔

واتَّقُوْا رَبَّكُمْ (سورۃ النساء آیت نمبر 1) اے لوگو اپنے رب سے ڈرو۔

اور ڈرو اس خدا سے جس کا نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو۔

اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (سورۃ آل عمران آیت نمبر 102)

اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔

میں ہر جگہ تقویٰ کا ایک خاص معنی مراد ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے اور بعد بیان ہوگی۔ اتقی فلان بکذا کے معنی کسی چیز کے ذریعہ بچاؤ حاصل کرنے کے ہیں۔ اور آیت:

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (سورۃ الزمر آیت نمبر 24)

تو کیا وہ جو قیامت کے دن برے عذاب کی ڈھال نہ پائے گا اپنے چہرے کے سوانجات والے کی طرح ہو جائے گا۔
میں اس عذاب شدید پر تنبیہ کی ہے جو قیامت کے دن ان پر نازل ہوگا اور یہ کہ سب سے بڑی چیز جس کے ذریعہ وہ عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے وہ ان کے چہرے ہی ہوں گے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا:

وَتَغْشٰى وُجُوهَهُمُ النَّارُ (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 50)
اور ان کے چہرے آگ ڈھانپ لے گی۔

يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ (سورۃ القمر آیت نمبر 48)
جس دن آگ میں اپنے مونہوں پر گھسیٹے جائیں گے۔

[سورة البقرة (2) : آية 3]

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ وَمِمَّا رَزَقْناهُمْ يُنْفِقُونَ (3)

ترجمہ:

”وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں اور نماز قائم رکھیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں“۔

متن:

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ إما موصول بالمتقين على أنه صفة مجرورة مقيدة له إن فسر التقوى بترك ما لا ينبغي مترتبة عليه ترتيب التحلية على التخلية، والتصوير على التصقيل. أو موضحة إن فسر بما يعم فعل الحسنات وترك السيئات لاشتماله على ما هو أصل الاعمال وأساس الحسنات من الإيمان والصلاة والصدقة، فإنها أمهات الاعمال النفسانية والعبادات البدنية والمالية المستتبعة لسائر الطاعات والتجنب عن المعاصي غالباً، ألا ترى إلى قوله تعالى: إِنَّ الصَّلاةَ تَنْهى عَنِ الْفَحْشاءِ وَالْمُنْكَرِ.

وقوله عليه الصلاة والسلام

الصلاة عماد الدين، والزكاة قنطرة الإسلام

أو مسوقة للمدح بما تضمنه المتقين، وتخصيص الإيمان بالغيب وإقامة الصلاة وإيتاء الزكاة بالذكر إظهار لفضلها على سائر ما يدخل تحت اسم التقوى. أو على أنه مدح منصوب، أو مرفوع بتقدير أعني أو هم الذين. وإما مفصول عنه مرفوع بالابتداء

وخبره أولئك على هدى، فيكون الوقف على المتقين تاماً.

ترجمہ:

اعراب میں یہ آیت یا تو متقین کے ساتھ متصل ہے یعنی اعراب میں اس کے تابع ہے تو اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر متقین کی صفت مقیدہ مجرورہ ہوگی اس شرط پر کہ تقوی کا معنی ایسے کاموں کو ترک کرنا ہو جو کہ مناسب نہ ہوں، اس صورت میں تقوی پر ایمان بالغیب اس طرح مرتب ہوگا جس طرح کسی چیز کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر کے نقش و نگار سے مزین کیا جاتا ہے یا پھر کسی چیز کو صیقل کر کے تصویر بنائی جاتی ہے۔ اور تقوی کا یہ معنیٰ لیا جائے کہ نیکی اختیار کرنا اور برائی کو چھوڑنا تو اس صورت میں یہ صفت موضحہ ہوگی۔ کیونکہ الذین یومنون ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو اعمال کی اصل اور بنیاد ہیں اور یہ عبادات اپنے پیچھے عموماً باقی تمام اطاعتوں کو عملی جامہ پہنانے اور تمام گناہوں سے بچنے کو لاتے ہیں کیا آپ اللہ کے اس فرمان کو ملاحظہ نہیں کرتے؟

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ.

کہ بے شک نماز تمام برائیوں اور ناپسندیدہ اعمال سے روکتی ہے اور حدیث پاک ہے،

الصلاة عماد الدين، والزكاة قنطرة الإسلام

نماز دین کا ستون، اور زکوٰۃ اسلام کا پل ہے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ یا یہ متقین کی صفت مادحہ ہوگی اور ان صفات کو بیان کر رہی ہے جن کو متقین اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں اور غیب پر ایمان، نماز کا قائم کرنا اور زکوٰہ ادا کرنے کے ساتھ خاص کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام اعمال کی فضیلت ظاہر ہو جو تقوی کے معنیٰ میں آتے ہیں۔

یا پھر یہ صفت ہے اپنے ماقبل کی لیکن یہ بطور مدح محل نصب میں ہے اور اس صورت میں اس سے پہلے اَعنی فعل محذوف ہوگا۔ اور یہ آیت اس کا مفعول ہوگی یا ھم ضمیر اس سے پہلے مبتداء محذوف ہوگا جس کی وجہ سے یہ مرفوع ہے اور یہ اس کی خبر، دونوں صورتوں میں اصل عبارت یوں ہوگی۔

اعنی الذین یومنون... الخ   یا ھم الذین یومنون... الخ

یا یہ اعراب میں اسکے تابع نہیں ہوگی اور اعراب میں متقین سے جدا ہوگی۔ اور یہ ایک علیحدہ جملہ ہوگا، اس صورت میں اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہوگا اور مرفوع ہوگا۔ اور اُولٰئک علیٰ ھدیً اسکی خبر ہوگی۔ اس صورت میں متقین پر وقف تام ہوگا۔

متن:

والإيمان في اللغة عبارة عن التصديق مأخوذ من الامن، كأن المصدّق أمن المصدّق

من التكذيب والمخالفة، وتعديته بالباء لتضمنه معنى الاعتراف وقد يطلق بمعنى الوثوق من حيث إن الواثق بالشيء صار ذا أمن منه، ومنه ما أمنت أن أجد صحابة وكلا الوجهين حسن فى يؤمنون بالغيب.

وأما فى الشرع: فالتصديق بما علم بالضرورة أنه من دين محمد صلّى الله عليه وسلّم كالتوحيد والنبوة والبعث والجزاء، ومجموع ثلاثة أمور: اعتقاد الحق، والإقرار به، والعمل بمقتضاه عند جمهور المحدثين والمعتزلة والخوارج.

فمن أخل بالاعتقاد وحده فهو منافق، ومن أخل بالإقرار فكافر، ومن أخل بالعمل ففاسق وفاقاً، وكافر عند الخوارج، وخارج عن الإيمان غير داخل فى الكفر عند المعتزلة، والذى يدل على أنه التصديق وحده أنه سبحانه وتعالى أضاف الإيمان إلى القلب فقال: أُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ، وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ، وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ، وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ، وعطف عليه العمل الصالح فى مواضع لا تحصى وقرنه بالمعاصى فقال تعالى: وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ مع ما فيه من قلة التغيير فإنه أقرب إلى الاصل وهو متعين الإرادة فى الآية، إذ المعدى بالباء هو التصديق وفاقاً. ثم اختلف فى أن مجرد التصديق بالقلب هل هو كاف لأنه المقصود أم لا بد من انضمام الإقرار به للمتمكن منه، ولعل الحق هو الثانى لأنه تعالى ذم المعاند أكثر من ذم الجاهل المقصر، وللمانع أن يجعل الذم للإنكار لا لعدم الإقرار للمتمكن منه.

ترجمہ:

ایمان امن سے ماخوذ ہے اواس کا معنیٰ ہے تصدیق کرنا اواس کا امن میں ہونا اور ایمان کا مطلب محفوظ کرنا ہے۔ امن میں کرنا ہے۔ گویا کہ تصدیق کرنے والا جس کی تصدیق کر رہا ہے، اس کو تکذیب اور مخالفت سے محفوظ کر رہا ہے۔ اور اس حرف جر ب کے ساتھ متعدی ہونا اپنے ضمن میں اعتراف کا معنیٰ لیے ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور کبھی اعتماد اور وثوق پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ اعتماد کرنے والا امن میں ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے

ما امنت ان اجد صحابةً

کہ مجھے اعتماد نہیں کی اپنے ساتھیوں کو پالوں گا اور یہ دونوں معانی یومنون بالغیب میں جائز ہیں۔ یعنی اعتماد و اعتراف

مطلب وہ غیب کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی اعتماد کرتے ہیں کہ یہ حق ہے۔ اور اصطلاح شرح میں اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہر اس چیز کی تصدیق کرنا جس کا علم بالبداہت ہو جائے کہ یہ دین مصطفیٰ ﷺ سے ہے جیسا کہ تصدیق کرنا توحید، نبوت، قبروں سے اٹھنے اور سزا و جزا کے برحق ہونے کی۔ محدثین، معتزلہ اور خوارج کے نزدیک ایمان تین امور کے مجموعے کا نام ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔

1۔ حق کا یقین کرنا

2۔ زبان سے اس کا اقرار کرنا

3۔ اور اس کے تقاضے کے مطابق عمل کرنا۔

اور وہ آدمی منافق ہے جو حق کے عقیدہ میں گڑ بڑ کرے اور وہ آدمی کافر ہوگا جو زبان کے ساتھ اقرار نہیں کرے گا۔ اور فاسق وہ ہوگا جو تصدیق اور اقرار پر عمل نہ کرے۔ البتہ ایسا آدمی خوارج کے نزدیک کافر ہوگا۔ اور معتزلہ کے نزدیک ایمان سے خارج لیکن کافر نہیں کیونکہ محققین تصدیق قلبی کو ایمان کہتے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں ایمان کی نسبت قلب کی طرف کی ہے۔ ان میں سے ایک آیت کا معنیٰ ہے کہ

اللہ کریم نے ان کے دلوں میں ایمان کو ثابت کر دیا۔

دوسری جگہ فرمایا، جس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو وہ، وہ مومن ہے۔

تیسری آیت کا مفہوم، منافق ہے وہ جس کا دل مومن نہیں۔

اور چوتھی آیت کا مفہوم ہے ایمان ابھی تک ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اور مزید یہ کہ متعدد مقامات پر عمل صالح کا ایمان پر عطف ڈالا ہے، اور کئی مقامات پر گنہگار کو بھی مومن کہا گیا ہے۔ مفہوم آیت، اگر دو گروہِ مومنین آپس میں لڑ پڑیں۔ ایک اور مقام پر فرمایا، اے ایمان والو قتل میں تمہارے اوپر قصاص فرض ہے۔

مزید فرمایا، جو لوگ ایمان لائے اور ان کا ایمان ظلم کے ساتھ ملتبس نہیں ہوا۔

اور کبھی کبھی شرعی معنی مراد لینے کے لئے لغوی معنیٰ میں تھوڑی سی تبدیلی کی جاتی ہے۔ کیونکہ ایمان بمعنی تصدیق کرنا حقیقی معنٰی کے زیادہ قریب ہے اور اس آیت میں ایمان کو ب کے ساتھ متعدی کر کے اس کی مراد متعین کر دی گئی ہے کہ اس سے مراد قلب کی تصدیق ہی ہے جو کہ متفق معنی مرادی ہے۔ مزید ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ کیا تصدیق قلبی نجات کے لئے کافی ہے کیونکہ یہی مقصود ہے، یا اس آدمی کے لئے جو تصدیق قلبی کے ساتھ اقرار کر سکتا ہے، اس کے لئے اقرار باللسان ضروری ہے۔ شاید یہ دوسرا معنیٰ ہی برحق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے ایسے لوگوں کی جو حق جاننے کے باوجود اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ بنسبت اس آدمی کے جو کہ جاہل ہے اور قاصر من الاقرار ہے، اور جو لوگ اس کے منکر ہیں ان کا کہنا ہے کہ سرکش کی مذمت کرنا اس کے انکار کی وجہ سے ہے نہ کہ عدم اقرار کی وجہ سے۔

متن:

والغيب مصدر، وصف به للمبالغة كالشهادة فى قوله تعالى: عالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهادَةِ والعرب تسمى المطمئن من الارض والخمصة التى تلى الكلية غيباً. أو فيعل خفف كقيل، والمراد به الخفى الذى لا يدركه الحس ولا تقتضيه بديهة العقل، وهو قسمان: قسم لا دليل عليه وهو المعنى بقوله تعالى: وَعِنْدَهُ مَفاتِحُ الْغَيْبِ لاَ يَعْلَمُها اِلَّا هُوَ وقسم نصب موقع عليه دليل: كالصانع وصفاته واليوم الآخر وأحواله وهو المراد به فى هذه الآية. هٰذا إذا جعلته صلة للإيمان وأوقعته موقع المفعول به. وإن جعلته حالاً على تقدير ملتبسين بالغيب كان بمعنى الغيبة والخفاء. والمعنى أنهم يؤمنون غائبين عنكم لا كالمنافقين الذين إذا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوا قالُوا آمَنَّا. وَاِذا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قالُوا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّما نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ. أو عن المؤمن به لما روى أن ابن مسعود رضى الله تعالى عنه قال: والذى لا إله غيره ما آمن أحد أفضل من إيمان بغيب، ثم قرأ هذه الآية.

وقيل المراد بالغيب: القلب لأنه مُستور، والمعنى يؤمنون بقلوبهم لا كمن يَقُوْلُوْنَ بأفواههم مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ. فالباء على الاول للتعدية. وعلى الثانى للمصاحبة. وعلى الثالث للآلة.

ترجمہ:

اور غیب مصدر ہے اور اس کے ساتھ صفت مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ:

عٰلِمُ الغَیبِ وَالشَّھادَةِ

میں شہادت اسم فاعل، صفت کے معنیٰ میں ہے۔ اہل عرب پست زمین اور اس کے سوراخ، جو گردے کا پاس ہوتا ہے اس کو غیب کہتے ہیں یا یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے بروزن فَیعل کہ اصل میں غَیِیب تھا اور ایک یا کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا ہے جس طرح قَیل اصل میں قَیِیل تھا اس میں بھی ایک یا کو تخفیفاً حذف کیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ مخفی چیز ہے جس کا ادراک نہ تو حواس سے ہوسکتا ہے اور نہ ہی بداہت عقل اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اور غیب کی دو قسمیں ہیں

☆ پہلی قسم

وہ غیب جس کی کوئی بھی دلیل نہیں، اور اللہ کریم کے فرمان سے یہی مراد ہے

عنده مفاتح الغيب لا يعلمها الا هو

یعنی غیب کی چابیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا۔

☆ دوسری قسم

وہ غیب جس کا ثبوت عقلی یا نقلی دلیل پر ہو جیسے صانع، عالم اور اس کی صفات، یوم آخرت اور اس کے احوال ان سب پر دلائل قائم ہیں اور اس آیت سے یہی مراد ہیں اور یہ معنٰی اس وقت ہوگا جب با کو یومنون کا صلہ بنایا جائے گا اور اسے مفعول بہ کے قائم مقام رکھا جائے اور اگر با کو ملتسبین بالغیب کے معنٰی میں کر کے حال بنایا جائے تو غیب سے مراد خفا اور غیبوبۃ ہو گا تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں وہ اس حال میں ہیں کہ وہ تم سے غائب ہیں۔ وہ ان منافقوں کی طرح نہیں جو ایمان والوں سے ملتے ہیں تو ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور جب شیاطین جیسے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں یا وہ مومن یہ یعنی حضور نبی کریم ﷺ سے غیب ہونے کے باوجود آپ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اس صورت حال میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو صحابہ کرام کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا،

قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس شخص کے ایمان سے کسی کا ایمان افضل نہیں جو حضور ﷺ کے غیب ہونے کے باوجود ایمان لایا پھر یہ آیت تلاوت کی۔

الذین یومنون بالغیب۔

اور بعض نے کہا کہ غیب سے مراد دل ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے دلوں کے ساتھ تصدیق کرتے ہیں اور نہ ان لوگوں کی طرح اپنی زبان سے ایسی بات کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی۔ از روئے معنی اول با تعدیہ کے لئے ہوگی اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مصاحبت اور استعانت کے لئے اور تیسرے معنٰی کے اعتبار سے آلۃ کے لئے ہے۔

متن:

وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ أي يعدلون أركانها ويحفظونها من أن يقع زيغ في أفعالها، من أقام العود إذا قومه أو يواظبون عليها، من قامت السوق إذا نفقت وأقمتها إذا جعلتها نافقة قال:

أقامتْ غزالةُ سُوقَ الضِّراب ... لأهْلِ العِرَاقينِ حولاً قَمِيطا

فإنه إذا حوفظ عليها كانت كالنافق الذي يرغب فيه، وإذا ضيعت كانت كالكاسد المرغوب عنه، أو يتشمرون لأدائها من غير فتور ولا توان، من قولهم قام بالامر وأقامه إذا جد فيه وتجلد، وضده قعد عن الامر، وتقاعد. أو يؤدونها. عبر عن الاداء

بالإقامة لاشتمالها على القيام، كما عبر عنها بالقنوت والركوع والسجود والتسبيح. والاول أظهر لأنه أشهر وإلى الحقيقة أقرب، وأفيد لتضمنه التنبيه على أن الحقيق بالمدح من راعى حدودها الظاهرة من الفرائض والسنن، وحقوقها الباطنة من الخشوع والإقبال بقلبه على الله تعالى، لا المصلون الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلاتِهِمْ ساهُونَ، ولذلك ذكر فى سياق المدح والمقيمين الصلاة، وفى معرض الذم فويل للمصلين، والصلاة فعلة من صلى إذا دعا كالزكاة من زكى، كتبتا بالواو على لفظ المفخم، وإنما سمي الفعل المخصوص بها لاشتماله على الدعاء.

وقيل: أصل صلى حرك الصلوين لأن المصلى يفعله فى ركوعه وسجوده، واشتهار هٰذَا اللفظ فى المعنى الثانى مع عدم اشتهاره فى الاول لا يقدح فى نقله عنه، وإنما سمى الداعى مصلياً تشبيهاً له فى تخشعه بالراكع الساجد.

ترجمہ:

اور وہ نماز کو ارکان کے ساتھ بالکل ٹھیک طریقے اور اطمینان سے ادا کرتے ہیں۔ اور اس کے افعال کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے، اور مشتق ہوگا اقام العود اذا قومہ سے، اور اس کا معنیٰ ہوگا کہ اس نے لکڑی کو سیدھا کیا جب وہ اس کے ٹیڑھے پن کو دور کر کے اس کو سیدھا کر دے۔ یا یقیمون بمعنیٰ یواظبون علیھا ہے، اس صورت میں اس کا معنیٰ اقامت السوق سے مشتق ہوگا جس کا مطلب ہے رونق والا بازار۔ واقمتھا جب کہ تو اس کو بارونق بنا دے یعنی جب بازار میں سودا سلف ہو تو اس میں بیع و شرا بھی ہوگی اور اسی طرح نماز پر بھی مواظبت اختیار کی جائے تو اس میں رغبت کی جاتی ہے۔ اور جب نماز کو ضائع کیا جائے گا تو وہ بے رونق بازار کی طرح ہو جائے گی اور لوگ اس کی طرف رغبت نہیں کریں گے۔ ایمن ابن حزیم انصاری ایک شاعر کا قول ہے،

أقامتْ غزالةٌ سُوقَ الضُراب لأهْلِ العِرَاقينِ حولاً قَمِيطا

بصرہ اور کوفہ والوں کے لئے غزالہ نے پورا سال بازار جنگ گرم کئے رکھا۔ یقیمون بتشمرون لادائھا کے معنیٰ میں ہوگا تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ نماز، بغیر سستی و کاہلی کے ادا ہو۔ اور یہ قام بالامر و اقامہ سے مشتق ہوگا، یہ عربوں کا قول ہے جس کا معنی ہے کہ کسی کام کو پوری کوشش و قوت کے ساتھ کیا جائے اور اس کی ضد قعد عن الامر و تقاعد ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ کسی امر سے سست ہو کر بیٹھ گیا، یا یہ یودونھا کے معنیٰ میں ہوگا یعنی وہ لوگ نماز ادا کرتے ہیں چونکہ نماز قیام پر مشتمل ہوتی ہے اس وجہ سے اس اقامت الصلوٰۃ کے ساتھ تعبیر کیا گیا جس طرح کئی دوسری جگہوں پر نماز کو قنوت، رکوع، سجدہ اور تسبیح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

والاول أظهر لأنه أشهر

اور پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے یعنی یعدلون ارکانھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حقیقی اور مشہور معنی کے زیادہ قریب ہے اور دوسرے معانی کے مقابلہ میں زیادہ مفید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ضمن میں اس بات کو بطور تنبیہ لئے ہوئے ہے کہ درحقیقت مدح کے لائق وہی شخص ہے جو اس نماز کو ظاہری حدود یعنی سنتوں اور فرائض کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ اللہ کریم عزوجل کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ پیش آتا ہے نہ کہ وہ نمازی جو اپنی نماز سے غافل ہے۔ اسی لئے جہاں نمازیوں کی تعریف کرنا مقصود ہو، وہاں والمقیمین الصلوٰۃ لایا جاتا ہے، اور فویل للمصلین اس مقام پر لایا جاتا ہے جہاں جہاں نمازی کی مذمت بیان کرنا مقصود ہو۔

اور لفظ صلوٰۃ فعلۃ کے وزن پر ہے یہ مشتق ہے صلی سے جس کا معنیٰ ہے دعا کرنا جس طرح زکوٰۃ کا معنی پاک کرنا ہے۔ اور یہ بنا ہے زکاء سے اور ان دونوں کو واو کے ساتھ لکھا گیا ہے یعنی اس کا الف اس طرح لکھا گیا ہے جس طرح واو سے بدلا ہوا الف لکھا جاتا ہے کیونکہ ان کا مادہ اشتقاق یائی ہے، اس میں تفخیم ہونے کی وجہ سے، تفخیم کا مطلب یہ ہے کہ صلوٰۃ کے فتحہ لام کو اور زکوٰۃ کے فتحہ کاف کو مائل بضمہ پڑھا جائے۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب فتحہ کے بعد ایسا الف آئے جو واو سے بدلا ہوا ہو اور دعا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مخصوص ارکان کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ صلی کا لغوی معنی سرین کو حرکت دینا ہے۔ اسی لئے نمازی دوران رکوع وسجود سرین کو حرکت دیتا ہے۔ اور صلوٰۃ کا ارکان صلوٰۃ کے معنی میں مشہور ہونا اور حرک الصلوین میں مشہور نہ ہونا یہ اس کے منقول ہونے میں باعث عیب نہیں اور مصلی، دعا کرنے والے کو اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ خشوع وخضوع میں رکوع اور سجدہ کرنے والے کے مشابہ ہوتا ہے۔

متن:

وَمِمَّا رَزَقْناهُمْ يُنْفِقُونَ

الرزق في اللغة: الحظ قال تعالى: وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ. والعرف خصصه بتخصيص الشيء بالحيوان للانتفاع به وتمكينه منه.

وأما المعتزلة لما استحالوا على الله تعالى أن يمكن من الحرام لأنه منع من الانتفاع به وأمر بالزجر عنه، قالوا: الحرام ليس برزق، ألا ترى أنه تعالى أسند الرزق هاهنا إلى نفسه إيذاناً بأنهم ينفقون الحلال المطلق.

فإن إنفاق الحرام لا يوجب المدح، وذم المشركين على تحريم بعض ما رزقهم الله تعالى بقوله: قُلْ اَرَاَيْتُمْ مَّا اَنْزَلَ اللهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَراماً وَحَلاَلًا .

ترجمہ:

اور جو ہم نے انہیں رزق دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

رزق کا لغوی معنیٰ ہے حصہ۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ.

اور تم اپنا حصہ بناتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو، اور عرف نے کسی چیز کو حیوان کے ساتھ خاص کر دینے اور اس سے منفعت کی طاقت دینے کے ساتھ اس کو خاص کر دیا ہے اور جب معتزلہ نے اس کو ناممکن سمجھا کہ اللہ کریم کسی کو حرام پر قدرت دے کیونکہ اس نے اس سے فائدہ حاصل کرنے سے روک دیا ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ تو کہنے لگے کہ حرام اصل میں رزق ہی نہیں۔ توجہ طلب امر ہے کہ یہاں اللہ کریم نے رزق کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اس بات کو عام کرنے کے لئے کہ متقی وہ ہیں جو حلال مال خرچ کرتے ہیں کیونکہ حرام خرچ کرنے پر تعریف نہیں کی جاتی اور اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی مذمت اس لئے کی کہ جو رزق اللہ نے ان پر حلال کیا تھا، انہوں نے اپنے آپ پر حرام کر لیا۔ ارشاد باری تعالیٰ

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَّا أَنزَلَ اللهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَاماً وَحَلالًا

آپ فرمایئے کہ کیا تم نے خیال نہیں کیا کہ جو چیز اللہ کریم نے اپنے رزق سے تمہیں عطا کی تھی، اس میں تم نے حلال اور حرام بنا دیا۔

متن:

وأصحابنا جعلوا الإسناد للتعظيم والتحريض على الإنفاق، والذم لتحريم ما لم يحرم. واختصاص ما رزقناهم بالحلال للقرينة. وتمسكوا لشمول الرزق له بقوله صلّى الله عليه وسلّم في حديث عمرو بن قرة:

لقد رزقك الله طيباً فاخترت ما حرم الله عليك من رزقه مكان مَا أَحَلَّ الله لَكَ من حلاله

وبأنه لو لم يكن رزقاً لم يكن المتغذى به طول عمره مرزوقاً، وليس كذلك لقوله تعالى:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا.

ترجمہ:

ہمارے اصحاب (اشاعرہ) کا قول ہے کہ اللہ کریم کی عظمت کو ظاہر کرنے اور خرچ پر ابھارنے کے لئے رزق کی نسبت اس کی طرف کی گئی ہے۔ اور حلال چیزوں کو اپنے آپ پر حرام کرنے کی مذمت کے لئے کہ حلال کو حرام کر دیا۔ لہٰذا اس مقام پر

ما رزقنھم میں رزق کو حلال کے ساتھ خاص کرنے قرینہ کی وجہ سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آیت سیاق مدح میں ذکر کی گئی ہے اور اشاعرہ نے اپنے اس قول کہ رزق حرام بھی رزق ہی ہے، کو ثابت کرنے کہ لئے نبی کریم ﷺ کے مندرجہ ذیل فرمان کو اپنی دلیل بنایا ہے۔

بقوله صلّى الله عليه وسلّم في حديث عمرو بن قرة: "لقد رزقك الله طيباً فاخترت ما حرم الله عليك من رزقه مكان مَا اَحَلَّ الله لَكَ من حلاله"

عمر بن قرہ دف لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میری بدبختی غالب آ گئی ہے، اللہ کریم نے میرا رزق دف بجانے میں رکھا ہے لہٰذا مجھے اس کی اجازت دیجئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے حلال رزق عطا کیا تھا مگر تو نے حلال کو چھوڑ کر حرام کو اختیار کیا ہے، جو کہ تجھ پر حرام تھا۔ اور یہاں پر اہلسنت نے یہ استدلال کیا ہے کہ ایسا آدمی جس نے پوری زندگی رزق حرام کھایا، کیا وہ مرزوق نہیں حالانکہ ایسا نہیں، بوجہ فرمان باری تعالیٰ کے،

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا.

زمین پر چلنے والی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے مگر اس کا رزق اللہ پر ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کی ہر ذی روح چیز مرزوق ہے۔

متن:

وأنفق الشيء وأنفده أخوان، ولو استقريت الالفاظ وجدت كل ما فاؤه نون وعينه فاء دالاً على معنى الذهاب والخروج. والظاهر من هٰذا الإنفاق صرف المال في سبيل الخير من الفرض والنفل. ومن فسره بالزكاة ذكر أفضل أنواعه والاصل فيه، أو خصصه بها لاقترانه بما هو شقيقها. وتقديم المفعول للاهتمام به وللمحافظة على رؤوس الآي، وإدخال من التبعيضية عليه لمنع المكلف عن الإسراف المنهي عنه. ويحتمل أن يراد به الإنفاق من جميع المعاون التي أتاهم الله من النعم الظاهرة والباطنة، ويؤيده

قوله عليه الصلاة والسلام: «إن عِلماً لا يُقال به، ككنزٍ لا يُنفق منه»

وإليه ذهب من قال: ومما خصصناهم به من أنوار المعرفة يفيضون.

ترجمہ

انفق اور انفذ دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں اگر آپ تمام الفاظ میں استقراء کر لیں تو آپ ہر اس لفظ کو جس کاف اور ع کلمہ موافق پائیں گے اس کی دلالت ذہاب اور خروج کے معنیٰ میں ہو گی۔

یہاں ظاہری طور پر مَا رَزَقنهم الله سے مراد مال کو اچھائی کے کاموں پر خرچ کرنا ہے۔ خواہ وہ کار خیر فرض سے یا نفل سے تعلق رکھتا ہو۔ اور جس نے مَا رَزَقنهم الله سے صرف زکوۃ مراد لی اس نے بھی نیکی کی اعلی قسم مراد لی ہے۔ یا پھر اس نے اس لئے مراد لیا ہے کہ اس کے ساتھ متصل ہے جو زکوۃ کی جڑواں یعنی نماز کے ساتھ متصل ہے۔

یہاں اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے مفعول بہ کو مقدم کیا گیا ہے اور آیات کے سروں کی حفاظت کے لئے ہے۔ اور مارَزَقنهم سے پہلے جو من ہے وہ تبعیض کے لئے ہے جس کا معنی فضول خرچی سے روکنا ہے۔ جو منہی عنہ ہے اور یہ اس کا بھی احتمال رکھتی ہے کہ اس سے مراد تمام عطیات کا خرچ کرنا ہے جو اللہ کریم نے ان کو ظاہری اور باطنی نعمتوں سے عطا فرمائی ہیں اور اس کی تائید نبی کریم ﷺ کا یہ قول بھی کر رہا ہے کہ علم کے بارے میں ایسا نہ کہا جائے کہ یہ ایسا خزانہ ہے جو خرچ نہیں کیا جا سکتا اور یہی معنی اس شخص نے بھی مراد لیا ہے جو آیت کی تفسیر،

ومما خصصناهم به من أنوار المعرفة يفيضون.

کے ساتھ کرتا ہے۔ یعنی ہم نے جو انوار اپنے بندوں کو عطا کئے ہیں وہ ان کو دوسرے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

ایمان کی تعریف:

(ا م ن) الایمان (Religion)

کے ایک معنی شریعت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"اِنَّ الَّذِینَ اٰمَنُوْا وَالَّذِینَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ"

بیشک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں۔ (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 62)

یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے۔

اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہو سکتا ہے جو توحید کا اقرار کر کے شریعت محمدی ﷺ میں داخل ہو جائے اور بعض نے آیت،

"وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 106)

اور ان میں اکثر وہ ہیں کہ اللہ پر یقین نہیں لاتے مگر شرک کرتے ہوئے۔

کو بھی اسی معنیٰ پر محمول کیا۔

لفظِ غیب کا معنیٰ:

(غ ی ب) الغیب (ض) (Invisible)

غابت الشمس وغیرها کا مصدر ہے جس کے معنی کسی چیز کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے،

غاب عنی کذا فلاں چیز میری نگاہ سے اوجھل ہوئی۔ قرآن مجید میں ہے:

اَمْ کَانَ مِنَ الْغَائِبِیْنَ (سورۃ النمل آیت نمبر 20)

یا وہ واقعی حاضر نہیں۔

اور ہر وہ چیز جو انسان کے علم اور حواس سے پوشیدہ ہو اس پر غیب کا لفظ بولا جاتا ہے۔

تحقیقِ اقامت:

الاقامته (افعال) فی المکان

اقامۃ کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اقامته الشیی (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

قُلْ یٰاَہْلَ الْکِتَابِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرَاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 68)

تم فرمادو اے کتابیو تم کچھ بھی نہیں ہو جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل۔

یعنی جب تک کہ علم وعمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔ اسی طرح فرمایا:

وَلَوْ اَنَّہُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 66)

اور اگر وہ قائم رکھتے توریت اور انجیل۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ وہاں اقامته کا صیغۃ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیبت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا ہے اسی بنا پر کئی ایک مقام پر اقیموا الصلوۃ اور المتقین الصلوۃ کہا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی (سورۃ النساء آیت نمبر 142)

اور جب نماز کو کھڑے ہوں تو ہارے جی سے۔

میں قاموا اقامته سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے (جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں) اور آیت:

"رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ" (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 40)

اے میرے رب مجھے نماز کا قائم کرنے والا رکھ۔

میں دعا ہے کہ الٰہی مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما اور آیت کریمہ:

"فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 11)

پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم رکھیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اقامۃ سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے

کے ہیں۔

المقام:۔

یہ مصدر میمی، ظرف، مکان ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف مصدر میمی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 66)

اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور مقامتہ (بضم الیم) معنی اقامتہ ہے جیسے فرمایا:

"الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 35)

وہ جس نے ہمیں آرام کی جگہ اتارا اپنے فضل سے۔

یہاں جنت کو دار المقامتہ کہا ہے جس طرح کہ اسے دار الخلد اور جنات عدن کہا ہے۔، اور آیت کریمہ:

"لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا" (سورۃ فاطر آیت نمبر 35)

یہاں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔

میں مقام کا لفظ قیام سے ہے یعنی تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور ایک قرات میں مقام (بضم المیم) اقام سے ہے اور کبھی اقامتہ سے معنی دوام مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"عَذَابٌ مُّقِیْمٌ" (سورۃ ھود آیت نمبر 39)

وہ عذاب جو ہمیشہ رہے۔

اور ایک قرأت میں آیت کریمہ: "اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 51)

بیشک ڈر والے امان کی جگہ میں ہیں۔

مقام بضمہ میم ہے۔ یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ تقویم الشی کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔

چنانچہ فرمایا:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" (سورۃ التین آیت نمبر 4)

بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا۔

اس میں انسان کے عقل وفہم قدوقامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

صلٰوۃ کے معانی:

(ص ل ی) الصلی (س) (Prayers offered by the MUHAMMADANS)

کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں صلی بالنار اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا صلی بکذا اسے فلاں چیز سے پالا پڑا۔ صلیت الشاۃ میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مصلیۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (سورۃ یٰس آیت نمبر 64)

آج اس میں جاؤ بدلہ اپنے کفر کا۔

الصلوۃ:

بہت سے اہل لغت کا خیال ہے کہ صلاۃ کے معنی دعا دینے۔ تحسین وتبریک اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے صلیت علیہ میں نے اسے دعا دی نشونما دی اور بڑھایا اور حدیث میں ہے کہ

إذا دعی أحدکم إلی طعام فلیجب، وإن کان صائما فَلْيُصَلِّ أی: لیدع لأهله،

جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کرلے اگر روزہ دار ہے تو وہ انکے لئے دعا کر کے واپس چلا آئے،

اور قرآن مجید میں ہے،

"وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ" (سورۃ یٰس آیت نمبر 64)

اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو بیشک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے۔

اور انسانوں کی طرح فرشتوں کی طرف سے بھی صلاۃ کے معنی دعا اور استغفار ہی آتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا: "اِنَّ اللهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 56)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے۔

اور الصلوۃ جو کہ ایک عبادت مخصوصہ کا نام ہے اس کی اصل بھی دعا ہی ہے اور نماز چونکہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے اسے صلوۃ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تسمیۃ الشئی باسم الجزء کے قبیل سے ہے یعنی کسی چیز کو اس کے ضمنی مفہوم کے نام سے موسوم کرنا اور صلاۃ (نماز) ان عبادت سے ہے جن کا وجود شریعت میں ملتا ہے گو اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"اِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 103)

بے شک نماز مسلمانوں پر وقت باندھا ہوا فرض ہے۔

رزق کی تعریف:

(ر ز ق) الرزق

وہ عطیہ جو جاری ہو خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور رزق بمعنی نصیبہ بھی آجاتا ہے۔ اور کبھی اس چیز کو بھی رزق کہا جاتا ہے جو پیٹ میں پہنچ کر غذا بنتی ہے، کہا جاتا ہے،

اعطی السلطان رزق الجنود بادشاہ نے فوج کو راشن دیا۔ رزقت علما، مجھے علم عطا ہوا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (سورۃ المنافقون آیت نمبر 10)

اور ہمارے دیئے میں سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں کسی کو موت آئے۔

انفاق کے معانی:

(ن ف ق) نفق (ن) (Spend or Expend)

نفق الشئی کے معنی کسی چیز کے ختم ہونے یا چلے جانے کے ہیں۔ اور چلے جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔

(1) خوب فروخت ہونے سے جیسے نفق البیع (سامان کا) خوب فروخت ہونا اسی سے نفاق الایتیم ہے جس کے معنی بیوہ عورت سے نکاح کے طلب گاروں کا بکثرت ہونا کے ہیں۔ نفق القوم بازار کا پر رونق ہونا۔

(2) بذریعہ مرجانے کے جیسے نفقت الدابۃ نفوقا جانور کا مرجانا۔

(3) بذریعہ فنا ہوجانے کے جیسے نفقت الدراھم دراہم خرچ ہوگئے، انفق تھا ان کو خرچ کردیا۔ الانفاق کے معنی مال وغیرہ صرف کرنا کے ہیں اور یہ کبھی واجب ہوتا ہے۔ اور کبھی مستحب اور مال اور غیر مال یعنی علم وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا۔

"وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 195)

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

"وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 254)

اللہ کی راہ میں ہمارے دیئے میں سے خرچ کرو۔

[سورۃ البقرۃ (2) : آیۃ 4]

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (4)

ترجمہ:

"اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا، اور آخرت پر یقین رکھیں"۔

متن:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

هم مؤمنوا أهل الكتاب كعبد الله بن سلام رضي الله تعالى عنه وأضرابه معطوفون على الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ، داخلون معهم في جملة المتقين دخول أخصين تحت أعم، إذ المراد بأولئك الذين آمنوا عن شرك وإنكار، وبهؤلاء مقابلوهم فكانت الآيتان تفصيلاً لِلْمُتَّقِيْنَ، وهو قول ابن عباس رضي الله عنهما. أو على المتقين وكأنه قال هُدىً لِلْمُتَّقِيْنَ عن الشرك، والذين آمنوا من أهل الملل. ويحتمل أن يراد بهم الاولون بأعيانهم، وَوُسِّط العاطف كما وسط في قوله:

إلى الملك القَرْمِ وابنِ الهمام ... وليثِ الكتيبةِ في المزْدَحَمْ

وقوله:

يا لهفَ ذؤابةَ للحارثِ الص ... ائحِ فالغانم فالآئب

على معنى أنهم الجامعون بين الإيمان بما يدركه العقل جُملة والإتيان بما يصدقه من العبادات البدنية والمالية وبين الإيمان بما لا طريق إليه غير السمع. وكرر الموصول تنبيهاً على تغاير القبيلين وتباين السبيلين.

أو طائفة منهم وهم مؤمنو أهل الكتاب، ذكرهم مخصصين عن الجملة كذكر جبريل وميكائيل بعد الملائكة تعظيماً لشأنهم وترغيباً لأمثالهم.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ میں اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور اس آیت کا عطف،

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

پر ہوگا اور اس آیت میں مذکور گروہ متقین اسی طرح داخل ہونگے جیسے ایک اعم کے تحت دو اخص داخل ہوتے ہیں۔ جس طرح حیوان کے تحت انسان اور فرس داخل ہوتے ہیں الذین یومنون بالغیب سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو شک اور انکار کو ترک کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور

الذین یومنون بما انزل الیك ... الی آخرہ

سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے اہل کتاب تھے اور بعد میں مسلمان ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کے قول کے مطابق یہ دونوں آیتیں متقین کی تفصیل بیان کر رہی ہیں۔ یا اس آیت کا عطف متقین پر ہے یعنی اس کے ماتحت ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کریم کا قول ہے کہ قرآن ان لوگوں کے لئے بھی ہدایت ہے پہلے مشرک تھے، بعد میں مسلمان ہوئے۔ اور ان اہل کتاب کے لئے بھی ذریعہ ہدایت ہے جو پہلے کتابی تھے اور بعد میں مشرف باسلام ہوئے۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کے مابعد آیت سے بھی وہی لوگ مراد ہوں جو

الذین یومنون بالغیب

سے مراد ہیں۔ تو اس صورت میں ان کے درمیان حرف عاطفہ تغایر بالصفات کے لئے ہوگا جیسا کہ اشعار میں ایک صفت کا عطف دوسری صفت پر ہے تو گویا ان کے درمیان حرف عطف تغایر بالصفات کے لئے ہے نہ کہ تغایر بالذات کے لئے یعنی الذین یومنون بالغیب سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل عرب سے شرک چھوڑ کر ایمان لائے اور دوسری آیت،

الذین یومنون بما انزل الیك

سے وہ لوگ مراد ہیں جو اہل کتاب میں سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اور عربوں میں ایسا عطف جائز ہے۔ قول شاعر،

إلى الملكِ القَرْمِ وابنِ الهمام ...
وليثِ الكتيبةِ في المزْدَحَم....

اس بادشاہ کی طرف جو بہادر ہے اور سردار ہے اور میدان میں شیر ہے اپنے لشکر کا۔

یہاں حرف واو الملک القرم وابن الہمام اور لیث الکتیبۃ صفات کے درمیان تغایر ظاہر کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے۔

دوسرا شعر،

يالهفَ ذؤابةَ للحارثِ الص ... ائحِ فالغانم فالآئب

اے میری ماں زیابہ کی حسرت حارث کی لوٹ مار کی وجہ سے ہے جو صبح سویرے حملہ آور ہوا پس مال غنیمت لوٹا پھر صحیح سلامت واپس چلا گیا۔

تو آیت سے مراد یہ ہوگا کہ بے شک وہ اس ایمان کو بھی جمع کرنے والے ہیں جس کا ادراک عقل اجمالاً کرتی ہے۔ اور وہ ان اشیاء کو عملی جامہ پہناتی ہے جن کی وہ تصدیق کرتے ہیں جن کا ادراک سوائے عقلی اور سمعی دلیل کے، اور کوئی طریقہ نہیں۔

دونوں آیات میں اسم موصول کو مکرر ذکر کرنے کی وجہ یہ کہ تنبیہ ہو جائے کہ ایمان کی ان دو قسموں کے راستے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ قسم اول میں ایمان سے مراد عقل کے ادراک سے ایمان لانا ہے۔ اور قسم دوم میں منقول دلیل سے ایمان لانا ہے یا،

الذین یومنون بما انزل الیك

سے مراد ایمان بالغیب لانے والوں میں سے ایک گروہ ہوگا جو اہل کتاب ہیں اور ان کی شان و شوکت اور عظمت ظاہر کرنے اور ان کے ہم جنسوں کو ایمان لانے کی ترغیب دینے کے لئے الگ الگ ذکر فرمایا جیسا کہ ملائکہ کے بعد جبریل امین اور میکائیل کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔

متن:

والإنزال نقل الشيء من الاعلى إلى الاسفل وهو إنما يلحق المعانى بتوسط لحوقه الذوات الحاملة لها، ولعل نزول الكتب الإلهية على الرسل بأن يلتقفه الملك من الله تعالى تلقفاً روحانياً؛ أو يحفظه من اللوح المحفوظ فينزل به فيبلغه إلى الرسول. والمراد بما أُنْزِلَ اِلَيْكَ القرآن بأسره والشريعة عن آخرها، وإنما عبر عنه بلفظ الماضى وإن كان بعضه مترقباً تغليباً للموجود على ما لم يوجد. أو تنزيلاً للمنتظر منزلة الواقع، ونظيره قوله تعالى: اِنَّا سَمِعْنا كِتاباً أُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسى. فإن الجنَّ لم يسمعوا جميعه ولم يكن الكتاب كله مُنَزَّلاً حينئذ. وبما أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ التوراة والإنجيل وسائر الكتب السابقة، والإيمان بها جملةً فرض عين، وبالاول دون الثانى تفصيلاً من حيث إنا متعبدون بتفاصيله فرض، ولكن على الكفاية. لأن وجوبه على كل أحد يوجب الحرج وفساد المعاش.

ترجمہ:

سوال مقدر اور اس کا جواب:

انزال کا مطلب کس چیز کو نیچے یا اوپر کی طرف حرکت دینا یا منتقل کرنا ہے۔ (اوپر اور نیچے کی طرف وہی چیز منتقل ہوتی ہے جس کا جسم ہو کیونکہ معانی اور صفات منتقل نہیں ہوتے او اللہ کریم کا کلام جسم نہیں بلکہ معانی ہیں انہیں انتقال کیسے لاحق ہوگا)

ان معانی کو یہ انتقال اور حرکت ان ذاتوں کے واسطے سے لاحق ہوگا جو ان معانی کو اٹھانے والے ہیں اور شاید کہ اللہ کی کتابوں کا نزول نبیوں پر اس طرح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ روحانی طور پر فوراً ان معانی کو حاصل کر لیتا ہو۔ یا انہیں لوح محفوظ سے یاد کر لیتا ہو پھر اسے لے کر نازل ہو اور رسولوں تک پہنچاتا ہو اور،

بما انزل اليك

سے مراد پورا قرآن اور ساری شریعت مطہرہ مراد ہے۔ اور اس کو فعل ماضی مجہول کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ (اس آیت کے نزول کے وقت) پورا قرآن اور ساری شریعت نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے نزول کا انتظار تھا تو جس کے نزول کا انتظار تھا چونکہ اس کا نزول یقینی امر تھا اس لئے جو نازل ہو چکا تھا اسی کو نازل ہونے والے کلام کے قائمقام رکھ دیا گیا اور جو

موجود تھا اسی کو جس کے نزول کا انتظار تھا، اس پر غلبہ دے دیا گیا۔

اور اللہ کریم کا وہ قول مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس میں جنوں کے قرآن پاک سننے کا ذکر ہے کہ جنوں نے کہا کہ ہم نے وہ کلام سنا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی یہ جنوں نے اپنی قوم کو تب بتایا جب وہ اپنی قوم میں واپس گئے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو وادی تہامہ میں قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے۔ اس وقت جنوں نے سارا قرآن نہیں سنا بلکہ کچھ حصہ سنا تھا اور اس بعض سنے ہوئے کو سارے قرآن کے قائمقام کر دیا۔ اور بما انزل الیک سے مراد پہلی تمام نازل شدہ کتابیں ہیں جیسا کہ توارت، زبور، انجیل اور قرآن پاک۔ ان میں سابقہ نازل شدہ پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے جب کہ قرآن پاک تفصیلی ایمان لانا اور اس کے احکامات عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ہم اس کے مکلف ہیں اور اس کی تفصیلات کا علم حاصل کرنا امت کے ہر فرد پر لازم نہیں اگر ایسا ہو تو حرجِ عظیم لازم آئے گا جس سے معاشیات میں خرابی بنتی ہے۔

متن:

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ

اور آخرت پر یقین رکھیں،،

أي يوقنون إيقاناً زال معه ما كانوا عليه من أن الجنة لا يدخلها إلا من كان هوداً أو نصارى، وأن النار لن تمسهم إلا أياماً معدودة، واختلافهم في نعيم الجنة: أهو من جنس نعيم الدنيا أو غيره؟ وفي دوامه وانقطاعه، وفي تقديم الصلة وبناء يوقنون على هم تعريض لمن عداهم من أهل الكتاب، وبأن اعتقادهم في أمر الآخرة غير مطابق ولا صادر عن إيقان، واليقين: إتقان العلم بنفي الشك والشبهة عنه نظراً واستدلالاً، ولذلك لا يوصف به علم البارئ ولا العلوم الضرورية. والآخرة تأنيث الآخر، صفة الدار بدليل قوله تعالى: تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ فغلبت كالدنيا، وعن نافع أنه خففها بحذف الهمزة إلقاء حركتها على اللام، وقرئ «يؤقنون» بقلب الواو همزة لضم ما قبلها إجراء لها مجرى المضمومة في وجوه ووقتت ونظيره:

لحبِّ المؤقدان إلى مؤسَى ... وجعدةَ إذ أضاءهما الوقود

ترجمہ:

مندرجہ بالا آیاتِ مقدسہ میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا آخرت پر اتنا پختہ ایمان ہے کہ اس کے ساتھ تمام باطل عقائد ختم ہو جاتے ہیں جو یہودیوں اور عیسائیوں کے تھے، مثلاً جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی جائیں گے۔ اور اگر جہنم میں گئے بھی تو صرف چند دنوں کے لئے جائیں گے اور ان کا جنت کی نعمتوں کے بارے میں بھی اختلاف تھا کہ وہ دنیاوی نعمتوں کی

مثل ہوں گی یا ان سے مختلف، ابدی ہوں گی یا عارضی۔ اس مقام پر یوقنون جو کہ بالآخرۃ کا صلہ ہے، یوقنون پر اس لئے مقدم کیا گیا ہے کہ تعریضاً یہ ثابت کیا جائے کہ جو ان مذکورہ بالا کے علاوہ اہل کتاب ہیں وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کا آخرت کے معاملہ میں اعتقاد کا دعوٰی کرنا واقع کے مطابق نہیں اور یقین سے بھی صادر نہیں ہے۔

یقین سے مشتق ہے یوقنون، اس کا معنیٰ شک وشبہ کی نفی کرتے ہوئے، نظر وفکر اور استدلال کے ساتھ علم کو مضبوط کرنا ہے۔ چونکہ یہ علم نظر وفکر سے حاصل ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے علم کو متصف بیقین نہیں کیا جاتا اور نہ ہی علوم بدیہیہ اور ضروریہ کی صفت یقین کے ساتھ لائی جاتی ہے۔

اور آخرۃ اسم فاعل، واحد مونث کا صیغہ ہے اور صفت ہے دار کی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں مذکور ہے،

تلك الدار الآخرۃ

یہاں الدار موصوف اور الآخرۃ صفت ہے۔ لیکن بہت زیادہ استعمال کی وجہ سے عالم برزخ کے علم کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ اور دنیا کا لفظ زیادہ استعمال کی وجہ سے دار فانی کا علم بن گیا ہے حالانکہ یہ اسم تفضیل مونث کا صیغہ ہے جو صفت کا صیغہ ہے اور الآخرہ میں نافع نے تخفیف کی ہے اس کے ہمزہ کو حذف کر کے اس کی حرکت لام کو دے دی اور لَاخِرۃ کر کے پڑھا ہے اسی طرح بعض قراء نے یوقنون کی واو کو ہمزہ سے بدل کر یوءقنون پڑھا ہے۔ اور اس کے ماقبل کے ضمہ کو واو مضموم کی جگہ رکھ دیا ہے، جیسے وُجُوہ اور وقتت میں واو مفہوم کو ہمزہ کے ساتھ بدل کر اُجُوہ اور اُقتت کر کے پڑھا ہے اس کی مثال میں شاعر کا قول ہے،

لحبِّ المؤقدإن إلى مؤسى وجعدةَ إذ أضاءهما الوقود

مجھے جعدہ کا محبوب بنانے والے گرمی اور سردی میں چلنے والے چولہے ہیں جبکہ ان دونوں کو ایک ہی ایندھن روشن کرتا ہے اور اسی ایندھن نے ان کو مشہور کر دیا ہے۔ یہاں پر موقدان اور موسیٰ میں واو کو ماقبل کے ضمہ کی وجہ ہمزہ کے ساتھ بدل کر پڑھا ہے۔

لفظ "ما" کی تحقیق مع اقسام:

(ما) یہ عربی زبان میں دو قسم پر ہے۔ اسمی اور حرفی
پھر ہر ایک پانچ قسم پر ہے لہٰذا کل دس قسمیں ہیں۔

(1) ما اسمی ہو تو واحد اور تذکیر و تانیث کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ پھر لفظاً مفرد ہونے کے لحاظ سے اس کی طرف ضمیر مفرد بھی لوٹ سکتی ہے۔ اور معنیٰ جمع ہونے کی صورت میں ضمیر جمع کا لانا بھی صحیح ہوتا ہے۔ یہ ما کبھی بمعنی الذی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا،

"وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ" (سورۃ یونس آیت نمبر 18)

اوراللہ کے سوا ایسی چیز کو پوجتے ہیں جو ان کا کچھ بھلا نہ کرے۔

تو یہاں ما کی طرف یضرھم میں مفرد کی ضمیر لوٹ رہی ہے اس کے بعد معنی جمع کی مناسب سے

يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ

(سورۃ یونس آیت نمبر 18)

اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں تم فرماؤ کیا اللہ کو وہ بات بتاتے ہو جو اس کے علم میں نہ آسمانوں میں ہے نہ زمین میں۔

آ گیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:

"وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقاً" (سورۃ النحل آیت نمبر 73)

اوراللہ کے سوا ایسوں کو پوجتے ہیں جو انہیں آسمان اور زمین سے کچھ بھی روزی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔

اس میں بھی جمع کے معنی ملحوظ ہیں اور آیت کریمہ:

"قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 93)

تم فرمادو کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو۔

میں بھی جمع کے معنی مراد ہیں اور کبھی نکرہ ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ" (سورۃ النساء آیت نمبر 58)

بے شک اللہ تمہیں کیا ہی خوب نصیحت فرماتا ہے۔

تو یہاں نعما بمعنی شیئا ہے نیز فرمایا:

"فَنِعِمَّا هِيَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 271] تو وہ بھی خوب ہیں۔

آیت کریمہ:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔

اس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما نکرہ بمعنی شیاء ہو اور یہ بھی کہ ما صلہ ہو اور اس کا مابعد یعنی بعوضۃ مفعول ہو اور نظم کلام دراصل یوں ہو أن یضرب مثلا بعوضۃ اور کبھی استفھا فیہ ہوتا ہے اس صورت میں کبھی کبھی چیز کی نوع یا جنس سے سوال کے لئے آتا ہے اور کبھی کسی چیز کی صفات جنسیہ یا نوعیہ کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اور کبھی غیر ذوی العقول اشخاص اور اعیان کے متعلق سوال کے لئے بھی آجاتا ہے۔ بعض علمائے نحو کا قول ہے کہ کبھی اس کا اطلاق اشخاص ذوی العقول پر بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

"اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ "(سورۃ المؤمنون آیت نمبر ٦)
مگر اپنی بیبیوں یا شرعی باندیوں پر جو ان کے ہاتھ کی ملک ہیں۔

اور آیت کریمہ:

"اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ "(سورۃ العنکبوت آیت نمبر 42)
اللہ جانتا ہے جس چیز کی اس کے سوا پوجا کرتے ہیں۔

اس میں خلیل نے کہا ہے کہ ما تدعون میں ما استفہامیہ ہے ای شئی تدعون من دون اللہ اور انہوں نے یہ تکلف اس لئے کیا ہے کہ یہ ہمیشہ ابتداء کلام میں واقع ہوتا ہے اور مابعد کے متعلق استفہام کے لئے آتا ہے۔ جو آخر میں واقع ہوتا ہے جیسا کہ آیت:

"مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ"

(سورۃ فاطر آیت نمبر 2)

اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھولے اس کا کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ روک لے تو اس کی روک کے بعد اس کا کوئی چھوڑنے والا نہیں۔ ⊙

اور مثال ما تضرب اضرب میں ہے۔ اور کبھی تعجب کے لئے ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

"فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 175)
تو کس درجہ انہیں آگ کی سہار (برداشت) ہے۔

ما حرفی کی اقسام:

ما حرفی ہونے کی صورت میں بھی پانچ قسم پر ہے،

اول یہ کہ اس کا بعد بمنزلہ مصدر کے ہو،

جیسا کہ فعل مستقبل پر ان ناصبہ داخل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 3)
اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں۔

تو یہاں ما رزق بمعنی رزق مصدر کے ہے اور اس ما کے بمعنی ان مصدر یہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی طرف کہیں بھی لفظاً یا تقدیراً ضمیر نہیں لوٹتی۔

اور آیت کریمہ: "بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 10) بدلہ ان کے جھوٹ کا۔

میں بھی ما مصدری معنی پر محمول ہے۔ اسی طرح اتانیالقوم ماعدا زیدا میں بھی ما مصدر یہ ہے اور تقدیر ظرف کی

صورت میں بھی ما مصدر یہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيْهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے۔

"كُلَّمَا اَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 64)

جب کبھی لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اُسے بجھا دیتا ہے۔

"كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 97)

جب کبھی بجھنے پر آئے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔

اور آیت کریمہ: "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 94)

تو اعلانیہ کہہ دو جس بات کا تمہیں حکم ہے۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما مصدر یہ ہوا اور یہ بھی کہ ما موصولہ بمعنی الذي ہو۔ یاد رکھو کہ ما اپنے مابعد کے ساتھ مل کر مصدری معنی میں ہونے کی صورت میں ہمیشہ حرفی ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اسی ہو تو اس کی طرف ضمیر کا لوٹنا ضروری ہے پس یہ اريدان اخرج میں ان کی طرح ہوتا ہے جس طرح ان کے بعد ضمیر نہیں ہوتی جو اس کی طرف لوٹ سکے اسی طرح ما کے بعد بھی عائد ضمیر نہیں آتی۔

دوم ما نافیہ ہے۔

اہل حجاز اسے مشروط عمل دیتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"مَا هٰذَا بَشَرًا" (سورۃ یوسف آیت نمبر 31) یہ آدمی نہیں ہے۔

تیسرا ما کافہ ہے۔

جو ان و اخواتھا اور (رب کے ساتھ مل کر فعل پر داخل ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" (سورۃ فاطر آیت نمبر 28)

اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

"اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِثْمًا" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 178)

ہم تو اسی لئے انہیں ڈھیل دیتے ہیں کہ اور گناہ میں بڑھیں۔

"كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وهم ينظرون" (سورۃ الانفال آیت نمبر 6)

گویا وہ آنکھوں دیکھی موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

"رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِيْنَ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 2)

بہت آرزوئیں کریں گے کافر کاش مسلمان ہوتے۔

میں بھی ما کافہ ہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ قلما اور لما میں بھی ما کافہ ہوتا ہے۔

چہارم ما مسلمۃ یعنی وہ ما جو کسی غیر عامل کلمہ کو عامل بنا کر مابعد پر مسلط کر دیتا ہے۔

جیسا کہ اذا ما و حیتما کا ما ہے کہ ما کے ساتھ مرکب ہونے سے قبل یہ کلمات غیر عاملہ تھے لیکن ترکیب کے بعد اسمائے شرط کا سا عمل کرتے ہیں اور فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں جیسے حیثما نقعد اقعد وغیرہ

پانچواں ما زائدہ ہے،

جو محض پہلے لفظ کی تو کید کے لئے آتا ہے جیسے اذا ما فعلت کذا جب تم ایسا کرو ما تخرج اخرج اگر تم باہر نکلو گے تو میں بھی نکلوں گا قرآن پاک میں ہے:

"فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا" (سورۃ مریم آیت نمبر 26)

پھر اگر تو کسی آدمی کو دیکھے۔

"إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 23)

اگر تیرے سامنے ان میں ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔

نزول کے معنی اور انزال و تنزیل میں فرق:

(ن ز ل) النزول (ض) (Come down,Alight)

اصل میں اس کے معنی بلند جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:

نزل عن دابۃ وہ سواری سے اتر پڑا۔ نزل فی مکان کذا کسی جگہ پر ٹھہرنا انزل و انفعال اتارنا قرآن میں ہے۔ عذاب کے متعلق انزال کا لفظ استعمال ہوا ہے قرآن اور فرشتوں کے نازل کرنے کے متعلق انزال اور تنزیل دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے کہ تنزیل کے معنی ایک چیز کو مرۃ بعد اخری اور متفرق طور نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور انزال کا لفظ عام ہے جو ایک ہی دفعہ مکمل طور کسی چیز نازل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ وہ آیات ملاحظہ ہو جہاں تنزیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

"نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 193) اسے روح الامین لے کر اترا۔

ایک قرات میں نزل ہے۔

"وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيْلًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 106) اور ہم نے اسے بتدریج رہ رہ کر اتارا۔

لفظ آخر کا مفہوم اور اس کا مدمقابل:

آخر۔ (Ultimate,End,Last)

اول کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور اخر (دوسرا) واحد کے مقابلہ میں آتا ہے اور الدار الاخرۃ سے نشاۃ ثانیہ مراد لی جاتی ہے جس طرح کہ الدار الدنیا سے نشاۃ اولی چنانچہ فرمایا،

"وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ "(سورۃ العنکبوت آیت نمبر 64)

اور بیشک آخرت کا گھر ضرور وہی سچی زندگی ہے۔

لیکن کہیں الدار کا لفظ حذف کر کے صرف الاخرۃ کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے فرمایا:

"أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ "(سورۃ ھود آیت نمبر 16)

یہ ہیں وہ جن کے لئے آخرت میں کچھ نہیں مگر آگ۔

اور دار کا لفظ کبھی اخرۃ کا موصوف ہوتا ہے اور کبھی اس کی طرف مضاف ہو کر آتا ہے چنانچہ فرمایا۔

"وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ "(سورۃ الانعام آیت نمبر 32)

اور بے شک پچھلا گھر بھلا ان کے لئے جو ڈرتے ہیں۔

"وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ "(سورۃ النحل آیت نمبر 41)

اور بیشک آخرت کا ثواب بہت بڑا ہے کسی طرح لوگ جانتے۔

یہ اصل میں ولاجر دار الحیاۃ الاخرۃ ہے (اور دار کا لفظ الحیاۃ الاخرۃ کی طرف مضاف ہے) اور اخر (جمع الاخری) کا لفظ الاخر (معرف بلام) سے معدول ہے اور کلام عرب میں اس کی دوسری نظیر نہیں ہے کیونکہ افعل من کذا (یعنی صیغہ تفصیل) کے ساتھ اگر لفظ من لفظاً یا تقدیراً مذکورہ ہو تو نہ اس کا تثنیہ ہوتا اور نہ جمع اور نہ ہی تانیث آتی ہے اور اس کا تثنیہ جمع دونوں آسکتے ہیں لیکن لفظ آخر میں اس کے نظائر کے برعکس الف لام کے بغیر اس کے استعمال کو جائز سمجھا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ الاخر سے معدول ہے۔

معرفتِ یقین.

(ی ق ن) الیقین (Belief)

یقین کے معنی کسی امر کو پوری طرح سمجھ لینے کے ساتھ اس کے پایہ ثبوت تک پہنچ جانے کے ہیں اسی لئے یہ صفات علم سے ہے اور معرفت اور وغیرہ سے اس کا درجہ اوپر ہے یہی وجہ ہے کہ کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے لیکن معرفۃ الیقین نہیں بولتے اور قدر معنوی فرق پایا جاتا ہے جسے ہم اس کتاب کے بعد بیان کریں گے استیقن والقن یقین کرنا قرآن میں ہے:

"اِنْ نَظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ" (سورۃ الجاثیۃ آیت نمبر 32)
ہمیں تو یونہی کچھ گمان سا ہوتا ہے اور ہمیں یقین نہیں۔

"وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ" (سورۃ الذاریات آیت نمبر 20)
اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین والوں کو۔

"قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 118)
بیشک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے۔

اور آیت کریمہ:

"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 157)
اور ہے یہ کہ انہوں نے نہ اُسے قتل کیا اور نہ اُسے سولی دی بلکہ ان کے لئے اُس کی شبیہ کا ایک بنا دیا گیا۔
کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے قتل ہو جانے کا یقین نہیں ہے بلکہ ظن وتخمین سے ان کے قتل ہو جانے کا حکم لگاتے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 5]

أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (5)

ترجمہ

"وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے"۔

متن:

أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ الجملة فی محل الرفع إن جعل أحد الموصولین مفصولاً عن المتقین خبر له. فكأنه لما قیل هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ قیل ما بالهم خصوا بذلك؟ فأجیب بقوله: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ إلى آخر الآیات. وإلا فاستئناف لا محل لها. فكأنه نتیجة الاحكام والصفات المتقدمة. أو جواب سائل قال: ما للموصوفین بهذه الصفات اختصوا بالهدى؟ ونظیره أحسنت إلى زید صدیقك القدیم حقیق بالإحسان، فإن اسم الإشارة هاهنا كإعادة الموصوف بصفاته المذكورة. وهو أبلغ من أن یستأنف بإعادة الاسم وحده لما فیه من بیان المقتضی وتلخیصه. فإن ترتب الحكم على الوصف إیذان بأنه الموجب له. ومعنى الاستعلاء فی عَلٰى هُدًى تمثیل تمكنهم من الهدى واستقرارهم علیه بحال من اعتلى الشیء وركبه. وقد صرحوا به فی قولهم:

امتطی الجهل وغوی واقتعد غارب الهوی، وذلك إنما یحصل باستفراغ الفکر وإدامة النظر فیما نصب من الحجج والمواظبة علی محاسبة النفس فی العمل. ونُکِّرَ هدیً للتعظیم. فکأنه أرید به ضرب لا یبالغ کنهه ولا یقادر قدره. ونظیره قول الهذلی:

فلا و ابی الطیر المربة بالضحیٰ
علی خالد لقد وقعت علی لحمٍ

وأُکِد تعظیمه بأن الله تعالی مَانِحُهُ والموفق له. وقد أدغمت النون فی الراء بغنة وبغیر غنة.

ترجمہ:

یہاں پر یہ جملہ محل رفع میں ہے، اس شرط کے ساتھ کہ پیچھے مذکور دونوں اسمائے موصول میں سے ایک کو متقین سے اعراب میں الگ کر دیا جائے (تو اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہوگا) اور جملہ اس کی خبر ہوگا۔ تو معنی یہ ہوگا کہ جب اللہ کریم کی طرف سے فرمایا گیا کہ قرآن مجید متقین کے لئے ہی سرچشمہ ہدایت ہے تو یہ اس سوال کا جواب ہوگا۔ کہ متقین کو ہی ہدایت کے ساتھ، کیونکہ خاص کیا جا رہا ہے تو جواب دیا گیا کہ وہ غیب پر ایمان، نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور آخرت پر ایمان جیسی صفات سے متصف ہیں تو جو ان اوصاف سے متصف ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی طرف سے فلاح پانے والا اور ہدایت یافتہ ہوتا ہے۔ اور اگر ان موصولات میں سے کسی کو متقین سے اعراب میں جدا نہ کیا جائے۔ (اور ان کو متقین کی مجرور صفت بنایا جائے) تب یہ جملہ مستانفہ ہوگا اور اس کا کوئی بھی محل اعراب نہیں ہوگا۔ دریں صورت یہ سابقہ احکامات پر عمل پیرا ہونے اور ماقبل بیان کردہ صفات سے متصف ہونے کا ثمرہ اور نتیجہ ہوگا۔ یا سوال کرنے والے کا جواب ہوگا جس کا سوال یہ ہو کہ ان مذکورہ صفات سے متصف ہونے والوں کو کس وجہ سے ہدایت کے ساتھ متصف کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل قول امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بطور مثال پیش کیا ہے۔

ونظیرہ أحسنت إلی زید صدیقك القدیم حقیق بالإحسان

اور تو نے احسان کیا ہے اپنے پرانے دوست زید کے ساتھ، تیرا دوست احسان کے لائق ہے

فی قول ہذا زید متقین کی نظیر ہے

صدیقك الذین یومنون بالغیب الی آخرہ

کی مثال ہے۔ اور

صدیقك القدیم حقیق بالاحسان اولئك هدیً من ربهم الی آخرہ

کی مثال ہے

تو امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مندرجہ بالا مثال میں استیناف بالصفات کی مثال بیان کر رہے ہیں لہٰذا اس مندرجہ بالا عبارت میں جہاں جہاں بھی استیناف ہوگا وہاں یہ جملہ اور قول، نظیر اور مثال ہوگا۔ اسی وجہ سے نظیر کی ہ ضمیر کا مرجع ماذکر بیان کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل وہ دو صورتیں ہیں، جن میں استیناف ثابت کیا گیا ہے۔

1۔ سب سے پہلی
2۔ سب سے آخری صورت

پس یہ جملہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں کی نظیر ہے۔

فان اسم الاشارہ ھھنا.....

یہاں پر اسم اشارہ کا ذکر کرنا اور اسم ظاہر ذکر نہ کرنا اس لئے ہے کہ اسم اشارہ ذکر کرنا ایسے ہی ہے جیسے موصوف جمیع صفات کا اعادہ کیا جائے کیونکہ اسم اشارہ کا ذکر بغیر مشارالیہ کے نہیں ہوسکتا۔ اور اسم ظاہر ذکر کرنے سے، اس کا ذکر کرنا زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ اس طرح حکم کا مقتضی اور اس کی تلخیص کا بھی بیان ہے کیونکہ کہ جب حکم کو کسی وصف پر مرتب کیا جائے تو وہی وصف اس حکم کی علت اور موجب ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مومنین کا اپنے رب کی طرف سے ہدایت کے ساتھ خاص ہونا اسکا سبب اور موجب مذکورہ بالا صفات سے متصف ہونا ہے۔

و معنی الاستعلاء فی علی ھدی......

علیٰ جو کہ ھدیٰ سے پہلے آیا ہے، وہ استعلاء کے معنیٰ میں ہے یعنی کسی چیز پر غالب آنا اور اس پر قادر ہونا یہاں یہ بات سمجھانے کے لئے لایا گیا ہے کہ متقین ہدایت پر متمکن اور غالب ہیں جیسا کہ ماہر شاہسوار اپنی سواری پر قدرت رکھتا ہے۔

عرب میں ایسی مثالیں عام ہیں، مثلاً

امتطی الجھل وغوی	وہ جہالت پر سوار ہوا اور گمراہ ہوگیا۔
واقتعد علی غارب الھویٰ	کہ وہ نفسانی خواہشات کے کندھے پر سوار ہوگیا۔

اور ہدایت پر تمکن وغلبہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنے فکر ونظر کو اپنے دلائل میں اس طرح مرکوز کردے کہ وہ ہر قسم کی فکر سے خالی ہو۔ نیز وہ اپنے نفسانی اعمال کا محاسبہ بھی کرتا رہے اور یہاں ھدیٰ کے لفظ نکرہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے عظیم ہدایت مراد ہے یعنی وہ عظیم الشان ہدایت جس کی حقیقت اور گہرائی تک رسائین حاصل کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی کسی پیمانہ سے ناپنا ممکن۔

ہزلی کا یہ شعر اسم نکرہ ذکر کرکے اس کی عظمت شان مراد لینے کی مثال ہے۔

فلا و ابی الطیر المربۃ بالضحیٰ   علیٰ خالد لقد وقعت علیٰ لحم

اے مخاطب، جو تو سمجھا ہے، وہ بات نہیں۔ بلکہ ان پرندوں کے باپ کی قسم جو چاشت کے وقت خالد کی نعش پر

جھپٹ رہے تھے یقیناً وہ ایک عظیم گوشت پر گر رہے تھے۔

یہاں پر لحم لفظ کو نکرہ، بطور استشہاد لایا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد عظیم گوشت ہے جو ایسے آدمی کا ہے جو بہت عظیم تھا تو اس کے گوشت کی عظمت کا حال کیا ہوگا۔ یہ شعر ہذلی نے خالد بن زہر کے مرثیہ میں کہا تھا جب اس کو قتل کر دیا گیا تھا اور بوقت چاشت پرندے اس کا گوشت کھا رہے تھے۔ اور آیت مبارکہ میں ھدیً کے بعد من ربھم ذکر کرنا یہ اس ہدایت کی عظمت میں مزید تاکید پیدا کر رہا ہے کہ اس ہدایت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے تو جس کی توفیق اللہ کریم عزوجل عطا کرے وہ کتنی عظیم ہوگی اور من ربھم سے پہلے من کے نون کو اس کی راء میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ ادغام بغیر غنہ کے ہے اور بعض کے نزدیک غنہ کے ساتھ ہے۔

متن:

وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

كرر فيه اسم الإشارة تنبيهاً على أن اتصافهم بتلك الصفات يقتضى كل واحدة من الاثرتين وإن كلاً منهما كاف فى تمييزهم بها عن غيرهم. ووسط العاطف لاختلاف مفهوم الجملتين هاهنا بخلاف قوله أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ أُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ فإن التسجيل بالغفلة والتشبيه بالبهائم شيء واحد فكانت الجملة الثانية مقررة للأولى فلا تناسب العطف. وهم:

فصل يفصل الخبر عن الصفة ويؤكد النسبة. ويفيد اختصاص المسند إليه. أو مبتدأ والمفلحون خبره والجملة خبر أولئك. والمفلح بالحاء والجيم:

الفائز بالمطلوب. كأنه الذى انفتحت له وجوه الظفر. وهٰذا التركيب وما يشاركه فى الفاء والعين نحو فلق وفلذ وفلى يدل على الشق. والفتح وتعريف المفلحين للدلالة على أن المتقين هم الناس الذين بلغك أنهم المفلحون فى الآخرة. أو الإشارة إلى ما يعرفه كل أحد من حقيقة المفلحين وخصوصياتهم.

تنبيه:

تأمل كيف نبه سبحانه وتعالى على اختصاص المتقين بنيل ما لا يناله كل أحد من وجوه شتى، وبناء الكلام على اسم الإشارة للتعليل مع الإيجاز وتكريره وتعريف الخبر وتوسيط الفصل، لإظهار قدرهم والترغيب فى اقتفاء أثرهم. وقد تشبث به الوعيدية فى خلود الفساق من أهل القبلة فى العذاب. ورد بأن المراد بالمفلحين الكاملون فى

الفلاح، ویلزمه عدم کمال الفلاح لمن لیس علی صفتهم، لا عدم الفلاح له رأساً.

ترجمہ:

اس آیت مقدسہ:

وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

میں اسم اشارہ دوبارہ لانے کا مقصد یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ مذکورہ بالا صفات کے ساتھ متصف ہوں گے تو وہ دونوں نعمتوں کو حاصل کرنے والے ہوں گے یعنی ہدایت اور فلاح، نیز اس بات پر آگاہی بھی مقصود ہے کہ ان دنوں نعمتوں میں سے ہر ایک نعمت متقین کو غیر متقین سے ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور ان بونوں جملوں کے درمیان واو عاطفہ کا ذکر کرنا، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان تغایر پر دال ہے۔ جب کہ اسی قسم کے دو جملے اور ہیں ان کے درمیان واو عاطفہ ذکر نہیں کی گئی۔

أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ

کہ کافر چوپایوں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں حقیقت میں وہی غافل ہیں۔

پہلے دو جملوں میں واو عاطفہ اس لئے ذکر کی گئی ہے کہ مفہوم اور وجود میں تغایر ہے اور ان دونوں جملوں کے مفہوم میں تغایر نہیں بلکہ پہلے جملے میں کافروں کو چوپایوں کے ساتھ تشبیہ دے کر، ان کی جہالت وغفلت کو ذکر کیا جبکہ دوسرے جملہ میں ان کی غفلت وجہالت پر مہر تصدیق ثبت کر دی تو جب ان دونوں جملوں میں تغایر نہیں بلکہ کفار کو بہائم کے ساتھ تشبیہ دینا اور غفلت وجہالت پر مہر لگانا ایک ہی چیز ہے کہ ان کی جہالت ثابت کی جائے۔ دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے۔ نیز موکد اور تاکید کے درمیان حرف عطف نہیں لایا جاتا۔

فصل یفصل الخبر عن الصفة ویؤکد النسبة

مفلحون سے پہلے لفظ ھم کا ذکر کرنا خبر کو صفت سے جدا کرنا ہے کیونکہ جب اسم اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو یہ ثابت کرنے کے لئے اس ضمیر کے بعد والا کلمہ ماقبل مبتداء کی خبر ہے اس کی صفت نہیں اسی لئے اس کو فصل کہا جاتا ہے ضمیر فصل کو ذکر کرنے کے مندرجہ ذیل تین فائدے ہیں،

پہلا خبر کو صفت سے جدا کرنا،

دوسرا نسبت حکمیہ میں تاکید پیدا کرنا

اور تیسرا یہ کہ مسند کو مسند الیہ کے ساتھ خاص کرنا

یا یہ ضمیر مبتداء ہے اور اسکا مابعد اس کی خبر ہے مبتداء اور خبر مل کر جملہ، اُلئک کی خبر ہے۔

المفلح کا لفظ جیم کے ساتھ ہو یا حاء کے ساتھ دونوں کا معنی مطلوب کو پانے والا ہی ہے گویا یا تو مفلج ہوگا یا پھر مفلح،

دونوں کا معنیٰ یہ ہے کہ جس کے لئے کامیابی کے تمام دروازے کھل گئے ہوں مزید یہ کہ ہر وہ کلمہ جو فاء اور عین کلمہ میں فلح کے ساتھ شریک ہو تو وہ چیرنے اور کھولنے کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ فلق، فلذجدا کرنا، فلی بالوں کو جدا کر کے جوئیں تلاش کرنا اور مفلحون کو معرف باللام ذکر کرنا، اشارہ ہے کہ متقین وہ ہوتے ہیں کہ جن کو ہر ایک جانتا ہے اور ان تک یہ خبر پہنچی ہوئی ہے کہ وہ آخرت میں کامیاب ہوں گے یا اس کا معنی یہ ہے کہ ہر شخص متقین کی حقیقت سے باخبر ہے اور ان کی خصوصیات سے مکمل باخبر ہے۔

تنبیہ:

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ غور کرو کہ کس طرح مختلف طریقوں سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ متقین ہی ان چیزوں کو پانے کے ساتھ خاص ہیں۔ اور وہ مختلف طریقے یہ ہیں کہ کلام یعنی ہدایت اور فلاح کے حکم کی بنیاد اسم اشارہ پر رکھی تا کہ اختصار کے ساتھ ان دونوں حکموں کی علت بھی معلوم ہو جائے اور اسم اشارہ کو مکرر لائے اور پھر خبر کو، معرف باللام ذکر کیا نیز درمیان میں ضمیر فصل لائے، اور متقین کی اس خصوصیت پر متنبہ کرنے کا مقصد ان کے مرتبہ کا اظہار ہے اور دوسروں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی رغبت دلانی ہے۔

متقین کو ان انعامات کے ساتھ خاص کرنے کی وجوہات:

متقین کو ان انعامات کے ساتھ خاص کرنے کی بے شمار وجوہات ہیں۔

1۔ کلام کو اسم اشارہ پر محمول کیا، جس کا مقصد ہدایت و فلاح کی علت بیان کرنا ہے اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ متقین متصف بصفات مذکورہ ہیں۔

2۔ کلام بھی مختصر ہے۔

3۔ ھدیً کو نکرہ ذکر کیا جو کہ اس کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

4۔ خبر معرفہ ذکر کی جو مبتداء کے ساتھ خاص ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

5۔ مبتداء اور خبر کے درمیان ھم ضمیر فصل ذکر کی جو متقین کے بلند مرتبہ کا اظہار ہے۔

6۔ تا کہ دوسرے لوگوں کو متقین کی پیروی کرنے میں رغبت دلائی جائے۔

ہدایت کی چار اقسام:

(ھدی) الھدایتہ (Instruction)

کے معنی لطف و کرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرف سے ہدایت کیا ہے۔

(1) وہ ہدایت ہے جو عقل وفطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے کی ہے۔

اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: "رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 50)

کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی پھر راہ دکھائی۔

(2) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ تجارت کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ آیت:

"وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 73)

اور ہم نے انہیں امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلاتے ہیں۔

(3) سوم بمعنی توفیق

یہ خاص ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى" (سورۃ محمد آیت نمبر 17)

اور جنہوں نے راہ پائی اللہ نے ان کی ہدایت اور زیادہ فرمائی۔

(4) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا۔

مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا: "سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ" (سورۃ محمد آیت نمبر 5)

جلد انہیں راہ دے گا اور ان کا کام بنا دے گا۔

اور مندرجہ ذیل آیت میں فرمایا:

"وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 43)

اور ہم نے ان کے سینوں میں سے کینے کھینچ لئے۔

نوٹ:

لفظ رب کی تحقیق "الحمدللہ رب العالمین" کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

فلاح کے معنی:

(ف ل ح) الفلاح (Betterment)

الفلح کے معنی پھاڑنا کے ہیں مثل مشہور ہے الحدید بالحدید یفلح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اس لئے فلاح کسان کو کہتے

ہیں۔ (کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتا ہے) اور فلاح کے معنی کامیابی اور مطلب وری کے ہیں۔

اقسام فلاح:

یہ دو قسم پر ہے دینوی اور اخروی۔ فلاح دنیوی ان سعادتوں کو حاصل کر لینے کا نام ہے جن سے دنیوی زندگی خوشگوار بنتی ہو یعنی بقاء لمال اور عزت و دولت۔

چنانچہ شاعر نے اسی معنی کے مدنظر رکھتے ہوئے نحلع البسیط میں کہا ہے،

افلح بما شئت فقد یدرك بالضعف وقد یخدع الاریب

جس طریقہ سے چاہو خوش عیشی کرو کبھی کمزور کامیاب ہوجاتا ہے اور چالاک دھوکا کھا جاتا ہے۔

اور فلاح اخروی چار چیزوں کے حاصل ہوجانے کا نام ہے بقا بلا فناء غنا بلا فقر، عزت بلا ذلت، علم بلا جہل اسی لئے کہا گیا ہے،

لاعیش الاعیش الاخرۃ کہ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے

اور اسی فلاح کے متعلق فرمایا:

"وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 64)

اور زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے۔

"اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (سورۃ المجادلۃ آیت نمبر 22)

(اور) سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" (سورۃ الاعلیٰ آیت نمبر 14)

بیشک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 9) جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچ گیا۔

"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 1)

بیشک ایمان والے رستگار ہوئے۔

"لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 189) تاکہ تم فلاح پاؤ۔

"اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 117)

کچھ شک نہیں کہ کافر رستگاری نہیں پائیں گے۔

"فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (سورۃ الحشر آیت نمبر 9) وہ تو نجات پانے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

"وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 64) اور آج جو غالب رہا وہ کامیاب ہوا۔ میں یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے فلاح دنیوی مراد لی ہو بلکہ یہی معنیٰ (بلحاظ قرآن) اقرب الی الصحت معلوم ہوتے ہیں۔ اور سحور یعنی طعام سحر کو بھی فلاح کہا گیا ہے کیونکہ اس وقت حی علی الفلاح کی آواز بلند کی جاتی ہے اور اذان میں حی علی الفلاح کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کامیابی کی طرف آؤ جو نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھی ہے۔

اور حدیث حتی خفنا ان یفوتنا الفلاح (حتیٰ کہ فلاح کے فوت ہو جانے کا ہمیں اندیشہ ہوا) میں بھی فلاح سے مراد وہ کامیابی ہے جو صلاۃ عشا ادا کرنے کی وجہ سے ہمارے لئے مقدر کی گئی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 6]

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَواءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لا يُؤْمِنُونَ (6)

ترجمہ:

"بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے، انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں"۔

متن:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

لما ذكر خاصة عباده وخلاصة أوليائه بصفاتهم التي أهلتهم للهدى والفلاح عقبهم بأضدادهم العتاة المردة، الذين لا ينفع فيهم الهدى ولا تغني عنهم الآيات والنذر، ولم يعطف قصتهم على قصة المؤمنين كما عطف في قوله تعالى إِنَّ الْأَبْرارَ لَفِي نَعِيمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ لتباينهما في الغرض، فإن الاولى سيقت لذكر الكتاب وبيان شأنه والاخرى مسوقة لشرح تمردهم، وانهما كهم في الضلال، و (إن) من الحروف التي تشابه الفعل في عدد الحروف والبناء على الفتح ولزوم الاسماء وإعطاء معانيه، والمتعدي خاصة في دخولها على اسمين، ولذلك أعملت عمله الفرعي وهو نصب الجزء الاول ورفع الثاني إيذاناً بأنه فرع في العمل دخيل فيه.

وقال الكوفيون: الخبر قبل دخولها كان مرفوعاً بالخبرية، وهي بعد باقية مقتضية للرفع قضية للاستصحاب فلا يرفعه الحرف. وأجيب بأن اقتضاء الخبرية الرفع مشروط بالتجرد لتخلفه عنها في خبر كان، وقد زال بدخولها فتعين إعمال الحرف. وفائدتها تأكيد النسبة وتحقيقها، ولذلك يُتَلَقَّى بها القَسَم ويصدر بها الاجوبة،

وتذكر في معرض الشك مثل قوله تعالى: وَيَسْئَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْراً إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ، وَقَالَ مُوسَى يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ قال المبرد (قولك: عبد الله قائم، إخبار عن قيامه، وإن عبد الله قائم، جواب سائل عن قيامه، وإن عبد الله لقائم، جواب منكر لقيامه).

وتعريف الموصول: إما للعهد، والمراد به ناس بأعيانهم كأبي لهب، وأبي جهل، والوليد بن المغيرة، وأحبار اليهود. أو للجنس، متناولاً من صمم على الكفر، وغيرهم. فخص منهم غير المصرين بما أسند إليه. والكفر لغة: ستر النعمة، وأصله الكَفر بالفتح وهو الستر، ومنه قيل للزارع ولليل كافر، ولكمام الثمرة كافور. وفي الشرع: إنكار ما علم بالضرورة مجيء الرسول صلّى الله عليه وسلّم به، وإنما عُدَّ لبس الغيار وشد الزنار ونحوهما كفراً لأنها تدل على التكذيب، فإن من صدق الرسول صلّى الله عليه وسلّم لا يجترء عليها ظاهرا لا لأنها كفر في أنفسها.

ترجمہ:

یہاں پر امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ برسرعنوان آیت کا ماقبل کلام کے ساتھ جو معنوی تعلق ہے، اس کو بیان فرمارہے ہیں کہ جب اللہ کریم نے آیت سے ماقبل میں اپنے خاص بندوں اور مخلص دوستوں کا ذکر ان صفات کے ساتھ بیان فرمایا۔ جنہوں نے ان کو ہدایت اور فلاح کا اہل بنادیا۔ تو اس آیت میں ان کی ضدوں اور مدمقابلوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ایسے ضدی، ہٹ دھرم اور سرکش ہیں کہ ان کو راہ راست پر لانے کے لئے ڈرانے میں نہ تو اللہ کریم کی ترغیبات مفید ثابت ہوئیں اور نہ ہی وعیدات نے انہیں کوئی نفع پہنچایا اور وہ اپنے کفر وانکار پر مضبوطی سے ڈٹے رہے اگرچہ مومنوں اور کافروں کے درمیان تغایر ہے اس کے باوجود ان دونوں کے درمیاں حرف عطف ذکر نہیں کیا گیا جس طرح،

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ

میں حرف عطف ذکر کیا گیا ہے ان دونوں واقعات میں یعنی مومنین او متقین اور منکرین اور کافرین کے درمیان واو عاطفہ نہیں لائی گئی کیونکہ ان دونوں کے مقاصد مختلف ہیں اور ان کر درمیان اعلیٰ درجے کا انقطاع بھی ہے۔ اس وجہ سے کہ پہلے قصے میں قرآن کریم کی شان وعظمت اور اس کے لاریب ہونے کا ذکر ہے۔ جو مومنین کے لئے سراپا نفع وہدایت ہے۔ اور دوسرے قصہ میں مشرکین کی ضد، سرکشی، تمرد اور گمراہی میں منہمک ہونے کا ذکر ہے۔ اس لئے حرف عطف ذکر کر کے تغایر ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور مندرجہ بالا دونوں جملے،

ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم

غرض میں متحد ہیں اس لئے ان میں تغایر ظاہر کرنے کے لئے حرف عطف ذکر کیا گیا ہے۔ اسی لئے امام بیضاوی نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہاں عطف القصہ علی القصہ ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ متعدد جملوں کے مجموعہ کا متعدد جملوں کے مجموعہ پر عطف کیا جائے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں قصے آپس میں غرض کے اعتبار سے متحد ہوں اور اس دوسری آیت،

ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم

میں جہنمیوں کے قصے کو جنتیوں کے قصے پر عطف کیا گیا ہے لیکن ان میں ان دونوں جملوں میں غرض کا اتحاد ہے کیونکہ پہلے جملے سے اعمال پر مرتب ہونے والی جزا کا ذکر ہے اور دوسرے جملہ میں فجار کے اعمال پر مرتب ہونے والی سزا کا ذکر ہے لیکن دونوں قصے الگ الگ ہیں اس لئے ان کے درمیان حرف عطف کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

و ان من الحروف التی شابہت الفعل...

اور ان حروف مشبہ بالفعل میں سے ہے جو اسم کو منصوب اور خبر کو مرفوع کرتے ہیں۔ اوان کی فعل کے ساتھ مشابہت کی چند وجوہات ہیں:

1۔ یہ تعداد حروف میں فعل کے مشابہ ہوتے ہیں یعنی ان میں سے بعض فعل کی طرح ثلاثی ہوتے ہیں۔ جیسے اِن، اَن اور لیت اور بعض رباعی ہیں جیسے لعل لکن اور کان

2۔ بناء میں بھی مشابہ ہے جس طرح فعل ماضی مبنی برفتحہ ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی مبنی برفتحہ ہوتے ہیں۔

3۔ جس طرح فعل متعدی دو اسموں پر داخل ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی دو اسموں پر داخل ہوتے ہیں جس طرح فعل، فاعل اور مفعول تک اپنا معنی پہنچاتا ہے اسی طرح یہ بھی اسم اور خبر تک اپنا معنی پہنچاتے ہیں اور فعل متعدی کے ساتھ ان کی خاص مشابہت ہے کیونکہ وہ بھی دو اسموں پر داخل ہوتا ہے اور فاعل کو رفع اور مفعول کو نصب دیتا ہے۔ اسی طرح یہ حروف بھی دو اسموں پر داخل ہوکر فعل متعدی کا عمل فرعی کرتے ہیں یعنی پہلے اسم کو نصب اور دوسرے کو رفع دیتے ہیں۔ اور انہیں فعل کا عمل فرعی اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ ظاہر ہوجائے کہ یہ عمل میں اصل نہیں بلکہ فعل کے تابع اور اس میں دخیل ہیں۔

اس کے متعلق کوفیوں کا قول ہے کہ حروف بالفعل کا عمل صرف ان کے اسماء تک ہی محدود ہوتا ہے۔ اور یہ خبر کو رفع نہیں دیتے چونکہ خبر اِنَّ کے دخول سے پہلے ہی مرفوع ہوتی ہے۔ اس لئے سابقہ تقاضا کے مطابق ان حروف کے داخل ہونے کے باوجود بھی وہ مرفوع ہوگی جس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حروف اس کو رفع دے رہے ہیں کہتے ہیں کہ یہ حروف اسم اور خبر دونوں میں عمل کرتے ہیں اس وجہ سے امام بیضاوی نے بصریوں کی تائید کرتے ہوئے کوفیوں کے نظریہ کا جواب یہ دیتے تھے کہ خبر بحیثیت خبر اس وقت مرفوع ہوتی ہے جب کہ وہ عوامل لفظیہ سے خالی ہو جب اس سے پہلے کوئی عامل آجائے تو اس کا وہ تقاضا ختم ہوجاتا ہے بلکہ اس وقت اس عامل کی وجہ سے منصوب یا مرفوع ہوتی ہے جیسے کان جو افعال ناقصہ سے ہے وہ اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتا ہے لیکن جب وہ جملہ اسمیہ پر داخل ہوتا ہے وہ اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتا ہے اس کی خبر کے تقاضا کی وجہ سے

مرفوع نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کو نصب دیتا ہے اس لئے ثابت ہوا کہ حروف مشبہ بالفعل کی وجہ سے ہی ان کی خبر بھی مرفوع ہے۔

کلام میں اِن کا استعمال بے شمار فائدے رکھتا ہے ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ نسبت حکمیہ میں تاکید پیدا کرتا ہے اور اس کے معنی کو پختہ کرتا ہے اسی لئے جواب قسم، دوسرے سوالات اور شک کرنے والوں کے جوابات میں اس ذکر کیا جاتا ہے قرآن مجید میں سوال کے جواب میں ذکر کرنے کی مثال مذکور ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْراً اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ

اے محبوب وہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے میں ابھی بیان کرتا ہوں تمہارے سامنے اس کا حال ہم نے بے شک اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں۔

اس آیت میں انا مکنا لہ ذی القرنین کے متعلق سوال کا جواب ہے اس لئے جواب کے شروع میں اِن ذکر کیا گیا ہے،

مزید ایک آیت میں مقام شک کی مثال ہے،

وَقَالَ مُوسٰى يَا فِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ

چونکہ فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی رسالت میں شک تھا تو آپ نے اس کے شک کا ازالہ کرنے کے لئے فرمایا، بے شک میں رب العالمین کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے کلام مخاطب کے ذہن کے مطابق چلائی جاتی ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مبرد کا وہ جواب، جو اس نے ابوالعباس الکندی کے سوال کو زائل کرنے کے لئے دیا تھا وہ ذکر فرمایا ہے ابوالعباس الکندی نے کہا کہ عربی لغت میں حشو وزائد ہیں، مبرد نے پوچھا وہ کیسے؟

اس نے کہا تیرا عبداللہ قائم (عبداللہ کھڑا ہے) کہنا ان کے اضافہ سے کلام کرنا عبداللہ کے کھڑا ہونے کے متعلق سوال کرنے والے کے شک کو زائل کرنے کے لئے ہے اور اِن عبداللہ لقائم (بے شک عبداللہ یقیناً کھڑا ہے۔) اس جملہ کے آغاز میں اِن اِن اور قائم سے پہلے لام مفتوح کا اضافہ کرنا عبداللہ کے کھڑا ہونے سے انکار کرنے والے کا جواب ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ عربی زبان حشو وزائد سے خالی ہے۔

اسم موصول چونکہ اس معرف باللام کے قائمقام ہوتا ہے اس لئے اسم موصول یا تو عہد خارجی افراد کے لئے ہوگا یا جنس اور ماہیت کو معرفہ بنانے کے لئے ہوگا اگر یہ عہد خارجی کے لئے ہو تو اس وقت اس سے مراد معین اور مخصوص کافر ہوں گے جیسے ابو لہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور یہود کے علماء (جو ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کفر پر مصر تھے) یا یہ اسم موصول جنس کے لئے ہو گا۔ اس صورت میں اس سے مراد مصر علی الکفر اور غیر مصر تمام مراد ہوں گے پھر سواء علیھم کی وجہ سے غیر مصر، ان سے خارج ہو جائیں گے (اس لئے اس سے مصر علی الکفر ہی مراد ہوں گے) کیونکہ ڈرانا یا نہ ڈرانا صرف ان ہی کے لئے مفید نہ ہوا۔

کفر کا لغوی معنیٰ نعمت کو چھپانا ہے، یہ اصل میں کفر بفتحہ ک ہے جس کا معنیٰ کسی چیز کو مطلق چھپانا ہے خواہ وہ نعمت ہو یا عدم

نعمت ہو۔ اسی لئے زراعت کرنے والے اور رات کو کافر کہتے ہیں کیونکہ زراع (کسان) بیج کو زمین میں چھپاتا ہے اور رات بھی تمام ایسی اشیاء کو اپنے اندھیرے میں چھپالیتی ہے اور شگوفہ میں پوشیدہ پھل کو کافور کہتے ہیں۔ اور شریعت کی اصطلاح میں اس چیز کو ماننے سے انکار کرنا جس کا ثبوت تواتر سے ہو کہ اس کو حضور ﷺ لے کر آئے، کفر کہلاتا ہے اور لمبی ٹوپی پہننے اور گلے میں تعویز لٹکانے اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کو کفر شمار کرنا اس وجہ سے ہے کہ وہ تکذیب قلبی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ یہ کافروں کا شعار اور ان کو پہچاننے کی علامات ہیں،

اور وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کی دل سے تصدیق کرتا ہے وہ ظاہری طور پر کافروں کے پہچاننے کی علامات اور شعار کو اپنانے کی جرات ہی نہیں کرسکتا، حالانکہ یہ چیزیں بذات خود تکذیب اور کفر نہیں بلکہ کافروں کا شعار ہیں۔

متن:

واحتجت المعتزلة بما جاء فی القرآن بلفظ الماضی علی حدوثه لاستدعائه سابقة المخبر عنه، وأجيب بأنه مقتضی التعلق وحدوثه لا يستلزم حدوث الكلام كما فی العلم.

ترجمہ:

ماضی کے جو صیغے قرآن میں ذکر کئے گئے ہیں ان سے معتزلہ نے قرآن پاک کے حدوث پر دلیل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی واقعہ کی خبر فعل ماضی کے صیغوں سے دینا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ واقعہ خبر دینے سے مسبوق ہوا اور جو مسبوق بالغیر ہو۔ وہ ازلی اور قدیم نہیں ہوسکتا۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ماضی کے صیغوں کے ساتھ قرآن کریم جو کلام نفسی ہے اس کے حدوث پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کے حدوث پر دلیل قائم کرنا درست نہیں کیونکہ مخبر عنہ کا خبر دینے کے وقت سے پہلے ہونا کلام نفسی کے حدوث پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ اس تعلق کے حدوث پر دلالت کرتا ہے جو کلام ازلی کا اس واقعہ کے ساتھ ہے کیونکہ وہ تعلق واقع کے وقوع پذیر ہونے کے بعد اس کے ساتھ ہوتا ہے اور تعلق کا حدوث کلام ازلی کے حدوث کو مستلزم نہیں۔ جس طرح اللہ تعالٰی کی صفت علم کے قدیم اور ازلی ہونے پر تمام کا اتفاق ہے لیکن اس علم ازلی کا تعلق معلوم چیز کے ساتھ اس وقت ہوتا ہے جب وہ معرض وجود میں آجاتی ہے لہٰذا علم حادث نہ ہوا بلکہ اس کا تعلق جو معلوم کے ساتھ ہے وہ حادث ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالٰی کے کلام نفسی کا وہ، تعلق جو اس واقع کے ساتھ ہے، وہ کلام نہیں ہے بلکہ حادث ہے۔

متن:

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ

خبر إن وسواء اسم بمعنى الاستواء، نعت به كما نعت بالمصادر قال الله تعالى: تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ رفع بأنه خبر إن وما بعده مرتفع به على الفاعلية كأنه قيل: إن الذين كفروا مستوٍ عليهم إنذارك وعدمه. أو بأنه خبر لما بعده بمعنى: إنذارك وعدمه سيان عليهم، والفعل إنما يمتنع الإخبار عنه إذا أريد به تمام ما وضع له. أما لو أطلق وأريد به اللفظ. أو مطلق الحدث المدلول عليه ضمناً على الاتساع فهو كالاسم في الإضافة. والإسناد إليه كقوله تعالى: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا وقوله: يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ وقولهم:

تَسْمَعُ بِالْمُعِيدِيِّ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَرَاهُ.

وإنما عدل هاهنا عن المصدر إلى الفعل لما فيه من إيهام التجدد وحسن دخول الهمزة. وأم عليه لتقرير معنى الاستواء وتأكيده. فإنهما جردتا عن معنى الاستفهام لمجرد الاستواء، كما جردت حروف النداء عن الطلب لمجرد التخصيص في قولهم: اللهم اغفر لنا أيتها العصابة.

والإنذار: التخويف أريد به التخويف من عذاب الله، وإنما اقتصر عليه دون البشارة لأنه أوقع في القلب وأشد تأثيراً في النفس، من حيث إن دفع الضر أهم من جلب النفع، فإذا لم ينفع فيهم كانت البشارة بعدم النفع أولى، وقرء أَأَنْذَرْتَهُمْ بتحقيق الهمزتين وتخفيف الثانية بين بين، وقلبها ألفاً وهو لحن لأن المتحركة لا تقلب، ولأنه يؤدي إلى جمع الساكنين على غير حده. وبتوسيط ألف بينهما محققتين، وبتوسيطها والثانية بين بين وبحذف الاستفهامية، وبحذفها وإلقاء حركتها على الساكن قبلها.

ترجمہ:

کفار کو آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا نفع مند نہ ہونے میں برابر ہے۔

سواء علیھم ..... الخ

سَواء اسم بمعنیٰ استواء ہے جو مصدر ہے اور اس کو اسی طرح ماقبل کلام کی صفت بنایا جاتا ہے جس طرح دوسری مصادر کو صفت بنایا جاتا ہے۔ (یعنی یا تو یہ بمعنیٰ مستوا اسم فاعل کے معنیٰ میں ہے اور یا اس سے پہلے مضاف محذوف ہے جو ذو ہے) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں بھی سَواء ماقبل کلام کی صفت ہے

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

اے اہل کتاب تم ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان مساوی ہے۔

اس آیت میں سَواء اعراب میں کلمۃ کے تابع ہے اور مجرور ہے اور یہ اس کی صفت نحوی ہے۔ مذکورہ آیت طیبہ میں سَواء اِن کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور سَواء کا مابعد کلام بتاویل مصدر سَواء بمعنی مستو کا فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ گویا اصل عبارت اس طرح ہے کہ،

ان الذین کفروا مستو علیہم انذارك و عدمه

بے شک کافروں کے لئے آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا مساوی ہے۔

یا مستو اپنے مابعد

انزرتھم ام لم تنذرھم

جو مبتداء ہے، کی خبر ہے۔ اس صورت میں اصل عبارت اس طرح ہوگی۔

انذارك او عدمه مستو علیہم

اس مذکورہ عبارت میں

ءانذرتھم أم لم تنذرھم

کو بتاویل مصدر کر کے مبتداء بنایا گیا ہے، حالانکہ یہ فعل ہیں اور فعل مسند الیہ نہیں ہوتا تو یہاں اس کو مبتداء کیسے بنا دیا گیا؟

اس کا جواب

والفعل انما یمتنع الاخبار عنه... الخ

کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یعنی فعل کو اس وقت مسند الیہ اور مبتداء بنانا اس وقت ممتنع ہوتا ہے جب اس سے تمام ماوضع کہ معنی مراد لیا جائے۔

تمام ماوضع لہ سے تین چیزیں مراد ہیں:

1۔ معنی مصدری پر دلالت کرتا ہے۔

2۔ وہ خاص وزن پر ہو۔

3۔ مصدری معنی کا کسی زمانہ کے ساتھ اقتران ہو۔

مگر جب اس فعل سے صرف لفظ مراد ہوں یا اس سے مصدری معنیٰ مراد ہو، جس پر وہ ضمناً دلالت کرتا ہے تو ان صورتوں میں اس کو مضاف اور مضاف الیہ اور مسند الیہ بنانا جائز ہے۔ کیونکہ اس وقت یہ اسم ہی کی طرح ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا

۴،

واذا قيل لهم امنوا

یہاں امنو، قیل کا نائب فاعل مسند الیہ ہے اور دوسری مثال،

ای یوم ینفع الصادقین صدقهم

یہاں

ینفع صدقهم یوم کا مضاف الیہ ہے۔ کیونکہ یہ مصدری معنی میں ہے

ای یوم نفعهم

اسی طرح شاعر کا قول ہے۔

تسمع بالمعیدی خیر من ان تراہ
وستعرف قدرہ ان فتح فاہ

نعمان ابن منذر نے کہا کہ تیر امعیدی کو سن لینا ہی کافی ہے، اس کے دیکھنے سے اور تو اس کی قدر معلوم کر لے گا۔ ملاقات کے وقت جب وہ تم سے اپنے منہ سے بات کرے گا۔

اس شعر میں تُسمع، سماعک کے معنی میں ہے۔

سوالِ عدول:

اس مقام پر امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک سوال کا جواب ارشاد فرما رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب یہاں اس کو مصدر کے معنی میں استعمال کرنا تھا تو اس سے فعل کی طرف عدول کیوں کیا گیا؟

جواب:

تا کہ سننے والے کے دل میں ڈرانے کے تجدد اور حدوث کا وہم پیدا کر دیا جائے کیونکہ جملہ فعلیہ حدوث اور تجدد کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ہمزہ استفہام اور ام کا فعل پر دخول استواء کے معنی میں تاکید اور پختگی پیدا کرنے کے لئے بہت بہتر ہے کیونکہ ہمزہ اور ام دو معنوں پر دلالت کرتے ہیں۔

1۔ استفہام 2۔ استواء

اس مقام پر یہ صرف استوا کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ ان کو معنی استفہام سے خالی کر دیا گیا ہے۔ اور یہ عربوں کا مروج اسلوب ہے۔ جس طرح حرف ندا دو معانی پر دلالت کرتا ہے۔

1۔ طلب 2۔ تعیین منادیٰ

لیکن بعض مقامات پر اس کو طلب کے معنی سے خالی کر دیا جاتا ہے۔ اورصرف تعیین وتخصیص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں

اللھم اغفرلنا ایتھا العصابۃ اے اللہ ہمیں بخش دے ہم ایک گروہ ہیں۔

یہاں ایتھا کے لفظ سے صرف نا ضمیر متکلم کی تخصیص مطلوب ہے یعنی نا سے مراد ہمارا گروہ ہے۔

الانذار کا معنی مطلقاً ڈرانا ہے لیکن یہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا ہے۔ اور اس مقام پر صرف اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور اللہ کریم نے اپنی عادت کے مطابق بشارت کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈرانا دل میں زیادہ اثر رکھتا ہے کیونکہ نفع حاصل کرنے کے مقابلے میں نقصان سے بچنا زیادہ ضروری ہوتا ہے تو جب ڈرانا ان کے لئے باعث نفع نہ ہوا تو بشارت بطریق اولیٰ نفع کا باعث نہ ہوگی۔

ءَاَنْذَرْتَھُمْ

میں دونوں ہمزہ کی چند قراتیں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ذکر کی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ دونوں ہمزہ کو بدستور باقی رکھتے ہوئے پڑھنا۔

2۔ دوسرے ہمزہ کو بین بین یعنی تسہیل کے ساتھ پڑھنا۔

3۔ دوسرے ہمزہ کو الف کے ساتھ قلب کر کے پڑھنا۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ ہمزہ متحرک کو الف کے ساتھ تبدیل نہیں کیا جاتا نیز اس طرح اجتماع ساکنین علیٰ غیر حدہ لازم آتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔

4۔ دونوں ہمزہ کو بدستور جاری رکھتے ہوئے اور درمیان میں الف ساکن کا اضافہ کر کے پڑھا جائے۔

5۔ دونوں ہمزوں کے درمیان الف کا اضافہ کیا جائے اور اور دوسرے ہمزہ کو تسہیل کے ساتھ پڑھا جائے۔

6۔ پہلے ہمزہ (ہمزہ استفہامیہ) کو حذف کر کے پڑھا جائے۔

7۔ پہلے ہمزہ کو حذف کر کے اور اس کی حرکت دوسرے ہمزہ کو دے کر پڑھا جائے۔

متن:

لَا يُؤْمِنُونَ

جملة مفسرة لإجمال ما قبلها فيما فيه الاستواء فلا محل لها أو حال مؤكدة. أو بدل عنه. أو خبر إن والجملة قبلها اعتراض بما هو علة الحكم.

والآية مما احتج به من جوز تكليف ما لا يطاق، فإنه سبحانه وتعالى أخبر عنهم بأنهم لا يؤمنون وأمرهم بالإيمان، فلو آمنوا انقلب خبره كذبا. وشمل إيمانهم بأنهم لا يؤمنون فيجتمع الضدان، والحق أن التكليف بالممتنع لذاته وإن جاز عقلاً من حيث

إن الاحكام لا تستدعى غرضاً سيما الامتثال، لكنه غير واقع للاستقراء، والإخبار بوقوع الشيء أو عدمه لا ينفى القدرة عليه كإخباره تعالى عما يفعله هو أو العبد باختياره، وفائدة الإنذار بعد العلم بأنه لا ينجع إلزام الحجة، وحيازة الرسول فضل الإبلاغ، ولذلك قال سَواءٌ عَلَيْهِمْ ولم يقل سواء عليك، كما قال لعبدة الاصنام سَواءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنْتُمْ صامِتُونَ.

وفى الآية إخبار بالغيب على ما هو به إن أريد بالموصول أشخاص بأعيانهم فهى من المعجزات.

ترجمہ:

یہ فاعل اور فعل مل کر جملہ مفسرہ ہے اور اس کے ماقبل کلام میں جو اجمال ہے اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ یعنی وہ چیز جس میں ڈرانا یا نہ ڈرانا مفید نہیں وہ یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے دریں صورت اس جملہ کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہوگا۔

یہ جملہ علیہم میں ھم سے حال موکدہ ہے یعنی ماقبل کلام میں تاکید پیدا کر رہا ہے۔

یا یہ ماقبل جملہ سے بدل اشتمال ہے یعنی یہ ماقبل جملہ کے متعلق معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کا متعلق ما فیہ الاستواء ہے۔

لا یومنون اپنے فاعل کے ساتھ مل کر ان کی خبر ہے اور اس سے ماقبل جملہ، جملہ معترضہ ہے اور یہ اس حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔ جو الذین کفروا پر لگایا گیا ہے، کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ کیونکہ انہیں کے لئے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔

امام بیضاوی اور تکلیف مالا یطاق کا جواز:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہے کہ یہ آیت ایسی آیات میں سے ہے جن سے ان لوگوں نے دلیل قائم کی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو ایسے عمل کا مکلف بنانا عقلاً جائز ہے جو اس کی طاقت میں نہیں۔ کیونکہ اللہ کریم نے خبر دی ہے کہ مصر علی الکفر ایمان نہیں لائیں گے اب اگر انہیں یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ ایمان لائیں، اب اگر وہ ایمان لاتے ہیں اور امنوا میں جو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں تو اس خبر کا جھوٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ نیز ان کا اس آیت لا یومنون پر بھی ایمان لانے کو وہ حکم شامل ہوگا تو اس طرح دو ضدیں جمع ہو جائیں گی۔ (ایمان لانا اور نہ لانا) او اجتماع ضدین محال ہے۔

ان دونوں دلیلوں سے ثابت ہوا کہ ان کا ایمان لانا محال ہے لیکن اس کے باوجود اللہ کریم ان کو مکلف بنا رہا ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حق بات یہ ہے کہ کسی کو ممتنع لذاتہ کا مکلف بنانا عقلاً جائز ہے کیونکہ احکام

کے مطابق عمل پیرا ہونے کا حکم دینا کسی غرض سے وابستہ نہیں ہوتا خصوصا وہ احکام جن میں مامور سے اطاعت اور اتباع کرانا مقصود ہوتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اگر شریعت کے احکام میں تتبع اور استقراء کیا جائے تو ایسا کوئی حکم موجود نہیں جس کو بجالانے کا حکم دیا گیا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے کسی کام کے واقع ہونے یا نہ ہونے کی اپنے علم ازلی کے مطابق خبر دینا اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ مامور سے اس کام کرنے کی قدرت اور آلات چھین لئے گئے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا کہ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے کسی کام کو انجام دے گا یا وہ اپنے بندوں میں سے کسی کے متعلق یہ خبر دے دے کہ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے اس کام کو عملی جامہ پہنائے گا تو یہ خبر دینا اس اس کام کے نہ کرنے کے اختیار کو سلب نہیں کرتا۔

کفار کو ڈرانے کا حکم کیوں؟

سوال: جب اللہ کریم کو یہ علم تھا کہ کافر ایمان نہیں لائیں گے اور ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا باعث نفع نہیں تو پھر ان کو ڈرانے اور تبلیغ کا حکم کیوں دیا گیا؟

جواب: اتمام حجت کے لئے یہ حکم دیا گیا تاکہ بروز قیامت یہ نہ کہیں کہ نہ ہی ہمیں تبلیغ کی گئی اور نہ ہی عذاب سے ڈرایا گیا جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ عزوجل ہے۔

اِنا کنا ھٰذا غفلین، لو لا ارسلت اِلینا رسولاً فنتبع ایتك ونكون من المومنین۔

ہم تو اس سے غافل تھے آپ نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی اتباع کرتے اور مومنین سے ہو جاتے۔

مزید اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو تبلیغ کرنے کی فضیلت اور ثواب مل جائے اسی لئے فرمایا،

سواءٌ علیھم

یعنی ان کافروں کو ڈرانا یا نہ ڈرانا مفید نہیں، یہ نہیں فرمایا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لئے جیسا کہ بتوں کے متعلق فرمان باری تعالیٰ،

سواءٌ علیکم ادعو تموھم ام انتم صامتون

تمہارے اوپر برابر ہے چاہے تم ان کو پکارو یا خاموش رہو۔

اللہ کریم نے جو ان کے ایمان نہ لانے کی خبر دی وہ غیب ہے جس پر آیت کریمہ الذین کفروا دلالت کرتی ہے کہ کہ اس سے مخصوص کافر مراد لئے جائیں مثلاً عتبہ، شیبہ اور ابولہب وغیرہ۔ چونکہ بالواسطہ یہ خبر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے سامنے پیش کی اس لئے یہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ ہوئی۔

مفہوم کفر:

(ک ف ر) الکفر (Infidelity)

اصل میں کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشتکار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لئے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔

سب سے بڑا کفر:

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا شریعت حقہ یا نبوت کا انکار ہے۔ پھر کفران کا لفظ زیادہ نعمت کا انکار کرنے کے معنی ہیں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکار یہ دین کے معنی میں اور کفور کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 99) تو ظالم نہیں مانتے بے ناشکری کئے۔

مساواۃ کی تحقیق:

(س و ی) المساواۃ (Equality)

مکان سوی و سواء کے معنی وسط کے ہیں اور سواء و سوی و سوی اسے کہا جاتا ہے جس کی نسبت دونوں طرف مساوی ہوں اور یہ یعنی سواء وصف بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور ظرف بھی لیکن اصل میں یہ مصدر ہے قرآن میں ہے۔

"فِيْ سَوَاءِ الْجَحِيْمِ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 55) تو اس کو وسط دوزخ میں۔

"وَسَوَاءَ السَّبِيْلِ" (سورۃ القصص آیت نمبر 22) تو وہ) سیدھے راستے سے۔

"فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 58)

تو ان کا عہد انہیں کی طرف پھینک دو اور برابر کا جواب دو۔

تو یہاں علی سواء سے عادلانہ حکم مراد ہے جیسے فرمایا:

"اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 64)

ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں یکساں ہے۔

اور آیات: "سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 6)

انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔

"سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" (سورۃ المنافقون آیت نمبر 6)

ان پر ایک سا ہے تم ان کی معافی چاہو یا نہ چاہو۔

تحقیقِ الانذار اور انذار و نذیر میں فرق:

(ن ذ ر) النذر (Frighten)

الانذار کے معنی کسی خوفناک چیز سے آگاہ کرنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل تبشیر کے معنی کسی اچھی بات کی خوشخبری سنانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى" (سورۃ اللیل آیت نمبر 14)

ستو میں تمہیں ڈراتا ہوں اس آگ سے جو بھڑک رہی ہے۔

النذیر کا معنی:

کے معنی منذر یعنی ڈرانے والا ہیں، اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس میں خوف پایا جائے خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَمَا اَنَا اِلَّا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 9) اور میں نہیں مگر صاف ڈر سنانے والا۔

ام کا استعمال:

(ا م حرف) ام

جب یہ ہمزہ استفہام کے بالمقابل استعمال ہو تو بمعنی اور ہوتا ہے جیسے ازید فی الدار ام عمرو۔ یعنی ان دونوں میں سے کون ہے؟ اور اگر ہمزہ استفہام کے بعد نہ آئے تو بمعنی بل ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"اَمۡ زَاغَتۡ عَنۡهُمُ الۡاَبۡصَارُ" (سورۃ ص آیت نمبر 63)

یا آنکھیں ان کی طرف سے پھر گئیں۔

ایمان کے معانی:

(ا م ن) الایمان

کے ایک معنی شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 62)

بیشک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔

اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہو سکتا ہے جو توحید کا اقرار کر کے شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو جائے اور بعض

نے آیت،

"وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ" (سورۂ یوسف آیت نمبر 106)
اور ان میں اکثر وہ ہیں کہ اللہ پر یقین نہیں لاتے مگر شرک کرتے ہوئے۔

[سورة البقرة (2) : آية 7]

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (7)

ترجمہ:

"اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب"۔

متن:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ

تعليل للحكمِ السابق وبيان لما يقتضيه.

والختم الكتم، سمي به الاستيثاق من الشيء بضرب الخاتم عليه لأنه كتم له والبلوغ آخره نظراً إلى أنه آخر فعل يفعل فى إحرازه. والغشاوة: فعالة من غشاه إذا غطاه بنيت لما يشتمل على الشيء، كالعصابة والعمامة ولا ختم ولا تغشية على الحقيقة، وإنما المراد بهما أن يحدث فى نفوسهم هيئة تمرنهم على استحباب الكفر والمعاصي، واستقباح الإيمان والطاعات بسبب غيهم، وانهماكهم فى التقليد وإعراضهم عن النظر الصحيح، فتجعل قلوبهم بحيث لا ينفذ فيها الحق، وأسماعهم تعاف استماعه فتصير كأنها مستوثق منها بالختم، وأبصارهم لا تجتلى الآيات المنصوبة لهم فى الانفس والآفاق كما تجتليها أعين المستبصرين، فتصير كأنها غطى عليها. وحيل بينها وبين الإبصار، وسماه على الاستعارة ختماً وتغشية. أو مثل قلوبهم ومشاعرهم المؤوفة بها بأشياء ضرب حجاب بينها وبين الاستنفاع بها ختماً وتغطية، وقد عبر عن إحداث هذه الهيئة بالطبع فى قوله تعالى: أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ. وبالاغفال فى قوله تعالى: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا، وبالاقساء فى قوله تعالى: وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً وهى من حيث إن الممكنات بأسرها مستندة إلى الله تعالى واقعة بقدرته أسندت إليه

ومن حيث إنها مسببة مما اقترفوه بدليل قوله تعالى: بَلْ طَبَعَ اللهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ وقوله تعالى: ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وردت الآية ناعية عليهم شناعة صفتهم ووخامة عاقبتهم.

ترجمہ:

"اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب"۔

یہ آیت کریمہ ماقبل کلام میں بیان کردہ حکم کی علت سبب اور ان کا مقتضی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی وضاحت اور بیان بھی ہے۔

مفرد کلمات کے معانی:

الختم یہ بمعنی کتم ہے جس کا مطلب چھپانا ہے۔

2۔ کسی چیز پر مہر لگا کر اسے قابل وثوق بنا دینے کو بھی ختم کہتے ہیں کیونکہ کسی چیز پر مہر لگا کر اس چیز کو پوشیدہ رکھنا ہوتا ہے۔

3۔ وہ ختم کا معنی کسی چیز کے آخر اور انتہاء کو پہنچنا بھی ہے کیونکہ کسی چیز کے محفوظ کرنے میں مہر لگانا آخری فعل ہوتا ہے۔

الغشاوۃ یہ فعالہ کے وزن پر ہے اور غشاہ کا معنی اس نے اس کو ڈھانپ لیا سے مشتق ہے اور یہ وزن اس چیز پر دلالت کرنے کے لئے بنایا گیا ہے جو کسی چیز پر مشتمل اور لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ جیسے عصابۃ جس کا معنی گروہ اور پٹی ہے کیونکہ گروہ میں بھی کچھ افراد ہوتے ہیں اور پٹی زخم پر لپٹی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح عمامۃ بمعنی پگڑی فعالۃ کے وزن پر ہے کیونکہ وہ بھی سر کو ڈھانپے ہوئے ہوتی ہے۔

(مزید امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کا جواب دے رہے ہیں کہ جب ان کے دلوں، کانوں پر مہر لگا دی گئی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا تو ایمان نہ لانے کی وجہ سے انہیں عذاب عظیم کی وعید کیوں سنائی گئی ہے۔)

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ حقیقت میں نہ تو مہر لگائی گئی اور نہ ان کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل کئے گئے بلکہ مجازاً اس حقیقت کو بیان کیا جا رہا ہے جو انہوں نے خود پیدا کرلی کہ ناحق کہ بات سمجھتے ہیں اور نہ اسے سنتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی قدرت کی آیات کو دیکھتے ہیں کیونکہ جب انہوں نے کفر عناد اور گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے خود ایسی حالت پیدا کرلی تو اسی کو ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا اس حالت نے انہیں کفر اور معاصی کو پسند کرنے اور ایمان واطاعت کو ناپسند کرنے کا عادی بنا دیا ہے اور اس حالت کے پیدا ہونے کے سبب ان کی گمراہی۔ اندھی تقلید میں انہماک ہے جس سے وہ صحیح نظر و فکر سے اعراض کرنے لگے اور اس حالت نے ان کو ایسا بنا دیا کہ حق کی بات ان کے دلوں پر اثر انداز نہ ہوتی اور اس نے کانوں کو ناکارہ اور ماوف بنا دیا جس کی وجہ سے وہ حق کی بات سننے سے نفرت کرنے لگے تو گویا وہ ایسے ہو گئے جیسے ان پر مہر لگا کر انہیں بند کر دیا گیا اور ان کی آنکھیں اسی طرح ہو گئے کہ وہ ان آیات کو جو ان کے نفوس و اطراف عالم میں پھیلا دی گئی ہیں۔ انہیں دیکھنے سے عاجز

ہو گئے تو اب ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ ان کی آنکھیں دیکھتی ہی نہیں اور نہ ہی ان آیات سے بصیرت حاصل کرتی ہیں تو گویا ان کے سامنے پردہ حائل کر کے انہیں ڈھانپ دیا گیا ہو اور وہ پردہ ان آیات اور ان کی روشن نگاہوں کے درمیان دیکھنے میں آٹ بن گیا اب اسی حالت کو بطورِ استعارہ تمثیلیہ اللہ کریم نے ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تعبیر فرمادیا یا ان کے دلوں پر نا کارہ مشاعر کو ایسی اشیاء کے ساتھ تشبیہ وے دی گئی ہے جن کے اپنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے درمیان پردے حائل کر دیئے گئے ہوں تو اس چیز کو ختم اور تغشیۃ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

اور یہ کیفیت جو ان کے اندر ان کی غلط کاریوں کی وجہ سے پیدا کر دی گئیں اس کو کبھی طبع کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے فرمایا،

أُولٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ. (سورۃ النحل آیت نمبر 108)

یہ ہیں وہ جن کے دل اور کان اور آنکھوں پر اللہ نے مُہر کر دی ہے۔

اور کبھی اس حالت کو اغفال کے ساتھ تعبیر کیا جیسے ارشاد باری تعالیٰ،

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (سورۃ الکهف آیت نمبر 28)

اور اس کا کہانہ مانو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔

اور کبھی اس کو قساوت کے ساتھ بیان کیا گیا جس طرح اللہ کریم کا ارشاد ہے،

وجعلنا قلوبهم قسيةً اور اُن کے دل سخت کر دیئے۔ (سورۃ المائدہ آیت نمبر 13)

اور اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممکنات میں سے ہے اور تمام ممکنات کی نسبت اللہ کریم ہی کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ تمام کی تمام حقیقت اس کی قدرت سے معرض وجود میں آتی ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ ان کے دلوں اور آنکھوں پر مہر لگانا اور ان کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل کرنا ان کے کفر و عناد اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہے۔ یعنی اس حالت کے پیدا کرنے کے وہ خود سبب ہیں۔

اللہ کریم کا قول ہے: بل طبع الله عليها بكفرهم

کہ اللہ کریم نے ان پر کفر کی وجہ مہر لگادی ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

ذالك بانهم امنوا ثم كفروا فطبع على قلوبهم

اور یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ وہ ایمان لے آئے پھر مرتد ہو کر کفر اختیار کیا تو ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی اس لئے ان کے برے اور قبیح فعل اور برے انجام کی مزاحمت اور ان کی قباحت کو ظاہر کرنے کے لئے یہ آیت طیبہ ذکر کی گئی ہے۔

متن:

واضطربت المعتزلة فيه فذكروا وجوهاً من التأويل:

الاول: أن القوم لما أعرضوا عن الحق وتمكن ذلك في قلوبهم حتى صار كالطبيعة لهم، شبه بالوصف الخلقي المجبول عليه.

الثاني: أن المراد به تمثيل حال قلوبهم بقلوب البهائم التي خلقها الله تعالى خالية عن الفطن، أو قلوب مقدر ختم الله عليها، ونظيره: سال به الوادي إذا هلك. وطارت به العنقاء إذا طالت غيبته.

الثالث: أن ذلك في الحقيقة فعل الشيطان أو الكافر، لكن لما كان صدوره عنه بإقداره تعالى إياه أسند إليه إسناد الفعل إلى المسبب.

الرابع: أن أعراقهم لما رسخت في الكفر واستحكمت بحيث لم يبق طريق إلى تحصيل إيمانهم سوى الإلجاء والقسر، ثم لم يقسرهم إبقاء على غرض التكليف، عبر عن تركه بالختم فإنه سد لإيمانهم. وفيه إشعار على تمادي أمرهم في الغي وتناهي انهماكهم في الضلال والبغي.

الخامس: أن يكون حكاية لما كانت الكفرة يقولون مثل: قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ تهكماً واستهزاءً بهم كقوله تعالى: لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ الآية.

ترجمہ:

ختم اور غشاوہ کو اللہ کی طرف منسوب کرنے میں اختلاف:

معتزلہ، اہلسنت اجماعت اور اصحاب ظاہر ان افعال کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کرنے میں علیحدہ علیحدہ نظریات رکھتے ہیں۔

جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

اصحاب ظاہر کا نظریہ:

کا کہنا ہے کہ یہاں ختم اور غشاوۃ کی نسبت اللہ کریم کی طرف حقیقی ہے وہ کہتے ہیں کفر اور معاصی کا ارتکاب کرنے والوں کے کانوں اور دلوں پر فی الحقیقت مہر لگادی گئی ہے جس کی وجہ سے نہ وہ حق بات قبول کر سکتے ہیں اور نہ ہی اسے سن سکتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل کر دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے حق پر دلالت کرنے والی آیات کو نہ وہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان سے بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔

امام بیضاوی ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ حقیقت میں نہ ان کے دل اور کان مہر زدہ ہیں اور نہ ہی ان کی آنکھوں کے سامنے پردے لٹکائے گئے ہیں۔

اس لئے یہاں ختم اور غشاوۃ کی نسبت اللہ کریم کی طرف حقیقی نہیں بلکہ ان کو بطور استعارہ تمثیلیہ ذکر کیا گیا ہے اور ان کے ناکارہ اعضاء کو ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور مشبہ کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے انہوں نے فرمایا،

لا ختم ولا تغشیه

یعنی نہ ہی حقیقت میں مہر لگائی گئی اور نہ ہی ان کی آنکھوں پر پردے ڈالے گئے۔

معتزلہ کا نظریہ:

کہتے ہیں کہ یہاں ان الفاظ کا نہ حقیقی معنیٰ مراد لینا جائز ہے اور نہ ان کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا جائز ہے۔ کیونکہ کسی کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ڈالنا اور نیک اعمال سے روکنا بہت برا ہے اور جس طرح برے افعال سر انجام دینا جائز نہیں اسی طرح ان کو اللہ کریم کی طرف منسوب کرنا بھی جائز نہیں اس لئے یہاں ان کا مجازی معنی مراد ہوگا جس کی چند درج ذیل توجیہات ہو سکتی ہیں۔

1۔ یہاں پر اللہ کریم نے کفار کے حق سے اعراض کرنے اور ان کے دلوں میں کفر کے راسخ ہونے کو تخلیقی وصف کے ساتھ تشبیہ دی ہے یعنی کفر اور گمراہی ان کے دلوں میں اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ گویا ان پر مہر لگا دی گئی ہے اس لئے وہ حق قبول کرنے سے رکے ہوئے ہیں اور اس تشبیہ دینے کو ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تعبیر فرمایا۔

2۔ کفار کے ایمان سے خالی دلوں کو ان جانوروں کے دلوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی جو عقل سے خالی ہیں یا ان کو ایسے دلوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جن کے متعلق فرض کر کیا گیا ہے کی ان پر مہر لگ چکی ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے کسی کی ہلاکت کو وادی کی طرف اور لمبی جدائی کو عنقاء کی طرف منسوب کر لیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ

سال به الوادی

کہ وادی اسے بہا کر لے گئی اور

طارت به العنقاء

عنقاء پرندہ اسے اڑا کر لے گیا۔ حالانکہ نہ ہی وادی نے کسی کو ہلاک کیا اور نہ ہی عنقاء اڑا کر لے گیا۔

3۔ ختم اور اضلال در حقیقت شیطان یا کافر کا فعل ہے۔ لیکن ان سے یہ فعل اللہ کریم کے انہیں قدرت دینے سے صادر ہوا اس لئے اس کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی جیسے سبب کی نسبت مسبب کی طرف کر دی جاتی ہے یہ اسناد حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے۔

4۔ کافروں کے دلوں میں کفر اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ سوائے جبر و اکراہ کے ایمان لانے کا کوئی راستہ باقی نہ تھا، اور

اللہ کریم عزّوجلّ نے انہیں مکلف بنانے کی غرض سے اور سزا و جزا کے مستحق ہونے کی وجہ سے ان پر جبر و اکراہ نہیں کیا بلکہ انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا اور ایمان لانے پر مجبور نہ کرنا گویا ایمان لانے سے روکنا تھا تو اسی کو ختم اور غشاوۃ کے ساتھ تشبیہ دے کر تعبیر کر دیا۔

5۔ یہ ختم اور اضلال آخرت میں ہوگا اور اس فعل کو فعل ماضی کے ساتھ اس لئے بیان فرمادیا کہ اس کا وقوع یقینی تھا اور اس توجیہہ پر فرمان باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔

ونحشرھم یوم القیامة علی وجوھھم عمیًا وبکمًا وصمًا

قیامت کے دن چہروں کے بل اندھا، گونگا اور بہرہ کرکے اٹھائیں گے۔

متن:

السادس: أن ذلك في الآخرة، وإنما أخبر عنه بالماضي لتحققه وتيقن وقوعه ويشهد له قوله تعالى:

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى وُجُوهِهِمْ عُمْياً وَبُكْماً وَصُمّاً.

السابع: أن المراد بالختم وَسْمُ قُلوبِهم بسمة تعرفها الملائكة، فيبغضونهم وينفرون عنهم، وعلى هٰذا المنهاج كلامنا وكلامهم فيما يضاف إلى الله تعالى من طبع وإضلال ونحوهما.

ترجمہ:

6۔ چونکہ کفار خود کہا کرتے تھے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کام کی آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اس کے سمجھنے سے ہمارے دلوں پر پردہ ہے کیونکہ وہ یہ بات سمجھتے ہی نہیں اور ہمارے کانوں پر بوجھ ہے کہ وہ حق کی بات سنتے ہی نہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے پردے حائل ہیں کہ وہ آیات کو دیکھتے ہی نہیں تو اسی کو بطور استہزاء انہی کے الفاظ میں نقل کر دیا گیا ہے۔

7۔ ختم سے مراد کفار کے دلوں پر اور چہروں پر آخرت میں ایسے نشانات لگانا ہے جن سے ملائکہ انہیں پہچان لیں اور ان سے بغض اور نفرت کرنے لگیں اور یہ نشانات ایمان نہ لانے اور کفر اختیار کرنے ہوں گے ان ہی نشانات کو غشاوۃ اور ختم سے تعبیر کر دیا۔

متن:

وعَلى سَمْعِهِمْ

معطوف على قلوبهم لقوله تعالى: وَخَتَمَ عَلَى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وللوفاق على الوقف عليه،

ولأنهما لما اشتركا فى الإدراك من جميع الجوانب جعل ما يمنعهما من خاص فعلهما الختم الذى يمنع من جميع الجهات، وإدراك الابصار لما اختص بجهة المقابلة جعل المانع لها عن فعلها الغشاوة المختصة بتلك الجهة، وكرر الجار ليكون أدل على شدة الختم فى الموضعين واستقلال كل منهما بالحكم. ووحد السمع للأمن من اللبس واعتبار الاصل، فإنه مصدر فى أصله والمصادر لا تجمع. أو على تقدير مضاف مثل وعلى حواس سمعهم.

والابصار جمع بصر وهو: إدراك العين، وقد يطلق مجازاً على القوة الباصرة، وعلى العضو وكذا السمع، ولعل المراد بهما فى الآية العضو لأنه أشد مناسبة للختم والتغطية، وبالقلب ما هو محل العلم وقد يطلق ويراد به العقل والمعرفة كما قال تعالى: إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ. وإنما جاز إمالتها مع الصاد لأن الراء المكسورة تغلب المستعلية لما فيها من التكرير. وغشاوة رفع بالابتداء عند سيبويه، وبالجار والمجرور عند الاخفش، ويؤيده العطف على الجملة الفعلية. وقرء بالنصب على تقدير، وجعل على أبصارهم غشاوة، أو على حذف الجار وإيصال الختم بنفسه إليه والمعنى: وختم على أبصارهم بغشاوة، وقرء بالضم والرفع، وبالفتح والنصب وهما لغتان فيها. و "غشوة" بالكسر مرفوعة، وبالفتح مرفوعة ومنصوبة و "عشاوة" بالعين الغير المعجمة.

ترجمہ:

مذکورہ بالا عبارت میں وعلی سمعھم کا عطف علی قلوبھم پر ہے اور اس عطف کی تائید میں تین دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

1۔ قرآن کریم کو ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ ارشار فرماتا ہے،

ختم الله على سمعهم و قلبه

یہاں پر قلب کا عطف سمعہ پر ہے اور یہ اس قول کا مصداق ہے یفسر القرآن بعضہ بعضا کہ قرآن کریم کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی وضاحت کرتا ہے۔

2۔ تمام قراء کا اس پر اتفاق ہے کہ علی سمعھم پر وقف تام کیا جاتا ہے جو اس کا مابعد سے اعرابی تعلق منقطع کر دیتا ہے۔

3۔ کیونکہ سمع اور قلب تمام جہات سے ادراک حاصل کرنے میں شریک ہیں اس لئے ان دونوں کو ان کے خاص فعل

ادراک سے روکنے کے لئے جو مانع بنایا گیا ہے، وہ ختم ہے جو ساری جہات سے ادراک کرنے سے روکتی ہے یہ بھی علی سمعهم کے علی قلوبهم پر عطف کا تقاضا کرتا ہے چونکہ ابصار کا ادراک صرف سامنے اور مقابلہ والی جہت کے ساتھ خاص ہے اس لئے مانع بھی وہ بنایا جو ان کے سامنے والی جہت سے ادراک کرنے سے روک دے اور وہ ہے غشاوۃ۔

معطوف علیہ اور معطوف پر علی حرف جر مکرر ذکر کیا گیا ہے تا کہ دونوں مقامات یعنی سمع اور قلب پر مہر کی شدت پر دلالت کرے اور دونوں کے مستقل بالحکم ہونے کو ظاہر کرے کیونکہ جب حرف جر مکرر ہوگا تو اس کا عامل بھی مکرر ہوگا اور عامل کا تکرار اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مہر بھی شدید ہوگی اور معطوف و معطوف علیہ پر بھی مستقل حکم ہوگا۔ اس مقام پر علی سمعهم کو علی قلوبهم پر عطف کیا گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ معطوف علیہ جمع ہے اور معطوف واحد ہے جس کو جمع کی ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے یہ اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ یہاں بھی علی اسماعهم ہونا چاہئے تھا نہ کہ علی سمعهم۔

تو امام بیضاوی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ سمع کے لفظ کو مفرد لانے کی تین وجوہات ہیں۔

1۔ یہاں التباس کا اندیشہ ہے کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ مخاطبین پر یہ بات ملتبس نہیں ہوگی کہ ایک ہی کان اور سمع میں کفار مشترک ہوں گے کیونکہ سمع بمعنی کان ان اشیاء میں سے ہے جو متصل ہوتی ہیں اور اس کو ہر ایک سمجھتا ہے۔ کہ کان ہر فرد کے الگ ہی ہوتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

اشتریت راس کبشتین

میں نے دو مینڈھوں کا سر خریدا اب ہر ایک کو معلوم ہے کہ دو مینڈھوں کا ایک سر نہیں ہوتا بلکہ دو الگ الگ ہوتے ہیں چونکہ التباس کا اندیشہ نہیں اس لئے راس واحد ذکر کر دیا اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں ہوگا۔

2۔ چونکہ سمع مصدر ہے اور مصدر ہمیشہ واحد ہی ذکر کیا جاتا ہے اس لئے اصل کا اعتبار کرتے ہوئے سمع کا لفظ واحد ذکر فرمادیا۔

3۔ یا سمع سے پہلے مضاف محذوف ہے اور محذوف پر اعتماد کرتے ہوئے سمعهم ذکر فرمادیا اصل عبارت، علی حواس سمعهم ہے۔

ولابصار بصر کی جمع ہے جس کا معنی ہے ادراک العین یعنی آنکھوں سے ادراک کرنا، لیکن مجازاً اس کا اطلاق قوت باصرہ اور دیکھنے کے آلات پر ہوتا ہے یہاں بھی اس سے مراد قوت باصرہ یا آلہ ہے اس لئے اس کو جمع لایا گیا۔ اسی طرح سمع کا بھی مجازاً قوت سماعت اور سننے کے آلہ یعنی کان پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن ان دونوں سے عضو مراد ہے۔

جس کے ساتھ دیکھا اور سنا جا سکتا ہے کیونکہ مہر لگانے اور ڈھانپنے کے لئے عضو ہی مراد لینا مناسب ہے اور قلب سے مراد گوشت کا وہ ٹکڑا مراد ہے جو صنوبری شکل کا ہوتا ہے اور علم کا محل ہوتا ہے اور مجازاً اس کا اطلاق عقل اور معرفت پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد:

اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ.
بے شک اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جس کے پاس عقل ومعرفت ہے۔
یہاں لفظ قلب عقل ومعرفت کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

علی ابصارھم

میں صاد کر راء کے مخرج کی طرف امالہ کرنا بھی جائز ہے باوجود اس بات کے کہ صاد حروف مستعلیہ میں سے ہے اور ان میں امالہ جائز نہیں۔ کیونکہ امالہ کا مطلب ہے کہ فتح اور الف کو کسرہ اور یاء کی طرف مائل کر کے پڑھا جائے یعنی ان کو ادا کرتے ہوئے آواز پست کی جائے۔ جبکہ حروف مستعلیہ کو ادا کرتے ہوئے آواز کو بلند کیا جاتا ہے اور اس مقام پر امالہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ الف کے بعد راء مکسور ہے جس کو ادا کرتے ہوئے مخرج میں تکرار پیدا ہوتا ہے گویا راء مکسورہ دو راء کے قائمقام ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو حروف مستعلیہ پر غلبہ دیتے ہوئے الف اور فتحہ کو یاء کے مخرج کی طرف مائل کر کے پڑھا جاتا ہے اور غشاوہ نکرہ ہونے کے باوجود سیبویہ کے نزدیک مبتداء ہے اور مرفوع ہے، اور اخفش کے نزدیک یہ ظرف کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اس جملہ

غشاوة علی ابصارھم

کو ختم اللہ (جملہ فعلیہ) پر عطف کرنا بھی اسی کی تائید کرتا ہے اور غشاوۃ کو فعل محذوف کا مفعول بناتے ہوئے منصوب بھی پڑھا گیا ہے اور اس سے پہلے جعل فعل محذوف ہوگا اصل عبارت یوں ہوگی۔

وجعل علی ابصارھم غشاوة

اور غشاوۃ سے پہلے حرف جر تھا جس کو حذف کر کے فعل کو بلا واسطہ اس کی طرف متعدی کر دیا گیا ہے۔ اصل میں بغشاوۃ تھا اور اس کو عین کے ضمہ کے ساتھ آخری حرف کے رفع کے ساتھ اور عین کے فتحہ اور آخری حرف۔ کے نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

یعنی غُشاوۃ اور غَشاوۃ یہ دونوں لغتیں عام مشہور ہیں۔ اس کو غشاوۃً اور غشاوۃٍ بھی پڑھا گیا ہے اور اسی طرح غِشوَۃ، غشوۃ اور غَشووۃ بھی پڑھا گیا ہے اور بعض قاریوں نے غشاوۃ کو عشاوۃ (ع کے ساتھ) بھی پڑھا ہے۔

متن:

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

وعيد وبيان لما يستحقونه. والعذاب كالنكال بناءً ومعنى تقول: عذب عن الشيء ونكل عنه إذا أمسك، ومنه الماء العذب لأنه يقمع العطش ويردعه ولذلك سمي نقاخاً وفراتاً. ثم اتسع فأطلق على كل ألم قادح وإن لم يكن نكالاً، أي: عقاباً يردع

الجانى عن المعاودة فهو أعم منهما. وقيل اشتقاقه من التعذيب الذى هو إزالة العذب كالتقذية والتمريض، والعظيم نقيض الحقير، والكبير نقيض الصغير، فكما أن الحقير دون الصغير، فالعظيم فوق الكبير، ومعنى التوصيف به أنه إذا قيس بسائر ما يجانسه قصر عنه جميعه وحقر بالإضافة إليه ومعنى التنكير فى الآية أن على أبصارهم نوع غشاوة ليس مما يتعارفه الناس، وهو التعامى عن الآيات، ولهم من الآلام العظام نوع عظيم لا يعلم كنهه إلا الله.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ میں بھی کافروں کے لئے وعید ہے اور اس سزا کا ذکر بھی جس کے وہ مستحق ہیں۔ عذاب کا لفظ معنی اور صیغہ کے اعتبار سے نکال کی طرح ہے یعنی دونوں لفظوں کا ایک ہی معنی ہے اور ان کا معنی روکتا ہے۔ عرب کہتے ہیں

عذب عن الشي و نكل عنه اذا امسك

جب کوئی شخص کسی کام سے رک جائے تو کہتے ہیں کہ وہ اس سے رک گیا اور اسی سے میٹھے پانی کو الماء العزب کہتے ہیں کیونکہ یہ پیاس کو ختم کر دیتا ہے اور روک دیتا ہے اسی وجہ سے شیریں پانی کو نقاح اور فرات بھی کہتے ہیں پھر مجازاً اس کا اطلاق ہر بوجھل درد پر ہونے لگا اگر چہ وہ اس سزا سے نہ ہو جو مجرم کو دوبارہ جنایت کرنے سے روک دیتی ہے اور یہ لفظ یعنی عذاب نکال اور عقاب دونوں سے عام ہے اور بعض نے کہا عذاب کا لفظ تعذیب سے بنا ہے جس کا مطلب ہے عمدہ چیز کو زائل کرنا جس طرح تقذیۃ کا معنی آنکھ سے تنکے کو دور کرنا اور تمریض کا معنی مرض کو دور کرنا ہے یعنی مریض کی تیارداری اس طرح اچھے انداز میں کرنا کہ اس کا مرض زائل ہو جائے۔ اور حقیر عظیم کی ضد ہے جیسے کبیر کا لفظ صغیر کی ضد ہے جس طرح حقیر، صغیر سے کمتر ہوتا ہے اسی طرح عظیم کبیر سے بلند تر ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر عذاب کو عظیم کی صفت کے ساتھ موصوف کرنا اس وجہ سے ہے کہ جب اس کا دوسرے عذابوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو وہ سارے اس سے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور اس سے مقابلہ میں قاصر اور حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ اور آیت طیبہ میں عظیم کو نکرہ ذکر کرنا اس وجہ سے ہے کہ ان کی آنکھوں پر جو پردہ ہے وہ اس قسم کا پردہ نہیں جس سے عام لوگ متعارف ہوں اور وہ آیات بینات کو دیکھنے سے جان بوجھ کر اندھے بنے ہوئے ہیں اور ان کے لئے عظیم دردوں سے ایک عظیم الشان عذاب کی قسم ہے جس کی حقیقت اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

الختم کا مفہوم:

(خ ت م) الختم والطبع۔ (Seal)

کے لفظ دو طرح سے استعمال ہوتے ہیں کبھی تو ختمت اور طبعت کے مصدر ہوتے ہیں اور اس کے معنی کسی چیز پر مہری کی

طرح نشان لگانا کے ہیں اور کبھی اس نشان کو کہتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا ہے۔ مجازاً کبھی اس سے کسی چیز کے متعلق وثوق حاصل کرلینا اور اس کا محفوظ کرنا مراد ہوتا ہے جیسا کہ کتابوں یا دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کردیا جاتا ہے۔ کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔ قرآن میں ہے۔

"خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 7)

اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے۔

"وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً" (سورۃ الجاثیۃ آیت نمبر 23)

اور اس کے کان اور دل پر مُہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈالا۔

اور کبھی کسی چیز کا اثر حاصل کرلینے سے کنایہ ہوتا ہے جیسا کہ مہر نقش ہوجاتا ہے اور اسی سے ختمت القرآن کا محاورہ ہے۔ یعنی قرآن ختم کرایا۔ اور آیت کریمہ:

"خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 7)

اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے۔

اور آیت:

"قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 46)

تم فرماؤ بھلا بتاؤ تو اگر اللہ تمہارے کان اور آنکھ لے لے اور تمہارے دلوں پر مُہر کردے۔

میں عادت الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اعتقاد باطل یا محرمات کے ارتکاب میں حد کو پہنچ جاتا ہے اور کسی طرح حق کی طرف (التفات نہیں کرتا تو اس کی ہیئت نفسانی کچھ ایسی بن جاتی ہے کہ گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی خوبی بن جاتی ہے۔ گویا اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

"اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ" (سورۃ النحل آیت نمبر 108)

یہ ہیں وہ جن کے دل اور کان اور آنکھوں پر اللہ نے مُہر کردی ہے۔

اسی طرح آیات کریمہ:

"وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 28)

جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام حد سے گزر گیا۔

"وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 25)

اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔

"وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 13)

اوران کے دلوں کو سخت کر دیا۔

میں افعال کن اور قساوۃ سے بھی علی الترتیب یہی معنی مراد ہیں۔

قولِ جبائی:

جبائی کہتے ہیں کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے ان کے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔ لیکن یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامات سے بے نیاز ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنی ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

" **اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ** " (سورۃ یٰسٓ آیت نمبر 65)

آج ہم ان کے مونہوں پر مُہر کر دیں گے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کلام نہیں کر سکیں گے اور آیت میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین فرمانے کے معنی یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آمد سے سلسلہ نبوت کی تکمیل کر دیا ہے (اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔

مِسک کی مہر:

اللہ کریم کا فرمان آیت: " **خِتٰمُهٗ مِسْكٌ** " (سورۃ المطففین آیت نمبر 26)

جس کی مُہر مسک کی ہوگی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ختام کے معنی مایختم بہ کے ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے مگر آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا آخری لفظ اور بیان میں باقی ماندہ جھوٹ مسک کی طرح مہکے گا اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی مگر یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ شراب کو بذات خود لذت ہونا چاہیے اگر وہ بذات خود لذت لذیذ نہ ہو تو اس پر مسک کی مہر لگانا چنداں مفید نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کی لذت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔

نوٹ: لفظِ اللہ کی تحقیق گزر گئی ہے۔

معنیِ قلب:

(ق ل ب) قلوب جمع قلب

الشئ کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے قلب الثوب (کپڑے کو الٹنا) اور قلب الانسان کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ "(سورۃ العنکبوت آیت نمبر 21)

عذاب دیتا ہے جسے چاہے اور رحم فرماتا ہے جس پر چاہے اور تمہیں اسی کی طرف پھرنا ہے۔

معنیٔ سماعت:

(س م ع) السمع۔ قوت سامعہ (Hearing)

کان میں ایک حاسہ کا نام ہے جس کے ذریعہ آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور اس کے معنی سننا (مصدر) بھی آتے ہیں اور کبھی اس سے خود کان مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 7)

اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی۔

اور کبھی لفظ سماع کی طرح اس سے مصدری معنی مراد ہوتے ہیں (یعنی سننا) چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ "(سورۃ الشعراء آیت نمبر 212)

وہ تو سننے کی جگہ سے دور کر دیے گئے ہیں۔

"اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ" (سورۃ ق آیت نمبر 37)

یا کان لگائے اور متوجہ ہو۔

اور کبھی سمع کے معنی فہم وتدبر اور کبھی طاعت بھی آجاتے ہیں مثلاً تم کہو۔ اسمع ما اقول لک میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو لم تسمع ما قلت لک تم نے میری بات سمجھی نہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

"وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا "(سورۃ الانفال آیت نمبر 31)

اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جائیں تو کہتے ہیں ہاں ہم نے سنا ہم چاہتے تو ایسی ہم بھی کہہ دیتے۔

معنیٔ بصارت:

(ب ص ر) البصر (The Sight,Seeing)

کے معنی آنکھ کے ہیں جیسے فرمایا:

"وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ "(سورۃ القمر آیت نمبر 50)

اور ہمارا کام تو ایک بات کی بات ہے جیسے پلک مارنا۔

سورۃ احزاب میں فرمایا:

"وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10) اور جبکہ ٹھٹک کر رہ گئیں نگاہیں۔

بصرہ اور بصیرت:

نیز قوت بینائی کو بصر کہہ لیتے ہیں اور دل کی بینائی پر بصرہ اور بصیرت دونوں لفظ بولے جاتے ہیں قرآن میں ہے:

"فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ" (سورۃ ق آیت نمبر 22)

تو ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھایا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

لفظ غشاوۃ کا معنیٰ:

(غ ش و) غشیۃ غشاوۃ وغشاء (To hide)

اس کے پاس اس چیز کی طرح آیا جو اسے چھپائے غشاوۃ (اسم) پردہ جس سے کوئی چیز ڈھانپ دی جائے قرآن میں ہے:

"وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً" (سورۃ الجاثیۃ آیت نمبر 23) اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

عذاب کا مفہوم:

(ع ذ ب) العذاب (Torture)

سخت تکلیف دینا عذبہ تعذیبا اسے عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رکھا۔ قرآن میں ہے۔

"لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا" (سورۃ النمل آیت نمبر 21)

ضرور میں اسے سخت عذاب کروں گا۔

لفظ عذاب کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ عذب (ض) الرجل کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی اس نے (پیاس کی شدت کی وجہ سے) کھانا اور نیند چھوڑ دی اور جو شخص اس طرح کھانا اور سونا چھوڑ دیتا ہے اسے عاذب وعذوب کہا جاتا ہے لہٰذا تعذیب کے اصل معنیٰ ہیں کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر اکسانا۔

عظم کا لغوی واصطلاحی معنیٰ:

(ع ظ م) العظم (Bone)

عظم الشئی کے اصل معنیٰ کسی چیز کی ہڈی کے بڑا ہونے کے ہیں مجازا ہر چیز کے بڑا ہونے پر بولا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق حس سے ہو یا عقل سے اور عام اس سے کہ وہ مادی چیز ہو یہ معنیٰ ی قرآن میں ہے:

"عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 13)

بڑے سخت دن کا عذاب تھا۔

"قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيْمٌ" (ص آیت نمبر 67)
تم فرماؤوہ بڑی خبر ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 8]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَما هُمْ بِمُؤْمِنِينَ (8)

ترجمہ:

''اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں''۔

متن:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ

لما افتتح سبحانه وتعالى بشرح حال الكتاب وساق لبيانه، ذكر المؤمنين الذين أخلصوا دينهم لله تعالى وواطأت فيه قلوبهم ألسنتهم، وثنى بأضدادهم الذين محضوا الكفر ظاهراً وباطناً ولم يلتفتوا لفتة رأساً، ثلث بالقسم الثالث المذبذب بين القسمين، وهم الذين آمنوا بأفواههم ولم تؤمن قلوبهم تكميلاً للتقسيم، وهم أخبث الكفرة وأبغضهم إلى الله لأنهم موهوا الكفر وخلطوا به خداعًا واستهزاءً، ولذلك طول فى بيان خبثهم وجهلهم واستهزأ بهم، وتهكم بأفعالهم وسجل على عمههم وطغيانهم، وضرب لهم الامثال وأنزل فيهم إِنَّ الْمُنافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وقصتهم عن آخرها معطوفة على قصة الْمُصِرِّينَ.

والناس أصله أناس لقولهم: إنسان وأنس وأناسي فحذفت الهمزة حذفها فى لوقة وعوض عنها حرف التعريف ولذلك لا يكاد يُجْمَع بينهما. وقوله:

إِنَّ المنايا يَطَّلِعَنَ على الإِناس الآمِنِينَا شاذ. وهو اسم جمع كرجال، إذ لم يثبت فعال فى أبنية الجمع. مأخوذ من أنس لأنهم يستأنسون بأمثالهم. أو آنس لأنهم ظاهرون مبصرون، ولذلك سموا بشراً كما سمي الجن جناً لاجتنابهم. واللام فيه للجنس، ومن موصوفة إذ لا عهد فكأنه قال: ومن الناس ناسٌ يقولون. أو للعهد والمعهود: هم الذين كفروا، ومن موصولة مراد بها ابن أبي وأصحابه ونظراؤه. فإنهم من حيث إنهم صمموا على النفاق دخلوا فى عداد الكفار المختوم على قلوبهم، واختصاصهم بزيادات

زادوها على الكفر لا يأبى دخولهم تحت هٰذا الجنس، فإن الاجناس إنما تتنوع بزيادات يختلف فيها أبعاضها فعلى هٰذا تكون الآية تقسيماً للقسم الثانی.

واختصاص الإيمان بالله وباليوم الآخر بالذكر، تخصيص لما هو المقصود الاعظم من الإيمان وادعاء بأنهم احتازوا الإيمان من جانبيه وأحاطوا بقطريه، وإيذان بأنهم منافقون فيما يظنون أنهم مخلصون فيه، فكيف بما يقصدون به النفاق، لأن القوم كانوا يهوداً وكانوا يؤمنون بالله وباليوم الآخر إيماناً كلا إيمان، لاعتقادهم التشبيه واتخاذ الولد، وإن الجنة لا يدخلها غيرهم، وأن النار لا تمسهم إلا أياماً معدودة وغيرها، ويرون المؤمنين أنهم آمنوا مثل إيمانهم. وبيان لتضاعف خبثهم وإفراطهم فی كفرهم، لأن ما قالوه لو صدر عنهم لا على وجه الخداع والنفاق وعقيدتهم عقيدتهم لم يكن إيماناً، فكيف وقد قالوه تمويهاً على المسلمين وتهكماً بهم. وفی تكرار الباء ادعاء الإيمان بكل واحد على الاصالة والاستحكام.

والقول هو التلفظ بما يفيد، ويقال بمعنى المقول، وللمعنى المتصور فی النفس المعبر عنه باللفظ وللرأی والمذهب مجازاً. والمراد باليوم الآخر من وقت الحشر إلى ما لا ينتهی. أو إلى أن يدخل أهل الجنة الجنة، وأهل النار النار لأنه آخر الاوقات المحدودة.

ترجمہ:

”اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں“۔

اس آیت کریمہ کا ماقبل سے دوطرح کا تعلق ہے:

1۔معنوی 2۔لفظی

معنوی تعلق:

اس سورت کی ابتداء میں ایک عظیم الشان کتاب کے تذکرے سے کی گئی ہے۔ اس دعویٰ کہ ساتھ کہ یہ وہ کتاب ہے عاجز کرنے والی اور اللہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ ہے اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش بھی نہیں۔ پھر جن کی رہنمائی کے لئے اس ہدایت والی کتاب کو نازل کیا گیا تو ان کے احوال واوصاف اور ان کا انجام بیان کیا گیا اور دونوں جہاں میں کامیابی کی خوشخبری بھی سنائی گئی۔ بعض لوگوں نے نے اس کو تہہ دل سے قبول کرلیا اور بعض نے انکار کردیا۔ لہٰذا اس اعتبار سے اس پر ایمان لانے اور نہ لانے والوں کی تین قسمیں ہیں:

(1) مخلص مومن (2) ظاہراً اور باطناً انکار کرنے والے۔ (3) منافق

پہلا گروہ مومنین:

وہ خوش قسمت جنہوں نے قرآن پاک کو تہہ دل سے قبول کیا اور اس پر عمل کر کے منزل مقصود کو پالیا، ابدی سعادتوں اور فلاح وکامرانی سے اپنے دامنوں کو بھر لیا ان کو متقین جیسا بہترین لقب دیا گیا اور ان کو دائمی ہدایت اور ابدی فلاح کی خوشخبری سنادی۔

دوسرا گروہ کافرین:

وہ ازلی بدبخت جنہوں نے اپنے کفر اور گناہوں کی وجہ سے اس کتاب حق کو ماننے سے انکار کردیا اور اس کی آیات بینات کا مشاہدہ کرنے اور اس کے چیلنج کا جواب نہ دے سکنے کے باوجود ظاہری اور باطنی طور پر کفر پر مصر رہے اور جس طرح ان کا دل کفر کی گندگی سے آلودہ تھا۔ اسی طرح اپنے ظاہری اور عمل سے بھی اس کا ثبوت پیش کرتے رہے اور ماننے سے صاف انکار کرتے رہے جس کی وجہ سے انہیں دائمی عذاب کا مستحق ہونے کی وعید سنائی گئی اور انہیں کافرین کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

تیسرا گروہ منافقین:

تیسرا گروہ منافقین کا ہے جنہوں نے اپنی جان اور مال کی حفاظت کی خاطر اور دنیاوی مال کے حصول کے لئے، بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا مگر دل میں کفر ہی رہا زبان سے اسلام کا دعوٰی لیکن حقیقت میں کفر میں ہی مبتلا رہے اور ان کی دورُخی پالیسی کی وجہ سے ان کو منافق کہا گیا ان کی مثال نبی کریم ﷺ نے اس بکری سے دی ہے جو نر کی تلاش میں دو ریوڑوں کے درمیان پھرتی ہے کبھی ایک ریوڑ میں جاتی ہے اور کبھی دوسرے گروہ میں جا گھستی ہے۔ اسی طرح منافقین جب بھی مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب کافروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان سے تو ہم مذاق کر رہے تھے۔

تو چونکہ ان کا ظاہر اور تھا اور باطن اور اور ایسے لوگ دین وملت کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور عام آدمی کے لئے ان کو پہچاننا بھی تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے اللہ کریم نے ان کے حالات اور احوال سے پردہ اٹھانے کے نئے کلام کے مختلف اسلوب اور انداز اپنائے اور ضرب الامثال بیان فرمائیں تاکہ مومنین ان کی مکاری اور خفیہ سازشوں سے باخبر رہیں اور ان دشمنان دین وملت سے اپنا دفاع کرلیں ان کے احوال اور اوصاف بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان اندوہناک انجام بھی بیان فرمادیا اور فرمایا کہ بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔

اعرابی تعلق:

واو عاطفہ ہے اور اس کے بعد جو منافقین کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس سارے کا عطف کفر پر اصرار کرنے والوں کے پورا قصہ پر ہے ایک جملہ کا عطف دوسرے جملہ پر نہیں۔ کفر پر اصرار کرنے والے، ان کے واقعات اور حالات جو بیان کئے گئے ہیں جو بیان کئے گئے ہیں، وہ تمام معطوف علیہ ہیں اور اس واو کے بعد منافقین ان کے تمام واقعات، اوصاف اور احوال کی

وضاحت کے کئے بیان کرہ ضرب الامثال معطوف ہیں۔ تو گویا ایک پورے قصے اور کہانی کا عطف کے قبیل سے ہوگا۔ جس میں انفرادی جملوں کی مناسبت کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ اس عطف میں دونوں قصوں کے بیان کردہ مضامین کا لحاظ ہوتا ہے اوران کی مناسبت کو دیکھا جاتا ہے۔

الناس کی لغوی تحقیق:

والناس اصله اناس۔ (People)

ومن الناس: الناس سے پہلے من بعض کے معنی میں ہے اصل میں بعض الناس ہے اس کے صیغہ میں چند احتمال ہیں۔

پہلا احتمال:

یہ جمع کا صیغہ ہے اور اس کا انس، ناس یا انسان ہوگا۔ یہ اصل میں الناس ہے یا اناس ہوگا۔ اناس میں اس سے پہلے ہمزہ تخفیفاً گرادیا گیا جیسے اُلوقة بمعنی مکھن۔ سے پہلے ہمزہ کو حذف کر کے لُوقة پڑھا جاتا ہے۔ انس میں ہمزہ کو حذف کرنے کے بعد اس کے عوض میں اس سے پہلے ال کا اضافہ کر دیا گیا ہے چونکہ اس سے پہلے ہمزہ محذوف کے عوض میں ال داخل کر دیا گیا ہے اس لئے ال اور ہمزہ دونوں اکھٹے ذکر نہیں کئے جاتے البتہ درج ذیل شعر میں ان دونوں کو جمع کیا گیا ہے تو یہ قلیل الاستعمال ہے اور شاذ ہے۔

إِنَّ المنایا یَطَّلِعْنَ علی الإِناس الآمِنِینَا
مطمئن اور غافل لوگوں پر موتیں اچانک آپڑتی ہیں۔

اس میں الاناس پر ال اور ہمزہ دونوں جمع ہیں لیکن یہ شذوذ کے قبیلہ سے ہے۔

دوسرا احتمال:

یا یہ جمع کا صیغہ نہیں بلکہ اسم جمع ہے۔ اور اسم جمع وہ کلمہ ہے جو دو سے زیادہ افراد پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ جمع کے اوزان میں سے کسی وزن پر بھی نہیں ہے جیسے رُخال بھیڑ کے مذکر اور مونث بچے کو کہتے ہیں اور اس جمع کی مثال رھط اور قوم وغیرہ ہے۔

تیسرا احتمال:

یہ نسی بمعنی بھولنا سے مشتق ہے اصل میں ناسی تھا (بھولنے والے) حذف یا کے بعد ناس ہوگا۔

نوٹ: الناس کا لفظ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جمع کا صیغہ نہیں بلکہ اسم جمع ہے۔ کیونکہ اس کا وزن فعال ہے اور یہ وزن جمع کے اوزان میں استعمال نہیں ہوتا گویا یہ رُخال کے وزن پر ہے۔

اس کا مادہ اشتقاق:

اس کا مادہ اشتقاق میں تین احتمال ہیں۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ یہ انس بمعنی محبت والفت سے مشتق ہے چونکہ انسان کا ہر ہر فرد ایک دوسرے سے محبت والفت کرتا ہے۔ اس لئے اس کا معنی ہوگا، محبت والفت کرنے والا۔

2۔ یہ موانسۃ بمعنی ہمدردی اور غم خواری کرنے سے مشتق ہے تو ناس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کرنے والے ہیں۔

3۔ یہ اِنس سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دیکھنا۔ دیکھی وہی چیز جاتی ہے جو ظاہر ہوتی ہے جو کہ انسان بھی ظاہر ہوتا ہے اور وہ دیکھا جاتا ہے اس لیئے انہیں اناس کہا جاتا ہے۔

جس طرح جنوں کو جن اس لئے کہتے ہیں کہ وہ پوشیدہ اور مخفی ہوتے ہیں اور انسان کو بشر کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کیونکہ بشر ظاہری جلد اور کھال کو کہتے ہیں البتہ پیر کرم شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بشر کو بشر کہنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ بشر کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانا ہے جو کہ انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے دست قدرت سے ہوئی اس لئے اسے بشر کہتے ہیں۔

الناس سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کے متعلق دو قول ذکر کئے گئے ہیں۔

(1) یا تو اس سے مراد وہ کافر ہیں جن کا ذکر الذین کفروا۔۔۔ الخ میں کیا گیا ہے۔ جو مصر علی الکفر تھے۔ یا ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے نفاق اور کفر پر قائم رہنے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے تھے اگرچہ ان میں کچھ زائد خبیث اوصاف بھی پائے جاتے تھے جیسے دھوکہ، چالبازی وغیرہ جیسے عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین اور ان کے ساتھی تھے، اور ان میں ان گندے زائد اوصاف کا پایا جانا ان کو مصر علی الکفر میں داخل ہونے سے نہیں روکتا کیونکہ اجناس کے تحت مختلف انواع ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں زائد اوصاف بھی ہوتے ہیں اور ان میں زائد اوصاف کا ہونا انہیں ان اجناس میں داخل ہونے سے نہیں روکتا، جب الناس کی یہ تاویل کی جائے گی تو پھر انسانوں کی دوسری قسم یعنی مصر علی الکفر کی تقسیم ہو گئی۔

من

اس میں بھی دو احتمال ہیں یا تو یہ اسم موصول ہے اور مابعد کلام اس کا صلہ ہے۔

(2) یا یہ من نکرہ کے حکم میں ہے اور موصوفہ ہے اور بعد والا جملہ اس کی صفت ہے اصل عبارت اس طرح تھی ومن الناس ناس یقول امنا لوگوں کی جنس سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو امنا کہتے ہیں۔

یقول یہ مضارع کا صیغہ ہے اور قول سے مشتق ہے اس کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔

1۔ ایسے کلمات کا تلفظ کرنا جو کسی معنی کا فائدہ دیتے ہوں اس اعتبار سے اس کا اطلاق مکمل جملہ پر بھی ہوگا۔

2۔ اس کا اطلاق ایسے مفرد الفاظ پر بھی ہوتا ہے جو کسی معنی اور نسبت حکمیہ پر دلالت کرتے ہیں۔

3۔ اس کا اطلاق اس معنی پر بھی ہوتا ہے جو ذہن میں ابھر رہا ہوتا ہے اور اسے الفاظ کے ساتھ بیان کئے جانے والا ہوتا ہے۔

4۔ رائے اور مذہب کو بھی قول کہتے ہیں۔ مذہب سے مراد وہ اعتقاد ہے جس کو مجتہدین میں سے کوئی اختیار کرلے اور جب اسے کوئی قوی دلیل مل جائے اور وہ زائل ہو جائے۔

اعتراض:

اس مذکورہ بالا آیت کریمہ میں جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے صرف دو کو ذکر فرمایا۔

ایک ایمان باللہ اور

دوسرا ایمان بالآخرۃ

اور باقی ایمانیات کو ذکر نہیں فرمایا مثلاً رسالت، نبوت، ملائکہ وغیرہ تو ان دونوں کو ذکر کرکے ساتھ خاص کیوں کیا؟

جواب: ایمان سے مراد صرف دو چیزیں نہیں بلکہ اس سے مراد تمام ایمانیات ہیں مگر ان دو کو ذکر کرنے کی چند وجوہات ہیں۔

1۔ ایمان سے مقصود اعظم ہے یعنی اللہ کی ذات پر ایمان لانا اور یوم آخرت پر، اس کو ذکر کر دیا۔

2۔ یہودی اللہ تعالیٰ پر، یوم آخرت پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے تو انہیں یہ بتلانا مقصود تھا کہ جن دو چیزوں پر ایمان لانے میں تم مخلص ہونے کا دعویٰ کرتے ہو وہ بالکل باطل ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ اس نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ اور وہ مخلوق میں سے کسی کی مثال ہو سکتا ہے حالانکہ نہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثل ہے اور اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور نہ اسے اولاد کی ضرورت ہے وہ ہر اس نقص سے منزہ اور پاک ہے جو جسم کے خواص سے ہو، تو یہود کا توحید پر ایمان لانے کا دعویٰ بالکل جھوٹا افتراء ہے اور آخرت کے متعلق عجیب وغریب نظریات تھے جو اخلاص و ایمان کے دعویٰ کے مخالف تھے وہ کہتے تھے کہ جنت میں سوائے یہود کے کوئی داخل نہیں ہوگا اور انہیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ اگر انہیں عذاب دیا بھی گیا تو وہ صرف چند دن ہوگا جن میں وہ بچھڑے کی عبادت کرتے رہے اور جنت کی نعمتوں کے متعلق بھی وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے کبھی کہتے وہ نعمتیں ابدی ہوں گی اور کبھی کہتے کہ وہ فانی ہیں اور کبھی کہتے کہ وہاں خشبو سونگھنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا تو ان کے یہ لغویات ایسے ہیں جو ایمان نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں خصوصاً جبکہ ان کا اظہارِ ایمان نفاق اور دھوکے کے لئے تھا۔

اس مذکورہ بالا بحث سے ثابت ہو گیا کہ ان کا اللہ کریم پر اور آخرت پر ایمان لانے کا دعویٰ بالکل باطل ہے۔

3۔ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے مبداء (اللہ کی ذات) اور معاد یعنی آخرت پر ایمان لا کر مکمل ایمان حاصل کرلیا ہے۔ اور اللہ کریم نے ان کے اسی دعویٰ کی تردید فرمادی۔

4۔ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جن چیزوں پر ایمان کے اخلاص کا ان کا دعویٰ ہے اس میں بھی وہ منافق ہیں وغیرہ وغیرہ

با کودوبارہ ذکر کرنے کی وجہ:

با کومکرر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہود یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ کی ذات پر اور یوم آخرت پر ان کا ایمان مستقل ہے کسی دوسرے کے تابع نہیں، حالانکہ ان کا یہ دعویٰ باطل تھا جس کو اللہ کریم نے،

وما هم بمومنين

کے ساتھ رد فرما دیا۔ حرف جر کومکرر ذکر کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ ان دونوں پر ان کا ایمان پختہ ہے، اس کو ظاہر کرنے کے لئے حرف جر کومکرر ذکر کیا گیا ہے۔

لفظ یوم کی تحقیق:

(ی و م) یوم (Day)

یہ لفظ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

1۔ مطلق وقت، جس میں دن رات کی کوئی قید نہیں۔ (لغوی معنی)

2۔ صبح صادق کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کا وقت، اصطلاح شرح میں ہے۔

3۔ سورج کے طلوع ہونے سے لے کر، سورج کے غروب ہونے تک وقت عرف عام میں۔

مگر یہاں اس سے مراد حشر سے لے کر نہ ختم ہونے والا وقت ہے یا جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے کا وقت مراد ہے۔

متن:

وَما هُمْ بِمُؤْمِنِينَ إنكار ما ادعوه ونفي ما انتحلوا إثباته، وكان أصله وما آمنوا ليطابق قولهم في التصريح بشأن الفعل دون الفاعل لكنه عكس تأكيداً. أو مبالغة في التكذيب، لأن إخراج ذواتهم من عداد المؤمنين أبلغ من نفي الإيمان عنهم في ماضي الزمان، ولذلك أكد النفي بالباء وأطلق الإيمان على معنى أنهم ليسوا من الإيمان في شيء، ويحتمل أن يقيد بما قيدوا به لأنه جوابه.

والآية تدل على أن من ادعى الإيمان وخالف قلبه لسانه بالاعتقاد لم يكن مؤمناً، لأن من تفوه بالشهادتين فارغ القلب عما يوافقه أو ينافيه لم يكن مؤمناً. والخلاف مع الكرامية في الثاني فلا ينهض حجة عليهم.

اللہ کریم کا یہ ارشاد کہ منافق مومن نہیں یہ ان کے ایمان کے دعویٰ کا انکار ہے اور جس چیز کو جھوٹے طریقہ پر (یعنی ایمان

کو) انہوں نے ثابت کرنے کی نسبت اپنی طرف کی تھی، اس کی نفی ہے اور اصل میں اس مقام پر وما امنوا ہونا چاہئے تھا تا کہ منافقین نے صراحۃً اپنی طرف جس فعل کی نسبت کی تھی، کلام اس کے مطابق ہو جاتا لیکن یہاں ماضی کے صیغہ کے ساتھ نفی کرنے کی بجائے اسم فاعل کا صیغہ استعمال فرما کر ان سے ایمان کی نفی کی ہے تا کہ ان کے جھوٹا ہونے میں مبالغہ اور تاکید کا اظہار کیا جائے کیونکہ ماضی کے صیغہ کے ساتھ ان سے زمانہ ماضی میں ایمان کی نفی کرنے کی بجائے اسم فاعل کا صیغہ ذکر فرمانا زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ ان سے ایمان کی نفی کرنا ان کو مومنین کے شمار سے خارج کرنا ہے کیونکہ اس انداز تکلم میں تینوں زمانوں میں ان سے ایمان کی نفی ہو جاتی ہے اور تکذیب میں مبالغہ اور انکار میں تاکید پیدا کرنے کے لئے خبر پر با کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جس شخص نے ایمان کا دعویٰ کیا اور اعتقاد میں اس کا دل اس کی زبان کے اقرار کے مخالف ہو (یعنی زبان سے وہ ایمان کا اقرار کرے لیکن تصدیق قلبی حاصل نہ ہو) وہ مومن نہیں ہو گا یہ آیت پاک اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ جو شخص زبانی شہادتین کا اقرار کرے اور اس کا دل زبان کی مخالفت اور موافقت دونوں سے خالی ہو یعنی نہ وہ اس کی تصدیق کرے اور نہ ہی تکذیب تو وہ مومن نہ ہوگا۔

اور کرامیہ کے ساتھ جو اختلاف ہے وہ دوسری بات میں ہے یعنی اس کا دل تصدیق اور تکذیب سے خالی ہو اس لئے یہ آیت اس کے خلاف حجت نہ ہوگی کیونکہ منافقین کا دل زبانی اقرار کے مخالف ہوتا ہے۔

لفظ الناس کی اصل:

(ن و س) الناس (People)

بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل اناس ہے۔ ہمزہ کو حذف کر کے اس کے عوض الف لام لایا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک نسی سے مقلوب ہے اور اس کی اصل انسیان بروزن افعلان ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں ناس ینوس سے ہے جس کے معنی مضطرب ہوتے کے ہیں۔

قرآن میں ہے: "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" (سورۃ الناس آیت نمبر ۱)

تم کہو میں اس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب۔

تحقیق لفظِ قول:

(ق و ل) القول (Affair)

القول اور القیل کے معنی بات کے ہیں قرآن میں ہے:

"وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 122)

اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔

نوٹ: ایمان، ما اور لفظ اللہ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 9]

يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹)

ترجمہ:

''فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں''۔

متن:

يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا

الخدع أن توهم غيرك خلاف ما تخفيه من المكروه لتنزله عما هو فيه، وعما هو بصدده من قولهم: خدع الضب. إذ توارى في جحره، وضب خادع وخدع إذا أوهم الحارش إقباله عليه ثم خرج من باب آخر وأصله الإخفاء ومنه المخدع للخزانة، والاخدعان لعرقين خفيين في العنق، والمخادعة تكون بين اثنين. وخداعهم مع الله ليس على ظاهره لأنه لا تخفى عليه خافية، ولأنهم لم يقصدوا خديعته. بل المراد إما مخادعة رسوله على حذف المضاف، أو على أن معاملة الرسول معاملة الله من حيث إنه خليفته كما قال تعالى: مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ. وإما أن صورة ضنيعهم مع الله تعالى من إظهار الإيمان واستبطان الكفر، وصنع الله معهم بإجراء أحكام المسلمين عليهم، وهم عنده أخبث الكفار وأهل الدرك الاسفل من النار، استدراجا لهم وامتثال الرسول صلّى الله عليه وسلّم والمؤمنين أمر الله في إخفاء حالهم، وإجراء حكم الإسلام عليهم مجاراة لهم بمثل صنيعهم صورة صنيع المتخادعين.

ويحتمل أن يراد ب يُخَادِعُونَ يخدعون لأنه بيان ليقول، أو استئناف بذكر ما هو الغرض منه، إلا أنه أخرج في زنة فاعل للمغالبة، فإن الزنة لما كانت للمغالبة والفعل متى غولب فيه، كان أبلغ منه إذا جاء بلا مقابلة معارضٍ ومبار استصحبت ذلك ويعضده قراءة من قرأ يَخْدَعُونَ. وكان غرضهم في ذلك أن يدفعوا عن أنفسهم ما يطرق به من سواهم من الكفرة، وأن يفعل بهم ما يفعل بالمؤمنين من الإكرام

والإعطاء، وأن يختلطوا بالمسلمين فيطلعوا على أسرارهم ويذيعوها إلى منابذيهم إلى غير ذلك من الاغراض والمقاصد.

وَما يَخْدَعُونَ إِلَّآ اَنْفُسَهُمْ قراءة نافع وابن كثير وأبي عمرو. والمعنى: أن دائرة الخداع راجعة إليهم وضررها يحيق بهم. أو أنهم في ذلك خدعوا أنفسهم لما غروها بذلك. وخدعتهم أنفسهم حيث حدثتهم بالاماني الفارغة وحملتهم على مخادعة من لا تخفى عليه خافية.

وقرأ الباقون وَما يُخَادِعُونَ، لأن المخادعة لا تتصور إلا بين اثنين وقرء و يُخَدِّعُونَ من خدع و خَدِعُونَ بمعنى يختدعون و يُخَدِّعُونَ و يخادعون على البناء للمفعول، ونصب أنفسهم بنزع الخافض، والنفس ذات الشيء وحقيقته، ثم قيل للروح لأن نفس الحي به، وللقلب لأنه محل الروح أو متعلقه، وللدم لأن قوامها به، وللماء لفرط حاجتها إليه، وللرأى في قولهم فلان يؤامر نفسه لأنه ينبعث عنها أو يشبه ذاتاً تأمره وتشير عليه. والمراد بالانفس ههنا ذواتهم ويحتمل حملها على أرواحهم وآرائهم.

وَما يَشْعُرُونَ لا يحسون لذلك لتمادي غفلتهم. جعل لحوق وبال الخداع ورجوع ضرره إليهم في الظهور كالمحسوس الذي لا يخفى إلا على مؤوف الحواس. والشعور: الإحساس، ومشاعر الإنسان حواسه، وأصله الشعر ومنه الشعار.

ترجمہ:

عرف میں خداع کا معنی یہ ہے کہ اپنے مدمقابل کو خفیہ تدبیر کے ساتھ اس مقصد سے ہٹا دیا جائے جس کو وہ حاصل کر چکا ہے یا حاصل کرنے کے قریب ہے اسی لئے عرب لوگ گوہ کو ضَب خادع کہتے ہیں دھوکہ دینے والی گوہ کیونکہ وہ اپنی بل میں چھپ کر شکاری کو باہر آنے کا چکمہ دیتی ہے اور دوسرے سوراخ سے بھاگ جاتی ہے۔

یہاں پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ یخادعون باب مفاعلہ سے ہے جس کی وجہ سے ظاہر معنی یہ نکلتا ہے کہ اللہ کریم اور مومنین، منافقوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ وہ اللہ کریم کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے تھے بلکہ وہ مومنین اور رسول کریم ﷺ کو دھوکہ دینا چاہتے تھے اس لئے اصل عبارت کچھ یوں ہوئی یخادعون رسول اللہ لفظ اللہ سے پہلے مضاف کو حذف کر دیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو دھوکہ دینا اللہ ہی کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے کیونکہ اللہ اور رسول ﷺ کا معاملہ ایک ہی جیسا ہے جس پر قرآن

کریم بھی دال ہے،

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ.
جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ (سورۃ النساء آیت نمبر 80)

اور

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ.
وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ (سورۃ الفتح آیت نمبر 10)

2۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم جو برتاؤ منافقین کے ساتھ کر رہا ہے یہ ظاہری طور پر ایک دوسرے کو دھوکہ دینے والوں کی طرح ہی بنتا ہے کیونکہ اللہ کریم منافقوں کو بھی وہی مراعات دے رہا ہے جو مومنین کو دی جا رہی ہیں ان کے حالات سے باخبر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو اپنی خصوصی نوازشات سے نواز رہا ہے انہیں احکام اسلام پر عمل پیرا ہونے کا مکلف بنا رہا ہے اور انہیں فوراً کفر اور نفاق کی سزا نہیں دے رہا ہے حالانکہ وہ اللہ کریم کے نزدیک بدترین عذاب کے مستحق ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں آہستہ آہستہ جہنم کے راستے پر چلا رہا ہے اور انہیں مومنین کی صفوں سے خارج نہیں فرما رہا؟

مال غنیمت وغیرہ میں انہیں باقاعدہ حصہ عطا کر رہا ہے ان کے مال وجان کی حفاظت کرنے کا حکم دے رہا ہے اور منافقین ایمان کے اظہار کے باوجود مومنین کو تکلیف پہنچانے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے اور ان کو نا کام کرنے کی طرح طرح کی سازشیں کرتے ہیں تو ان تمام مذکورہ بالا چیزوں کی بظاہر ایسی صورت بنتی ہے جس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دیا جاتا ہے اس لئے باب مفاعلہ کا صیغہ ذکر فرمایا جو حقیقت میں دھوکہ دینے پر دلالت نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے سزا ہے۔

3۔ بعض دفعہ باب مفاعلہ ذکر کر کے اس سے مشارکت مراد نہیں ہوتی بلکہ اس فعل میں مبالغہ کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے یہاں بھی ان کی حد درجہ دھوکہ دینے کی تدبیریں کرنے کو بیان کرنے کے لئے باب مفاعلہ کا صیغہ ذکر کیا، تاکہ ان کے اس برے فعل میں مبالغہ کا اظہار ہو۔

بعض قاریوں نے یخدعون کی جگہ یخادعون۔ یخدعون، یخدعون، بفتحہ ی، یخدعون بضمہ ی اور دال کی تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ یہاں مبالغہ مقصود ہے نہ کہ مشارکت۔ کیونکہ جب مفاعلہ کا صیغہ بلا مقابل اور معارض ذکر کیا جائے تو اس کو مبالغہ لازم ہوتا ہے۔

ایک اور اشکال یہ کہ منافقوں کا اہل اسلام کے ساتھ ایسی دورُخی پالیسی اختیار کرنے کا مقصد کیا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے کئی مقاصد ہیں،

1۔ تاکہ وہ اس طرح اپنے اموال اور جانوں کی حفاظت کر سکیں اور جزیہ، جو ان کی جان و مال کی حفاظت کے لئے ان سے

لیا جاتا تھا، اس سے بچ جائیں کیونکہ جو شخص کافر ہو اس کے ساتھ جہاد کرنا فرض ہے اور ان کے مال غنیمت اور ان کے بچوں اور عورتوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت تھی، اس لئے وہ ایمان کا اظہار کرتے تا کہ وہ ان سزاؤں سے اپنے آپ کو بچا لیں۔

2۔ ان کے ایمان کے اظہار کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مومنین کی طرح مال غنیمت سے اپنا حصہ وصول کریں اور عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جائیں، ایمان کے ظاہر نہ کرنے کی وجہ سے وہ اس سے محروم ہو جاتے،

3۔ یہ کہ وہ مومنین کے رازوں سے آگاہی حاصل کریں اور ان کو کفار تک پہنچائیں تا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکیں اور اسی قسم کے ان کے فاسدن اغراض و مقاصد تھے۔

انفس اس کا مفرد نفس ہے جس کا معنی کسی چیز کی حقیقت اور اس کی ذات ہے اور مجازاً اس کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔

(1) روح اور خون، کیونکہ کسی چیز کی ذات ان دونوں کے ساتھ ہی قائم رہتی ہے۔

(2) دل کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ وہ روح کا محل ہوتا ہے، پانی کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ اس کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

(3) رائے کو بھی نفس کہتے ہیں کیونکہ وہ اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مذکورہ بالا آیت میں انفسھم سے منافقین کی ذاتیں اور ان کی ارواح اور باطل آراء مراد ہیں۔

یشعرون یہ شعور سے نکلا ہے جس کا معنی محسوس کرنا ہے وہ کپڑا جو انسان کے جسم کو مس کرتا ہے اسے شعار کہتے ہیں اور وہ کپڑا جو اوپر ہوتا ہے اسے دثار کہتے ہیں (یعنی جو جسم سے مس نہیں کرتا یہاں شعور سے مراد ظاہری حواس کے ساتھ کسی چیز کا ادراک کرنا ہے اسی لئے انسانی حواس کو مشاعرہ کہتے ہیں جو ادراک کرنے کا آلہ ہوتے ہیں۔

نوٹ: آیت کا معنی یہ ہوگا کہ منافقین نہ تو اللہ کو دھوکہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی مومنین کو بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں لیکن انہیں ان کا احساس ہی نہیں اور انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اس دھوکے کا وبال اور نقصان انہی کو پہنچ رہا ہے یا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے اس کے ساتھ اپنے آپ کو دھوکہ پر جری بنا کر خود اپنے نفسوں کو فریب دیا اور ان کے اپنے نفوس نے ان کے اندر جھوٹی اور بے فائدہ امیدیں پیدا کر کے انہیں مغرور بنا دیا اور انہیں اس ذات پاک سے دھوکے دینے پر ابھارہ جس پر کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں باقی قاریوں نے اس میں کچھ اور لغات پڑھی ہیں اور وہ یہ ہیں، یا تو یہ خداع سے مشتق ہیں اور یخدعون کے معنی میں ہیں یا یخدعون بمعنی یختدعون پڑھا گیا ہے اور یخدعون اور یخادعون مجہول کے صیغے کے ساتھ ہی پڑھا گیا ہے۔ اور مجہول پڑھنے کی صورت میں انفسھم کی نصب حرف جر کو اس سے پہلے حذف کر دیئے جانے کی وجہ سے ہوگی۔

لفظِ خدع کی مفصّل تحقیق:

(خ د ع) الخداع (Deception))

کے معنی ہیں جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کر کے کسی کو اس چیز سے پھیر لینا جس کے علاوہ در پے ہوا اور آیت

کریمہ:

"يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 9)

فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو۔

میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے اس کے رسول اور اولیاء کو فریب دینا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کوئی سا معاملہ کرنا گو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا:

"اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 10)

وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

اور ان کے اس فعل کی شناخت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے خدا سے تعبیر کیا ہے۔ اور بعض اہل لغت کا یہ کہنا کہ یہاں (مضاف محذوف ہے اور اصل میں یخادعون رسول اللہ ہے۔ پھر مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ مضاف محذوف کو ذکر کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ایک تو یہاں ان کی فریب کاریوں کی شناخت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ بتانا ہی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ آیت

"اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ ... الآية" (سورۃ الفتح آیت نمبر 10) میں بیان ہو چکا ہے۔

اور آیت کریمہ:

"اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 142)

بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دیا چاہتے ہیں۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہیں ان کی فریب کاریوں کا بدلہ دے گا اور بعض نے کہا ہے کہ مقابلہ اور مشاکلہ کے طور پر یہ کہا گیا ہے جیسا کہ آیت

"وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 54)

اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی۔ میں ہے۔

گوہ اور بچھو:

خدع الضب گوہ کا اپنے بل میں داخل ہو جانا اور گوہ کے بل میں چھپ جانے کے لئے خدع کا استعمال اس بنا پر ہے کہ اس کی بل کے دروازے پر ہمیشہ ایک بچھو تیار بیٹھا رہتا ہے۔ جو بل میں ہاتھ ڈالنے والے کو ڈس دیتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے العقرب بواب الضب کو بچھو گوہ کا دربان ہے۔ چونکہ اہل عرب کے ہاں ضب کی مکاری ضرب المثل تھی اس لئے کہا گیا ہے

(مثل) هو اخدع من الضب کہ وہ ضب سے زیادہ مکار ہے طریق خادع و خیدع گمراہ کرنے والا راستہ گویا وہ مسافر کا دھوکا دیتا ہے۔ الهذع بڑے کمرے کے اندر چھوٹا کمرہ۔ گویا اس بڑے کمرے سے چیز اٹھانے والے کو دھوکا دینے کے لئے بنایا ہے۔ خدع الریق منہ میں تھوک کا خشک ہونا اس میں بھی دھوکے کا تصور پایا جاتا ہے۔ الاخدعان گردن کی دو رگیں کیونکہ وہ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ ہو ہیں۔ کہا جاتا ہے خدعته میں نے اس کی اخدع رگ کو کاٹ دیا۔

حدیث شریف میں ہے:

بین یدی الساعة سنون خداعة

کہ قیامت کے قریب دھوکا دینے والے سال ہوں گے کیونکہ وہ بھی خشک سالی اور خوشحالی سے رنگ بالتے ہوں گے۔

حرفِ الا کا استعمال:

الا

الا یہ حرف استفتاح ہے (یعنی کلام کے ابتداء میں تنبیہ کے لئے آتا ہے۔

الا یہ حرف استثناء ہے اولاء (اولا) یہ اسم مبہم ہے جو جمع مذکر و مؤنث کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے اس کا مفرد من لفظہ نہیں آتا (کبھی اس کے شروع میں ھا تنبیہ بھی آجاتا ہے) قرآن مجید میں ہے:

"هَا اَنْتُمْ اُولَاءِ تُحِبُّوْنَهُمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 119)

سنتے ہو یہ جو تم ہو تم تو انہیں چاہتے ہو۔

"اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ"

وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں. (سورۃ البقرہ آیت نمبر 5)

اور کبھی اس میں تصرف (یعنی بحذف ہمزہ آخر) بھی کرلیا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

هؤلا ثم هؤلاء كلا اعطيته ت نوالا محذوة بمثال

ان سب لوگوں کو میں نے بڑے بڑے گرانقدر عطیئے دیئے ہیں۔

مفہوم نفس:

(ن ف س) النفس (Respiration, Breath, Self)

کے معنی روح کے آتے ہیں چنانچہ اللہ کریم نے فرمایا:

"اَخْرِجُوْا اَنْفُسَكُمُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 93) کہ نکالو اپنی جانیں۔

"وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 235)

اور جان لو کہ اللہ تمہارے دل کی جانتا ہے تو اس سے ڈرو۔

اور ذیل کی دونوں آیتیں۔

"تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 116)

تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے۔

"وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 30)

اور اللہ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔

اس میں نفس بمعنی ذات ہے اور یہاں نفسہ کی اضافت اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرۃ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوائی سے پاک ہے بعض کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی طرف نفس کی اضافت اضافت ملک ہے اور اس سے ہمارے نفوس امارہ مراد ہیں جو ہر وقت برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔

معرفتِ شعور:

شعور حواس کو کہتے ہیں، لہٰذا آیت کریمہ:

"وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 2) اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم حواس سے اس کا ادرک نہیں کر سکتے۔

یشعرون اور یعقلون میں فرق:

اور اکثر مقامات میں جہاں لایشعرون کا صیغہ آیا ہے اس کی بجائے۔ لایعقلون کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بہت ک
چیزیں ایسی ہیں جو محسوس تو نہیں ہو سکتی لیکن عقل سے ان کا ادراک ہو سکتا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 10]

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ (10)

ترجمہ:

"ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا"۔

متن:

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً

المرض حقيقة فيما يعرض للبدن فيخرجه عن الاعتدال الخاص به ويوجب الخلل فى أفعاله. ومجاز فى الاعراض النفسانية التى تخل بكمالها كالجهل وسوء العقيدة والحسد والضغينة وحب المعاصى، لأنها مانعة من نيل الفضائل، أو مؤدية إلى زوال الحياة الحقيقية الابدية. والآية الكريمة تحتملهما فإن قلوبهم كانت متألمة تحرقاً على ما فات عنهم من الرياسة، وحسداً على ما يرون من ثبات أمر الرسول صلّى الله عليه وسلّم واستعلاء شأنه يوماً فيوماً. وزاد الله غمهم بما زاد فى إعلاء أمره وإشادة ذكره. ونفوسهم كانت موصوفة بالكفر وسوء الاعتقاد ومعاداة النبى صلّى الله عليه وسلّم ونحوها، فزاد الله سبحانه وتعالى ذلك بالطبع. أو بازدياد التكاليف وتكرير الوحى وتضاعف النصر، وكان إسناد الزيادة إلى الله تعالى من حيث إنه مسبب من فعله وإسنادها إلى السورة فى قوله تعالى فَزَادَتْهُمْ رِجْساً لكونها سبباً.

ويحتمل أن يراد بالمرض ما تداخل قلوبهم من الجبن والخور حين شاهدوا شوكة المسلمين وإمداد الله تعالى لهم بالملائكة، وقذف الرعب فى قلوبهم وبزيادته تضعيفه بما زاد لرسول الله صلى الله عليه وسلم نصرة على الاعداء وتبسطاً فى البلاد.

ترجمہ:

ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی۔

مرض کے لفظ کا حقیقت میں اس عارضہ پر اطلاق ہوتا ہے جو بدن انسانی کو لاحق ہوتا ہے اور اس اعتدال سے خارج کر دیتا ہے جو اس کا خاصہ ہے اور اس کے افعال میں خلل کا باعث بنتا ہے مجازاً اس کا اطلاق ان تمام عوارض نفسانیہ پر ہوتا ہے جو نفس کے کمال کے لئے مخل ہوتے ہیں جیسے جہالت، بداعتقادی۔ حسد کینہ اور گناہوں کی محبت وغیرہ کیونکہ یہ تمام ایسے عوارض ہیں جو فضائل وکمالات حاصل کرنے سے مانع ہوتے ہیں اور یا وہ حقیقی، دائمی اور ابدی زندگی کے زوال تک پہنچاتے ہیں اور اس آیت طیبہ میں مرض کے دونوں معنی حقیقی اور مجازی مراد ہو سکتے ہیں حقیقی معنی اس لئے مراد ہو سکتا ہے کہ ان سے ریاست اور سرداری فوت ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ان کے دل پریشان ہو گئے تھے وہ غصہ میں تھے اور حسد کی آگ میں جلتے رہے اور جب وہ دیکھتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا دین دن بدن ترقی کر رہا ہے اور اس سے آپ کی شان بھی بلند ہو رہی ہے تو وہ اس سے جلتے تھے اور جب یہ دیکھتے کہ اللہ کریم ان کو عزتیں عطا کر رہا ہے تو ان کی اس مرض میں اور اضافہ ہو جاتا چونکہ ان کے نفوس کفر و الحاد اور نبی کریم ﷺ کی دشمنی اور عناد میں مبتلا تھی اور اسی طرح وہ دوسرے گناہوں کے مرتکب بھی ہوتے تھے جس کی وجہ سے ان کے قلوب پر مہر ثبت کر دی گئی تھی اور اللہ کریم نے ان کو شرعی احکام کا مکلف بنانے میں اضافہ کر دیا اور نبی کریم ﷺ

پر مسلسل وحی نازل فرماتا رہا اور آپ کی مدد کرتا رہا اور اس کی وجہ سے ان کے حسد اور خباثت میں اضافہ ہو گیا اسی بات کو اللہ کریم نے

فزادھم اللہ مرضا

کے ساتھ تعبیر کیا جیسے فرمادیا

فزادتھم رجساً الی رِجسھم۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ مرض سے مراد وہ بزدلی اور ضعف ہو جو منافقین کے دلوں میں اس وقت پیوست ہو گیا تھا جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا کہ مومنین کی عظمت اور شوکت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور اللہ کریم، ملائکہ کے ذریعے ان کی مدد کر رہا ہے اور منافقین کے دلوں میں رعب ڈالنے کے سبب پیدا کر رہا ہے اور مرض کے اضافہ سے یہ مراد ہے کہ اللہ کریم اپنے رسول ﷺ کو دشمنوں پر غلبہ عطا فرمانے اور دائرہ اسلام کو وسعت عطا کرنے میں اضافہ فرما رہا ہے، جو ان کی بزدلی اور ضعف میں اضافہ کا سبب بن رہا ہے۔

نیز آیت طیبہ میں حقیقی اور مجازی دونوں معنی معانی مراد ہو سکتے ہیں۔

متن:

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ أى:

مؤلم يقال: ألم فهو أليم كوجع فهو وجيع، وصف به العذاب للمبالغة كقوله: تحيةُ بينِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيعٌ على طريقة قولهم: جد جده. بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ قرأها عاصم وحمزة والكسائى والمعنى بسبب كذبهم، أو ببدله جزاء لهم وهو قولهم آمنا. وقرأ الباقون يُكَذِّبُونَ من كذبه لأنهم كانوا يكذبون الرسول عليه الصلاة والسلام بقلوبهم، وإذا خلوا إلى شياطينهم. أو من كذَّب الذى هو للمبالغة أو للتكثير مثل بين الشيء وموتت البهائم. أو من كذب الوحشى إذا جرى شوطاً وقف لينظر ما وراءه فإن المنافق متحير متردد.

والكذب: هو الخبر عن الشيء على خلاف ما هو به. وهو حرام كله لأنه علل به استحقاق العذاب حيث رتب عليه. وما روى أن إبراهيم عليه الصلاة والسلام كذب ثلاث كذبات فالمراد التعريض. ولكن لما شابه الكذب فى صورته سمى به.

ترجمہ:

الیم یہاں پر مؤلم اسم مفعول کے معنی میں ہے بمعنی دردمند، جیسے کہا جاتا ہے کہ

الم هوا الیم کوجع فهو وجیع

یعنی جس طرح وجع سے وجیع فعیل کے وزن پر صفت مشبہ بمعنی اسم مفعول آتا ہے اسی طرح الم سے الیم صفت مشبہ کا صیغہ بمعنی اسم مفعول ہے اس کو مبالغہ کے لئے عذاب کی صفت بنایا گیا ہے اور الیم کی نسبت عذاب کی طرف مجازی ہوگی جس طرح جد جدہ میں جد کی نسبت جدہ کی طرف مجازی ہے۔

بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ بدلہ ان کے جھوٹ کا۔

اس جگہ یکذبون کو عاصم، حمزہ اور کسائی نے یکذبون کو بالتخفیف ذ پڑھا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان کو عذاب بسبب ان کے جھوٹ بولنے کے ہے۔ اور ان کے جھوٹ بولنے کے بدلے میں ہے اس صورت میں ما مصدریہ ہوگا اور یکذبون بمعنی کذب ہوگا باسببیہ یا بمعنی بدل اور عوض ہوگا اور ان کا وہ جھوٹ اٰمنا کہنا ہے اور باقی قراء نے اس کو باب تفعیل سے یکذبون پڑھا ہے اس صورت میں اس میں چار احتمال ہیں۔

1- یہ کذبہ بمعنی اس نے اس کو جھٹلایا ہوگا تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ وہ نبی کریم ﷺ کو اپنے دلوں سے جھٹلاتے ہیں اور جب وہ اپنے شیطان صفت سرداروں کی ساتھ ہوتے ہیں تو تو پھر زبان سے بھی تکذیب کرتے ہیں۔

2- یا یہ اس کذب سے مشتق ہوگا جو مبالغہ اور کثرت کے معنی میں ہوتا ہے یعنی وہ بہت ہی زیادہ اور بکثرت جھوٹ بولتے تھے جیسے بین الشی (وہ چیز جو خوب واضح ہوگئی) اور ماتت البھائم (کثرت سے جانور مر گئے) یعنی یہ شدید ترین عذاب انہیں شدت تکذیب کی وجہ سے ہوگا۔

3- یا یہ جذب الوحشی سے مشتق ہوگا اس صورت میں یہ لازم معنی میں استعمال ہوگا معنی یہ ہوگا کہ منافقین جنگلی درندے کی طرح حیران اور متردد ہیں تو گویا جس طرح جنگلی جانور چند قدم چلنے کے بعد رک جاتا ہے اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور وہ اسی شش و پنج میں ہوتا ہے کہ شکار آکر اسے دبوچ لیتا ہے بعینہ اسی طرح منافقین ایمان میں متردد اور حیران ہونے کی وجہ سے شدید ترین عذاب میں مبتلا کر دیئے گئے چونکہ منافق اسی شک وشبہ میں مبتلا تھے اس لئے یہ معنی ان پر منطبق ہو جاتا ہے۔

والکذب: هو الخبر عن الشیء علی خلاف ما هو به...الخ

واقع کے خلاف بات کرنے کو کذب کہتے ہیں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک ہر قسم کا کذب حرام ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کذب پر عذاب الیم کو مترتب فرمایا اور اسی جھوٹ کو عذاب کی علت اور سبب قرار دیا۔ اور روایات میں جو مذکور ہے کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے تین دفعہ خلاف واقع بات کہی یعنی وہ تین بار حرام فعل کے مرتکب ہوئے۔ العیاذ با

للہ۔

اس لئے اس کا یہ معنی ہو گیا کہ یہ تعریض تھی چونکہ وہ کذب کے مشابہ تھے اس لئے انہیں کذب کہا گیا حالانکہ وہ کذب نہ تھے۔

معنی قلب:

(ق ل ب) قلب (Turn,Change)

الشئی کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے قلب الثوب(کپڑے کو الٹنا) اور قلب الانسان کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاِلَیْهِ تُقْلَبُوْنَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 21)

عذاب دیتا ہے جسے چاہے اور رحم فرماتا ہے جس پر چاہے اور تمہیں اسی کی طرف پھرنا ہے۔

لفظ مرض کی تحقیق:

(م ر ض) مرض (Sickness,Disease)

المرض کے معنی ہیں انسان کے مزاج خصوصی کا اعتدال اور توازن کی حد سے نکل جانا اور یہ دو قسم پر ہے۔ مرض جسمانی جیسے فرمایا:

"وَلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ" (سورۃ النور آیت نمبر 61) اور نہ بیمار پر روک۔

"لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَی الْمَرْضٰی" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 91)

ضعیفوں پر کچھ حرج نہیں اور نہ بیماروں پر۔

دوم مرض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بولا جاتا ہے اور اس سے جہالت بزدلی۔ بخل، نفاق وغیرہ جیسے اخلاق رزیلہ مراد ہوتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا: "فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 10)

ان کے دلوں میں کفر کا مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔

"اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا" (سورۃ النور آیت نمبر 50)

کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے، یا شک رکھتے ہیں۔

"وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 125)

اور جن کے دلوں میں مرض ہے ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

"وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيراً مِنْهُمْ ما أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْياناً وَكُفْراً" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 64)

اور اے محبوب یہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا اس سے ان میں بہتوں کو شرارت اور کفر میں ترقی ہوگی۔

اور نفاق، کفر وغیرہ اخلاق رذیلہ کی (مجاز) بطور تشبیہ مرض کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لئے کہ اس قسم کے اخلاق کسب فضائل سے مانع بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ بیماری جسم کو کامل تصرف سے روک دیتی ہے۔ اور یا اس لئے اخروی زندگی سے محرومی کا سبب بنتے ہیں۔

جس قسم کی زندگی کا، کہ آیت کریمہ:

"وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوانُ لَوْ كانُوا يَعْلَمُونَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 64)

اور ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے کاش کہ یہ لوگ سمجھتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یا رذائل کو اس چونکہ ایسے اخلاق بھی ایک طرح کا مرض ہی ہیں اس لئے قلب وصدر میں کینہ و کدورت پیدا ہونے کے لئے دوی صدر فلان و نجل قلبہ وغیر محاورات استعمال ہوتے ہیں

ایک حدیث میں ہے: وای داء ادوء من البخل

اور بخل سے بڑھ کر کونسی بیماری ہوسکتی ہے۔ اور شمس مریضۃ اس وقت کہتے ہیں جب گردہ غبار یا کسی اور عارضہ سے اس کی روشنی ماند پڑ جائے۔ امرض فلان فی قولہ کے معنی تعریض اور کنایہ سے بات کرنے کے ہیں۔ المتریض تیمارداری کرنا۔ اصل میں تمریض کے معنی مرض کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ۔ تقذیۃ کی طرح سے جس کے معنی آنکھ سے خاشاگ دور کرنا کے ہیں۔

زیادۃ کی تعریف:

(زی د) الزیادۃ (Too much, More)

اس اضافہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے پورا کرنے کے بعد بڑھا جائے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ زد تہ میں نے اسے بڑھایا چنانچہ وہ بڑھ گیا۔

اور آیت: "وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 65) اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ پائیں۔

عذاب کا معنی:

(ع ذ ب) العذاب (Torture)

سخت تکلیف دینا عذبہ تعذیبا اسے عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رکھا۔

قرآن مجید میں ہے:

"لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا" (سورۃ النمل آیت نمبر 21) ضرور میں اسے سخت عذاب کروں گا۔

لفظِ عذاب کے معنی میں اختلاف:

لفظ عذاب کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے،

بعض کہتے ہیں کہ یہ عذب (ض) الرجل کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی اس نے (پیاس کی شدت کی وجہ سے) کھانا اور نیند چھوڑ دی اور جو شخص اس طرح کھانا اور سونا چھوڑ دیتا ہے اسے عاذب و عذوب کہا جاتا ہے لہٰذا تعذیب کے اصل معنی ہیں کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر اکسانا۔

لفظِ اَلَم کا مفہوم:

(ا ل م) الالم (Pain, Sorrow)

کے معنی سخت درد کے ہیں کہا جاتا ہے۔

الم یالم (س) اَلِمَ يَاْلَمُ اَلَمًا فهو اَلِمٌ.

قرآن میں ہے:

"فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ" (سورۃ النساء آیت نمبر 104)

تو جس طرح تم شدید درد پاتے ہو اسی طرح وہ بھی شدید درد پاتے ہیں۔

اٰلمت فلانا میں نے فلاں کو سخت تکلیف پہنچائی۔

اور آیت کریمہ: "وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 10)

اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

میں الیم بمعنی مؤلمٌ ہے یعنی دردناک۔ دکھ دینے والا۔ اور آیت:

"اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ" (سورۃ التغابن آیت نمبر 5)

کیا تمہیں ان کی خبر نہ آئی جنہوں نے تم سے پہلے کفر کیا۔

میں الف استفہام کا ہے جو لم پر داخل ہوا ہے۔ (یعنی اس مادہ سے نہیں ہے)

استعمالِ کذب:

(ک ذ ب) الکذب (Lie, false-hood)

قول اور فعل دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔

"اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰذِبُوْنَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 105)

جھوٹ بہتان وہی باندھتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور وہی جھوٹے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 11]

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (۱۱)

ترجمہ:

"اور جو اُن سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں"۔

متن:

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ

عطف على يَكْذِبُونَ أو يَقُولُ. وما روى عن سلمان رضى الله عنه أن أهل هذه الآية لم يأتوا بعد فلعله أراد به أن أهلها ليس الذين كانوا فقط، بل وسيكون من بعد من حاله حالهم لأن الآية متصلة بما قبلها بالضمير الذى فيها. والفساد: خروج الشيء عن الاعتدال. والصلاح ضده وكلاهما يعمان كل ضار ونافع.

وكان من فسادهم فى الارض هَيْجُ الحُروب والفتن بمخادعة المسلمين، وممالاة الكفار عليهم بإفشاء الاسرار إليهم، فإن ذلك يؤدى إلى فساد ما فى الارض من الناس والدواب والحرث.

ومنه إظهار المعاصى والإهانة بالدين فإن الإخلال بالشرائع والإعراض عنها مما يوجب الهرج والمرج ويخل بنظام العالم. والقائل هو الله تعالى، أو الرسول صلّى الله عليه وسلم، أو بعض المؤمنين. وقرأ الكسائى وهشام (قُيْل) بإشمام الضم الاول.

قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ جواب ل إِذا رد للناصح على سبيل المبالغة. والمعنى أنه لا يصح مخاطبتنا بذلك، فإن شأننا ليس إلا الإصلاح، وإن حالنا متمحضة عن شوائب الفساد. لأن (إنما) تفيد قصر ما دخلت عليه على ما بعده، مثل: إنما زيد منطلق، وإنما ينطلق زيد. وإنما قالوا ذلك: لأنهم تصوروا الفساد بصورة الصلاح لما فى قلوبهم من المرض كما قال الله تعالى: اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا.

ترجمہ:

اور جو اُن سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو۔

یہ مکمل جملہ شرط اور جزاء مل کر یا تو یکذبون پر معطوف ہے یا یقول الی آخرہ پر اور حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے کہ اس آیت کے جو مصداق ہیں، وہ ابھی تک نہیں آئے شاید آپ کی اس سے مراد یہ ہو کہ اس آیت کے مصداق صرف وہی منافق نہیں جو عہد نبوت میں تھے بلکہ آپ کی مراد یہ ہے کہ بعد میں بھی ایسے لوگ آتے رہیں گے کہ جن کا حال وہی ہوگا جو ان منافقوں کا تھا جو عہد نبوت میں تھے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تاویل اس لئے کرنا پڑی کہ اس آیت میں ھم ضمیر مذکور ہے جو اس آیت کے ماقبل کلام سے متصل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اور اگر اس کا عطف یقول الی آخرہ پر کیا جائے تو اعراب میں اس آیت کا کوئی محل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا عطف من موصولہ کے صلہ پر ہوگا کیونکہ صلہ کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہوتا اس لئے اس کا بھی اعراب میں کوئی محل نہیں ہوگا۔

فساد کی تحقیق:

(ف س د) فساد (Quarrel,Disturbance)

فساد کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کا اعتدال کی حد سے خارج ہو جانا، اور اس کے برعکس کسی چیز کا اپنے حد پر رہنا صلاح کہلاتا ہے اور اصطلاح میں فساد سے مراد ہر قسم کی نقصان دہ چیز ہے۔ اور صلاح سے مراد ہر قسم کی نفع مند چیز ہے اور منافقین کا زمین میں فساد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی مخالفت کرتے تھے اور ان کے خلاف کفار کی مدد کرتے تھے اور مسلمانوں کے راز کفار تک پہنچاتے تھے جن کی وجہ سے وہ جنگوں اور فتنوں کو بھڑکاتے تھے۔ اور ان کا یہ طرز عمل زمین میں فساد برپا کرنے کا سبب اور اس تک پہنچانے کا سبب تھا کیونکہ اس طرح لوگ اور چوپائے تباہ ہو جاتے اور کھیتیاں برباد ہو جاتیں اور ان کا یہ بھی فساد تھا کہ وہ کھلے بندوں برملا گناہ کا ارتکاب کرتے اور دین و مذہب کی توہین کرتے جو فساد کے قبیلہ سے ہے کیونکہ شرعی احکام میں رخنہ اندازی کرنا، ان کو عملی جامہ پہنانے سے منہ موڑ لینا یہ بھی ان چیزوں سے ہے جو فتنہ و فساد کا باعث بنتی ہیں اور نظام کائنات کو بگاڑ دیتی ہیں منافقین کو فساد سے رکنے کا حکم دینے والا یا تو اللہ تعالیٰ ہے یا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین ہیں۔

قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ہم تو سنوارنے والے ہیں۔

یہ مکمل جملہ اذا کا جواب شرط ہے اور منافقین کا یہ کہنا ہے کہ ہم سراپا اصلاح کرنے والے ہیں ان کے نقطہ نظر کے مطابق فساد سے رکنے کی نصیحت کرنے والے کی بھرپور اور مبالغہ کے ساتھ تردید ہے۔ گویا منافقین نے یوں کہا کہ ہمیں فسادی کہنا سرے سے درست ہی نہیں کیونکہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں اور ہماری حالت فساد کے شائبوں سے بھی پاک ہے کیونکہ

یہاں انما کا لفظ ذکر کیا گیا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس پر وہ داخل ہوتا ہے اس کو اپنے مابعد کے ساتھ خاص کر دیتا ہے۔ جیسے انما زید منطلق بے شک زید چلنے کے ساتھ خاص ہے یا انما ینطلق زید کہ چلنا زید کے ساتھ خاص ہے۔ منافقین کا اپنے آپ کو سراپا اصلاح لئے تھا کہ وہ فساد کو ہی اصلاح تصور کرتے تھے کیونکہ ان کے دل مریض تھے اور جس کی طبیعت خراب ہوا سے ہر ایک چیز خراب لگتی ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ،

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا۔ (سورۃ فاطر آیت نمبر 8)

توکیا وہ جس کی نگاہ میں اس کا بُرا کام آراستہ کیا گیا کہ اس نے اسے بھلا سمجھا ہدایت والے کی طرح ہو جائے گا۔

توکیا ایسا آدمی مومن مخلص کے برابر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

حرف اذا کا معنیٰ :

(اذا) اذا

(ظرف زمان) زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے کبھی جب اس میں شرطیت کا مفہوم پایا جاتا ہے تو فعل مضارع کو جزم دیتا ہے اور یہ عام طور پر نظم میں آتا ہے اور اذ (ظرف) ماضی کے لئے آتا ہے اور جب ما کے ساتھ مرکب ہو (اذ ما) تو معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا،

اذ ما اتیت علی الرسول فقل لہ

جب تو رسول اللہ کے پاس جائے تو ان سے کہنا۔

اذا کی مختلف صورتیں :

اذا کی مختلف صورتیں ہیں :

(1) یہ ظرف زمان ہے۔ (زجاج، ریاشی)

(2) یہ ظرف مکان ہے۔ (مبرد، سیبویہ)

(3) اکثر و بیشتر اذا شرط ہوتا ہے۔

مفسرین نے تینوں معنوں میں اس کا استعمال کیا ہے۔

(1) ظرف زمان: اور جب تو وہاں (کی نعمتیں) دیکھے گا۔ تو تجھ کو وہاں بڑی نعمت اور شاہی ساز و سامان نظر آئے گا۔ (تفسیر حقانی)

(2) ظرف مکان: اور جدھر بھی تم وہاں دیکھو گے تمہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور وسیع مملکت نظر آئے گی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

(3) اذا شرطیہ۔ اور اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھے بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دکھائی دے۔ (تفسیر ماجدی)

نوٹ: حرف لا کی مفصّل تفصیل گزر چکی ہے۔

فساد کا معنی:

(ف س د) الفساد (ن) (Quarrel,Disturbance)

یہ فسد الشئی فھو فاسد کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ قرآن مجید میں ہے:

"لَفَسَدَتِ السَّماواتُ وَالْاَرْضُ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 71)
تو ضرور آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے۔

ارض کا صیغہ:

(ارض) الارض (Earth,Ground,Land)

(زمین) سماء (آسمان) کے بالمقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع ارضون ہے۔ جس کا صیغہ قرآن میں نہیں ہے کبھی ارض کا لفظ بول کر کسی چیز کا نیچے کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح سماء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔

صلح کا مفہوم:

(ص ل ح) الصلاح (Peace)

اور الصلح کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت کو دور کر کے (امن وسلامتی پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے) چنانچہ

اصطلحوا وتصالحوا

کے معنی باہم امن وسلامتی سے رہنے کے ہیں قرآن میں ہے:

"اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحاً وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" (سورۃ النساء آیت نمبر 128)
کہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح خوب ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 12]

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (12)

ترجمہ:

’’سنتا ہے وہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں‘‘۔

متن:

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ

ردلما ادعوه أبلغ رد للاستئناف به وتصديره بحرفی التأكيد:

(ألا) المنبهة على تحقيق ما بعدها. فإن همزة الاستفهام التي للإنكار إذا دخلت على النفي أفادت تحقيقاً، ونظيره (أليس ذلك بقادر)، ولذلك لا تكاد تقع الجملة بعدها إلا مصدرة بما يتلقى به القسم، وأختها أما التي هي من طلائع القسم: وإن المقررة للنسبة، وتعريف الخبر وتوسيط الفصل لرد ما في قولهم (إنما نحن مصلحون) من التعريض للمؤمنين، والاستدراك ب لا يَشْعُرُوْنَ.

ترجمہ:

یہ آیت منافقین کے اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے جو وہ کرتے تھے کہ وہ تو سراپا مصلح ہیں منافقین نے جس بلیغ انداز میں دعوی اصلاح کیا تھا اس کی تردید کے لئے اس سے کہیں زیادہ بلیغ انداز کلام اختیار کیا گیا ہے اور اس انداز بلاغت کی چند درج ذیل وجوہات ہیں۔

1۔ ان کے دعویٰ کی تردید کے لئے جملہ مستانفہ ذکر کیا گیا ہے جو کسی پوشیدہ سوال کا جواب ہوتا ہے۔

2۔ اس سے پہلے دو حرف تاکید ذکر کئے گئے، الا حرف تنبیہ، ان حرف تحقیق

حرف الا:

یہ مخاطب کو اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے لایا جاتا ہے جو بعد حکم بیان ہونے والا ہے اسے چوکنا اور خبردار ہو کر سماعت کریں، اور یہ اثبات کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ جب لا حرف نفی سے پہلے ہمزہ استفہام انکاری آجاتا ہے تو وہ اثبات کا ہی فائدہ دیتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ،

الیس ذالك بقادر   کیا اللہ اس پر قادر نہیں یعنی وہ قادر ہے۔ (سورۃ قیامۃ آیت نمبر 40)

اسی وجہ سے اس کے بعد ایسا جملہ آتا ہے جس کے آغاز میں ایسے حروف آتے ہیں جو قسم کے مقدمات میں سے ہیں اور اسی کا ہم معنی لفظ اما ہے جو جملہ قسمیہ کے طلائع میں سے ہے۔

اس جملہ کے آغاز میں ان حروف مشبہ بالفعل ہے جو نسبت حکمیہ کو ثابت کرنے کے لئے آتا ہے۔

خبر کو معرفہ ذکر کیا اور مبتداء اور خبر ھم ضمیر فصل ذکر فرمائی جو خبر اور صفت کے درمیان فرق کرنے کے ساتھ ساتھ خبر کو مبتداء کے ساتھ خاص کرنے کا فائدہ بھی دیتی ہے۔ یہ تاکید بالائے تاکید اسی لئے لگائی گئی ہے کہ منافقین کے دعویٰ اصلاح کی بھرپور انداز میں تردید کی جائے کیونکہ انہوں نے

انما نحن مصلحون

کہا تھا جس سے ان کا مقصد اصلاح کے دعویٰ کے ساتھ تعریضاً مومنین کو فسادی شمار کرنا تھا اور لکن کا لفظ ذکر فرما کر اس وہم کا ازالہ کر دیا جو مومنوں کے فسادی ہونے کا پیدا ہوتا تھا اور لا یشعرون کا جملہ ذکر کر کے ان سے احساس ہی کی نفی فرما دی کہ انہیں اپنے فسادی ہونے کا احساس تک نہیں۔ (جبکہ ان کا فساد بالکل ظاہر تھا)

نوٹ:

فساد و شعور کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 13]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ (13)

ترجمہ:

”اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنتا ہے؟ وہی احمق ہیں مگر جانتے نہیں“۔

متن:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا من تمام النصح والإرشاد فإن كمال الإيمان بمجموع الامرين: الإعراض عما لا ينبغي وهو المقصود بقوله: لَا تُفْسِدُوْا، والإتيان بما ينبغي وهو المطلوب بقوله: آمَنُوْا.

كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ في حيز النصب على المصدر، وما مصدرية أو كافة مثلها في ربما، واللام في الناس للجنس والمراد به الكاملون في الإنسانية العاملون بقضية العقل، فإن اسم الجنس كما يستعمل لمسماه مطلقاً يستعمل لما يستجمع المعاني المخصوصة به والمقصودة منه، ولذلك يسلب عن غيره فيقال: زيد ليس بإنسان، ومن هذا الباب قوله تعالى: صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ ونحوه وقد جمعهما الشاعر في قوله:

إذ الناسُ ناسٌ والزمانُ زمان أو للعهد، والمراد به الرسول صلّى الله عليه وسلّم ومن معه. أو من آمن من أهل جلدتهم كابن سلام وأصحابه.

والمعنى آمنوا إيماناً مقروناً بالإخلاص متمحضاً عن شوائب النفاق مماثلاً لإيمانهم، واستدل به على قبول توبة الزنديق وأن الإقرار باللسان إيمان وإن لم يفد التقييد.

ترجمہ:

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ آمِنُوا...الخ
کے ساتھ منافقوں کو مخاطب کیا گیا ہے تا کہ وعظ ارشاد اور نصیحت کو مکمل کیا جائے کیونکہ ایمان دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں،

1۔ ان تمام چیزوں کی تصدیق کرتے ہوئے ان کو عملی جامہ پہنانا، جو مناسب ہوں اللہ کریم کے فرمان کا بھی یہی مقصد ہے۔

2۔ ان تمام چیزوں سے پرہیز کرنا جو غیر مناسب اور غلط ہیں اور اللہ کریم کے ارشاد لا تفسدوا سے بھی یہی مراد ہے اور کما امن الناس میں کاف بمعنیٰ مثل ہے۔ اور ما یا تو مصدریہ ہے اور یا کافہ ہے جیسے ربما میں ما کافہ ہے اور کاف بمعنیٰ مثل اپنے مابعد کے ساتھ مل کر بتاویل مصدر ہو کر بحیثیت مفعول مطلق منصوب ہے۔ اور الناس سے پہلے الف لام یا تو جنسی ہے اور الناس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ان اوصف سے متصف ہیں جن کا کامل انسانوں میں پایا جانا ضروری ہوتا ہے تو دریں صورت آیت کریمہ کا یہ معنیٰ ہوگا کہ اے ایمان والو ایسے ایمان لے کر آؤ جیسے کامل الانسانیت ایمان لے کر آئے اور عقل وشریعت کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح مطلق اسم بول کر اس سے کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت مراد لی جاسکتی ہے اسی طرح اس سے وہ ذات بھی مراد لی جاتی ہے کہ جس میں اس جنس کے وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جو اس کے کمال کا تقاضا کرتے ہیں اور جو اوصاف اس جنس سے مقصود ہوتے ہیں اسی وجہ سے جس میں وہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں اس سے اس جنس کی نفی ہی کر دی جاتی ہے اور یوں کہا جاتا ہے کہ وہ انسان ہی نہیں یعنی اس میں انسانیت کے اوصاف ہی نہیں پائے جاتے اللہ کریم کا یہ ارشاد اسی پر دال ہے،

صم بکم عمی
یعنی وہ قوت نطق، قوت سماعت اور قوت بصارت کے ہونے کے باوجود نہ ہی حق کی باتیں سنتے ہیں اور نہ ہی زبان سے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ تو گویا وہ دیکھنے، سننے اور بولنے سے بے بہرہ ہیں۔ اور کسی شاعر نے اس کی وضاحت کے لئے جنس مطلق اور مخصوص اوصاف سے متصف جنس کو ایک ہی شعر میں جمع کر دیا۔

دیار بها کنا نحب مزارها   اذا الناس ناس والزمان زمان

ان شہروں کا دیکھنا ہمیں اس وقت محبوب تھا جب لوگ لوگ تھے اور زمانہ زمانہ تھا۔

پہلے ناس سے مطلق جنس مراد ہے اور دوسرے ناس سے وہ انسان مراد ہیں جو انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ اسی طرح پہلے زمانہ سے مراد مطلق زمانہ ہے اور دوسرے زمانہ سے مراد خاص زمانہ ہے یا الناس سے پہلے الف لام عہد خارجی کی ہے۔ یعنی خارج میں مخصوص لوگ مراد ہیں۔ اور وہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب ہیں کیونکہ وہی ہستیاں انسانیت کے اعلیٰ

درجے پر فائز تھیں۔ یا اسی سے یہود کے وہ افراد مراد ہوں گے جو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی، تو مطلب یہ ہوگا کہ اے منافقین تم اس طرح نفاق سے پاک ایمان لاؤ جس طرح وہ ایمان لائے تھے جو کامل الانسانیت تھے وہ نفاق جیسے تمام شائبوں سے پاک تھے۔ اور اے یہودیو تم اس طرح اخلاص کے ساتھ ایمان لے آؤ جس طرح تمہاری قوم سے کچھ افراد ایمان لا چکے ہیں۔

توبہ زندیق:

اور اس آیت طیبہ میں اس بات پر دلیل قائم کی گئی ہے کہ زندیق کی توبہ قبول ہے زندیق وہ شخص ہے جو نبوت، توحید اور اسلامی عقائد کا بھی زبان سے اقرار کرتا ہے اور ایسے عقائد کا بھی متحمل ہے جو بالاتفاق کفریہ عقائد ہیں اور معتزلہ کے نزدیک یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی کہ صرف زبان سے اقرار کر لینا خواہ اسے تصدیق قلبی حاصل نہ ہو، ایمان ہے ورنہ کما امن الناس کی قید کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

نوٹ: ناس اور ایمان کی تحقیق گزر چکی ہے۔

سفاہت کا مفہوم:

(س ف ہ) السفة (Fool)

اس کے اصل معنی جسمانی ہلکا پن کے ہیں اسی سے بہت زیادہ مضطرب رہنے والی مہار کو زمام سفیہ کہا جاتا ہے اور ثوب سفیۃ کے معنی ردی کپڑے کے ہیں۔ پھر اسی سے یہ لفظ نقصان عقل کے سبب خفت نفس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے سفہ نفسہ جو اصل میں سفہ نفسہ ہے پھر اس سے فعل کے نسبت قطع کر کے بطور تمیز کے اسے منصوب کر دیا ہے جیسے بطرت معشیتہ کہ یہ اصل میں بطرت معیشتہ ہے۔ اور سفہ کا استعمال امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق ہوتا ہے چنانچہ امور دنیوی میں سفاہت کے متعلق فرمایا:

"وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 5)

اور بے عقلوں کو ان کے مال نہ دو۔

اور سفاہت اخروی کے متعلق فرمایا:

"وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا" (سورۃ الجن آیت نمبر 4)

اور یہ کہ ہم میں کا بے وقوف اللہ پر بڑھ کر بات کہتا تھا۔

یہاں سفاہت دینی مراد ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے اور آیت کریمہ:

"اَنُؤْمِنُ كَمَا اٰمَنَ السُّفَهَاءُ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 13)

توکہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں سنتا ہے؟ وہی احمق ہیں۔

میں ان سفیہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ ان کا مؤمنین کو سفہاء کہنا بنا برحماقت ہے اور خود ان کی نادانی کی دلیل ہے۔

اسی معنی میں فرمایا:

"سَيَقُوْلُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 142)

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر تھے۔

علم کا معنیٰ:

(ع ل م) العلم (Knowledge)

کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا۔

متن:

قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ الهمزة فيه للإنكار، واللام مشار بها إلى الناس، أو الجنس بأسره وهم مندرجون فيه على زعمهم، وإنما سَفَّهُوهُم لاعتقادهم فساد رأيهم، أو لتحقير شأنهم، فإن أكثر المؤمنين كانوا فقراء ومنهم موالى: كصهيب وبلال، أو للتجلد وعدم المبالاة بمن آمن منهم إن فسر الناس بعبد الله بن سلام وأشياعه. والسفه: خفة وسخافة رأي يقتضيهما نقصان العقل، والحلم يقابله.

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ رد ومبالغة فى تجهيلهم، فإن الجاهل بجهله الجازم على خلاف ما هو الواقع أعظم ضلالة وأتم جهالة من المتوقف المعترف بجهله فإنه ربما يعذر وتنفعه الآيات والنذر، وإنما فصلت الآية ب لَا يَعْلَمُونَ والتى قبلها ب لَا يَشْعُرُونَ لأنه أكثر طباقاً لذكر السفه، ولأن الوقوف على أمر الدين والتمييز بين الحق والباطل مما يفتقر إلى نظر وفكر. وأما النفاق وما فيه من الفتن والفساد فإنما يدرك بأدنى تفطن وتأمل فيما يُشَاهد من أقوالهم وأفعالهم.

ترجمہ:

یہاں انومن سے مراد ہمزہ استفہام انکاری ہے اور السفہاء سے پہلے جو سوال مذکور ہے اس کا اشارہ الناس کی طرف ہے یا اس کا اشارہ جنس سفہاء کی طرف ہے اور منافقین کے زعم باطل کے مطابق مومنین بھی سفہاء کی اس جنس میں داخل ہیں، ان کا مومنین کو بیوقوف کہنے کی وجہ یہ تھی، ان کے اعتقاد کے مطابق مومنین کی رائے درست نہ تھی بلکہ وہ انہیں نادان سمجھتے تھے یا

مومنین کو بیوقوف کہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ انہیں حقیر سمجھتے تھے کیونکہ مومنین میں سے اکثر فقراء اور آزاد کردہ غلام تھے جیسے حضرت صہیب رومی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے اور اگر الناس سے مراد عبداللہ بن سلام اور آپ کے ساتھی لئے جائیں تو انہیں بیوقوف کہنے کی وجہ یہ ہوگی کی منافقین اپنا تعصب اور مضبوطی ظاہر کرتے تھے اور وہ ان کی قوم سے ایمان لانے والوکی پرواہ نہیں کرتے تھے اور سفہاء سفہ سے مشتق ہے جس کا مطلب کمزوری اور ضعف عقل ہے اور یہ کمزوری ضعف عقل کا تقاضا کرتی ہے اوحلم اس کے مقابلہ میں ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ

جان لو وہی نے وقوف ہیں مگر جانتے نہیں۔

یہ منافقین کے دعویٰ کا جواب ہے اور تردید ہے کیونکہ ان کے باطل گمان کے مطابق مومن بے وقوف تھے اور ان کی حماقت اور بے وقوفی میں مبالغہ کا اظہار کرنا مقصود ہے کیونکہ وہ شخص جو اپنی جہالت سے ناواقف ہو اور اپنی جہالت کے کے خلاف کا یقین رکھتا ہو وہ اس شخص سے کہیں جاہل اور گمراہ ہوتا ہے جس کو اپنی جہالت اور گمراہی کا علم ہو۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایسے شخص کو معذور سمجھ لیا جائے اور تنبیہات اور ڈراوے اس کے لئے مفید ثابت ہوں جبکہ اس کے مخالف کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اور اس آیت کے آخر میں لایعلمون کا ذکر کر کے فاصلہ کیا گیا ہے۔ جبکہ ماقبل آیت طیبہ میں جس میں منافقین کے فساد اور فتنہ پردازیوں کا ذکر ہے، کا فاصلہ لایشعرون کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سفاہت کا ذکر کر کے مناسب لایعلمون میں صنعت طباق زیادہ ہے اور دین کے معاملہ میں آگاہی حاصل کرنا اور حق و باطل میں تمیز کرنا غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں اس لئے ان کی سفاہت کے ثبوت کے بعد لایعلمون ذکر فرما دیا لیکن ان کا فتنہ اور فساد محسوس چیز کی طرح تھا جس میں تھوڑا سا غور و فکر کر کے ادراک حاصل کیا جا سکتا تھا اور ان کے اقوال و افعال کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہو جاتا تھا اس لئے فرمایا کہ انہیں شعور و احساس ہی نہیں کہ وہ اپنے فتنوں اور فسادات کو محسوس کر سکیں گویا اس کے حواس ناکارہ ہو چکے ہیں جن سے وہ احساس کر سکتے تھے۔

[سورة البقرة (2) : آية 14]

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (14)

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یونہی ہنسی کرتے ہیں"۔

متن:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بيان لمعاملتهم المؤمنين والكفار، وما صدرت به

القصة فمساقه لبيان مذهبهم وتمهيد نفاقهم فليس بتكرير.

روى أن ابن أبيّ وأصحابه استقبلهم نفر من الصحابة، فقال لقومه:

انظروا كيف أرد هؤلاء السفهاء عنكم، فأخذ بيد أبي بكر رضى الله عنه فقال: مرحباً بالصديق سيد بنى تيم، وشيخ الإسلام وثانى رسول الله فى الغار الباذل نفسه وماله لرسول الله صلّى الله عليه وسلّم، ثم أخذ بيد عمر رضى الله عنه فقال: مرحباً بسيد بنى عدى الفاروق القوى فى دينه، الباذل نفسه وماله لرسول الله صلّى الله عليه وسلّم، ثم أخذ بيد على رضى الله عنه فقال: مرحبا يا ابن عم رسول الله صلّى الله عليه وسلّم وختنه سيد بنى هاشم، ما خلا رسول الله صلّى الله عليه وسلّم. فنزلت.

واللقاء المصادفة يقال لقيته ولاقيته، إذا صادفته واستقبلته، ومنه ألقيته إذا طرحته فإنك بطرحه جعلته بحيث يلقى.

وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ من خلوت بفلان وإليه إذا انفردت معه. أو من خلاك ذمٌّ أى عداك ومضى عنك، ومنه القرون الخالية. أو من خلوت به إذا سخرت منه، وعدى بإلى لتضمن معنى الإنهاء، والمراد بشياطينهم الذين ماثلوا الشيطان فى تمردهم، وهم المظهرون كفرهم، وإضافتهم إليهم للمشاركة فى الكفر. أو كبار المنافقين والقائلون صغارهم. وجعل سيبويه نونه تارة أصلية على أنه من شطن إذا بعد فإنه بعيد عن الصلاح، ويشهد له قولهم: تشيطن. وأخرى زائدة على أنه من شاط إذا بطل، ومن أسمائه الباطل.

قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ أى فى الدين والاعتقاد، خاطبوا المؤمنين بالجملة الفعلية، والشياطين بالجملة الإسمية المؤكدة بإن لأنهم قصدوا بالاولى دعوى إحداث الإيمان، وبالثانية تحقيق ثباتهم على ما كانوا عليه، ولأنه لم يكن لهم باعث من عقيدة وصدق رغبة فيما خاطبوا به المؤمنين، ولا توقع رواج ادعاء الكمال فى الإيمان على المؤمنين من المهاجرين والانصار بخلاف ما قالوه مع الكفار.

إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ تأكيد لما قبله، لأن المستهزىء بالشىء المستخف به مُصِرٌّ على خلافه. أو بدل منه لأن من حقر الإسلام فقد عظم الكفر. أو استئناف فكأن الشياطين قالوا لهم لما (قالوا إنا معكم) إن صح ذلك فما بالكم توافقون المؤمنين وتدعون

الإيمان فأجابوا بذلك. والاستهزاء السخرية والاستخفاف يقال: هزئت واستهزأت بمعنى كأجبت واستجبت. وأصله الخفة من الهزء وهو القتل السريع يقال: هزأ فلان إذا مات على مكانه. وناقته تهزأ به أي تسرع وتخف.

__ترجمہ:__

اس آیت مقدسہ میں منافقین کا جو طرز عمل مومنین اور کفار سے تھا اس کا ذکر کیا گیا ہے، اور

ومن الناس من يقول الى آخره

جہاں سے منافقین کے قصے کا آغاز ہوا ہے اس کا مقصد ان کا مذہب اور عقیدہ بیان کرنا تھا اور وہ ان کے نفاق کی تمہید تھی جب انہوں نے یہ کہا

امنا بالله وباليوم الآخر

تو اللہ کریم نے یہ فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہیں اس میں ان کے ایمان کے دعویٰ کی مؤکد نفی ہے لہٰذا زیر بحث آیت کا ذکر کرنا قصے کا تکرار نہیں بلکہ ان کے برتاؤ کا بیان ہے۔

اس آیت کریمہ کے شان نزول میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی رئیس المنافقین اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا رہا تھا کہ اس کی ملاقات صحابہ کرام کی اس جماعت سے ہوئی جس میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم تھے تو اس نے کہا کہ دیکھو میں ان بیوقوفوں (اللہ کی پناہ) کو تم سے کیسے ٹالتا ہوں اس نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا میں بنی تیم کے سردار، شیخ الاسلام، غار میں نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی اور آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سب کچھ قربان کرنے والے صدیق اکبر کو خوش آمدید کہتا ہوں، ا اور پھر اس نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا کہ میں بنو عدی کے سردار الفاروق، دین اسلام کے لئے اپنا جان و مال قربان کرنے والے عمر فاروق کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی، آپ کے داماد، اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بنو ہاشم کے سردار علی رضی اللہ عنہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی۔

نیز یہ روایت محدثین کے نزدیک پایہ صحت تک نہیں پہنچی۔

لقوا یہ لقاء سے مشتق ہے اس کا معنی کسی چیز کو پالینا اور ملاقات کرنا ہے لقیتہ اور لاقیتہ تو اس وقت کہے گا جب تو کسی سے ملاقات کرے گا کہ میں نے اس سے ملاقات کی اور اسے میں نے پالیا اور لقاء سے جب باب افعال القاء بنا لیا جائے تو اس کا معنی پھینکنا ہو جاتا ہے جیسا کہ تو کہے القیتہ بمعنی طرحتہ (کہ میں نے اسے پھینک دیا) کیونکہ جب تو اسے پھینکے گا تو وہ دوسری چیز سے مل جائے گی۔

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيَاطِيْنِهِمْ

اور جب وہ اپنے شیطانوں جیسے سرداروں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔

خلو مشتق ہے خلوۃ سے۔ جو تین معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

1. اگر اس کے بعد حرف جارہ میں سے با یا الی آجائے تو اس کا معنیٰ تنہا ہونا، الگ ہونا ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے خلوت بفلان والیہ (کہ میں اس کے ساتھ علیحدہ ہوا) تو اس آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جب وہ اپنے شیطانوں جیسے سرداروں کے ساتھ علیحدہ ہوتے ہیں۔ تو انہیں کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم مومنین کے ساتھ تو مذاق کر رہے تھے۔

2۔ اور جب خلاک ذم سے مشتق ہو یا صرف خلاک سے مشتق مانا جائے تو اس کا معنیٰ ہوگا گزر یعنی مذمت تجھ سے تجاوز کر گئی اسی لئے گزشتہ صدیوں کو قرون خالیہ کہتے ہیں۔

3۔ یا اگر خلوت بہ سے مشتق مانا جائے تو معنی مذاق کرنا ہوگا اس معنیٰ کے اعتبار سے خلوا کے بعد الی کا لفظ اسی لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ اپنے ضمن میں انتہاء کا معنیٰ لئے ہوئے ہے، اور شیاطین سے مراد ان کے وہ سردار ہوں گے جو اپنی سرکشی اور ہٹ دھرمی میں شیطان کے ہم مثل ہیں اور اس صورت میں یا تو ان سے مراد وہ کفار ہوں گے جو اپنے کفر کا برملا اظہار کرتے تھے اور منافقین کو کفار میں شمار کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ کفر میں ان کے ساتھ شریک تھے یا ان میں سے ایک چیز ہونی چاہئے شیاطین سے بڑے بڑے گبر منافق مراد ہوں گے اور انا معکم کہنے والے ان کے چھوٹے منافق ہوں گے شیاطین کا مفرد شیطان ہے جو سیبویہ کے نزدیک شطن بمعنیٰ بعد سے ماخوذ ہے اور اس کا نون اصلی ہوگا اور معنیٰ ہوگا کہ وہ اصلاح سے بہت ہی دور ہیں۔ اور بعض کا تشیطن پڑھنا بھی اسی کی تائید کرتا ہے اور یا یہ شاط بمعنیٰ بطل سے مشتق ہے، جس کا معنیٰ جھوٹا اور باطل ہونا ہے اور شیطان کے ناموں میں سے ایک نام باطل بھی ہے جو اس معنیٰ کی تائید کرتا ہے۔

قالوا انا معکم...

منافقوں کا کہنا ہے کہ ہم بلا شک وشبہ تمہارے ساتھ ہیں، اعتقاد اور دین میں۔ تو منافقین نے جب مومنین کو خطاب کیا تو جملہ فعلیہ ذکر کیا جو تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے اور جب اپنے شیطان جیسے سرداروں سے ملاقات کی تو ان کے ساتھ خطاب میں جملہ اسمیہ، ان کے ساتھ مؤکد کر کے استعمال کیا جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مومنین کو دھوکہ دینا چاہتے تھے کہ اب وہ نئے سرے سے ایمان لا رہے ہیں جس میں اخلاص ہے اور اپنے سرداروں کے ساتھ ملاقات میں جملہ اسمیہ مؤکدہ پیش کیا جو ثبات، تحقیق اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، تاکہ وہ انہیں یقین دلا سکیں کہ وہ اپنے سابقہ دین اور کفر پر مضبوط اور پختہ ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ایمان کے اظہار میں نہ تو ان کے اندر سچی رغبت تھی اور نہ ہی انہیں یہ توقع تھی کہ کامل فی الایمان کا، ان کا دعویٰ ان پر اثر انداز ہوگا۔ اسی لئے محض تصنع اور بناوٹ ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے امنا کہہ دیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ مومنین کا تعلق مہاجرین اور انصار سے تھا جو فراست ایمانی کے نور سے دیکھتے تھے، بخلاف کفار کے ساتھ خطاب میں جس کا انہوں نے دعویٰ کیا

تھا کیونکہ اس میں انہیں صرف توقع ہی نہ تھی بلکہ پختہ یقین تھا کہ ان پر اثر انداز ہوگا اور وہ اسے تسلیم کرلیں گے۔

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ

بے شک ہم ان سے (مومنین سے) استہزاء کررہے ہیں۔

اس جملہ کے ماقبل کلام سے تین اعرابی احتمال مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) اپنے ماقبل کلام کی تاکید ہے۔

(2) یا یہ اپنے ماقبل سے بدل اشتمال ہے، اسی لئے اس کے درمیان واو عاطفہ ذکر نہیں کی گئی کیونکہ جو کسی کے ساتھ استہزاء کرتا ہے اور اسے حقیر سمجھتا ہے تو وہ اسی کے خلاف پر مصر ہوتا ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوگا کہ منافقین مومنین کا مذاق اڑا کر اور انہیں حقیر سمجھ کر اپنے مذہب یہودیت پر قائم رہنے کو ثابت کررہے ہیں کیونکہ جو اسلام کو حقیر سمجھتا ہے وہ کفر کی تعظیم کرتا ہے۔

(3) یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کا ماقبل سے اعرابی تعلق نہیں ہے اور آپکو پتہ ہے کہ جملہ مستانفہ سوال مقدر کا جواب ہوتا ہے تو گویا منافقین ان سے پوچھتے کہ اگر تم ہمارے ساتھ ہو تو جیسے تم نے انا معکم کہا تو مومنین کے ساتھ موافقت کیوں کرتے ہو؟

اور ایمان کا دعویٰ کرنے کی وجہ کیا ہے؟

تو جواب دیتے ہیں کہ وہ ان کا مذاق اڑا رہے تھے اور انہیں بے وقوف بنا رہے تھے۔

مُسْتَهْزِءُوْنَ

مشتق ہے استہزاء سے، جس کا معنی ہے خفیف سمجھنا اور مذاق کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے ھزات و استھزات میں نے مذاق کیا اور حقیر سمجھا۔ یہ دونوں ہم معنی ہیں جیسے اجبت اور استجبت ہم معنیٰ ہیں کہ میں نے قبول کیا۔ دراصل استہزاء ھزء سے بنا ہے جس کا معنیٰ جلدی قتل کرنا ہے اور جب کوئی بندہ فوراً موقع پر ہلاک ہوجاتا ہے تو کہا جاتا ہے ھزء فلان کہ فلاں اسی جگہ مرگیا اور جب کوئی اونٹنی کسی چیز کو اٹھا کر تیز اور سبک رفتاری سے چلے تو کہتے ہیں۔

ناقتہ تھزا بہ

کہ اونٹنی اسے سبک اور تیز رفتاری سے لئے جارہی ہے۔

لفظ لقوا کی تحقیق:

و تلقی السماحۃ منہ والندی خلقا سخاوت اور بخشش کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ لقیت بکذا۔ میں فلاں چیز کے ساتھ اس کے سامنے پہنچا۔ قرآن میں ہے:

"وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلاماً" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 75)

اور وہاں مجرے اور سلام کے ساتھ ان کی پیشوائی ہوگی۔

"وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُوراً" (سورۃ الانسان آیت نمبر 11)

اور فرشتے ان کی پیشوائی کو آئیں گے۔

تلقاہ کے معنی کسی چیز کو پالینے یا اس کے سامنے آنے کے ہیں۔

جیسے فرمایا: "وَتَتَلَقّٰاهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ "(سورۃ الانبیاء آیت نمبر 103)

اور فرشتے ان کو لینے آئیں گے۔

"وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ "(سورۃ النمل آیت نمبر 6)

اور بیشک تم قرآن سکھائے جاتے ہو حکمت والے علم والے کی طرف سے۔

تحقیق لفظِ خلا:

(خ ل و) الخلاء (Vacancy, Empty, Cavity)

خالی جگہ جہاں عمارت و مکان وغیرہ نہ ہو اور الخلو کا لفظ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ میں مضی (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت خلا الزمان کے معنی زمانہ گزر گیا کر لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَما مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول ہو چکے۔

"وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ "(سورۃ الرعد آیت نمبر 6)

اور ان سے اگلوں کی سزائیں ہو چکیں۔

"تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 141) یہ ایک گروہ ہے کہ گزر گیا۔

تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں۔

"اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ "(سورۃ فاطر آیت نمبر 24) سب میں ایک ڈر سنانے والا گزر چکا۔

"مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 214)

تم پر اگلوں کی سی روداد نہ آئی۔

"وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 119)

اور اکیلے ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں غصہ سے۔

اور آیت کریمہ: "يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ "(سورۃ یوسف آیت نمبر 9)

کہ تمہارے باپ کا منہ صرف تمہاری ہی طرف رہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے۔ رہ جائے گی۔ خلا الانسان۔ تنہا ہونا۔ خلا فلان بفلان کسی کے ساتھ تنہا ہونا۔ خلا الیہ کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔ قرآن میں ہے:

"وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیَاطِیْنِهِمْ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 14)

اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں۔

خلت فلانا کے اصل معنی کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔

فرمایا:

"فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ " (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 5) تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

ناقۃ خلیۃ۔ اونٹنی کو دودھ دوہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔ امراءۃ خلیۃ مطلقۃ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد چھوڑ دی اور جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی ہو اسے بھی خلیۃ کہا جاتا ہے۔ الخلی جو غم سے خالی ہو۔ جیسا کہ مطلقۃ کا لفظ سکون و اطمینان کے معنی میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر کا قول،

تطلقۃ طورا طورا تراجع

میں (کسی سے سکون ہو جاتا ہے اور کبھی وہ درد (عود کر آتی ہے) میں تطلقۃ کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ الخلاء، خشک گھاس۔ کہا جاتا ہے: خلیت الخلاء۔ میں نے خشک گھاس کاٹی۔ خلیت الدابۃ۔ جانور کو خشک گھاس ڈالی۔ سیف یختلی۔ تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

الی حرف جار کی تحقیق:

الیٰ۔ حرف (جر) (Upto, Till)

حرف جر ہے اور جہات ستہ میں سے کسی جہت کی نہایت حد بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ (ال و) الوت فی الامر کے معنی ہیں کسی کام میں کوتاہی کرنا گویا کوتاہی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس امر کی انتہا یہی ہے۔ اور الوت فلانا کے معنی اولیتہ تقصیرا (میں نے اس کوتاہی کا والی بنا دیا) کے ہیں جیسے کسبتہ ای اولیتہ کسبا (میں نے اسے کسب کا ولی بنا دیا) ماالوتہ جھدا میں نے مقدر پھر اس سے کوتاہی نہیں کی اس میں جھدا تمیز ہے جس طرح ماالوتہ نصحا میں نصحا ہے۔

قرآن میں ہے:

"لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 118)

یعنی یہ لوگ تمہاری خرابی چاہنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔

اور آیت کریمہ: "وَلَا یَاْتَلِ اُولُو الْفَضْلِ مِنْکُمْ "(سورۃ النور آیت نمبر 22)

اور قسم نہ کھائیں وہ جو تم میں فضیلت والے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ الوت سے باب افتعال ہے اور بعض نے الیت بمعنی حلفت سے مانا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی تھی جب کہ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ مسطح کی مالی امداد نہیں کریں

گے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ فعل (مجرد) سے بنایا جاتا ہے جیسے:

کبت سے اکتسبت اور صنعت سے اصطنعت اور رایت سے ارتایت اور روایت لا دریت ولا ائتلیت میں بھی ماالوته شنیا سے افتعال کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے معنی ولا استطعت کے ہیں (یعنی تو نے نہ جانا اور نہ تجھے اس کی استطاعت ہوئی۔

نوٹ: لفظِ شیطان کی بحث گزر چکی ہے۔

مفہوم استہزاء:

الاستہزاء

اصل میں طلب ھزء کو کہتے ہیں اگر چہ کبھی اس کے معنی مزاق اڑانا بھی آجاتے ہیں جیسے استجابة کے اصل معنی طلب جواب کے ہیں اور یہ اجابة جواب دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

" قُلْ اَبِاللهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِؤُنَ "(سورة التوبة آیت نمبر 65)

کہو کیا تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی کرتے تھے۔

" وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِؤُنَ " (سورة هود آیت نمبر 8)

اور جس چیز کے ساتھ یہ استہزاء کیا کرتے۔ تھے وہ ان کو گھر لے گی۔

" مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِؤُنَ " (سورة الحجر آیت نمبر 11)

اور ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا تھا مگر اس کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔

"اِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا" (سورة النساء آیت نمبر 140)

جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جاتا اور ان کی ہنسی بنائی جاتی ہے۔

" وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ " (سورة الانعام آیت نمبر 10)

اور ضرور اے محبوب تم سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ٹھٹھہ کیا گیا۔

استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسا؟

حقیقی معنی کے لحاظ سے استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے جیسا کہ لہو ولعب کا استعمال باری تعالیٰ کے حق میں جائز نہیں ہے لہٰذا آیت:

" اللهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ " (سورة البقرة آیت نمبر 15)

اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

میں یستھزئ کے معنی یا تو استھزاء کی سزا تک مہلت دی اور پھر انہیں دفعتہً پکڑ لیا یہاں انہوں نے ھزء کی طرح دھوکا

کھایا پس یا اس مارج کے ہم معنی ہے جیسے فرمایا: ان کو بتدریج اس طرح سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر وہ استہزار اڑا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے استہزار سے باخبر ہے تو گویا اللہ تعالیٰ بھی ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو دھوکہ دے۔ اور وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہو کر اسے اطلاع دیئے بغیر اسے سے احتراز کرے تو کہا جاتا ہے۔ خدعنہ یعنی وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

ان للمستهزئین فی الدنیا الفتح لهم باب من الجنته فیسرعون نحوه فاذا انتهوا الیه سد علیهم۔

کہ جو لوگ دنیا میں دین الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں قیامت کے دن ان کے لئے جنت کا دروازہ کھولا جائیگا جب یہ لوگ اس میں داخل ہونے کے لئے سرپ دوڑ کر وہاں پہنچیں گے تو وہ دروازہ بند کر دیا جائیگا۔

چنانچہ آیت: "فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ" (سورة المطففین آیت نمبر 34)

تو آج ایمان والے کافروں سے ہنستے ہیں۔

اس میں بعض کے نزدیک ضحک سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت

"سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ" (سورة التوبة آیت نمبر 79)

اللہ ان کی ہنسی کی سزا دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

میں بھی اسی قسم کی تاویل ہوسکتی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 15]

اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (15)

''اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں''۔

متن:

اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ

يجازيهم على استهزائهم، سمي جزاء الاستهزاء باسمه كما سمي جزاء السيئة سيئة، إما لمقابلة اللفظ باللفظ، أو لكونه مماثلاً له في القدر، أو يرجع وبال الاستهزاء عليهم فيكون كالمستهزئ بهم، أو ينزل بهم الحقارة والهوان الذي هو لازم الاستهزاء، أو الغرض منه، أو يعاملهم معاملة المستهزئ: أما في الدنيا فبإجراء أحكام المسلمين عليهم، واستدراجهم بالإمهال والزيادة في النعمة على التمادي في الطغيان، وأما في

الآخرة: فبأن يفتح لهم وهم فى النار باباً إلى الجنة فيسرعون نحوه. فإذا صاروا إليه سد عليهم الباب، وذلك قوله تعالى: فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ وإنما استؤنف به ولم يعطف ليدل على إن الله تعالى تولى مجازاتهم، ولم يحوج المؤمنين إلى أن يعارضوهم، وأنَّ استهزاءهم لا يؤبه به فى مقابلة ما يفعل الله تعالى بهم ولعله لم يقل: الله مستهزئ بهم ليطابق قولهم، إيماء بأن الاستهزاء يحدث حالاً فحالاً ويتجدد حيناً بعد حين، وهكذا كانت نكايات الله فيهم كما قال تعالى: أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ.

ترجمہ:

اللہ یستھزئُ بِھِم

کا معنی یہ ہے کہ اللہ کریم ان منافقین کو ان کے استہزا کی سزا دیتا ہے۔ یہاں استہزاء کی سزا کو مجازاً اسی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے سیئۃ، برائی کی سزا کو کہا جاتا ہے حالانکہ برائی کی سزا برائی نہیں ہوتی بلکہ انصاف ہوتا ہے۔ یہ تو بطور مشاکلہ یعنی ایک لفظ کے انجام کو اسی لفظ کے ساتھ تعبیر کرنا ہے

یا جو سزا منافقین کو دی جائے گی وہ مقدار میں ان کے نفاق کے مماثل ہوگی۔

یا اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ کریم ان کے وبال انہیں کی طرف لوٹائے گا جس کو مجازاً استہزاء کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے ساتھ استہزاء کر دیا جائے۔

یا ان کے استہزاء کی وجہ سے ان پر حقارت اور ذلت نازل فرمائے گا کیونکہ ذلت وحقارت، استہزاء کو لازم ہیں اس لئے ملزوم بول کر لازم مراد لیا اور استہزاء کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے۔

یا اللہ کریم منافقین کے ساتھ ایسا معاملہ فرما رہا ہے جیسا ان لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے جن سے استہزاء کیا جاتا ہے۔ یا تو معاملہ دنیا میں ہوگا وہ اس طرح کہ دنیا میں ان کو اسلامی احکام کا مکلف بنایا جا رہا ہے اور ان پر فوری عذاب نازل نہیں کیا جا رہا۔ بلکہ انہیں مہلت دے کر آہستہ آہستہ جہنم کی طرف لے جا رہا ہے، اور ان کی سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے کے باوجود ان پر نعمتوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

یا یہ معاملہ آخرت میں ہوگا وہ اس طرح کہ جب وہ دوزخ کی آگ میں جل رہے ہوں گے تو ان کے سامنے جنت کا ایک دروازہ کھول دیا جائے گا وہ اس میں داخل ہونے کے لئے تیزی کے ساتھ دوڑیں گے تو جب وہ اس کے نزدیک پہنچیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا، اور اللہ کریم کا یہ ارشاد گرامی اس کی تائید کرتا ہے فرمایا،

فالیوم الذین امنوا من الکفار یضحکون

کہ آج ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے۔

اللہ یستھزءُ بھم کو بطور جملہ مستانفہ ذکر کیا گیا ہے اور اس کا ماقبل کلام پر عطف نہیں کیا گیا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ اللہ کریم مومنین کی طرف سے منافقین کو سزا دینے کا متولی ہے اور اس نے مومنین کو اس سے بے پرواہ کر دیا ہے کہ وہ ان کا مقابلہ کریں اور یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ ایمان والے ان کے استہزاء کی پرواہ نہ کریں کیونکہ اللہ کریم جو ان سے معاملہ کرنے والا ہے وہ بہت ہی شدید عذاب ہے۔

اور شاید اسی وجہ سے اللہ کریم نے،

اللہ یستھزءُ بھم
نہیں فرمایا کہ عبارت منافقین کی کہی ہوئی عبارت کے مطابق ہو جاتی بلکہ اس کی جگہ،

اللہ یستھزُ بھم
مضارع کا صیغہ ذکر فرمایا تا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ یہ سزا دن بدن نئے انداز میں پیدا ہوتی رہے گی، اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہے گی اور منافقین کے حق میں اللہ کریم کی سزائیں اس طرح شدید ترین ہوتی ہیں۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ کریم انہیں سال میں ایک یا دو مرتبہ آزمائشوں میں مبتلاء کرتا ہے۔

متن:

وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ

من مد الجيش وأمده إذا زاده وقواه، ومنه مددت السراج والارض إذا استصلحتهما بالزيت والسماد، لا من المد فى العمر فإنه يعدى باللام كأملى له. ويدل عليه قراءة ابن كثير (ويمدهم) . والمعتزلة لما تعذر عليهم إجراء الكلام على ظاهره قالوا: لما منعهم الله تعالى ألطافه التى يمنحها المؤمنين وخذلهم بسبب كفرهم وإصرارهم، وسدهم طرق التوفيق على أنفسهم فتزايدت بسببه قلوبهم ريناً وظلمة، تزايد قلوب المؤمنين انشراحاً ونوراً، وأمكن الشيطان من إغوائهم فزادهم طغياناً، أُسْنِدَ ذلك إلى الله تعالى إسناد الفعل إلى المسبب مجازاً، وأضاف الطغيان إليهم لئلا يتوهم أن إسناد الفعل إليه على الحقيقة، ومصداق ذلك أنه لما أسند المد إلى الشياطين أطلق الغي وقال وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ. أو أصله يمد لهم بمعنى يملى لهم ويمد فى أعمارهم كى يتنبهوا ويطيعوا، فما زادوا إلا طغياناً وعمهاً، فحذفت اللام وعدى الفعل بنفسه كما فى قوله تعالى: وَاخْتَارَ مُوسى قَوْمَهُ. أو التقدير يمدهم

استصلاحاً. وهم مع ذلك يعمهون فى طغيانهم. والطغيان بالضم والكسر كلقيان، والطغيان: تجاوز الحد فى العتو، والغلو فى الكفر. وأصله تجاوز الشيء عن مكانه قال تعالى: اِنَّا لَمَّا طَغَى الْماءُ حَمَلْناكُمْ. والعمه فى البصيرة كالعمى فى البصر، وهو: التحير فى الامر يقال رجل عامه وعمه، وأرض عمهاء لا منار بها، قال:

اَعْمَى الْهُدَى بالجاهِلين العمهُ

ترجمہ:

یہاں یمد کا مادہ اشتقاق مدالجیش وامدہ ہے اور یہ فقرہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب سپہسالار لشکر کے افراد میں اضافہ کردے اوراسے رسد پہنچا کر طاقتور بنادے، اس طرح مددت السراج والارض جس کا معنیٰ یہ کہ میں نے چراغ میں تیل ڈال کراورزمیں میں کھاد پھینک کران کی اصلاح کردی۔ یہ مدفی العمر سے مشتق نہیں جس کا معنیٰ عمر درازکرنا اور مہلت دینا ہے کیونکہ جب یہ عمر دراز کرنے اور مہلت دینے کے معنیٰ میں ہوتو اس وقت یہ لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسا کہ اُملی لہ کہ میں اسے مہلت دیتا ہوں اور جو معنیٰ اوپر مذکور ہوا ابن کثیر کی قرات بھی اس کی تائید کرتی ہے، کیونکہ انہوں نے یَمدھم کی جگہ یُمدھم بضمہ یا اور بکسرہ میم پڑھا ہے اس کا معنیٰ ہے کہ وہ ان کی مدد کرتا ہے۔

جب معتزلہ نے ان اللہ کریم کے اس ارشاد کو اس کے ظاہری معنیٰ پر محمول کرنا متعذر سمجھا کیونکہ ان کے نزدیک سرکشی میں بھٹکنے کی مہلت دینا اللہ کریم کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ یہاں اس کا حقیقی معنیٰ مراد لینا جائز نہیں بلکہ مجازی معنیٰ مراد ہے اور وہ معنی یہ ہے کہ جب اللہ کریم نے وہ اپنی نوازشات روک لیں جو وہ مومنین پر فرمارہا ہے، اور منافقین کو کفرواصرار کی وجہ سے ذلیل ورسوا کردیا اور انہوں نے اپنے اوپر راہِ راست کو بند کرلیا تو اللہ کریم نے اپنی غیبی مدد ان سے روک لی جس کی وجہ سے منافقین کے دلوں پر ظلمت اور مَیل کا اضافہ ہوگیا جس طرح مومنین کے دلوں میں ایمان کے نور اور انشراح قلب کا اضافہ ہوگیا۔ یا اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ کریم نے شیطان کو منافقین کے ہمراہ کرنے کی قدرت عطا فرمادی تو اس نے ان کی سرکشی میں اضافہ کردیا اور اس کو اللہ کریم کی طرف اسی طرح مجازاً منصوب کیا جس طرح کسی فعل کی نسبت اس کی سبب کی طرف کردی جاتی ہے اور سرکشی کی نسبت منافقین کی طرف ہی برقرار رکھی تاکہ یہ وہم پیدا نہ ہو کہ اس فاعل کی نسبت اللہ کریم کی طرف حقیقی ہے اور اس معنیٰ کی تصدیق اس بات سے ہوئی ہے کہ دوسری آیت میں اللہ کریم نے مدد کی نسبت یمدونھم فی الغی میں ان کے سرداروں کی طرف کی ہے اور غی کا لفظ مطلق ذکر فرمایا اور اس کو ہم ضمیر کی طرف مضاف نہیں کیا اور فرمایا،

وإخوانهم يمدونهم فى الغى

کہ ان کے بھائی ان کی گمراہی میں اضافہ کررہے ہیں اور بعض معتزلہ نے یہ کہا ہے کہ اصل میں یمد لھم تھا اور یہ یملی لھم کے معنیٰ میں ہے کہ اللہ کریم انہیں مہلت دیتا ہے اور ان کی عمر لمبی کرتا ہے اور یہ مہلت اور عمر میں اضافہ اس لئے ہے کہ وہ

بیدار ہو جائیں اور اطاعت کریں لیکن انہوں نے سرکشی اور طغیان میں اضافہ کے سوا کچھ نہ کیا یہاں لام کو حذف کر کر دیا ہے اور فاعل کو بلاواسطہ حرف جر ھم ضمیر کی طرف منسوب کر دیا جس طرح،

واختار موسٰی قومہٗ

میں قومہ سے پہلے حرف جار کو حذف کر کے اختار کو قومہ کی طرف بلاواسطہ منصوب کر دیا ہے اصل میں،

واختار موسٰی قومہٗ

تھا۔ یا اصل میں عبارت اس طرح تھی یمد ھم استصلاحا کہ اللہ کریم نے اس لئے مہلت دی تھی کہ وہ اپنی اصلاح کریں لیکن انہوں نے اس کے برعکس اپنی گمراہی اور سرکشی میں بھٹکتے رہنے کو ہی پسند کیا۔

اور لفظ طغیان کو بضمہ طا اور بکسرہ طا یعنی طغیان دونوں طرح پڑھا ہے جس طرح لقیان کے لام کو ضمہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور طغیان کو معنیٰ سرکشی میں اور کفر میں حد سے متجاوز ہونا اور ان میں غلو کرنا ہے اس کا لغوی معنیٰ کسی چیز کا اپنے محل سے تجاوز کرنا ہے جیسے اللہ کریم کا ارشاد ہے،

اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ

بے شک جب پانی حدود سے تجاوز کر گیا تو ہم نے تمہیں کشتی پر سوار کر لیا۔ اور یعمھون یہ مشتق ہے عمہ سے جس کا معنی ہے بصیرت کا نہ ہونا جیسے عمی کا معنیٰ قوت سے محروم ہونا ہے۔ جو کہ عمہ کے معنیٰ میں حیران و ششدر ہونا ہے اس لئے کہا جاتا ہے رجل، عامہ، عمہ سرگرداں آدمی اور ارض عمہاء اس زمین کو کہتے ہیں جو بے نشان اور بے علامت ہو امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ روبہ کے شعر کو اس کی تائید میں ذکر کیا ہے،

اَعْمَى الْهُدَى بِالجَاهِلِين العمة

تکمیل شعر اس طرح ہے،

وَمَهمَهٍ اطرافه في مَهمَةٍ   اَعْمَى الْهُدَى بِالجَاهِلِين العمة

بہت سے جنگل ایسے وسیع ہیں جن کے اطراف دوسرے جنگلوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں ان کے نشان ہائے، راستے ان مسافروں پر مخفی ہیں جو راستوں سے ناواقف اور ان پر حیران اور ششدر ہوتے ہیں۔

اس شعر میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ دلیل قائم کی ہے کہ عمہ کا لفظ عدم بصیرت اور حیران و ششدر کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

مدّ کا معنی اور استعمال:

(م د د) المد (Extension, wine)

کے اصل معنی (لمبائی میں) کھینچنا اور بڑھانے کے ہیں اسی سے عرصہ دراز کو مدۃ کہتے ہیں اور مدۃ الجرح کے معنی زخم کا

گندہ مواد کے ہیں۔ مد النھر دریا کا چڑھاؤ۔ مدہ نھر اخر۔ دوسرا دریا اس کا معاون بن گیا۔ قرآن میں ہے:

"اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 45)

تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارا رب سائے کو کس طرح دراز کر کے پھیلا دیتا ہے۔

مددت عینی الی کذا کسی کی طرف حریصانہ اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 131)

اور اے سننے والے اپنی آنکھیں نہ پھیلا اس کی طرف جو ہم نے کافروں کے جوڑوں کو برتنے کے لئے دی ہے جیتی دنیا کی تازگی۔

مددتہ فی غیہ گمراہی پر مہلت دینا اور فوراً گرفت نہ کرنا۔ مددت الابل اونٹ کو مدید پلایا۔ اور مدید اس بیج اور آٹے کو کہتے ہیں جو پانی میں بھگو کر باہم ملا دیا گیا ہو امددت الجیش بمدد کا مدد دینا۔ کمک بھیجنا۔ امددت الانسان بطعام کسی کی طعام (غلہ) سے مدد کرنا قرآن پاک میں عموماً امد (افعال) اچھی چیز کے لئے اور مد (ثلاثی مجرد) بری چیز کے لئے) استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ" (سورۃ الطور آیت نمبر 22)

اور جس طرح کے میوے اور گوشت کو ان کا جی چاہے گا ہم ان کو عطا کریں گے۔

"اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 55)

کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں۔

"وَیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ" (سورۃ نوح آیت نمبر 12)

اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

"یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلافٍ الآیة" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 125)

تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔

"اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ" (سورۃ النمل آیت نمبر 36)

کیا تم مجھے مال سے مدد دینا چاہتے ہو۔

"وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 79)

اور اسے خوب لمبا عذاب دیں گے۔

"وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 15)

اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

"وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 202)
اور وہ جو شیطانوں کے بھائی ہیں، شیطان انہیں گمراہی میں کھینچتے ہیں۔
لیکن آیت کریمہ: "وَالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 27)
اور سمندر اس کی سیاہی ہو اس کے پیچھے سات سمندر۔

میں یمددہ کا صیغہ مدہ نہرا اخر کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور یہ امداد یا مد سے نہیں ہے جو کسی محبوب یا مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتے ہیں بلکہ یہ مددت الداواۃ امدھا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوات میں روشنائی ڈالنا کے ہیں اسی طرح آیت کریمہ:

"وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا" (سورۃ الکھف آیت نمبر 109) اگرچہ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لے آئیں۔
میں مداد یعنی روشنائی کے معنی مراد ہیں۔ المد۔ غلہ ناپنے کا ایک مشہور پیمانہ۔

مفہوم طغیان:

(ط غ ی) طغوت وطغیت طغوانا وطغیانا (To go Astray)
کے معنی طغیان اور سرکشی کرنے کے ہیں اور اَطْغَاہُ (انعال) کے معنی ہیں اسے طغیان سرکشی پر ابھارا اور طغیان کے معنی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"اِنَّهٗ طَغٰى" (سورۃ النازعات آیت نمبر 17) وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔

یعمھون کا معنی:

(ع م ہ) العمہ (To be misled)
کے معنی حیرانگی کی وجہ سے کسی کام میں تردد سے کام لینا کے ہیں۔ عمہ (س) صیغہ صفت فاعل عمہ وعامہ اور عامہ کی جمع عمہ ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

"فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 186)
وہ اپنی شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔
زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ" (سورۃ النمل آیت نمبر 4)
ان کے کوتک ان کی نگاہ میں بھلے کر دکھائے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 16]

أُولئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلالَةَ بِالْهُدى فَما رَبِحَتْ تِجارَتُهُمْ وَما كانُوا مُهْتَدِينَ (16)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے"۔

أُولئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلالَةَ بِالْهُدى

اختاروها عليه واستبدلوها به، وأصله بذل الثمن لتحصيل ما يطلب من الاعيان، فإن كان أحد العوضين ناضاً تعين من حيث إنه لا يطلب لعينه أن يكون ثمناً وبذله اشتراء، وإلا فأى العوضين تصورته بصورة الثمن فباذله مشترٍ وآخذه بائع، ولذلك عدت الكلمتان من الاضداد. ثم استعير للإعراض عما فى يده محصلاً به غيره، سواء كان من المعانى أو الاعيان، ومنه قول الشاعر:

أخذْتُ بالجُمْلةِ رأساً أزْعَرا ... وبالثّنايَا الواضحات الدّردرا
وبالطّويل العمر عمراً جيدرا ... كما اشْتَرَى المُسْلمُ إذ تَنَصَّرا

ثم اتسع فيه فاستعمل للرغبة عن الشيء طمعًا فى غيره. والمعنى أنهم أخلوا بالهدى الذى جعله الله لهم بالفطرة التى فَطَرَ النّاسَ عَلَيْهَا محصلين الضلالة التى ذهبوا إليها. أو اختاروا الضلالة واستحبوها على الهدى.

فَما رَبِحَتْ تِجارَتُهُمْ. ترشيح للمجاز، لَمّا استعمل الاشتراء فى معاملتهم أتبعه ما يشاكله تمثيلاً لخسارتهم، ونحوه:

وَلّما رأيتُ النسرَ عزَّ ابن دأية ... وعَشَّشَ فى وَكْرَيْهِ جَاشَ لَهُ صَدْرِى

والتجارة: طلب الربح بالبيع والشراء. والربح: الفضل على رأس المال، ولذلك سمى شفا. وإسناده إلى التجارة وهو لأربابها على الاتساع لتلبسها بالفاعل، أو لمشابهتها إياه من حيث إنها سبب الربح والخسران.

وَما كانُوا مُهْتَدِينَ لطرق التجارة. فإن المقصود منها سلامة رأس المال والربح، وهؤلاء قد أضاعوا الطلبتين لأن رأس مَالِهم كان الفطرة السليمة، والعقل الصرف، فلما اعتقدوا هذه الضلالات بطل استعدادهم، واختل عقلهم ولم يبق لهم رأس مال يتوسلون به إلى درك الحق، ونيل الكمال، فبقوا خاسرين آيسين من الربح فاقدين للأصل.

ترجمہ:

منافقین نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی اور گمراہی کو ہدایت کے بدلے لے لیا۔

اشتروا یہ اشتراء سے مشتق ہے اس کا لغوی معنی ثمن کو اس لئے خرچ کرنا کہ اعیان میں سے جو چیز مطلوب ہو اس کو حاصل کیا جائے اور اگر دونوں عوضوں یعنی ثمن اور مبیع سے کوئی ایک نقدی ہو تو متعین ہو جاتا ہے کہ وہی ثمن ہے۔ کیونکہ وہ بذات خود مطلوب نہیں ہوتا بلکہ کاسب ہوتا ہے اور اس کا خرچ کرنا اشتراء کہلاتا ہے اور اگر ان دونوں عوضوں میں سے کوئی بھی نقدی نہ ہو تو جس کو نقدی کی صورت میں تصور کر لیا جائے اس کو خرچ کرنے والا مشتری ہوگا اور اسکو لینے والا بائع کہلائے گا۔ اسی لئے ان دونوں کلموں یعنی بیع اور شراء کو اضداد میں شمار کیا جاتا ہے یعنی یہ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر بطور استعارہ یہ لفظ اس چیز سے اعراض کرنے کے لئے، جو کسی کے قبضہ میں ہو، اس سے ایسی چیز حاصل کرنا جو اس کے قبضہ میں نہ ہو خواہ اس کا تعلق صفات اور معانی سے ہو یا اعیان سے ہو ابو النجم کے شعر کا تعلق اسی قبیلہ سے ہے۔ وہ اپنی بیوی کے بڑھاپے پر مرثیہ کہتے ہوئے کہتا ہے؛

أخذتُ بالجُمْلَةِ رأساً أزْعَرا ... وبالثَّنايا الواضحات الدّردرا
وبالطويل العمر عمرا جيدرا ... كما اشْتَرى المُسْلِمُ إذ تنَصَّرا

اس نے پورے گھنے بالوں والے سر کے بدلے میں گنجا سر لے لیا اور مضبوط، خوبصورت، چمکدار دانتوں کے بدلے پیلا پن اور لمبی زندگی کے بدلے چھوٹی عمر لے لی تو اس کا یہ لین دین اس طرح تھا جس طرح جبلہ بن ایہم غسانی نے اسلام چھوڑ کر نصرانیت اختیار کر لی۔

پھر اشتراء کا لفظ کسی چیز سے اعراض کرنے کے علاوہ اور معنی میں استعمال ہونے لگا اور اس کے معنی میں وسعت پیدا کر دی گئی اور ہر اس چیز کے حصول میں استعمال ہونے لگا جس میں کسی چیز سے اعراض اور دوسری چیز کے حصول میں طمع نہ ہو خواہ وہ چیز اس کے قبضہ میں ہو یا نہ ہو۔ یہ معنی پہلے معنی سے عام ہے اس معنی کے مناسب فَمَا رَبِحَت ہے تو دریں صورت آیت کا معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اس ہدایت کو ضائع کر دیا جو ان کو اللہ کریم نے فطرتی طور پر عطا کی تھی۔ اور پر ان کی تخلیق بھی ہوئی تھی۔

اور یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کیا۔ تو اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ ان کی یہ تجارت ان کے لئے فائدہ مند نہ ہوئی، قرآن کریم کی آیت کا یہ حصہ،

فما ربحت تجارتهم

اشتراء کے معنی مجازی کو مزین و مضبوط کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ماقبل کلام میں ان کے باہمی معاملہ اور دین میں اشتراء کا لفظ استعمال فرمایا ہے تو اس کے پیچھے وہ لفظ ذکر فرمایا جو اشتراء کے مناسب تھا۔ یعنی اس خرید و فروخت میں ان کے خسارہ کو بیان کرنے کے لئے اس لفظ کو بطور استعارہ مرشحہ ذکر فرما دیا یعنی ان کو تجارت سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

فما ربحت تجارتھم

یہ استعارہ اور ترشیح دونوں کا فائدہ دے رہا ہے لغت عرب میں یہ عام استعمال ہے، جیسے شاعر کا قول

وَلَمَّا رأیتُ النسرَ عزَّ ابن دأیة ... وعَشَّشَ فی وَکْرَیْهِ جَاشَ لَهُ صَدْرِی

جب میں نے سفید بالوں کو، جو گدھ کی مانند تھے دیکھا کہ وہ سیاہ بالوں پر، جو کوے کی مانند تھے غالب آ گئے اور انہوں نے کوے کے دونوں گھونسلوں یعنی سر اور داڑھی میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں تو میرا سینہ کھول اٹھا۔

تجارت کا مقصد نفع حاصل کرنا ہوتا ہے اور نفع اس مال کو کہتے ہیں جو اصل مال یعنی پونجی سے زائد کمایا جاتا ہے یعنی زیادتی اور آیت میں خسارہ کی نسبت تجارت کی طرف کی گئی ہے حالانکہ نفع ونقصان تاجر کو ہوتا ہے تو یہ نسبت مجازی ہے کیونکہ تجارف باعث نفع ہوتی ہے اور تجارت تاجر کے ساتھ ملتبس ہوتی ہے کیونکہ تاجر کے بغیر تجارت ناممکن ہے اور یہاں سبب بول کر مسبب مراد کیا گیا ہے۔ اور منافقین کے خسارہ اٹھانے کو اللہ کریم نے

وما کانوا مھتدین یعنی وہ تجارت کے طریقوں سے ہی ناواقف تھے۔

کے ذکر کے ساتھ فرمایا کیونکہ تجارت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تاجر اپنا راس المال بھی محفوظ رکھے اور اس پر منافع بھی لے تو منافقین نے دونوں مطلوب چیزیں ضائع کر دیں ان کا راس الما اور سرمایہ خالص عقل اور فطرت سلیمہ تھی تو جب انہوں نے ان گمراہیوں کو اختیار کیا تو ان کی فطرتی صلاحیتیں بھی باطل ہو گئیں اور ان کی عقلیں بھی مختل ہو گئیں اور ان کے پاس وہ سرمایہ ہی نہ رہا جس کو وہ حق تک پہنچنے اور کمال حاصل کرنے کا وسیلہ بناتے اس لئے وہ خائب وخاسر ہیں اور منفعت سے مکمل ناامید ہو چکے ہیں۔

بیع اور شراء کا مفہوم:

(ش ر ی) شراء (Buying and Selling)

اور بیع دونوں لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ مشتری کے معنی قیمت دے کر اس کے بدلے میں کوئی چیز لینے والے کے ہیں۔ اور بائع اسے کہتے ہیں جو چیز دے کہ قیمت لے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک طرف سے نقدی اور دوسری طرف سے سامان ہو لیکن جب خرید وفروخت جنس کے عوض جنس ہو۔ تو دونوں میں سے ہر ایک کو بائع اور مشتری تصور کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بیع اور شراء کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر شربت بمعنی بعت اور ابتعت بمعنی اشتریت آتا ہے قرآن میں ہے۔

"وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 20)

اور بھائیوں نے اسے کھوٹے داموں گنتی کے روپوں پر بیچ ڈالا۔

نوٹ: ضلال اور ہدایت کی بحث گزر چکی ہے۔

لفظِ تجارت کی تحقیق:

(ت ج ر) تجر (ن) (Commerce, Trade)

تجر اور تجارۃ کے معنی نفع کمانے کے لئے المال کو کاروبار میں لگانے کے ہیں۔ صیغہ صفت تاجر و تجور جیسے صاحب وصحت یاد رہے۔ کہ عربی زبان میں اس کے سوا اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہے۔ جس تاء (اصل) کے بعد جیم ہو۔ رہا تجاۃ تو اصل میں وجاہ ہے اور تجوب وغیرہ میں تاء اصلی نہیں ہے بلکہ فعل مضارع کی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

"هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ" (سورۃ الصف آیت نمبر 10)

کیا میں بتادوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے۔

میں لفظ تجارہ کی تفسیر خود قرآن نے بعد کی آیت؛

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجٰرَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ" (سورۃ الصف آیت نمبر 11)

اے ایمان والو کیا میں بتادوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے۔

میں بیان فرمادی ہے۔ نیز فرمایا؛

"اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 16)

جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا۔

"اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 29)

مگر یہ کہ کوئی سودا تمہاری باہمی رضامندی کا ہو۔ (اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہوجائے تو وہ جائز ہے)

"تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 282)

مگر یہ کہ کوئی سردست کا سودا دست بدست ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر گناہ نہیں۔

ابن لاعرابی کہتے ہیں کہ فلان تاجر بکذا کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز میں ماہر ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔

تحقیق لفظِ ربح:

(ر ب ح) الربح (Profet, Advantage)

وہ فائدہ جو خرید و فروخت سے حاصل ہو مجازاً ثمرہ اعمال کو بھی ربح کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کبھی سامان تجارت کی طرف ہوتی ہے۔ اور کبھی صاحب سامان کی طرف۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

"فَمَا رَبِحَتْ تِّجٰرَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 16)

تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

قروا أضيافهم ربحا ببحّ بعض نے کہا ہے کہ ربح ایک پرندے کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ربح بمعنی چربی ہے لیکن ہمارے خیال میں ربح سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو ربح سے حاصل ہوئی ہو جیسا کہ نقص سے جو اثر ظاہر ہوتا ہے اسے نقص کہا جاتا ہے اور بح قرعہ اندازی یا قماری بازی کے تیر کو کہتے ہیں۔ تو شعر کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اپنے مہمانوں کی مہمانداری سے تعریف کا بہت بڑا فائدہ حاصل کیا۔

جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے:

فأوسعنى حمدا وأوسعته قرى ... وأرخص بحمد كان كاسبه الاكل

اس نے میری تعریف میں فروگذاشت نہ کی اور میں نے بھی اس کی خوب مہمان نوازی کی۔ وہ تعریف کتنی سستی ہے جو چند لقموں سے حاصل ہو جائے۔

اهتداء کی تحقیق:

الاهتداء (Instruction) (ہدایت پانا)

کا لفظ خاص کر اس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو دینوی یا اخروی کے متعلق انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 97)

اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے تارے بنائے کہ ان سے راہ پاؤ۔

"إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 98)

مگر وہ جو دبا لئے گئے مرد اور عورتیں اور بچے جنہیں نہ کوئی تدبیر بن پڑے، نہ راستہ جانیں۔

لیکن کبھی اهتداء کے معنی طلب ہدایت بھی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 53)

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا کہ کہیں تم راہ پر آؤ۔

"فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 150)

تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور کسی طرح تم ہدایت پاؤ۔

"فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 20)

پس اگر وہ گردن رکھیں جب تو راہ پا گئے۔

"فَاِنْ اٰمَنُوا بِمِثْلِ ما اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 137)

پھر اگر وہ بھی یونہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے۔

المھتدی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالم کی اقتدا کر رہا ہے ہو چنانچہ آیت:

"اَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لا يَعْلَمُونَ شَيْئاً وَلا يَهْتَدُونَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 104)

جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا کیا اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانیں نہ راہ پر ہوں۔

میں تنبیہ کی گئی ہے کہ نہ وہ خود عالم تھے اور نہ ہی کسی عالم کی اقتداء کرتے تھے۔

اور آیت:

"فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَا اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِينَ" (سورۃ النمل آیت نمبر 92)

تو جس نے راہ پائی اس نے اپنے بھلے کو راہ پائی اور جو بہکے تو فرما دو کہ میں تو یہی ڈر سنانے والا ہوں۔

میں اھتداء کا لفظ طلب ہدایت اقتدا اور تحری ہدایت تینوں کو شامل ہے،

اس طرح آیت:

"وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لا يَهْتَدُونَ" (سورۃ النمل آیت نمبر 24)

اور شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہ میں سنوار کر ان کو سیدھی راہ سے روک دیا تو وہ راہ نہیں پاتے۔

میں بھی سے تینوں قسم کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے اور آیت:

"وَاِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً ثُمَّ اهْتَدٰى" (سورۃ طه آیت نمبر 82)

اور بیشک میں بہت بخشنے والا ہوں اسے جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھا کام کیا پھر ہدایت پر رہا۔

میں اھتدی کے معنی لگا تار ہدایت طلب کرنے اور اس میں سستی نہ کرنے اور دوبارہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے کے ہیں۔

اور آیت: اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔

کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا، یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی دُرودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔ (سورۃ لبقرۃ آیت نمبر 156، 157)

یہاں مھتدون سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس کے حصول کے لئے کوشش کی اور اس کے مطابق عمل بھی کیا چنانچہ انہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔

"وَقَالُوا يَا اَيُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 49)

اور بولے کہ اے جادوگر ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر اس عہد کے سبب جو اس کا تیرے پاس ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 17]

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَاراً فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَا يُبْصِرُوْنَ (17)

’’ان کی کہاوت اسکی طرح ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا‘‘۔

متن:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَاراً

لما جاء بحقيقة حالهم عقبها بضرب المثل زيادة فى التوضيح والتقرير، فإنه أوقع فى القلب وأقمع للخصم الالد، لأنه يريك المتخيل محققاً والمعقول محسوساً، ولأمر ما أكثر الله فى كتبه الامثال، وفشت فى كلام الانبياء والحكماء. والمثل فى الاصل بمعنى النظير يقال: مَثَل ومِثْل ومَثِيل كشبه وشبه وشبيه، ثم قيل للقول السائر الممثل مضربه بمورده، ولا يضرب إلا ما فيه غرابة، ولذلك حوفظ عليه من التغيير، ثم استعير لكل حال أو قصة أو صفة لها شأن وفيها غرابة مثل قوله تعالى: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ وقوله تعالى: وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی.

والمعنى حالهم العجيبة الشأن كحال من استوقد ناراً، والذى: بمعنى الذين كما فى قوله تعالى:

وَخُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا إن جعل مرجع الضمير فى بنورهم، وإنما جاز ذلك ولم يجز وضع القائم موضع القائمين لأنه غير مقصود بالوصف، بل الجملة التى هى صلته وهو وصلة إلى وصف المعرفة بها لأنه ليس باسم تام بل هو كالجزء منه، فحقه أنه لا يجمع كما لا تجمع أخواتها، ويستوى فيه الواحد والجمع وليس الذين جمعه المصحح، بل ذو زيادة زيدت لزيادة المعنى ولذلك جاء بالياء أبداً على اللغة الفصيحة التى عليها التنزيل، ولكونه مستطالاً بصلته استحق التخفيف، ولذلك بولغ فيه فحذف ياؤه ثم كسرته ثم اقتصر على اللام فى أسماء الفاعلين والمفعولين، أو قصد به جنس المستوقدين، أو

الفوج الذی استوقد. والاستیقاد: طلب الوقود والسعی فی تحصیله، وهو سطوع النار وارتفاع لهبها. واشتقاق النار من: نار ینور نوراً إذا نفر لأن فیها حرکة واضطراباً.

ترجمہ:

اس سے ماقبل آیات میں منافقین کی حقیقت ان کے خبیث اوصاف اور ان کی عقیدہ بیان ہوا، اب اس کی مزید وضاحت کے لئے ضرب المثل ذکر فرمائی تا کہ ان کے حالات کی مزید وضاحت بھی ہو جائے اور سننے والے کے دل میں بات راسخ ہو جائے کیونکہ ضرب المثل مخاطب کے دل میں زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور جھگڑالو دشمن کو خاموش کرنے کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ یہ خیالی چیز کو خارج اور معقول چیز کو محسوس شکل میں پیش کرتی ہے۔ اور اس عظیم الشان فائدہ کے پیش نظر اللہ کریم نے اپنی الہامی کتابوں میں کثرت سے ضرب المثل بیان فرمائیں ہیں اور انبیائے کرام اور حکماء کے کلام میں بھی بکثرت ان کا ذکر آتا ہے۔

مثل کی تحقیق:

اس کا لغوی معنیٰ نظیر اور مثل ہے اور مثل کے لفظ کو عربی زبان میں تین طرح پڑھا جاتا ہے۔

مَثل، مِثل اور مَثِیل جیسے شَبَہ، شِبہ اور شَبِیہ بروزن فَعل اور فِعل اور فَعِیل اس لفظ کا اطلاق اور مشہور و معروف کہاوت پر ہوتا ہے جو زبان زد عام ہو اور اس کے محل ورود کے ساتھ اس موقع کو تشبیہ دی گئی ہو جس میں وہ اب استعمال ہو رہا ہے۔ اور یہ ضرب المثل صرف اس واقع کے لئے استعمال کی جاتی ہے جس میں غرابت اور ندرت ہو اسی وجہ سے اس کے الفاظ میں تغیر وتبدل نہیں کیا جاتا یعنی وہ الفاظ جو کسی نے کسی موقع پر پیش کئے ہوں۔ بعینہ وہی الفاظ اس عجیب وغریب واقعہ کو بیان کرنے کے لئے ذکر کئے جاتے ہیں۔ جس کو اصل مورد کے ساتھ تشبیہ دی گئی پھر بطور استعارہ ہر اس حالت، قصہ یا صفت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کی عجیب وغریب شان ہو اور اس میں غرابت بھی ہر جیسے اللہ کریم اس جنت کی صفت کو بیان فرماتا ہے جس کا متقین کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے جیسے فرمایا،

مثل الجنة التی وعدت للمتقین

اس میں مثل بمعنیٰ صفت ہے اور دوسرے مقام پر فرمایا،

و لله المثل الاعلیٰ

بلند و بالا شان اللہ کریم ہی کے لئے ہے معنیٰ یہ ہوگا کہ منافقوں کی عجیب وغریب کی حالت اس آدمی کی حالت کی مثل ہے جس نے روشنی حاصل کرنے کے لئے آگ جلائی تو جب اس کی آگ خوب روشن ہو گئی تو اللہ کریم نے اس کے نُور کو ختم کر دیا اور وہ گھپ اندھیرے میں حیران و ششدر ہو کر رہ گیا۔

والذی بمعنیٰ الذین یہاں الذی اسم موصول بمعنیٰ الذین ہے اور یہ استعمال عام ہے جیسے اللہ کریم کا ارشاد ہے،

و خضتم کالذی خاضوا

میں الذی بمعنیٰ الذین ہے۔ زیر بحث آیت میں الذی بمعنیٰ الذین اس وقت ہوگا جب بنورھم کی ضمیر کا مرجع الذی کو بنایا جائے۔

الذی کو الذین کے معنیٰ میں استعمال کرنا جائز ہے لیکن القائم کو القائمین کی جگہ ذکر کرنا جائز نہیں کیونکہ الذی محض واسطہ ہوتا ہے، جملہ کو اسم معرفہ کی صفت بنانے کا، یہ مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ مقصود بالذات وہ جملہ ہوتا ہے جو اس کا صلہ بن رہا ہوتا ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اسم تام نہیں ہوتا بلکہ وہ کلمہ کی جزء کی مانند ہوتا ہے اس لئے اس کا حق یہی ہے کہ اس کو جمع ذکر نہ کیا جائے جیسے اس کے ہم معنیٰ دوسرے الفاظ من، ما اور ای وغیرہ کو جمع ذکر نہیں کیا جاتا اس کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ الذین جمع مذکر سالم نہیں کیونکہ جمع مذکر سالم جس اسم سے بنی ہے اس کی شرائط اس میں نہیں پائی جاتیں بلکہ اس کے معنیٰ کو زیادتی کے لئے کچھ الفاظ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے ن اسی لئے یہ فصیح لغت میں ہمیشہ الذین ہی استعمال کیا جاتا ہے اور کسی مقام پر بھی الذون استعمال نہیں ہوا یعنی حالت رفعی میں اُس کے آخر واؤ اور نون نہیں آتے اور قرآن کریم میں بھی الذین ہی استعمال ہوتا ہے اور یہ کلام میں اپنے صلہ کے ساتھ مل کر کلام کو طویل کر دیتا ہے اس لئے یہ تخفیف کا مستحق ہے اس لئے اس سے نون اور یا کو حذف کر دیا جاتا ہے بلکہ اسم فاعل اور اسم مفعول سے جب یہ پہلے آتا ہے تو اس کی "ذ" کو بھی حذف کر کے صرف ال پڑھا جاتا ہے۔ اور یہ ال بمعنیٰ الذی ہوگا یا اس سے پہلے الفوج موصوف محذوف ہے اور یا اس سے جنس مستوقدین مراد ہے۔

والاستیقاد طلب الوقود

استیقاد کا معنیٰ روشنی حاصل کرنے کے لئے ایندھن طلب کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرنا ہے اور اس سے مراد آگ کا بھڑکنا اور اس کے شعلوں کا بلند ہونا ہے۔

نار یہ نار، ینور، نوراً سے مشتق ہے جس کا معنیٰ بھاگنا اور بدکنا ہے آگ میں اضطراب و حرکت کی وجہ سے اس کو نار لفظ کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔

متن:

فَلَمَّآ اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ

أي: النار، ما حول المستوقد إن جعلتها متعدية، وإلا أمكن أن تكون مسندة إلى ما، والتأنيث لأن ما حوله أشياء وأماكن أو إلى ضمير النار، وما: موصولة في معنى الامكنة، نصب على الظرف، أو مزيدة، وحوله ظرف وتأليف الحول للدوران، وقيل للعام حول لأنه يدور.

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ جواب لما، والضمير للذى، وجمعه للحمل على المعنى، وعلى هٰذَا إنما

قال:

بِنُورِهِمْ ولم يقل: بنارهم لأنه المراد من أيقادها. أو استئناف أجيب به اعتراض سائل يقول: ما بالهم شبهت حالهم بحال مستوقد انطفأت ناره؛ أو بدل من جملة التمثيل على سبيل البيان. والضمير على الوجهين للمنافقين، والجواب محذوف كما فى قوله تعالى: فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ للإيجاز وأمن الالتباس. وإسناد الذهاب إلى الله تعالى إما لأن الكل بفعله، أو لأن الإطفاء حصل بسبب خفى، أو أمر سماوى كريح أو مطر، أو للمبالغة ولذلك عدى الفعل بالباء دون الهمزة لما فيها من معنى الاستصحاب والاستمساك. يقال: ذهب السلطان بماله إذا أخذه، وما أخذه الله وأمسكه فلا مرسل له. ولذلك عدل عن الضوء الذى هو مقتضى اللفظ إلى النور، فإنه لو قيل: ذهب الله بضوئهم احتمل ذهابه بما فى الضوء من الزيادة وبقاء ما يسمى نوراً. والغرض إزالة النور عنهم رأساً ألا ترى كيف قرر ذلك وأكده بقوله وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ فذكر الظلمة التى هى عدم النور، وانطماسه بالكلية، وجمعها ونكرها ووصفها بأنها ظلمة خالصة لا يتراءى فيها شبحان.

ترجمہ:

اور جب آگ لگانے والے کے اردگرد کی چیزوں کو آگ نے روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ ان کے نور کو لے گیا۔

اضاءت کو مؤنث ذکر کرنا اس وجہ سے ہوگا کہ ما حولہ سے اشیاء اور اماکن مراد لی جائیں یا اضاءت کا فاعل ہی ضمیر ہو گی جس کا مرجع النار ہے اس صورت میں ما موصولہ بمعنی امکنۃ ہوگا اور بحیثیت مفعول فیہ محل نصب میں ہوگا۔

یا یہ ما زائدہ ہوگا اور حولہ اضاءت کی ظرف ہوگی اور جن کلمات سے حول کا لفظ مرکب ہے یہ دوران بمعنی گردش کرنا ہوگا۔

اسی لئے سال کو حول کہتے ہیں کیونکہ وہ کرتا رہتا ہے، اور

ذھب اللہ بنورھم

مکمل جملہ لما کی شرط کا جواب ہے۔ اس صورت میں ھم ضمیر کا مرجع الذی ہوگا اور ھم ضمیر جمع کی الذی کی طرف اس کے لئے لوٹائی گئی ہے کہ وہ الذین کے معنیٰ میں ہے جیسے خضتم کالذی خاضوا میں ہے۔ کلام کے سیاق و سباق کے مطابق بنارھم ذکر نہیں فرمایا بلکہ اس کی جگہ بنورھم ذکر کیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ آگ جلانے والے کا مقصود نور ہی ہوتا ہے۔ یا

ذَھَبَ اللہ بنورھم

لما کی شرط کا جواب نہیں بلکہ جملہ مستانفہ ہے اور یہ اس سائل کے جواب میں ہوگا کہ منافقین کی حالت کو اس آگ

جلانے والے حالت کے ساتھ تشبیہ کیوں دی گئی ہے جس کی آگ بجھ جاتی ہے۔

یا یہ جملہ ماقبل کلام میں پورے جملہ تمثیلیہ سے بدل ہوگا اور اس کو عطف کے طریقہ پر ذکر کیا گیا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں بنورھم کی ھم ضمیر کا مرجع منافقین ہوں گے اور جواب شرط اختصار اور التباس سے امن میں ہونے کی وجہ سے حذف کردیا ہوگا جیسے اللہ کریم کے اس ارشاد گرامی میں جواب شرط محذوف ہے سورۃ یوسف میں ہے،

فما ذھبوا به

یہاں

فعلوا به ما فعلوا من الاذاء

محذوف ہے۔ اس آیت کریمہ میں ہے ذھاب نور کی نسبت اللہ کریم کی طرف کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ ہر فعل کا فاعل حقیقی وہی ہے یا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آگ کسی مخفی سبب یا کسی آسمانی حادثہ کی وجہ سے بجھ گئی۔ جیسے بارش، ہوا وغیرہ۔ اور جس فعل کا سبب مخفی ہوا، اس کی نسبت اللہ ہی کی طرف کردی جاتی ہے۔

یا یہ نسبت مبالغہ پر دلالت کرنے لے لئے اللہ کریم کی طرف کی گئی ہے اور اسی وجہ سے ذھب کے فاعل کو با کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے اور اس سے پہلے ہمزہ کا اضافہ کرکے باب افعال نہیں بنایا گیا کیونکہ باء کے ساتھ متعدی کرنے سے معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ اور اس نے ہی اسے روک لیا۔ اگر کسی شخص کا بادشاہ مال پکڑ لے تو کہا جاتا ہے۔

ذھب السلطان بماله

کہ بادشاہ اس کا مال بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ تو جس چیز کو اللہ تعالیٰ اپنی گرفت میں لے لے اور اسے روک لے تو اسے کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ مبالغہ ظاہر کرنے کے ہی یہاں لفظ ضوء ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ نور ذکر کیا گیا حالانکہ ماقبل کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں

ذھب اللہ بضوئھم

کہا جاتا، کیونکہ بضوئھم ذکر کیا جاتا تو اس میں یہ احتمال تھا کہ ضوء کے لفظ میں جو زیادتی ہوتی ہے اسے تو ختم کردیا گیا۔ لیکن جسے نور کہا جاتا ہے وہ باقی رہ گیا، حالانکہ مقصد یہ تھا کہ ان سے بلکل نور سلب کرلیا جائے۔ ذرا آپ غور فرمائیں کہ اللہ کریم نے ان کے ذھاب نور میں کس قدر مبالغہ فرمایا ہے اور اس کو بہت ہی مؤکد انداز میں ذکر کیا ہے اور اسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے اللہ کریم نے فرمایا۔

وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ

چونکہ یہاں ظلمات جمع کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ اس کا واحد ظلمۃ ہے اور اس کا معنی ہے روشنی۔ اور نور کا نہ ہونا اور اس کا بالکلیہ مٹ جانا اور پھر اسے نکرہ ذکر کیا ہے۔ جو اپنے مدلول کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اور اس کی صفت لا یبصرون ذکر فرمائی، گویا وہ ایسی تہہ در تہہ اور خالص تاریکیوں میں ہے جن میں دو شکلیں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتیں اور یہ انداز تخاطب بھی

ذھاب نور میں مبالغہ اور تاکید پر دلالت کرتا ہے یہ تاکید بالائے تاکید اس لئے ذکر کی گئی کہ منافقین کے پاس نور نام کی کوئی چیز بھی نہیں بلکہ وہ گھپ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔

متن:

وترك فى الاصل بمعنى طرح وخلى، وله مفعول واحد فضمن معنى صير، فجرى مجرى أفعال القلوب كقوله تعالى: وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ.

وقول الشاعر:

فتركْتُه جَزَرَ السِّباعِ يَنُشْنَهُ ... يَقضُمْنَ حُسنَ بنانِهِ والمِعْصَمِ

والظلمة مأخوذة من قولهم: ما ظلمك أن تفعل كذا، أي ما منعك، لأنها تسد البصر وتمنع الرؤية.

وظلماتهم: ظلمة الكفر، وظلمة النفاق، وظلمة يوم القيامة يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ. أو ظلمة الضلال، وظلمة سخط الله، وظلمة العقاب السرمدى، أو ظلمة شديدة كأنها ظلمة متراكمة، ومفعول لَّا يُبْصِرُونَ من قبيل المطروح المتروك فكأن الفعل غير متعد.

ترجمہ:

ترک اصل میں خلی اور ترک کے معنیٰ میں ہے جس کا معنیٰ اس نے چھوڑ دیا، اس نے پھینک دیا، ہے اور یہ متعدی بیک مفعول ہے اور یہ اپنے ضمن میں صیر کا معنیٰ لئے ہوئے ہے اسی وجہ سے یہ افعال قلوب کے قائم مقام ہوتا ہے جو دو مفعولوں کو نصب دیتے ہیں۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ

وَ ترکھم فی الظلمات یہاں اس کا ایک مفعول ھم ضمیر منصوب متصل ہے اور دوسرا،

فی ظلمات مستوقدین

کے متعلق ہو رہا ہے۔ اور شاعر کا قول ہے،

فتركْتُه جَزَرَ السِّباعِ يَنُشْنَهُ ... يَقضُمْنَ حُسنَ بنانِهِ والمِعْصَمِ

میں نے مدجج کو اس وقت مار گرایا جب اس کے سارے حمایتی بھاگ کھڑے تھے اور لاش کو اس بے بسی کے عالم میں چھوڑ گئے تھے کہ درندے بڑے مزے سے اس کا گوشت، اس کے سر کی کھوپڑی اور موٹی کلائی سے نچوڑ رہے تھے۔

اس شعر میں ترکت بمعنیٰ صیرت ہے اور اس کے دو مفعول ہیں ایک ہ ضمیر منصوب متصل اور دوسرا جزء السباع ہے۔

اور ظلمات جمع ہے ظلمۃ کی جو عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے،

ما ظلمك ان تفعل كذا

کہ تجھ کو کس چیز نے اس طرح کرنے سے روکا ہے کیونکہ ظلمت نظر کے آڑے آجاتی ہے اور دیکھنے سے روک دیتی ہے

اور اب ظلمتوں سے درج ذیل ظلمات ہیں۔

1۔ کفر کی ظلمت
2۔ نفاق کی ظلمت
3۔ قیامت کے دن کی ظلمت

یہ وہ دن ہے جس دن آپ دیکھیں گے کہ مومنین کے آگے دائیں اور بائیں جانب نور دوڑ رہا ہوگا یا ان سے یہ ظلمات مراد ہیں۔

گمراہی کی ظلمت
اللہ کریم کی ناراضگی کی ظلمت
عذاب سرمدی کی ظلمت

یا اس سے شدید ترین ظلمات مراد ہیں گویا متعدد ظلمتیں تہہ در تہہ جمع ہوں گی اور لا یبصرون کے مفعول کو ذکر نہ کرنا بھی اس قبیلہ سے ہے گویا یہاں مفعول کو حذف کر کے اس کو بالکل نسیاً منسیا کر دیا ہے اور یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہ فعل متعدی نہیں بلکہ فعل لازم ہے۔

متن:

والآية مَثَلٌ ضربه الله لمن آتاه ضرباً من الهدى فأضاعه، ولم يتوصل به إلى نعيم الابد فبقي متحيراً متحسراً، تقريراً وتوضيحاً لما تضمنته الآية الاولى، ويدخل تحت عمومه هؤلاء المنافقون فإنهم أضاعوا ما نطقت به ألسنتهم من الحق باستبطان الكفر، وإظهاره حين خلوا إلى شياطينهم، ومن آثر الضلالة على الهدى المجعول له بالفطرة، أو ارتد عن دينه بعد ما آمن، ومن صح له أحوال الإرادة فادعى أحوال المحبة فأذهب الله عنه ما أشرق عليه من أنوار الإرادة، أو مَثَّل لإيمانهم من حيث إنه يعود عليهم يحقن الدماء، وسلامة الاموال والاولاد، ومشاركة المسلمين فى المغانم. والاحكام بالنار الموقدة للاستضاءة، ولذهاب أثره وانطماس نوره بإهلاكهم وإفشاء حالهم بإطفاء الله تعالى إياها وإذهاب نورها.

ترجمہ:

اس آیت میں اللہ کریم نے ہر اس شخص کی مثال بیان کی ہے جس کو اللہ کریم نے کسی بھی قسم کی ہدایت کا حصہ عطا کیا ہو، اس شخص نے اس ہدایت کو ضائع کر دیا ہو اور اسے ابدی نعمتوں کا ذریعہ نہ بنایا ہو تو وہ حیرت اور حسرت میں رہ جائے اس ضرب المثل کے بیان کا مقصد اس مضمون کو ثابت کرنا اور اس کی وضاحت کرنا ہے جس کو ماقبل آیت،

اُلٰئک الذین اشتروا الضللۃ بالھدٰی... الخ

اگرچہ یہ آیت طیبہ عام ہے لیکن اس کے عموم میں وہ منافق بھی داخل ہوں گے جن کا اس سے ماقبل آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے بھی کفر کو بچا کر اپنی زبانوں سے حق پر ہونے اور مومن ہونے کا دعویٰ کیا اور ان لوگوں کے سامنے اپنے کفر کا اظہار کیا جو گمراہی اور سرکشی میں شیاطین کی مثل تھے، اور وہ ان سے علیحدگی میں ملاقات کرتے۔ اور وہ شخص بھی اسی تشبیہ کے عموم میں داخل ہوگا جس نے گمراہی کو اس ہدایت پر ترجیح دی جو اس کو فطرت سلیمہ کی صورت میں عطا کی گئی تھی اور وہ آدمی بھی اس میں داخل ہوگا جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہوگیا اور وہ شخص بھی اس تشبیہ کے عموم میں داخل ہوگا جو ابھی ارادت کے احوال کی منزل میں ہو تو وہ محبت کا دعویٰ کر کر دے تو اس کے اس جھوٹے دعویٰ کی وجہ سے اللہ کریم نے اس سے ارادت کے احوال بھی چھین لئے جو اس پر ظاہر ہوئے تھے۔ اور ان لوگوں کے ایمان کو اس آگ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو روشنی حاصل کرنے کے لئے جلائی گئی ہو، جس سے آگ جلانے والے نے کچھ نفع حاصل کیا ہو، پھر وہ بھسم ہو گئی۔ اسی طرح منافقین کے اظہار ایمان نے انہیں دنیاوی فائدہ دیا کہ ان کی جانیں اور مال محفوظ ہوگئے اور قتل ہونے سے بھی بچ گئے نیز ان کی اولادیں غلام بننے اور جائیدادیں مال غنیمت بننے سے بھی بچ گئیں۔ اور مال غنیمت میں بھی حصہ دار بن گئے اور شریعت پر عمل کرنے میں بھی مسلمانوں کے ساتھ برابر شریک رہے، اور اسی نور ایمان کے ضائع ہونے اور اس کے بالکل مٹ جانے کو ان کی ہلاکت کے ساتھ تشبیہ دی اور ان کے کفر کے ظاہر کرنے کو آگ کے بجھنے اور روشنی کے ختم ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

مثل کی تعریف:

(م ث ل) مثل (ك) (Similar, Like)

المثل کے معنی ہیں ایسی بات کے جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو۔ اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ دوسری کا مطلب واضح ہو جاتا ہو۔ اور معاملہ کی شکل سامنے آجاتی ہو۔ مثلاً عین ضرورت پر کسی چیز کو کھو دینے کے لئے الصیف ضیعت اللبن کا محاورہ وہ ضرب المثل ہے۔ چنانچہ قرآن میں امثال بیان کرنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ" (سورۃ الحشر آیت نمبر 21)

اور یہ مثالیں لوگوں کے لئے ہم بیان فرماتے ہیں کہ وہ سوچیں۔

وقود کا معنیٰ:

(و ق د) (ض) (To kindle, To ignite)

وقدت النار وقودا۔ ووقدا آگ روشن ہونا۔ الوقود۔ ایندھن کی لکڑیاں جن سے آگ جلائی جاتی ہے۔ اور آگ کے شعلہ کو بھی وقود کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

"وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 24)
جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

"أُولٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 10)
اور وہی دوزخ کے ایندھن ہیں۔

" النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ "(سورۃ البروج آیت نمبر 5)
وہ اس بھڑکتی آگ والے۔

نار کا معنیٰ:

(ن و ر) نار (Fire,Flame)

اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

" أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ "(سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 71)
تو بھلا بتاؤ تو وہ آگ جو تم روشن کرتے ہو۔

لمّا کا معنیٰ اور استعمال:

(لما) (حرف)

یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے زمانہ ماضی میں کسی فعل کی نفی اور اس کے قریب الوقوع ہونے کے لئے جیسے فرمایا:

"وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ"(سورۃ آل عمران آیت نمبر 142)
اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر والوں کی آزمائش کی۔

اور کبھی یہ اسم ظرف ک طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن میں بکثرت آیا ہے۔ جیسے فرمایا:

" فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ "(سورۃ یوسف آیت نمبر 96)
پھر جب خوشی سنانے والا آیا۔

ضیاء ہے کیا؟:

(ض و ء) الضوء (Light,Illumination)

کے معنی نور اور روشنی کے ہیں ضائت النار و اضائت: آگ روشن ہوگئی اور اضائت (افعال) کے معنی روشن کرنا بھی آتے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں ہے۔

" فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللهُ بِنُوْرِهِمْ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 17)

توجب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا۔

" كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيْهِ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے۔

" مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَاءٍ " (سورۃ القصص آیت نمبر 71)

تو اللہ کے سوا کون خدا ہے جو تمہیں روشنی لادے۔

اور سماوی کتابوں کو جو انسان کی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہیں ضیاء سے تعبیر فرمایا ہے۔

چنانچہ (تورات کے متعلق) فرمایا:

" وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسٰى وَهَارُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ " (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)

اور بیشک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ دیا اور اجالا اور پرہیزگاروں کو نصیحت۔

لفظ حول کا معنیٰ:

(ح ول) الحوال (ن) (All around,Round about)

دراصل اس کے معنی کسی چیز کے متغیر ہونے اور دوسری چیزوں سے الگ ہونا کے ہیں۔ معنی تغیر کے اعتبار سے حال الشئی یحول حوولا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کی شے کے متغیر ہونے کے ہیں۔ اور استحال کے معنی تغیر پذیر ہونے کے لئے مستعد ہونے کے اور معنی انفصال کے اعتبار سے حال بینی وبینک کذا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی میرے اور اس کے درمیان فلاں چیز حائل ہوگئی۔

اور آیت کریمہ:

" يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ " (سورۃ الانفال آیت نمبر 24)

اللہ کا حکم آدمی اور اس کے دلی ارادوں میں حائل ہو جاتا ہے۔

لفظ ذھب کا معنیٰ:

(ذ ہ ب) الذھب (ف) (convey)

ذھب بالشیء واذھبته لے جانا۔ یہ اعیان و معانی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

" اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ " (سورۃ الصافات آیت نمبر 99)

کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔

نور کا مفہوم:

(ن و ر) النور (Light)

وہ پھیلنے والی روشنی جو اشیاء کے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔

اور یہ دو قسم پر ہے دینوی اور اخروی۔

نور دینوی پھر دو قسم پر ہے معقول

جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے یعنی امور الٰہیہ کی روشنی جیسے عقل یا قرآن کی روشنی۔

دوم محسوس جس کا تعلق بصر سے ہے جیسے چاند سورج ستارے اور دیگر اجسام نیز چنانچہ نور الٰہی کے متعلق فرمایا:

" قَدْ جَاءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَ كِتَابٌ مُبِيْن " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 15)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب۔

" وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا "

(سورۃ الانعام آیت نمبر 122)

اور اس کے لئے ایک نور کر دیا جس سے لوگوں میں چلتا ہے وہ اس جیسا ہو جائے گا جو اندھیریوں میں ہے۔

لفظِ ترک کا معنیٰ:

(ت ر ك) ترك (Desertion,Leaving)

ترک الشیء کے معنی کسی چیز کو چھوڑ دینا کے ہیں خواہ وہ چھوڑنا ارادہ اختیار سے ہو اور خواہ مجبوراً چنانچہ ارادۃ اور اختیار کے ساتھ چھوڑنے کے متعلق فرمایا:

" وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ " (سورۃ الکھف آیت نمبر 99)

اور اس دن ہم انہیں چھوڑیں گے کہ ان کا ایک گروہ دوسرے پر ریلا آوے گا۔

" وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا " (سورۃ الدخان آیت نمبر 24)

اور دریا کو یونہی جگہ جگہ سے کھلا چھوڑ دے۔

اور بحالت مجبوری چھوڑنے کے متعلق فرمایا:

" كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ " (سورۃ الدخان آیت نمبر 25)

کتنے چھوڑ گئے باغ اور چشمے۔

لفظِ ظلم کی تحقیق:

(ظ ل م) الظلمۃ (Cruelty)

کے معنی میں روشنی کا معدوم ہونا اس کی جمع ظلمات ہے۔ قرآن میں ہے:

"اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ" (سورۃ النور آیت نمبر 40)

یا جیسے اندھیریاں کسی کنڈے کے دریا میں۔

"ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" (سورۃ النور آیت نمبر 40)

اندھیرے ہیں ایک پر ایک۔

"اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (سورۃ النمل آیت نمبر 63)

یا وہ جو تمہیں راہ دکھاتا ہے اندھیریوں میں خشکی اور تری کی۔

"وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 1)

اور اندھیریاں اور روشنی پیدا کی۔

اور کبھی ظلمۃ کا لفظ بول کر جہالت شرک اور فسق وفجور کے معنی مراد لئے جاتے ہیں جس طرح کہ نور کا لفظ ان کے اضداد یعنی علم وایمان اور عمل صالح پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 257)

اندھیریوں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔

"وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" (سورۃ إبراھیم آیت نمبر 5)

اور بیشک ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں لے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیریوں سے اجالے میں لا۔

نوٹ: لفظِ بصر کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2) : آیۃ 18]

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (18)

"بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں"۔

متن:

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ لما سدوا مسامعهم عن الإصاخة إلى الحق وأبوا أن ينطقوا به ألسنتهم ويتبصروا الآيات بأبصارهم، جُعِلُوا كأنما أيفت مشاعرهم وانتفت قواهم كقوله:

صُمٌّ إذا سَمِعُوا خَيْراً ذُكِرْتُ بِهِ ... وإنْ ذُكِرْتُ بسوءٍ عندَهُمْ أذنوا

وكقوله:

أَصَمُّ عن الشيء الَّذِى لا أُرِيدُهُ ... وأَسْمَعُ خَلْقِ الله حينَ أُرِيدُ

وإطلاقها عليهم على طريقة التمثيل، لا الاستعارة إذ من شرطها أن يطوى ذكر المستعار له، بحيث يمكن حمل الكلام على المستعار منه لولا القرينة كقول زهير:

لَدَى أسدٍ شاكى السِّلاحِ مُقَذَّفٍ ... لَهُ لِبَدٌ أظفَارُه لم تُقَلَّمِ

ومن ثم ترى المفلقين السحرة يضربون عن توهم التشبيه صفحاً كما قال أبو تمام الطائى:

وَيصعَدُ حتى يَظُنَّ الجَهولُ ... بأنَّ لَهُ حَاجةً فى السَّماء

وهاهنا وإن طوى ذكره بحذف المبتدأ لكنه فى حكم المنطوق به، ونظيره:

أُسَدٌ علىَّ وفى الحُرُوبِ نَعَامة ... فَتْخاءُ تنفر منْ صَفِيرِ الصَّافرِ

هٰذَا إذا جَعَلْتَ الضمير للمنافقين على أن الآية فذلكة التمثيل ونتيجته، وإن جعلته للمستوقدين، فهى على حقيقتها. والمعنى: أنهم لما أوقدوا ناراً فذهب الله بنورهم، وتركهم فى ظلماتٍ هائلة أدهشتهم بحيث اختلت حواسهم وانتقصت قواهم. وثلاثتها قرئت بالنصب على الحال من مفعول تركهم. والصمم: أصله صلابة من اكتناز الاجزاء، ومنه قيل حجر أصم وقناة صماء، وصمام القارورة، سمي به فقدان حاسة السمع لأن سببه أن يكون باطن الصماخ مكتنزاً لا تجويف فيه، فيشتمل على هواء يسمع الصوت بتموجه. والبكم الخرس. والعمى: عدم البصر عما من شأنه أن يبصر وقد يقال لعدم البصيرة.

فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ لا يعودون إلى الهدى الذى باعوه وضيعوه. أو عن الضلالة التى اشتروها. أو فهم متحيرون لا يدرون أيتقدمون أم يتأخرون، وإلى حيث ابتدءوا منه كيف يرجعون. والفاء للدلالة على أن اتصافهم بالاحكام السابقة سبب لتحيرهم واحتباسهم.

ترجمہ:

وہ منافقین بہرے، گونگے اواندھے ہیں جب کہ انہوں نے اپنے کانوں کے سوراخوں کو حق بات سننے سے بند کرلیا ہے اور اپنی زبانوں سے حق اقرار کرنے سے انکار کردیا اور اپنی آنکھوں کو اللہ کریم کی نشانیاں دیکھنے سے روک دیا۔ ان کو ظاہری اس ناکارہ ہوگئے ان کی قوتیں بیکار ہوگئیں یعنی کہ درحقیقت نہ تو وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں بلکہ ان کو حق بات سننے

سے روک دیا گیا اور انہوں نے اپنی زبانوں کو حق سے روک رکھا ہے۔ اسی حقیقت کو شاعر نے بیا کیا ہے،

صُمٌّ إذا سَمِعُوا خَيْراً ذُكِرْتُ بهِ ... وإنْ ذُكِرْتُ بسوءٍ عندَهُمْ أذنوا

وہ بہرے ہیں، جب ان کے کے سامنے میری خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اور جب میری برائی کی جائے تو وہ بغور سنتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور شعر میں ہے،

اَصَمُّ عن الشيء الَّذی لا أُرِيدُهُ ... وأسمَعُ خَلْقِ الله حينَ أُرِيدُ

میں ہر اس چیز کو سننے سے بہرا ہوں جس کو سننے کا میں ارادہ نہیں رکھتا اور جب میں سننے کا ارادہ کرتا ہوں تو اللہ کریم کی ساری مخلوق سے زیادہ سننے والا ہوں۔

منافقوں کی یہ تینوں صفات بطور تشبیہ ذکر کی گئی ہیں نہ کہ بطور استعارہ، کیونکہ استعارہ کی شرط یہ ہے کہ مستعار لہ (مشبہ) کا ذکر بالکل ہی لپیٹ دیا جاتا ہے اس حیثیت سے اگر وہاں کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جو اس کا حقیقی معنیٰ مراد لینے سے مانع ہو تو اس کو حقیقی معنیٰ پر محمول کرنا ممکن ہوتا ہے لیکن یہاں مشبہ اگرچہ محذوف ہے لیکن ذہن میں اس کا تصور موجود ہے کہ وہ ھم ضمیر ہے جو راجع الی المنافقین ہے۔

زہیر شاعر کہتا ہے:

لَدَی أسدٍ شاکی السِلاحِ مُقَذَّفٍ ... لَهُ لِبَدٌ اَظفَارُه لم تُقَلَّمِ

(میں نے موت کے گھر) ایسے شیر پر حملہ کر دیا جس نے ہتھیار سونتے ہوئے تھے وہ بڑا ہی بہادر جنگجو تھا۔ اس کی گردن کے اردگرد تہہ در تہہ بال جمے ہوئے تھے۔ جس کے ناخن بھی نہیں کاٹے ہوئے تھے۔

یہاں لفظ اسد بطور استعارہ استعمال ہوا ہے اگر شاکی السلاح کا قرینہ موجود نہ ہوتا تو لفظ اسد کو اپنے حقیقی معنیٰ پر محمول کرنا ممکن تھا، چونکہ استعارہ میں مشبہ کا ذکر بالکل نہیں ہوتا اسی لئے وہ لوگ قادر الکلام بن جاتے ہیں، اسی لئے جہاں تشبیہ کا وہم ہو ،وہاں سے اعراض کر جاتے ہیں، ایک شاعر ابوتمام کہتا ہے،

وَيصعَدُ حتی يَظُنَّ الجَهولُ ... بأَنَّ لَهُ حَاجةً فی السَّماء

کہ میرا ممدوح مکان اور بلند مرتبہ کی طرف عروج کر جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے مرتبہ سے بے خبر لوگ گمان کرتے ہیں کہ اسے آسمان میں کوئی کام ہے۔

صم بکم عمی

سے پہلے اگر مبتداء کو حذف کر کے مشبہ کا ذکر لپیٹ دیا گیا ہے لیکن وہ منطوق ہ کے حکم میں ہے۔ اومحذوف مذکور کی طرح ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح عمران بن خطان خارجی اپنے شعر میں کہتا ہے،

أَسَدٌ عليَّ وفی الحُرُوبِ نَعَامة ... فَتُخاءُ تنفر منْ صَفِیر الصَّافِرِ

(کہ حجاج بن یوسف میرے خلاف تو) شیر کی طرح ہے، لیکن وہ اس شتر مرغ کی طرح ہے جو جنگوں میں پر پھیلائے ہوئے ہے، جو سیٹی بجانے والے کی سیٹی کی آواز سن کر بھاگ جاتا ہے۔

اس مقام پر اسد سے پہلے مبتداء محذوف ہے اس لئے یہ بھی تشبیہ ہے۔ اور مندرجہ بالا آیت میں تمثیل اور تشبیہ کا قول اس وقت ہی درست ہوسکتا ہے جب کہ ضمیر محذوف کا مرجع منافقین کو بنایا جائے تو یہ تمثیل اور تشبیہ اس سے ماقبل کلام میں بیان کی ہوئی حقیقت کا خلاصہ اور نتیجہ ہوگی۔ اور اگر ضمیر کا مرجع مستوقدین النار کو بنایا جائے تو پھر یہ الفاظ اپنے حقیقی معنیٰ میں ہی استعمال ہوں گے اور آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ آگ جلانے والوں نے جب آگ جلائی اور اس نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ کریم نے ان کا نور سلب کر لیا اور انہیں گھپ اندھیروں میں چھوڑ دیا تو ان ظلمتوں نے ان کو ایسا دہشت زدہ کر دیا کہ وہ حواس باختہ ہوگئے اور ان کے حواس ناکارہ ہوگئے اور ان کی دیکھنے، سننے اور بولنے کی قوتیں کمزور ہوگئیں۔ ان تینوں صفات کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے اس وقت یہ ترکھم کے مفعول سے حال ہوں گے۔

الصمم کا معنیٰ:

صمم کا لغوی معنیٰ وہ سختی اور صلابت ہے جو مختلف اجزاء کے جمع اور منجمد ہونے سے بنتی ہے اور اسی سے اصم کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جو حجر اور قناۃ کی صفت بنتا ہے کہا جاتا ہے، حجر اصم (سخت پتھر) اور قناہ اصماء (ٹھوس اور مضبوط لکڑی کا نیزہ) اور بوتل کے ڈھکنا کو بھی صمام القارورۃ کہتے ہیں۔ اب اس لفظ کا اطلاق سماعت کے حاسہ کے فقدان پر ہوتا ہے۔ کیونکہ قوت سماعت کے نہ ہونے کے سبب یہ ہوتا ہے کہ کان کے سوراخ کے اندر سے اس قدر ٹھوس ہو جاتے ہیں کہ اس میں ذرا برابر بھی خلا باقی نہیں رہتا جو اس ہوا پر مشتمل ہو جس کے کانوں کے پردہ سے ٹکرانے کی وجہ سے آواز سنائی دیتی ہے۔

بکم قوت گویائی کے نہ ہونے کو کہتے ہیں اور عمی اس وقت بولتے ہیں کہ جب کسی ایسی چیز میں بینائی نہ ہو جس کی شان یہ ہو کہ بصیر ہو سکے اور کبھی عمی کے لفظ کا اطلاق عدم بصیرت پر بھی ہوتا ہے جو کہ ان کے یہ حواس ان کی گمراہی کی وجہ سے مختل ہو چکے تھے اس لئے اللہ کریم نے فرمایا کہ وہ اس ہدایت کی طرف نہیں لوٹیں گے جس کو انہوں نے فروخت اور ضائع کر دیا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس گمراہی سے واپس نہیں پلٹیں گے جسے انہوں نے ہدایت کے بدلے خرید لیا ہے۔ یا اس کا معنیٰ یہ ہے کی وہ اس حد تک حیران اور ششدر ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ انہوں نے آگے کیسے بڑھنا ہے یا پیچھے ہٹنا ہے کہ وہ اس جگہ کی طرف لوٹ جائیں جہاں سے انہوں نے ابتداء کی تھی تو جب انہیں اپنی منزل کا علم ہی نہیں تو وہ کیسے پلٹ سکتے ہیں۔

فاء کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کا سابقہ اوصاف سے متصف ہونا ان کی رکاوٹ اور ان کی حیرت انگیزی کا سبب ہے۔

صمّ کا معنیٰ:

(ص م م) الصمم (Deaf)

کے معنیٰ حاسہ سماعت ضائع ہو جانا کے ہیں (مجاز) اس کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہوتا ہے جو نہ تو حق کی آواز سنے اور نہ ہی اسے قبول کرے (بلکہ اپنی مرضی کرتا چلا جائے) قرآن میں ہے:

"صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 18)

بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔

بکم کا معنیٰ:

(ب ک م) الابکم (Dumb,Speechless)

پیدائشی گونگا اور اخرس عام گونگے کو کہتے ہیں لہٰذا بکم عام اور اخرس خاص ہے قرآن میں ہے۔

"وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ" (سورۃ النحل آیت نمبر 76)

اور خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں ایک ان میں گونگا اور دوسرے کی ملک (ہے بے اختیار وناتوان) کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

اور ابکم کی جمع بکم آتی ہے چنانچہ فرمایا:

"صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 18)

بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔

اور جو شخص ضعف عقلی کے سبب گفتگو نہ کر سکے اور گونگے کی طرح چپ رہے تو اس کے متعلق بکم عن الکلام کہا جاتا ہے یعنی وہ کلام سے عاجز ہو گیا۔

عمی کا معنیٰ:

(ع م ی) العمی (Blindness)

یہ بصارت اور بصیرت دونوں قسم اندھے پن کے لئے بولا جاتا ہے لیکن جو شخص بصارت کا اندھا ہو اس کے لئے صرف اعمیٰ اور جو بصیرت کا اندھا ہو اس کے لئے اعمیٰ و عم دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

"اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی" (سورۃ العبس آیت نمبر 2)

کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔

میں الاعمیٰ سے مراد بصارت کا اندھا ہے مگر جہاں کہیں قرآن نے العمی کی مذمت کی ہے وہاں دوسرے معنی یعنی

بصیرت کا اندھاپن مراد لیا ہے جیسے فرمایا:

"صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 18)
بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔

"فَعَمُوْا وَصَمُّوْا" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 71)
تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔

بلکہ بصیرت کے اندھاپن کے مقابلہ میں بصارت کا اندھاپن۔ قرآن کی نظر میں اندھاپن ہی نہیں ہے

رجوع کا اصل معنیٰ:

(ر ج ع) الرجوع (To Return Back)

اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کے اپنے مدار حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جز کے اور یا باعتبار فعل کے ہو الغرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رجع کے معنی لوٹانے کے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 19]

اَوْ کَصَیِّبٍ مِنَ السَّماءِ فِیهِ ظُلُماتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ یَجْعَلُونَ اَصابِعَهُمْ فِي آذانِهِمْ مِنَ الصَّواعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِیطٌ بِالْکافِرِینَ (19)

"یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے"۔

متن:

اَوْ کَصَیِّبٍ مِنَ السَّماءِ عطف على الذي استوقد أي: كمثل ذوي صيب لقوله: يَجْعَلُونَ أَصابِعَهُمْ فِي آذانِهِمْ وأَوْ في الاصل للتساوي في الشك، ثم اتسع فيها فأطلقت للتساوي من غير شك مثل:

جالس الحسن أو ابن سيرين، وقوله تعالى: وَلا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِماً أَوْ كَفُوراً. فإنها تفيد التساوي في حسن المجالسة ووجوب العصيان ومن ذلك قوله: أَوْ كَصَيِّبٍ ومعناه أن قصة المنافقين مشبهة بهاتين القصتين، وأنهما سواء في صحة التشبيه بهما، وأنت مخير في التمثيل بهما أو بأيهما شئت. والصيب: فيعل من الصوب، وهو النزول، يقال

للمطر وللسحاب، قال الشماخ:

وأَسْحَمَ دانٍ صادقِ الرعْدِ صَيِّبِ

وفى الآية يحتملهما، وتنكيره لأنه أريد به نوع من المطر شديد، وتعريف السماء للدلالة على أن الغمام مطبق آخذ بآفاق السماء كلها فإن كل أفق منها يسمى سماء كما أن كل طبقة منها سماء، وقال:

وَمِنْ بَعْدِ أرضٍ بيننَا وسماءِ

أمد به ما فى الصيب من المبالغة من جهة الاصل والبناء والتنكير، وقيل المراد بالسماءِ السحاب فاللامِ لتعريف الماهية.

فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ إن أريد بالصيب المطر، فظلماته ظلمة تكاثفه بتتابع القطر، وظلمة غمامه مع ظلمة الليل وجعله مكاناً للرعد والبرق لأنهما فى أعلاه ومنحدره ملتبسين به. وإن أريد به السحاب، فظلماته سحمته وتطبيقه مع ظلمة الليل.

ترجمہ:

اس عبارت میں لفظ او حرف عطف ہے اور کصیب کا عطف الذی استوقد نارا پر ہے تو معنی یہ ہوگا کہ منافقین موسلا دھار برسنے والی بارش میں چلنے والوں کی طرح ہے کیونکہ اس کے مابعد آیت میں اللہ کریم فرماتا ہے کی وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے باعث موت واقع ہونے کے خوف سے ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ کریم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس جگہ او حرف عطف ذکر کیا گیا ہے جو اصل میں تساوی فی الشک کے لئے وضع کیا گیا ہے اس میں وسعت پیدا کر دی گئی ہے اور مجازاً صرف تساوی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس میں شک نہیں ہوتا، جیسے کوئی کہتا ہے کہ

جالس الحسن او ابن سيرين

چاہئے۔ (حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجلس میں بیٹھا کرو اور چاہے ابن سیرین، دونوں کی محفل میں جانا خیر و برکت میں مساوی ہے)

اسی طرح دوسری آیت طیبہ میں فرمایا:

ولا تطع منهم آثما او كفورا — اے مخاطب گناہگار یا ناشکرے کی اطاعت نہ کر۔

اطاعت نہ کرنے میں دونوں مساوی، اسی طرح او کصیب میں او کا لفظ ہے تشبیہ دینے کی مساوات پر دلالت کر رہا ہے یعنی چاہے تو آپ منافقین کو مستوقدین کے ساتھ تشبیہ دیں اور چاہے اصحاب صیب سے کیونکہ دونوں کے ساتھ تشبیہ دینا صحیح اور درست ہے۔ آپ کو اختیار ہے کہ منافقین کی حالت اصحاب صیب اور مستوقدین دونوں کے قصوں سے تشبیہ دیں اور چاہے ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تشبیہ دیں۔

اصیب صفت مشبہ کا صیغہ ہے بروزن فعیل۔ اور یہ صوب سے مشتق ہے۔ (برسنا) اور صیب کے لفظ کا اطلاق بارش اور بادل دونوں پر ہوتا ہے۔ شماخ کہتا ہے،

وأسْحَمَ دانٍ صادقِ الرعْدِ صَيِّبِ

کہ وہ کالے کالے بارش سے بوجھل بادل کڑک کے سچے، برسنے والے ہیں۔

اس مصرع میں صیب کا لفظ بادل کے معنیٰ میں ہے اور زیر بحث آیت طیبہ میں سیب سے دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں۔ (بادل اور بارش) اور اس کو نکرہ ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے شدید قسم کی بارش مراد ہے اور السماء کو معرف باللام ذکر کرنا بھی معنیٰ پر دلالت ہے، یعنی بادل آسمان کے تمام گوشوں پر چھایا ہوا ہے۔ کیونکہ سماء کے لفظ کا اطلاق آسمان ہر افق کے لئے کیا جاتا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ السماء پر الف لام استغراقی، شاعر کہتا ہے۔

وَمِنْ بَعْدِ أرضٍ بينَنَا وسماءِ

میری محبوب کے درمیان اور میرے درمیان اتنی دوری ہے جتنی دوری قطعہ زمیں اور قطعہ آسمان کے درمیان ہے۔

اور صیب کے لفظ میں کئی طرح مبالغہ پایا جاتا ہے۔ وہ بھی بارش یا بادل میں مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ اصل معنیٰ اور صیغہ کے اعتبار سے بھی اور اس کو نکرہ ذکر کرنے کے اعتبار سے بھی مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ یہ صوب سے مشتق ہے اور حروف شدیدہ سے مرکب ہے جو بارش کے نزول کی شدت پر دلالت کرتا ہے اور یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے جو دوام اور استمرار کے معنیٰ کو ظاہر کرتا ہے اور نکرہ ہونا بھی اس کے مدلول کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

بعض نے کہا کہ یہاں سماء سے مراد آسمان نہیں، بادل مراد ہے اور اس پر ال کا دخول اس کی حقیقت اور ماہیت کی تعریف کے لئے ہے۔

وہ بادل یا بارش ایسے ہیں، جن کے ظلمتیں بجلی کی کڑک اور چمک ہے۔

اگر صیب سے مراد بارش لی جائے تو اس کی ظلمتیں یہ ہوں گی۔

☆ بارش کے موسلا دھار اور تسلسل سے برسنے سے پیدا ہوتی ہے۔

☆ رات کی ظلمت: جس کے ساتھ بادل کے چھا جانے کی ظلمت بھی ہو، بارش کو کڑک اور چمک کا محل بنانے کی وجہ کیا ہے؟

حالانکہ یہ دونوں چیزیں بادل میں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ یہ دونوں بارش کے اوپر اس کے برسنے کے محل کے ساتھ ملتبس ہوتی ہے اس لئے اس کا اطلاق مجازاً بارش پر کر دیا گیا ہے۔

اور اگر صیب سے مراد بادل لیا جائے تو ظلمات سے یہ ظلمتیں مراد ہوں گی۔

1۔ بادل کی ظلمت 2۔ اس کے سیاہ ہونے کی ظلمت 3۔ رات کی ظلمت

متن:

وارتفاعها بالظرف وفاقاً لأنه معتمد على موصوف. والرعد: صوت يسمع من السحاب. والمشهور أن سببه اضطراب أجرام السحاب واصطكاكها إذا حدتها الريح من الارتعاد. والبرق ما يلمع من السحاب، من برق الشيء بريقاً، وكلاهما مصدر فى الاصل ولذلك لم يجمعا.

ترجمہ:

یہاں پر فیہ جار اور مجرور، شبہ فعل کے متعلق ہو کر خبر مقدم ہے اور ظلمات، ورعد و برق معطوف اور معطوفات علیہ مل کر مبتداء مؤخر ہے۔ ان کے مرفوع ہونے میں ان کے عامل میں اختلاف ہے۔

بصریوں کا کہنا ہے کہ یہ عامل معنوی کے ساتھ بحیثیت مبتداء ہونے کے مرفوع ہیں۔

اور کوفیوں کا کہنا ہے کہ ان کا عامل شبہ فعل ہے، جار مجرور مل کر اس کے متعلق ہیں۔ اور امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس مؤخر الذکر قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس پر تمام علمائے نحو کا اتفاق ہے کہ جب ظرف سے پہلے موصوف مبتداء اور اسم موصول وغیرہ ہوں تو ان پر اعتماد کرتے ہوئے ظرف کو عامل بنانا جائز ہے۔ اس مقام پر فیہ کا اعتماد ماقبل کلام میں صیب کے لفظ پر ہے جو موصوف ہے اور یہ اس کی صفت ہے۔

الرعد یہ ارتعاد بمعنی کانپنا سے مشتق ہے اور رعد اس آواز کو کہتے ہیں جو بادلوں کے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور مشہور یہ ہے کہ اس آواز اور کڑک کے پیدا ہونے کا سبب اجرام سماویہ کا اضطراب اور ان کا آپس میں ٹکرانا ہے۔ جب کہ ہوا انہیں ہانک کر لے جا رہی ہو۔ اور برق اس چمک کا نام ہے جو بادلوں کی ملاقات سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ مشہور ہے برق الشیء بریقا بمعنیٰ وہ چیز خوب چمکی۔ چونکہ اصل میں برق اور رعد مصدر ہیں اس لئے ظلمات کی مطابقت کی وجہ سے ان کو جمع ذکر نہیں کیا جاتا۔

متن:

يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ.... الخ

الضمير لأصحاب الصيب وهو وإن حذف لفظه وأقيم الصيب مقامه لكن معناه باق، فيجوز أن يعول عليه كما عول حسان فى قوله:

يَسْقُوْنَ مَنْ وَرَدَ الْبَرِيْصَ عَلَيْهِم ... بَرَدَى يُصَفِّقُ بِالرَّحِيْقِ السَّلْسَلِ

حيث ذكر الضمير لأن المعنى ماء بردى، والجملة استئناف فكأنه لما ذكر ما يؤذن

بالشدة والهول قيل:

فكيف حالهم مع مثل ذلك؛ فأجيب بها، وإنما أطلق الاصابع موضع الانامل للمبالغة.

مِنَ الصَّوَاعِقِ متعلق بيجعلون أى من أجلها يجعلون، كقولهم سقاه من الغيمة. والصاعقة قصفة رعد

- هائل معها نار لا تمر بشيء إلا أتت عليه، من الصعق وهو شدة الصوت، وقد تطلق على كل هائل مسموع أو مشاهد، يقال صعقته الصاعقة إذا أهلكته بالإحراق أو شدة الصوت، وقرء من »الصواقع« وهو ليس بقلب من الصواعق لاستواء كلا البناءين فى التصرف يقال صقع الديك، وخطيب مصقع، وصقعته الصاقعة، وهى فى الاصل إما صفة لقصفة الرعد، أو للرعد. والتاء للمبالغة كما فى الرواية أو مصدر كالعافية والكاذبة.

حَذَرَ الْمَوْتِ نصب على العلة كقوله:

وأَغْفِرُ عَوراءَ الكَريم ادِّخَارَه... وأَصْفَحُ عَنْ شتمِ اللئيمِ تَكَرُّمَا

والموت: زوال الحياة، وقيل عرض يضادها لقوله: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ، وَرُدَّ بأن الخلق بمعنى التقدير، والاعدام مقدرة.

وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ

لا يفوتونه كما لا يفوت المحاط به المحيط، لا يخلصهم الخداع والحيل، والجملة اعتراضية لا محل لها.

ترجمہ:

،،اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے،،

یجعلون کی ضمیر مرفوع متصل کا مرجع اصحاب صیب ہیں، اگرچہ وہ لفظاً محذوف ہے لیکن معناً موجود ہے۔ اس کے معنیٰ کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اس ضمیر کا مرجع بنانا جائز ہے، اور عربوں میں یہ استعمال عام مروج تھا جیسے حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت میں غسان کے بادشاہوں کے پاس جاتے اور ان کی مدح میں اشعار کہتے۔ ان کا ایک شعر بطور دلیل ملاحظہ ہو، جس میں مضاف محذوف کو ضمیر کا مرجع بنایا گیا ہے۔

يَسْقُونَ مَنْ وَرَدَ الْبَرِيصَ عَلَيهِم... بَرَدَى يُصَفِّقُ بِالرَّحِيقِ السَّلْسَلِ

میرے ممدوحین اس آدمی کو بریص کے مقام پر، جوان کے پاس آتا ہے، تو اسے بردی نہر کا پانی ایسی شراب میں ملا کر پلاتے ہیں جو آسانی سے گلے سے اتر جاتی ہے۔

اس شعر میں یصفق مذکر غائب کا صیغہ ہے جس کی ضمیر کا مرجع ماء ہے جو بردی سے پہلے محذوف ہے اصل میں ماء بردیٰ تھا۔ اگرچہ ماء لفظوں میں مذکور نہیں لیکن اس کے معنیٰ کا لحاظ کرتے ہوئے یصفق کی ضمیر مذکر کا اسے مرجع بنایا گیا ہے ورنہ یہاں تصفق ہوتا۔

یجعلون الی آخرہ مکمل جملہ مستانفہ ہے جس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ چونکہ جملہ مستانفہ کسی سوال کا جواب ہوتا ہے تو یہاں یہ اس سوال کا جواب ہے کہ ان تمام ہولناکیوں کے باوجود بارش میں چلنے والوں کا حال کیا ہوگا تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ بجلی کی زبردست کڑک اور چمک کی وجہ سے موت کے خوف سے وہ اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنا انہیں موت سے بچا نہیں سکتا، اور اس مقام پر ان کی دہشت میں مبالغہ ظاہر کرنے کے لئے اصابعھم کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ کانوں کے سوراخوں میں ساری انگلیاں داخل نہیں کی جاتیں بلکہ ان پر صرف انگلیوں کے پورے رکھے جاتے ہیں۔

اور من الصواعِقِ جار اور مجرور مل کر یجعلون کے متعلق ہیں اور من سببیہ ہے اور من سبب کے معنیٰ میں عام استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے:

سقاہ من العیمة اس نے دودھ شدت شوق کی وجہ سے پلایا۔

الصواعق

یہ صاعقہ کی جمع ہے جو صعق بمعنی شدت خوف سے مشتق اور صاعقة کا معنیٰ ہے۔ ایسی شدید کڑک، جس کے ساتھ آگ ہو اور جس پر پڑے اسے جلا کر ہلاک کر دے اور صاعقة کے لفظ کا اطلاق اس ہولناک چیز پر بھی ہوتا ہے جسے سنا جائے یا اسے دیکھ کر دہشت طاری ہو جائے اور اسے دیکھنے یا سننے والا ہلاک ہو جائے۔

صواعق کو صواقع بھی پڑھا گیا ہے۔ اور یہ صواعق کا مقلوب نہیں کیونکہ قلب کا معنیٰ ہوتا ہے کسی حرف کو مقدم یا مؤخر کرنا۔

کیونکہ یہ دونوں لفظ یعنی صواعق اور صواقع کثیر الاستعمال اور فصیح لفظ ہیں اور ان سے تمام مشتقات استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے صقع الدیک (مرغ نے آذان دی)، خطیب مصقع (جہوری آواز والا خطیب) اور اسی طرح صقعتہ الصاقعة (کہ اسے بجلی کی گرج دار کڑک نے ہلاک کر دیا)۔

اور صاقعة اصل میں اسم فاعل کا صیغہ ہے اور یہ یا تو قصفة الرعد کی صفت ہے، اس لئے یہ مؤنث ہے اور یا یہ رعد کی صفت ہے اس صورت میں اس کے آخر تائے تانیث نہیں ہوگی بلکہ مبالغہ کے لئے ہوگی جیسے راویہ اور علامة کے آخر میں تا

داخل ہوگئی اور مؤنث کی تا نہیں ہے جیسے عافیۃ بمعنی عفو اور کاذبۃ بمعنی کذب کے آخر میں تا ہے۔

حذر الموت

اس مقام پر حذر کو موت کی طرف مضاف کر کے منصوب پڑھا گیا ہے کیونکہ یہ مفعول لہ ہے اور لغت عرب میں معرفہ کی طرف مضاف کر کے مفعول لہ کے طور پر پڑھنا جائز ہے۔ جیسا کہ حاتم طائی کا قول،

وأغْفِرُ عَوراءَ الكَريم اِدِّخَارَہ... وأصْفَحُ عن شتمِ اللئيمِ تَكَرُّمَا

اور میں سخی آدمی کی ناپسندیدہ بات کو معاف کر دیتا ہوں۔ اس کی محبت ذخیرہ کرنے کے لئے اور کمینہ فطرت کو گالی دینے سے اپنی شرافت و بزرگی کی وجہ درگزر کرتا ہوں۔

اس شعر میں اذخارہ الی الضمیر کے باوجود مفعول لہ ہے۔

واللہ محیط بالکفرین

یعنی تمام کافر اس کے علم میں ایسے گھرے ہوئے ہیں کہ وہ اس سے کسی طرح فوت یعنی مخفی نہیں ہوتے۔ جس طرح وہ چیز جسے گھیرا گیا ہو وہ گھیرنے والے سے فوت نہیں ہوتی۔ اس لئے کافروں اور منافقوں کے حیلے اور دھوکے بازیاں اس سے انہیں چھٹکارہ نہیں دلائیں گی اور یہ جملہ معترضہ ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔

صیب خاص کر صاب یصوب سے فعیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بارش کا گرنا اوپر سے نیچے آنا شاعر نے کہا ہے۔

فکانھم صابت علیھم سبلۃ

گویا اس پر (زور کا) بادل برسا ہے۔

اور آیت کریمہ: " اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 19)

یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک۔

اس میں بعض نے کہا ہے کہ صیب کے معنی بادل ہیں۔ اور بعض نے بارش مراد لی ہے۔ اور بارش کو مجازاً صیب کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے سحاب کہہ دیتے ہیں اصاب السھم تیر ٹھیک نشانہ پر جالگا۔

مفہوم سماء:

(س م و) سماء (The Sky)

ہر شے کے بالائی حصہ کو سماء کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سماء ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔

اور آیت:

" اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ "(سورۃ الطلاق آیت نمبر 12)

اللہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور انہی کی برابر زمینیں۔

کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

مفہوم ظلم:

(ظ ل م) الظلمۃ۔(Cruelty)

کے معنی میں روشنی کا معدوم ہونا اس کی جمع ظلمات ہے۔

قرآن میں ہے:" اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ "(سورۃ النور آیت نمبر 40)

یا جیسے اندھیریاں کسی کنڈے کے دریا میں۔

" ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ "(سورۃ النور آیت نمبر 40)

بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک۔

" اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ "(سورۃ النمل آیت نمبر 63)

یا وہ جو تمہیں راہ دکھاتا ہے اندھیریوں میں خشکی اور تری کی۔

" وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ "(سورۃ الانعام آیت نمبر ۱)

اور اندھیریاں اور روشنی پیدا کی۔

اور کبھی ظلمۃ کا لفظ بول کر جہالت شرک اور فسق وفجور کے معنی مراد لئے جاتے ہیں جس طرح کہ نور کا لفظ ان کے اضداد یعنی علم وایمان اور عمل صالح پر بولا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:" يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 257)

ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔

" اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ "(سورۃ ابراھیم آیت نمبر 5)

کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ۔

رعد کا معنیٰ:

(ر ع د) رعد (Thunder)

الرعد (اسم) بمعنی بادل کی گرج۔

رعد، فرشتے کا نام:

مروی ہے انہ ملک یسوق السحاب کہ رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں کو چلاتا ہے کہا جاتا ہے۔ بادل گرجا اور چمکا۔ اور یہی معنی ارعد وابرقت کے ہیں اور کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ تہدید یعنی ڈرانے اور دھمکانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور صلف (مثل) ضرب المثل ہے جو اس شخص کے حق میں بولی جاتی ہے جو زبانی توتی ہو کچھ کر کے نہ دکھاتا ہو الرعدید بزدلی کی وجہ سے کانپنے والا نیز محاورہ ہے ارعد فوائصہ خوفاً یعنی مارے خوف کے اس کے پٹھے کانپنے لگے۔

برق کا مفہوم:

(ب ر ق) البرق

کے معنی بادل کی چمک کے ہیں قرآن میں ہے:

"فِیهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 19)

اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک۔

جعل کا معنیٰ:

(ج ع ل) جعل (ف)

یہ لفظ ہر کام کرنے کے لئے بولا جاسکتا ہے اور فعل وصنع وغیرہ افعال کی بنسبت عام ہے۔

اصبع کیا ہے؟

(اص ب ع) اصبع (Finger)

الاصبع (انگلی) کا لفظ انگلی کی ہڈی ناخن بالائی سرا خم اور جوڑ کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ اور بطور استعارہ ظاہری احسان کے معنی میں آتا ہے چنانچہ لک علیہ ید کی طرح لک علی فلان اصبع کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔

اذن کا معنیٰ:

(اذ ن) الاذن (Ear)

کے معنی کان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر ہنڈیا کی کوروں کو اذن القدر کہا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر اس شخص پر اذن کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لیتا ہو۔

چنانچہ فرمایا:

"وَیَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّکُمْ" (سورۃ التوبۃ آت نمبر 61)

اور کہتے ہیں وہ تو کان ہیں تم فرماؤ تمہارے بھلے کے لئے کان ہیں۔

اور آیت کریمہ: "وَفِيٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا" (سورۃ الانعام 25)

اور انکے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔

کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بہرے ہوگئے ہیں بلکہ اس سے انکی جہالت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

تحقیق لفظِ صاعقہ:

(ص ع ق) الصاعقة (Explosion)

اور صاعقہ دونوں کے تقریبا ایک ہی معنی ہیں یعنی ہولناک دھماکہ۔ لیکن صقع کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور صعق اجسام علوی کے بارے میں بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ صاعقہ تین قسم پر ہے

صاعقہ کی اقسام:

اول بمعنی موت اور ہلاکت

جیسے فرمایا: "فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 68)

تو بے ہوش ہو جائیں گے جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں۔

"فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 153)

تو انہیں کڑک نے آلیا۔

دوم بمعنی عذاب جیسے فرمایا: "اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ" (سورۃ حم سجدہ آیت نمبر 13)

تمہیں ڈراتا ہوں ایک کڑک سے جیسی کڑک عاد اور ثمود پر آئی تھی۔

سوم بمعنی آگ (اور بجلی کی کڑک)

جیسے فرمایا: "وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 13)

اور کڑک بھیجتا ہے تو اسے ڈالتا ہے جس پر چاہے۔

لیکن یہ تینوں چیزیں دراصل صاعقہ کے آثار سے ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو فضا میں سخت آواز کے ہیں پھر کبھی تو اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے یعنی دراصل وہ ایک ہی چیز ہے اور یہ سب چیزیں اس کے آثار سے ہیں۔

حذر کا معنی:

(ح ذ ر) الحذر (س) (To Frighten,To Fear)

خوف زدہ کرنے والی چیز سے دور رہنا کہا جاتا ہے حذر حذرا و حذرتہ میں اس سے دور رہا۔

قرآن میں ہے: "يَحْذَرُ الْآخِرَةَ "(سورۃ الزمر آیت نمبر 9)

آخرت سے ڈرتا ہو۔

وانّا لجمیع حَذِرُون، وحاذِرُونَ اور ہم سب باساز و سامان ہیں۔ ایک قرآت میں حذرون ہے

" هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ "(سورۃ المنافقون آیت نمبر 4)

یہ تمہاری دشمن میں ان سے محتاط رہنا۔

" اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ "(سورۃ التغابن آیت نمبر 14)

تمہاری کچھ بیبیاں اور بچے تمہارے دشمن ہیں تو ان سے احتیاط رکھو۔

حذر۔ کسی امر سے محتاط رہنے کے لئے کہنا۔

قرآن میں ہے: " وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 28)

اور اللہ تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے۔

الحذر بچاؤ۔ اور آیت کریمہ: " خُذُوا حِذْرَكُمْ "(سورۃ النساء آیت نمبر 71)

جہاد کے لئے ہتھیار لے لیا کرو۔

میں حذر سے مراد اسلحہ جنگ وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ دشمن سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے حذار (اسم فعل بمعنی امر) بچو جیسے مناع بمعنی امنع۔

خوف کا معنیٰ:

(خ و ف) الخوف (س) (Fear,Dread)

کے معنی ہیں قرآن وشواہد سے کسی آنے والے کا خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ کا لفظ قرائن وشواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیوی اور آخروی دونوا کرمتعلق استعمال ہوتا ہے:

قرآن میں ہے: " وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُونَ عَذَابَهٗ "(سورۃ آیت نمبر 57)

اس کی رحمت کی امید رکھتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

موت کا معنیٰ۔

(م و ت) الموت (Death,Calamity)

یہ حیات کی ضد ہے،

موت کی اقسام:

لہٰذا حیات کی طرح موت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

1۔ اول قوت نامیہ:

(جو کہ انسان حیوانات اور نباتات (سب میں پائی جاتی ہے) کے زوال کو موت کہتے ہیں جیسے فرمایا:

"يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (سورۃ الروم آیت نمبر 19)

اور زمین کو جلاتا ہے اس کے مرے پیچھے۔

"وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا" (سورۃ ق آیت نمبر 11)

اور ہم نے اس سے مردہ شہر جلایا۔

2۔ حس و شعور کے زائل ہو جانے کو موت کہتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا: "قالت یالیتنی مِتُّ قَبْلَ هٰذا" (سورۃ مریم آیت نمبر 23)

بولی ہائے کسی طرح میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی۔

"أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 66)

جب میں مر جاؤں گا تو ضرور عنقریب جلا کر نکالا جاؤں گا۔

3۔ قوت عاقلہ کا زائل ہو جانا اور اسی کا نام جہالت ہے۔

چنانچہ فرمایا: "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 122)

اور کیا وہ کہ مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ کیا۔

اور آیت کریمہ: "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى" (سورۃ النمل آیت نمبر 80)

بیشک تمہارے سنائے نہیں سنتے مردے۔

4۔ غم جو زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کر دیتا ہے۔

چنانچہ آیت کریمہ: "وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ" (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 17)

اور اسے ہر طرف سے موت آئے گی اور مرے گا نہیں۔

اس میں موت سے یہی معنی مراد ہیں۔

5۔ موت بمعنی نیند ہوتا ہے۔

اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ النوم موت خفیف والموت نوم ثقیل کہ نیند کا نام ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو توفی سے تعبیر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 60)

اور وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے۔

الحائط کا مطلب:

(ح و ط) الحائط۔ (Wall)

دیوار جو کسی چیز کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور

احاطة (افعال) کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(1) اجسام کے متعلق جیسے۔ احطت بمکان کذا یہ کبھی بمعنی حفاظت کے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ" (سورۃ فصلت آیت نمبر 54)

سن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یعنی وہ ہر جانب سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔

(2) دوم احاطہ بالعلم ہے جیسے فرمایا:

"اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 12) اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

کفر کے معانی:

(ک ف ر) الکفر (Unbelief,Infidelity)

اصل میں کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشتکار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لئے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔

کفر کا اصطلاحی معنیٰ:

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا شریعت حقہ یا نبوت کا انکار ہے۔

پھر کفران کا لفظ زیادہ نعمت کا انکار کرنے کے معنی ہیں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکار دین کے معنی میں اور کفور کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَاَبَی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 99)

تو ظالم نہیں مانتے بے ناشکری کئے۔

[سورة البقرة (2) : آية 20]

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (20)

"بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے اور جب

اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا، بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

متن:

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصارَهُمْ استئناف ثان كأنه جواب لمن يقول: ما حالهم مع تلك الصواعق؛ وكاد من أفعال المقاربة، وضعت لمقاربة الخبر من الوجود لعروض سببه لكنه لم يوجد، إما لفقد شرط، أو لوجود مانع وعسى موضوعة لرجائه، فهي خبر محض ولذلك جاءت متصرفة بخلاف عسى، وخبرها مشروط فيه أن يكون فعلاً مضارعًا تنبيهاً على أنه المقصود بالقرب من غير أن، لتوكيد القرب بالدلالة على الحال، وقد تدخل عليه حملاً لها على عسى، كما تحمل عليها بالحذف من خبرها لمشاركتهما في أصل معنى المقاربة.

والخطف الاخذ بسرعة وقرء (يَخْطِف) بكسر الطاء ويخطف على أنه يختطف، فنقلت فتحة التاء إلى الخاء ثمّ ادغمت في الطاء، ويخطف بكسر الخاء لالتقاء الساكنين وإتباع الياء لها، ويخطف ويتخطف.

ترجمہ:

بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی۔

یہ ماقبل کلام میں پیدا شدہ سوال کا جواب اور جملہ مستانفہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ بجلیوں کی چمک، گرج اور ہولنا کیوں کے وقت ان کی حالت کیا ہوگی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب بارش میں چلنے والا اچانک گرج اور چمک دیکھتا ہے تو اس کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ ڈر جاتا ہے، بالکل اسی طرح منافقین کی نگاہیں بھی اسلام کی سربلندی اور عظمت کو دیکھ کر خیرہ ہو جاتی ہیں۔

یکاد فعل مضارع کا صیغہ ہے اور افعال مقاربہ میں سے ہے اور یہ زمانہ حال میں خبر کے قریب ہی واقع ہونے پر دلالت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ یعنی آنکھوں کے اچکنا وقوع پذیر ہونے کے بالکل قریب ہے۔ مگر وہ ابھی تک اچکی نہیں گئیں کیونکہ شرط مفقود ہے۔ یا کوئی ایسا مانع موجود ہے جو خبر کو واقع ہونے سے روک رہا ہے۔ اور وہ مانع اور شرط اللہ کریم کا ارادہ ہے، جو ابھی تک اس کے متعلق نہیں ہوا۔

کاد یہ خبر کے زمانہ حال میں قریب ہی واقع ہونے کی امید پر دلالت کرتا ہے جب کہ عسی انشائیہ ہے زمانہ مستقبل میں قریب ہی واقع ہونے کی امید پر دلالت کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی خبر پر اکثر اِن آتا ہے جب کہ کاد کی خبر اکثر ان کے بغیر ہی ہوتی ہے۔ اور کاد فعل متصرف اور محض خبریہ ہے جب کہ عسیٰ انشائیہ غیر متصرف ہے۔

نوٹ: عسی کی خبر سے ان اس وقت حذف کیا جاتا ہے جب کہ وہ کاد کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور کاد کی خبر پر اس وقت ان لگایا جاتا ہے جب کہ وہ عسی کے معنی میں ہو۔

"یخطف" واحد مذکر غائب فعل مضارع کا صیغہ ہے یہ مشتق ہے خطف سے جس کا معنی پکڑ لینا یا اچک لینا ہے۔ اور یخطف میں پانچ لغتیں پڑھنا جائز ہے،

طاء کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ یَخطَفُ یَخطِف

طاء مشدد بفتحہ حاء کے کسرہ کے ساتھ۔

اصل میں یخطتف تھا تاء کے فتحہ کو نقل کر کے خاء کو دیا اور پھر اس کو دوسری طاء میں ادغام کر دیا اور اس صورت میں خاء کے فتحہ کو دور ہٹا کر اسے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے کیونکہ جب دو ساکن جمع ہوتے ہیں، تو پہلے حرف ساکن کو کسرہ ہی دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یاء کی اتباع کی وجہ سے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور اس کو باب تفعّل سے یتخطف بھی پڑھا گیا ہے۔

متن:

كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا...

استئناف ثالث كأنه قيل: ما يفعلون في تارتي خفوق البرق، وخفيته؟ فأجيب بذلك. وأضاء إما متعد والمفعول محذوف بمعنى كلما نور لهم ممشى أخذوه. أو لازم بمعنى كلما لمع لهم مشوا في مطرح نوره، وكذلك أظلم فإنه جاء متعدياً منقولاً من ظلم الليل، ويشهد له قراءة أظلم على البناء للمفعول، وقول أبي تمام:

هُمَا أظلَمَا حالَيَّ ثُمَّتَ أجْلَيَا ... ظلامَيْهِما عن وَجهِ أمْرَدَ أشيبِ

فإنه وإن كان من المحدثين لكنه من علماء العربية. فلا يبعد أن يجعل ما يقوله بمنزلة ما يرويه. وإنما قال مع الإضاءة كُلَّمَا ومع الإظلام إذا لأنهم حراص على المشي، فكلما صادفوا منه فرصة انتهزوها ولا كذلك التوقف. ومعنى (قاموا) وقفوا، ومنه قامت السوق إذا ركدت، وقام الماء إذا جمد. وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ أي ولو شاء الله أن يذهب بسمعهم بقصيف الرعد وأبصارهم بوميض البرق لذهب بهما فحذف المفعول لدلالة الجواب عليه. ولقد تكاثر حذفه في شاء وأراد حتى لا يكاد يذكر إلا في الشيء المستغرب كقوله:

فَلَوْ شِئْتُ أنْ أبْكِي دَمًا لَبَكَيْتُهُ

(ولو) من حروف الشرط، وظاهرها الدلالة على انتفاء الاول لانتفاء الثانى، ضرورة انتفاء الملزوم عند انتفاء لازمه، وقرء: لأذهب بأسماعهم، بزيادة الباء كقوله تعالى:
وَلا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ.

وفائدة هذه الشرطية إبداء المانع لذهاب سمعهم وأبصارهم مع قيام ما يقتضيه، والتنبيه على أن تأثير الاسباب فى مسبباتها مشروط بمشيئة الله تعالى، وأن وجودها مرتبط بأسبابها واقع بقدرته وقوله.

إِنَّ اللهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ كالتصريح به والتقرير له.

ترجمہ:

"جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا، بیشک اللہ سب کچھ کرسکتا ہے"۔

یہ تیسرا جملہ مستانفہ ہے اور یہ اس سوال کا جواب ہے جو ماقبل کلام سے پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بارش میں چلنے والوں کی اس وقت کیا کیفیت ہوتی ہے جب بجلی چمکتی اور بجھتی ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب بجلی چمکتی ہے تو وہ چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو رک جاتے ہیں۔ اور فعل اضاء جو کہ اضاءة سے مشتق ہے، یہ دونوں معنوں لازم اور متعدی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ متعدی ہو تو اس کا مفعول محذوف ہو گا۔ جو ممشی ہے بمعنی گزرگاہ۔ مطلب جب بھی بجلی کوندتی ہے تو وہ اس راستہ پر چلنے لگتے ہیں۔ اور ار یہ لازم معنی میں ہو تو معنی ہو گا کہ ج بھی بجلی چمکتی ہے تو وہ راستے پر چلنے لگتے ہیں۔

اور اسی طرح اظلم کا فعل ہے جو اظلام سے مشتق ہے جس کا معنی تاریک کرنا ہے۔ یہ بھی لازم و متعدی دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ متعدی ہو تو ظلم اللیل سے جو لازم ہے، سے باب افعال ہو گا جو لازم کو متعدی بنا دیتا ہے اور جو اسے أظلِم صیغہ مجہول سے پڑھتے ہیں وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ جیسا کہ ابو تمام کا شعر ہے،

هُمَا أظلَمَا حالى ثُمَّتَ أجلَيا ... ظلامَيهِما عن وَجهِ أمرَدَ أشيبِ

ان دونوں (عقل و زمانہ) نے میری دو حالتیں تاریک کر دیں پھر ان دونوں نے ایک جسمانی اور عمر کے اعتبار سے نوجوان اور تجربہ کے اعتبار سے عمر رسیدہ شخص سے اپنی تاریکیاں دور کر دیں۔

ابو تمام شاعروں کے اس اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو محدثین کہلاتے ہیں۔ اور یہ آغاز اسلام کے شعراء میں سے ہے اگرچہ الفاظ کے ثبوت کے لئے ان کا کلام پیش نہیں کیا جاتا مگر معانی کے ثبوت کے لئے بطور دلیل ان کے کلام کو سابقہ شعراء کے کلام پر محمول کرتے ہوئے دلیل بنانا جائز ہے چونکہ ابو تمام محدثون میں سے ہے، لیکن تھا وہ عربی علماء میں سے، اسی وجہ سے اس

کے کلام سے دلیل پکڑنا جائز ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اضاء کے ساتھ کلما ذکر کیا گیا جبکہ اظلم کے ساتھ اذا، اس کی وجہ کیا ہے؟

تو جواباً عرض ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلما تکرار کا فائدہ دیتا ہے چونکہ اصحاب صیب چلنے کے بڑے حریص تھے تو جب بھی فرصت پاتے اس کو غنیمت سمجھتے ہوئے چلنا شروع کر دیتے اور اس حالت میں انہیں رکنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس وجہ سے اظلم سے پہلے وہ لفظ ذکر کیا جو تکرار کا فائدہ نہیں دیتا۔ اور وہ اذا ہے، یہ صرف شرط اور جزاء کے واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

قاموا کا لفظ اس جگہ وقفوا کے معنیٰ میں ہے یعنی وہ رک جاتے ہیں یہ قعود کی ضد نہیں جس کا معنیٰ بیٹھنا ہے بلکہ قاموا کا معنیٰ مطلقاً رک جانا ہے، اسی سے قامت السوق، اور قام الماء ہے۔ (بازار بے رونق ہو گیا، پانی جم گیا)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ

"اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا"

لو حرف شرط ہے جو فعل ماضی پر داخل ہوتا ہے اور شاء اگرچہ فعل متعدی ہے لیکن اس کا مفعول عموماً محذوف ہوتا ہے اور اس کے حذف پر جواب شرط دلالت کرتا ہے اسی طرح اراد فعل متعدی ہے لیکن اس کا بھی بکثرت مفعول محذوف ہوتا ہے یہاں تک اگر کوئی ایسا مفعول نہ ہو جو عجیب وغریب معنیٰ پر دلالت کرتا ہو تو ان دونوں کا مفعول بالکل ذکر نہیں کیا جاتا گویا ان کا مفعول کا ذکر کرنا بہت کم ہے، قولِ شاعر،

فَلَوْ شِئْتُ اَنْ اَبْکِیَ دَمًا لَبَکَیْتُهُ

اگر میں (تیرے وصال پر) خون کے آنسوں رونا چاہتا تو رو سکتا تھا۔

خون کے آنسوں رونا نادر ہے اسی لئے أن أبکی دما ذکر کر دیا۔

لو حروف شرط میں سے ہے اور یہ اپنے ظاہری معنیٰ کے اعتبار سے جزاء کے منتفی ہونے کی وجہ سے شرط کے منتفی ہونے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ بوجہ اس کے کہ جب لازم منتفی ہوتا ہے تو ملزوم بھی منتفی ہو جاتا ہے یہاں شرط یہ ہے کہ اگر اللہ کریم چاہتا تو ان کی بصارت وسماعت سلب ہو جاتی تو ان قوتوں کا سلب نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مشیت الٰہی اس کے متعلق نہیں ہوئی۔

بعض قراء نے لذهب بسمعهم کو لاذهب باسماعهم پڑھا ہے۔ اور اس میں باء کا اسی طرح اضافہ ہے جیسے اللہ کریم عز وجل کے اس ارشاد گرامی میں،

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ.

ایدیکم سے پہلے با زائدہ ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں نہ پھینکو۔

زیر بحث آیت میں جملہ شرطیہ ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ مانع ذکر کیا جائے جو ان کی بصارت وسماعت کو سلب کرنے

سے روک رہا ہے۔ حالانکہ انہیں سلب کرنے کے اسباب مہیا ہیں۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس بات پر متنبہ کیا جائے کہ اسباب کا مسببات میں مؤثر ہونا اللہ کریم کی مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔

اس کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ بات واضح کی جائے کہ مسببات کا وجود اسباب کے ساتھ مربوط ہونے کے باوجود اللہ کریم کی قدرت کے بغیر واقع نہیں ہوتا یعنی ان کا واقع ہونا اللہ کریم کی قدرت کے تحت ہے اور ارشاد باری تعالیٰ،

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر

اس کی تصریح اور تاکید کر رہا ہے۔

متن:

والشیء یختص بالموجود، لأنه فی الاصل مصدر شاء أطلق بمعنی شاء تارة، وحینئذ یتناول البارء تعالی کما قال: قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ وبمعنی مشیء أخری، أی مشیء وجوده وما شاء الله وجوده فهو موجود فی الجملة وعلیه قوله تعالی: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فهما علی عمومهما بلا مثنویة. والمعتزلة لما قالوا الشیء ما یصح أن یوجد وهو یعم الواجب والممکن، أو ما یصح أن یعلم ویخبر عنه فیعم الممتنع أیضاً. لزمهم التخصیص بالممکن فی الموضعین بدلیل العقل.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ میں اختلاف اس بات میں ہے کہ شَیٔ لفظ کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کی وضاحت میں اشاعرہ کا مؤقف بیان کرتے ہیں کہ شَیٔ کا اطلاق موجود کے ساتھ خاص ہے کیونکہ شئی شاء یشاء کا مصدر ہے جو کبھی اسم فاعل بمعنیٰ شاء استعمال ہوتا ہے۔ جس کا معنی وہ ذات ہے جس کے ساتھ مشیت اور ارادہ کا فعل قائم ہو۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے اس کا اطلاق باری تعالیٰ پر بھی ہوگا۔ جیسے اللہ کریم کا ارشاد ہے،

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ (ای اللہ شئی شهید)

کیونکہ وہ ارادہ اور مشیت کی صفات کے ساتھ متصف ہے۔ اور کبھی لفظ شئی اسم مفعول مشئی کے معنی میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ ذات جس کے وجود کو چاہا جائے اور جس کے وجود کو اللہ کریم چاہے وہ موجود ہی ہوتی ہے۔ اور اللہ کریم کے یہ ارشاد اس معنیٰ پر دال ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ

یعنی اللہ کریم ہر چیز پر قادر ہے جس کے وجود کو وہ چاہے۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے دونوں آیات اپنے عموم پر ہوں گی اور

واجب الوجود اور محال اور ممتنع کو مستثنیٰ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ورنہ ان دونوں آیات کو ممکن کے ساتھ مقید کرنا پڑے گا، جو بلا ضرورت جائز نہیں۔

اور معتزلہ کا یہ کہنا ہے کہ شئی کا اطلاق اس ذات پر ہوگا جس کا پایا جانا صحیح ہو تو اس صورت میں شئی کا لفظ واجب اور ممکن دونوں کو شامل ہوگا۔ یا ان کے خیال کے مطابق اگر شئی سے مراد وہ ذات لی جائے جس کا علم حاصل کرنا اور خبر دینا صحیح ہو تو عقلی دلیل کے تقاضا کے مطابق ان دونوں آیات کو ممکن کے ساتھ خاص کرنا لازم ہوگا۔

متن:

والقدرة: هو التمكن من إيجاد الشيء. وقيل صفة تقتضي التمكن، وقيل قدرة الإنسان هيئة بها يتمكن من الفعل وقدرة الله تعالى: عبارة عن نفي العجز عنه. والقادر هو الذي إن شاء فعل وإن لم يشاء لم يفعل، والقدير الفعال لما يشاء على ما يشاء ولذلك قلما يوصف به غير الباري تعالى، واشتقاق القدرة من القدر لأن القادر يوقع الفعل على مقدار قوته أو على مقدار ما تقتضيه مشيئته. وفيه دليل على أن الحادث حال حدوثه والممكن حال بقائه مقدوران وأن مقدور العبد مقدور لله تعالى، لأنه شيء وكل شيء مقدور لله تعالى.

ترجمہ:

قدیر یہ مشتق ہے قدرت سے، اور قدرت کا معنیٰ کسی چیز کو وجود عطا کرنے کا تمکن حاصل ہونا ہے بعض مفسرین کے نزدیک قدرۃ ایسی صفت کا نام ہے۔ جو تمکن و قدرت کا تقاضا کرتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسان کی قدرت اس ہیئت و کیفیت کو کہتے ہیں، جن سے وہ کسی فعل کو کرنے پر قادر ہوتا ہے اور اللہ کریم کی قدرت کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ کسی کام کے کرنے سے عاجز نہیں اور نہ ہی اسے کسی کام کے کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

قادر اور قدیر میں فرق:

لفظ قادر اور قدیر کے معنیٰ میں فرق یہ ہے کہ قادر وہ ہوتا ہے جو اپنے اندازے کے مطابق جو چاہے اسے کر ڈالتا ہے اور اگر چاہے تو اسے نہ کرے اور قدیر یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، بروزن فعیل جس کا معنیٰ ہے، بہت ہی زیادہ قدرت والا یعنی جو چاہے، جب چاہے، جس طرح چاہے اسے کر ڈالتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ کریم کی ذات کے علاوہ یہ کسی اور کی صفت بہت ہی کم واقع ہوتی ہے۔ اور یہ قدرت سے مشتق ہے جس کا معنیٰ اندازہ لگانا ہے چونکہ قادر اپنی قوت اور اندازے کے مطابق کسی فعل کو واقع کرتا ہے یا جس کا اس کی مشیت تقاضا کرتی ہے اسی کی مقدار کے مطابق اس فعل کو انجام دیتا ہے اسی لئے اسے قادر کہتے ہیں۔

اوراس کی دلیل یہ ہے کہ حادث اپنی حالت حدوث میں اور ممکن اپنی حالت بقاء میں مقدور ہیں اور بندے کا مقدور اللہ کریم کا مقدور ہے کیونکہ یہ شئی ہے اور شئی اللہ کریم کی قدرت کے تحت ہے۔

متن:

والظاهر أن التمثيلين من جملة التمثيلات المؤلفة، وهو أن يشبه كيفية منتزعة من مجموع تضامت أجزاؤه وتلاصقت حتى صارت شيئاً واحداً بأخرى مثلها، كقوله تعالى: مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا الآية، فإنه تشبيه حال اليهود فى جهلهم بما معهم من التوراة، بحال الحمار فى جهله بما يحمل من أسفار الحكمة.

والغرض منهما تمثيل حال المنافقين من الحيرة والشدة، بما يكابد من انطفأت ناره بعد إيقادها فى ظلمة، أو بحال من أخذته السماء فى ليلة مظلمة مع رعد قاصف وبرق خاطف وخوف من الصواعق. ويمكن جعلهما من قبيل التمثيل المفرد، وهو أن تأخذ أشياء فرادى فتشبهها بأمثالها كقوله تعالى:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ وقول امرء القيس:

كأَنَّ قلوبَ الطير رَطْباً ويابِسا ...لَدَى وكرِها العنَّابُ والحشفُ البالى

بأن يشبه فى الاول: ذوات المنافقين بالمستوقدين، وإظهارهم الإيمان باستيقاد النار وما انتفعوا به من حقن الدماء وسلامة الاموال والاولاد وغير ذلك بإضاءة النار ما حول المستوقدين، وزوال ذلك عنهم على القرب بإهلاكهم وبإفشاء حالهم وإبقائهم فى الخسار الدائم، والعذاب السرمد بإطفاء نارهم والذهاب بنورهم.

وفى الثانى: أنفسهم بأصحاب الصيب وإيمانهم المخالط بالكفر والخداع بصيب فيه ظلمات ورعد وبرق، من حيث إنه وإن كان نافعًا فى نفسه لكنه لما وجد فى هذه الصورة عاد نفعه ضراً ونفاقهم حذراً عن نكايات المؤمنين، وما يطرقون به من سواهم من الكفرة بجعل الاصابع فى الآذان من الصواعق حذر الموت، من حيث إنه لا يرد من قدر الله تعالى شيئاً، ولا يخلص مما يريد بهم من المضار وتحيرهم لشدة الامر وجهلهم بما يأتون، ويذرون بأنهم كلما صادفوا من البرق خفقة انتهزوها فرصة مع خوف أن تخطف أبصارهم فخطوا خطىً يسيرة، ثم إذا خفى وفتر لَمَعانُهُ بقوا متقيدين لا حراك

بهم. وقيل: شبه الإيمان والقرآن وسائر ما أوتى الإنسان من المعارف التى هى سبب الحياة الابدية بالصَيِّب الذى به حياة الارض. وما ارتكبت بها من الشبه المبطلة، واعترضت دونها من الاعتراضات المشككة بالظلمات. وشبه ما فيها من الوعد والوعيد بالرعد، وما فيها من الآيات الباهرة بالبرق، وتصامهم عما يسمعون من الوعيد بحال من يهوله الرعد فيخاف صواعقه فيسد أذنيه عنها مع أنه لا خلاص لهم منها وهو معنى قوله تعالى: وَاللهُ مُحِيطٌ بِالْكافِرِينَ.

واهتزازهم لما يلمع لهم من رشد يدركونه، أو رفد تطمح إليه أبصارهم بمشيهم فى مطرح ضوء البرق كلما أضاء لهم، وتحيرهم وتوقفهم فى الامر حين تعرض لهم شبهة، أو تعن لهم مصيبة بتوقفهم إذا أظلم عليهم.

ونبه سبحانه بقوله: وَلَوْ شاءَ اللهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصارِهِمْ على أنه تعالى جعل لهم السمع والابصار ليتوسلوا بها إلى الهدى والفلاح، ثم إنهم صرفوها إلى الحظوظ العاجلة، وسدوها عن الفوائد الآجلة، وَلَوْ شَاءَ الله لَجَعَلَهُمْ بالحالة التى يجعلونها لأنفسهم، فإنه على ما يشاء قدير.

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں تشبیہات

مثلهم كمثل الذى استوقد نارًا

اور

كصيب من السماء... الخ

تمثیل مرکب کے قبیلہ سے ہیں اور تشبیہ مرکب ہوتی ہے جس سے متعدد امور سے اخذ کردہ مجموعہ کو اسی قسم کی متعدد اشیاء سے اخذ کردہ مجموعہ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے جس طرح،

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْراةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوها كمثل الحمار يحمل اسفارا

یہودی جن کو توراۃ کا مکلف بنایا گیا تو انہوں نے اس پر عمل کرنے سے انحراف کیا وہ اس گدھے کی طرح ہیں جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوتا ہے لیکن کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ یہاں پر یہود، تورات اور اس پر عمل نہ کرنا تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اور حمار اس پر کتابوں کا لادنا اور اس کا ان سے کوئی نفع نہ اٹھانا مشبہ بہ ہے، اس کو تمثیل اور تشبیہ مرکب کہتے ہیں۔

ان دونوں تمثیلات کا مقصد یہ ہے کہ منافقین کی حیرانگی، تردد اور شدت امر میں مبتلاء ہونے کی حالت کو اس آدمی کی

حالت کے ساتھ تشبیہ دی جائے جو آگ جلاتا ہے اور وہ اس کے ماحول کو روشن کر دیتی ہے پھر وہ اچانک بجھ جاتی ہے۔ اس اندھیرے اور ظلمت میں وہ جس پریشانی اور تکلیف میں مبتلاء ہوتا ہے۔ یہی حالت منافقین کی ہے اور دوسری تمثیل میں منافقین کو اس آدمی کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو تاریک اور اندھیری رات میں چل رہا ہے، اس میں اس کو سخت گھنے بادلوں نے آلیا ہو جن میں سخت قسم کی گرج، کڑک اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی چمک بھی ہو اور اسی کڑک کی وجہ اسے ہلاکت اور موت کا خوف بھی ہو، یہی حالت منافقین کی ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں تمثیلات مفرد تمثیل کے قبیلہ سے ہو اور مفرد تمثیل وہ ہوتی ہے جو کسی مفرد چیز کو مفرد کے ساتھ تشبیہ دی جائے مرکب چیزوں کے مجموع کو کسی دوسری چیز سے اخذ کردہ مجموعہ کے ساتھ تشبیہ نہ دی گئی ہو۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ:

وَما يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُماتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُور

کہ اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں ہوتے اور نہ ہی تاریکیاں اور نور برابر ہوتے ہیں اور نہ ہی سایہ اور دھوپ ایک جیسے ہوتے ہیں۔

یہاں کافر کو اعمیٰ کے ساتھ اور مومن بصیر کے ساتھ، کافر کو تاریکیوں کے ساتھ ایمان کو نور کے ساتھ اور ثواب کو سایہ کے ساتھ اور کافر پر عذاب کو دھوپ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اسی طرح امراء القیس جو کہ بہت بڑا فصیح وبلیغ شاعر تھا اس نے اپنے شعر میں تشبیہ دی ہے اس کا قول ملاحظہ ہو،

كَأَنَّ قلوبَ الطيرِ رَطْباً ويابِسا ... لَدَى وكرِها العنَّابُ والحشفُ البالى

گویا شاہین کے گھونسلے کے ارد گرد تازہ شکار کر دیا، پرندوں کے دل جو عناب کی طرح ہیں اور باسی دل جو خشک ردی کھجور کے مانند ہیں، بکھرے پڑے ہیں۔

آیت کریمہ میں پہلی تشبیہ منافقین کی ذاتوں کو آگ جلانے والوں کے ساتھ اور مخلوط ایمان کے اظہار کو آگ کے روشن کرنے کے ساتھ اور جو انہوں نے جانوں کی حفاظت اور اموال کی سلامتی اور ان کے علاوہ منافع حاصل کئے ہیں۔ ان کو آگ جلانے والوں کے ماحول کو روشن ہونے کے ساتھ اور قریب ہی ان کی آگ کے بجھ جانے کو ان کی ہلاکت کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور ان کے نفاق والی حالت کو ظاہر کرنے، ان کے دائمی خسارہ میں باقی رہنے کو اور ابدی عذاب میں مبتلاء ہونے کو آگ کے بجھنے اور نور کے سلب ہونے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

اور دوسری آیت یعنی او کصیبٍ من السماء... الخ میں منافقین کے نفوس، اصحاب صیّب اور ان کے کفر اور دھوکے کے ساتھ مخلوط ایمان کو ایسی بارش کے ساتھ تشبیہ دی گئی

ہے جس میں اندھیرے، گرج اور چمک ہو اس حیثیت سے کہ اگرچہ بارش بذات خود نفع کا باعث ہوتی ہے لیکن جب وہ اس صورت میں پائی جائے مذکور ہوئی۔ تو اس بارش کا نفع نقصان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور مومنین کی طرف سے انہیں دی جانے والی سزاؤں کے ڈر اور ان کے علاوہ انہیں جن تکالیف میں مبتلاء کیا گیا ہے اور ان کے مومنین کے خوف نفاق، موت کے ڈر کو بادلوں کی کڑک کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ حالانکہ ان کو ایسا کرنا اللہ کریم کی تقدیر میں سے کسی چیز کو بھی ٹال نہیں سکتا، اور اگر وہ انہیں نقصان پہنچانا چاہے تو ان کا یہ بزدلانہ عمل انہیں نہ بچا سکتا ہے اور اس شدت امر کی وجہ سے ان کا حیران ہونا اور ان کا ان کاموں کے انجام سے بے خبر ہونا، جن کو وہ کرتے ہیں۔ یا جس کو وہ چھوڑتے ہیں، کو تشبیہ دی گئی اس بات کے ساتھ کہ جب بجلی چمکتی ہے تو اس کو غنیمت تصور کرتے ہیں حالانکہ انہیں یہ بھی خدشہ ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں بجلی کی سخت چمک کی وجہ سے اچک لی جائیں گی۔ پس وہ چند ہی قدم چلتے ہیں اور جب بجلی کی چمک ختم ہوتی ہے تو وہ اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں جیسا کہ وہ مقید ہیں اور حرکت تک نہیں کرتے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ایمان، قرآن اور ان کے علاوہ جو بھی معارف انسان کو عطا کئے گئے ہیں جو حقیقت میں ابدی زندگی کے سبب ہیں، کو اس بارش کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کے ساتھ بنجر زمین میں زندگی حاصل ہوتی ہے اور ہدایت قبول کرنے کے راستہ میں جو انہیں باطل شبہات اور شک میں ڈالنے والے اعتراضات لاحق ہوتے ہیں، ان ظلمات کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور قرآنی آیات میں جو وعدے اور وعیدیں ہیں، ان کو رعد کے ساتھ اور جو اس میں واضح آیات ہیں، ان کو برق کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور ان کا دانستہ ان وعیدوں کو سننے سے بہرا ہونا، کو اس آدمی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کو بادل کی کڑک خوفزدہ کر دیتی ہے اور اسے بجلی کی وجہ سے ہلاکتوں کا خوف بھی ہوتا ہے اس وجہ سے وہ اپنے کان بند کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان ہلاکتوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی انہیں کوئی امید بھی نہیں ہوتی۔ اور اللہ کریم کے فرمان کا یہی معنی ہے۔

وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ.

اور اللہ کریم اپنے علم کے ساتھ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

اور جب ان کے لئے بجلی چمکتی ہے نفع اور عطیہ کے حصول میں وہ آگے بڑھتے ہیں اور للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہیں ان کی اس حالت کو اس آدمی کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بارش میں بجلی کے پڑنے کی جگہ میں چلنے لگتا ہے۔ اور جب انہیں دین کے معاملہ میں شبہات لاحق ہوتے ہیں یا انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے جس کی وجہ سے وہ حیران ہوتے ہیں اور توقف کرتے ہیں۔ اس کو اندھیرا چھانے کی وجہ سے ان کے توقف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

تنبیہ:

اللہ کریم نے اپنے اس ارشاد گرامی کے ساتھ اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے، کہ اس نے کان اور آنکھیں انہیں اس لئے عطا فرمائیں تھیں۔ کہ وہ انہیں فلاح اور ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے لیکن انہوں نے ان کو دنیاوی نعمتوں کے حصول کی

طرف پھیر دیا اور آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے حصول سے انہیں روک دیا اور اگر اللہ کریم چاہتا تو انہیں اس حالت میں کر دیتا جو انہوں نے خود اپنے لئے تیار کر لیں۔ کیونکہ اللہ کریم ہر اس چیز پر قادر ہے جسے وہ چاہتا ہے۔

کاد کی تحقیق:

(ک و د) کاد (س)

فعل مقارب ہے یعنی کسی فعل کے قریب الوقوع ہونے کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے مثلاً کاد یفعل قریب تھا وہ اس کام کو گزرتا یعنی کرنے والا تھا مگر کیا نہیں قرآن میں

"لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا" (سورۃ الإسراء آیت نمبر 74)

تو تم کسی قدر ان کی طرف مائل ہونے ہی لگے تھے۔

"وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 73)

اور وہ تو قریب تھا کہ تمہیں کچھ لغزش دیتے۔

"تَكَادُ السَّمٰوٰتُ" (سورۃ مریم آیت نمبر 90)

قریب ہے کہ (اس فتنہ) سے آسمان پھٹ پڑیں۔؛

"يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی۔

"يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ" (سورۃ الحج آیت نمبر 72)

قریب ہے کہ لپٹ پڑیں۔

"اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 56)

کہا خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دے۔

اور اگر ان کے ساتھ حرف نفی آجائے تو اثباتی حالت کے برعکس فعل وقوع کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے جو وقوع کے قریب نہ ہوا اور حروف نفی اس پر مقدم ہو یا متاخر دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 71)

اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔

"لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ" (سورۃ النساء آیت نمبر 78)

کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اور کاد کے بعد ان کا استعمال صرف ضرورت شعری کے لئے ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

قد کاد من طول البلی ان یمصحا

قریب تھا کہ زیادہ بوسیدگی کے باعث وہ مٹ جائے۔

خطف کی تحقیق:

(خ ط ف) خطف یخطف خطفا و اختطف اختطافا

کے معنی کسی چیز کو سرعت سے اچک لینا کے ہیں۔ یہ باب (س ض) دونوں سے آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ" (سورۃ صافات آیت نمبر 10)

مگر جو ایک آدھ بار اچک لے چلا۔

طا پر فتحہ اور کسرہ دونوں منقول ہیں اور اس سے مراد وہ شیاطین ہیں جو چوری چھپے ملاءِ اعلیٰ کی گفتگو سنا کرتے تھے۔

نیز فرمایا: "فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيْحُ" (سورۃ الحج آیت نمبر 31)

پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔

"يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

قریب ہے کہ بجلی (کی چمک) ان کی آنکھوں (کی بصارت) کو اچک لے جائے۔

"وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 67)

اور لوگ ان کے گرد نواح سے اچک لئے جاتے ہیں۔

یعنی ان کے گرد و نواح میں قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہے۔

(1) ابابیل کی قسم کا ایک پرندہ جو پرواز کرنے میں کسی چیز کو جھپٹ لیتا ہے۔

(2) آہن کج جس کے ذریعے کنوئیں سے ڈول نکالا جاتا ہے گویا وہ ڈول کو اچک کر باہر لے آتا ہے۔

(3) وہ لوہا جس پر کنوئیں کی چرخی گھومتی ہے۔ خطاطیف باز مخطف۔ باز جو اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ الخطیفہ تیز رفتاری۔ الخطف الحشا و مختطفتہ مرد باریک شکم جس کے دبلا پن کی وجہ سے ایسا معلوم ہو کہ اس کی انتڑیاں اچک لی گئی ہیں۔

تنبیہ:

لفظِ بصر کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

مفہوم ضوء:

(ض و ء) الضوء۔ (Light,Lamp)

کے معنی نور اور روشنی کے ہیں ضائت النار واضائت: آگ روشن ہوگئی اور اضائت (افعال) کے معنی روشن کرنا بھی آتے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں ہے: "فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 17)

جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کردیں۔

"كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

"يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ" (سورۃ القصص آیت نمبر 71) جو تم کو روشنی لادے۔

اور سماوی کتابوں کو جو انسان کی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہیں ضیاء سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ تورات سے متعلق فرمایا:

"وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)

"وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)

اور بیشک ہم نے موسیٰؑ اور ہارون کو فیصلہ دیا اور اجالا اور پرہیزگاروں کو نصیحت۔

مشی کا معنی:

(م ش ی) المشی (ج) (To walk,To move)

کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف قصد اور ارادہ کے ساتھ منتقل ہونے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:

"كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 20)

جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

"فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ" (سورۃ النور آیت نمبر 45)

ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔

"يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 63)

جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

"فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا" (سورۃ الملک آیت نمبر 15) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور کنایۃً مشی کا لفظ چغلی کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ" (سورۃ القلم آیت نمبر 11)

بہت طعنے دینے والا بہت اِدھر کی اُدھر لگاتا پھرنے والا۔

اور کنایۃ کے طور پر مشئی کے معنی مسہل پینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: شربت مشیا ومشوا میں نے مسہل دوائی الماشیۃ مویشی یعنی بھیڑ بکری کے ریوڑ کو کہتے ہیں اور امراۃ ماشیۃ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے بہت ہوں۔

نوٹ:

اذا، لو اور ظلم کی تفصیل گزر چکی ہے۔

شئی کی عمدہ تحقیق:

(ش ی ء) الشیئ

المشیئۃ اکثر متکلمین کے نزدیک مشیئت اور ارادہ ایک ہی صفت کے دو نام ہیں لیکن بعض کے نزدیک دونوں میں فرق ہے۔

(1) مشیئت کے اصل معنی کسی چیز کی ایجاد یا کسی چیز کو پا لینے کے ہیں۔ اگر چہ عرف میں مشیئت ارادہ کی جگہ استعمال ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے معنی اشیاء کو موجود کرنے کے ہیں اور لوگوں کی مشیئت کے معنی کسی چیز کو پا لینے کے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو چاہنا چونکہ اس کے وجود کو مقتضی ہوتا ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لم یکن کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے نہیں ہوتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کا ارادہ کرنا اس کے حتمی وجود کو نہیں چاہتا چنانچہ قرآن میں ہے:

"يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 185)

اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔

"وَمَا اللهُ يُرِيدُ ظُلْماً لِلْعِبَادِ " (سورۃ مؤمن آیت نمبر 40)

اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں چاہتا۔

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ لوگوں میں عسرۃ اور ظلم پائے جاتے ہیں۔

(2) اور ارادہ میں دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کا ارادہ تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر ہو سکتا ہے مثلاً انسان چاہتا ہے کہ اسے موت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو مار لیتا ہے۔ لیکن مشیئت انسانی مشیئت الٰہی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی جیسے فرمایا:

" وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ" (سورۃ الدھر آیت نمبر 30)

اور تم کیا چاہو مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

ایک روایت ہے کہ جب آیت: " لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ " (سورۃ التکویر آیت نمبر 28)

اس کے لئے جو تم میں سیدھا ہونا چاہے۔

نازل ہوئی تو کفار نے کہا ہے یہ معاملہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم چاہیں تو استقامت اختیار کریں اور چاہیں تو انکار کردیں اس پر آیت کریمہ۔

"وَما تَشاؤُنَ اِلَّا اَنْ يَشاءَ اللهُ"

نازل ہوئی۔ بعض نے کہا ہے کہ اگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال اس پر معلق اور منحصر نہ ہوتے تو لوگ تمام افعال انسانیہ میں انشاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہوسکتے تھے۔ قرآن میں ہے:

"سَتَجِدُنِي اِنْ شاءَ اللهُ مِنَ الصَّابِرِينَ" (سورۃ الصافات آیتن نمبر 102)

خدا نے چاہا تو قریب ہے کہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔

"قال سَتَجِدُنِي اِنْ شاءَ اللهُ صابِراً" (سورۃ الکهف آیت نمبر 69)

کہا عنقریب اللہ چاہے تو تم مجھے صابر پاؤ گے۔

"يَأْتِيكُمْ بِهِ اللهُ اِنْ شاءَ" (سورۃ ھود آیت نمبر 33)

اگر اس کو خدا چاہے گا تو نازل کرے گا۔

"اُدْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شاءَ اللهُ امنين" (سورۃ یوسف آیت نمبر 99)

مصر میں داخل ہو اللہ چاہے تو امان کے ساتھ،

"قُلْ لا اَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلا ضَرًّا اِلَّا ما شاءَ اللهُ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 188)

تم فرماؤ میں اپنی جان کے بھلے برے کا خودمختار نہیں مگر جو اللہ چاہے۔

"وما يَكُونُ لَنا اَنْ نَعُودَ فِيها اِلَّا اَنْ يَشاءَ اللهُ رَبُّنا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 89)

اور ہم مسلمانوں میں کسی کا کام نہیں کہ تمہارے دین میں آئے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

"وَلا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّي فاعِلٌ ذٰلِكَ غَداً اِلَّا اَنْ يَشاءَ اللهُ" (سورۃ الکهف آیت نمبر 24)

اور ہرگز کسی بات کو نہ کہنا کہ میں کل یہ کردوں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

تنبیہ:

سمع اور ذھب کا ذکر ہوچکا ہے۔

اِنّ اور اَنّ کی تحقیق:

(ان حرف) ان وان

(حرف) یہ دونوں اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ ان جملہ مستقل پر آتا ہے اور ان کا مابعد

ایسے مفرد کے حکم میں ہوتا ہے جو اسم مرفوع، منصوب اور مجرور کی جگہ پر واقع ہوتا ہے جیسے اعجبنی انک تخرج وعجبت انک تخرج اور تعجب من انک تخرج جب ان کے بعد ما (کافہ) آجائے تو یہ عمل نہیں کرتا اور کلمہ حصر کے معنی دیتا ہے۔

فرمایا:

"اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 28) مشرک نرے ناپاک ہیں۔

یعنی نجاست تامہ تو مشرکین کے ساتھ مختص ہے۔ نیز فرمایا:

"اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 173)

اس نے یہی تم پر حرام کئے ہیں مردار اور خون۔

یعنی مذکورہ اشیاء کے سوا اور کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا اس میں تنبیہ ہے کہ معلومات میں سے جو چیزیں اصول شریعت میں حرام ہیں ان میں سے یہ چیزیں سب سے بڑھ کر ہیں۔

(اَن) یہ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے:

(1) اَن مصدریہ۔

یہ ماضی اور مضارع دونوں پر داخل ہوتا ہے اور اس کا مابعد تاویل مصدر میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مضارع کو نصب دیتا ہے جیسے:

اعجبنی ان تخرج وان خرجت۔ ان المخففہ من المثقلۃ یعنی وہ ان جو ثقیلہ سے خفیفہ کر لیا گیا ہو (یہ کسی شے کی تحقیق اور ثبوت کے معنی دیتا ہے جیسے۔ اعجبنی ان زید منطلق ان (زائدہ) جو لما کی تاکید کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا،

"فَلَمَّا اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 96)

جب خوشخبری دینے والا آپہنچا۔

(2) اَن مفسرہ۔

یہ ہمیشہ اس فعل کے بعد آتا ہے جو قول کے معنیٰ پر مشتمل ہو، خواہ وہ لفظاً ہو یا معنیً جیسے فرمایا:

"وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ" (سورۃ ص آیت نمبر 6)

اور ان کے سردار چلے کہ اس کے پاس سے چل دو۔

ان امشوا اور ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو،

یہاں ان امشوا، قالوا کے معنی کو متضمن ہے ان کی طرح یہ بھی چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ ان شرطیہ جیسے فرمایا:

"اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 118)

اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔

ان مخففہ جو ان ثقیلہ سے مخفف ہوتا ہے (یہ تاکید کے معنی دیتا ہے اور) اس کے بعد لام (مفتوح) کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا:

"اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 42)
(تو) یہ ضرور ہم کو بہکا دیتا ہے۔

(3) ان نافیہ

اس کے بعد اکثر الا آتا ہے جیسے فرمایا: "اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا" (سورۃ الجاثیۃ 32)
ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔
"اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ" (سورۃ المدثر آیت نمبر 25)
یہ نہیں مگر آدمی کا کلام۔
"اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ" (سورۃ ہود آیت نمبر 54)
ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا (کر دیوانہ کر) دیا ہے۔ ان (زائدہ) جو (ما) نافیہ کی تاکید کے لئے آتا ہے جیسے: ما ان یخرج زید۔ زید باہر نہیں نکلے گا۔

شئی کی بعض کے نزدیک تعریف:

(ش ی ء) الشئی
بعض کے نزدیک شی وہ ہوتی ہے جس کا علم ہو سکے اور اس کے متعلق خبر دی جا سکے اور اکثر متکلمین کے نزدیک یہ اسم مشترکہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ماسوا پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور موجودات اور معدوم سب کو شے کہہ دیتے ہیں۔

قدیر کسے کہتے ہیں؟:

القدیر (Power full)
اسے کہتے ہیں جو اقتضائے حکمت کے مطابق جو چاہے کر سکے اور اس میں کمی بیشی نہ ہونے دے۔ لہٰذا اللہ کے سوا کسی کو قدیر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن میں ہے:

اور وہ جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر قادر ہے۔
اور یہی معنی تقریبا مقتدر کے ہیں جیسے فرمایا:
"عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ" (سورۃ القمر آیت نمبر 55)

ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔

"فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُقْتَدِرُوْنَ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 42) ہم ان پر قابو رکھتے ہیں۔

لیکن مقتدر کے ساتھ کبھی انسان بھی متصف ہو جاتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق مقتدر کا لفظ استعمال ہو تو یہ قدیر کے ہم معنی ہوتا ہے اور جب انسان کا وصف واقع ہو تو اس کے معنی تکلیف سے قدرت حاصل کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے:

قدرت علی کذا قدرة کہ میں نے فلاں چیز پر قدرت حاصل کر لی۔

قرآن مجید میں ہے: (اسی طرح یہ ریا کار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ نہیں لے سکیں گے۔

[سورة البقرة (2) : آية 21]

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (21)

"اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے"۔

متن:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ

لما عدد فرق المكلفين وذكر خواصهم ومصارف أمورهم، أقبل عليهم بالخطاب على سبيل الالتفات هزّاً للسامع وتنشيطاً له واهتماماً بأمر العبادة، وتفخيماً لشأنها، وجبراً لكلفة العبادة بلذة المخاطبة. و (يا) حرف وضع لنداء البعيد، وقد ينادى به القريب تنزيلاً له منزلة البعيد. إما لعظمته كقول الداعى: يا رب، ويا الله، هو أقرب إليه من حبل الوريد. أو لغفلته وسوء فهمه. أو للاعتناء بالمدعو له وزيادة الحث عليه. وهو مع المنادى جملة مفيدة، لأنه نائب مناب فعل. وأى: جعل وصلة إلى نداء المعرف باللام، فإن إدخال »يا« عليه متعذر لتعذر الجمع بين حرفى التعريف فإنهما كمثلين وأعطى حكم المنادى وأجرى عليه المقصود بالنداء وصفاً موضحاً له، والتزام رفعه إشعاراً بأنه المقصود، وأقحمت بينهما هاء التنبيه تأكيداً وتعويضاً عما يستحقه، أى من المضاف إليه، وإنما كثر النداء على هذه الطريقة فى القرآن لاستقلاله بأوجه من التأكيد، وكل ما نادى الله له عباده من حيث إنها أمور عظام، من حقها أن يتفطنوا إليها، ويقبلوا بقلوبهم عليها، وأكثرهم عنها غافلون، حقيق بأن ينادى له بالآكد

الابلغ والجموع وأسماؤها المحلاة باللام للعموم حيث لا عهد ويدل عليه صحة الاستثناء منها. أو التأكيد بما يفيد العموم كقوله تعالى:

فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ

واستدلال الصحابة بعمومها شائعًا وذائعاً. فالناس يعم الموجودين وقت النزول لفظاً ومن سيوجد، لما تواتر من دينه عليه الصلاة والسلام أن مقتضى خطابه وأحكامه شامل للقبيلين، ثابت إلى قيام الساعة إلا ما خصه الدليل.

ترجمہ:

اللہ کریم نے ماقبل آیات میں ان فرقوں کا ذکر کیا جن کو احکام کا مکلف بنایا جاتا ہے، اور ان کی خصوصیات اور امور کا ذکر کیا تو بطور التفات اس آیت میں ان کی طرف خطاب کے صیغوں کے ساتھ توجہ فرمائی تاکہ سننے والے کو تنبیہ اور خوشی دی جائے اور عبادت کی اہمیت کو ظاہر کیا جائے اور اس کی عظمت شان کو بیان کیا جائے۔ اور بوجہ عبادت مشقت کو لذت خطاب کے ساتھ مکمل کرنے کے لئے یایھا الناس سے خطاب فرمایا۔

یا حرف نداء منادیٰ بعید کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اور کبھی منادیٰ قریب کو منادیٰ بعید کی جگہ رکھ کر اس کے ساتھ بھی اسے نداء کی جاتی ہے۔ منادیٰ قریب کو منادیٰ بعید کی جگہ رکھنے کی مندرجہ ذیل چند وجوہات ہیں۔

☆ اس کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے جیسا کہ دعا کے موقع پر کہا جاتا ہے، یارب، یااللہ جبکہ اللہ کریم دعا کرنے والے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

☆ منادیٰ کے سوءِ فہم اور غفلت کی وجہ سے۔

☆ مدعولہ (جس کی طرف نداء کی جاتی ہے) کی اہمیت ظاہر کرنے اور کام کرنے پر ابھارنے کے لئے اسے بعید کے قائمقام رکھا جاتا ہے۔

جب حرف نداء اپنے منادیٰ کے ساتھ ملتا ہے تو جملہ مفیدہ ہوتا ہے۔ بوجہ فعل کے قائم مقام ہونے کے، جو ادعوا ہے۔ منادیٰ اس فعل محذوف کا مفعول بہ ہوتا ہے جیسے یازید بمعنیٰ ادعو زیداً ہے۔ اور ای کے لفظ کو منادیٰ معرف باللام کے نداء کرنے کا وسیلہ بنایا جاتا ہے، کیونکہ منادیٰ معرف باللام بغیر کسی فاصلہ کے حرف نداء پر داخل کرنا متعذر ہوتا ہے کیونکہ اگر حرف نداء اور منادیٰ معرف باللام کے درمیان فاصلہ نہ ہو تو دو اداۃ تعریف جمع ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی مقصد کے لئے دو ادات تعریف جمع کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس طرح تحصیل حاصل لازم آتا ہے، جو کہ ناجائز ہے۔ اور لفظ ای کو منادیٰ کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور مقصود بالنداء کو اسی پر محمول کیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ شعور دلایا جائے کہ گویا مقصود بالنداء یہی ہے۔ اور منادیٰ معرف باللام کو بحیثیت صفت موضحہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور لفظ ای کو رفع دیا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ حقیقت میں مقصود بالنداء یہی

ہے۔ اور حرف نداء او منادیٰ کے درمیان ھاء کا لفظ بطور تنبیہ تاکید کے لئے لایا جاتا ہے۔ اور ای کا لفظ چونکہ مضاف الیہ کا مستحق ہوتا ہے یہ حرف تنبیہ اس کا عوض ہو جائے۔ اور ہر وہ حکم جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اللہ کریم اپنے بندوں کو نداء کرتا ہے۔ قرآن میں اکثر یہی انداز اختیار کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ امور جو بہت ہی عظیم ہوتے ہیں ان کا حق یہ ہوتا ہے، ہ انہیں سمجھا جائے اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف متوجہ کیا جائے۔ حالانکہ اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں اس لئے یہ چیز اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اس کو اسی طرح بلیغ اور مؤکد انداز کے ساتھ ندا کی جائے۔

متن:

وما روى عن علقمة والحسن أن كل شيء نزل فيه يَا أَيُّهَا النَّاسُ فمكي وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا فمدني، إن صح رفعه فلا يوجب تخصيصه بالكفار، ولا أمرهم بالعبادة، فإن المأمور به هو القدر المشترك بين بدء العبادة، والزيادة فيها، والمواظبة عليها، فالمطلوب من الكفار هو الشروع فيها بعد الإتيان بما يجب تقديمه من المعرفة والإقرار بالصانع، فإن من لوازم وجوب الشيء وجوب ما لا يتم إلا به، وكما أن الحدث لا يمنع وجوب الصلاة، فالكفر لا يمنع وجوب العبادة، بل يجب رفعه والاشتغال بها عقيبه. ومن المؤمنين ازديادهم وثباتهم عليها وإنما قال: رَبَّكُمُ تنبيهاً على أن الموجب للعبادة هي الربوبية.

ترجمہ:

اور حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن بُصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جو روایت کی گیا کہ قرآن مجید ہر وہ آیت جس میں یا یھا الناس کے ساتھ خطاب کیا گیا، وہ سورۃ مکی ہے۔ اور جس میں یا ایھا لذین اٰمنوا کے ساتھ خطاب ہے، وہ مدنی ہے۔ تو پھر یہ حکم بعد میں آنے والوں کو کیسے شامل ہوگا؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اگر اس روایت کا مرفوع ہونا بھی ثابت ہو جائے تو یہ اس حکم کو کفار کے ساتھ خاص کرنے کا موجب نہیں بنتا اور نہ ہی عبادت کے حکم کی تخصیص کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ جس حکم پر عمل پیرا ہونے کا حکم فرمایا ہے وہ قدر مشترک ہے۔ جو عبادت کے ابتداء کرنے، اس میں اضافہ کرنے اور اس پر ہیشگی کرنے کو شامل ہے۔ تو جب کفّار کو یہ خطاب ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان چیزوں کو تسلیم کریں جن کا عبادت کرنے سے پہلے اپنانا لازم ہے۔ یعنی وہ پہلے ایمان لائیں، اس کے بعد عبادت کو اپنائیں کیونکہ کسی چیز کے وجوب کے لوازمات سے ہے کہ جس کے بغیر وہ چیز مکمل نہ ہو تو وہ بھی واجب ہوتی ہے۔ جس طرح حدث کا لاحق ہونا وجوب صلوٰۃ کے منافی نہیں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ کفر عبادت کے وجوب کے مانع نہیں، بلکہ پہلے کفر کو دور کیا جائے۔ اور اس کے بعد عبادت میں مشغول ہوا جائے، تو اس اعتبار سے مومنین سے یہ مطلوب ہوگا کہ وہ اپنی عبادت میں اضافہ کریں اور وہ اس بات پر ڈٹے رہیں۔

یہاں اللہ کریم نے ربکم کا لفظ ذکر کیا ہے یہ اس بار پر متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ تربیت، عبادت کے واجب ہونے کی علت ہے۔

متن:

الَّذِی خَلَقَكُمْ

صفة جَرَتْ عليه تعالى للتعظيم والتعليل، ويحتمل التقييد والتوضيح إن خص الخطاب بالمشركين، وأريد بالرَّب أعم من الرب الحقيقي، والآلهة التي يسمونها أرباباً. والخلق إيجاد الشيء على تقدير واستواء، وأصله التقدير يقال: خلق النعل إذا قدرها وسواها بالمقياس.

وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ متناول كل ما يتقدم الإنسان بالذات أو بالزمان. منصوب معطوف على الضمير المنصوب فى خَلَقَكُمْ. والجملة أُخْرِجَتْ مُخْرَجَ المقرر عندهم، إما لاعترافهم به كما قال الله تعالى:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللهُ

أو لتمكنهم من العلم به بأدنى نظر! وقرء مِن قَبْلِكُمْ على إقحام الموصول الثانى بين الاول وصلته تأكيداً، كما أقحم جرير فى قوله:

يا تيم تيمَ عُدَيٍّ لا أبالَكُمُو تيماً، الثانى بين الاول وما أضيف إليه.

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ حال من الضمير فى اعْبُدُوا كأنه قال: اعبدوا ربكم راجين أن تنخرطوا فى سلك المتقين الفائزين بالهدى والفلاح، المستوجبين جوار الله تعالى. نبه به على أن التقوى منتهى درجات السالكين وهو التبرى من كل شيء سوى الله تعالى إلى الله. وأن العابد ينبغي أن لا يغتر بعبادته، ويكون ذا خوف ورجاء قال تعالى:

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَطَمَعًا يَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ.

أو من مفعول خَلَقَكُمْ والمعطوف عليه على معنى أنه خلقكم ومن قبلكم فى صورة من يرجى منه التقوى لترجح أمره باجتماع أسبابه، وكثرة الدواعى إليه. وغلب المخاطبين على الغائبين فى اللفظ، والمعنى على إرادتهم جميعاً. وقيل تعليل للخلق أى خلقكم

لكي تتقوا كما قال: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. وهو ضعيف إذ لم يثبت في اللغة مثله.

والآية تدل على أن الطريق إلى معرفة الله تعالى والعلم بوحدانيته واستحقاقه للعبادة النظر في صنعه والاستدلال بأفعاله. وأن العبد لا يستحق بعبادته عليه ثواباً. فإنها لما وجبت عليه شكراً لما عدده عليه من النعم السابقة فهو كأجير أخذ الاجر قبل العمل.

ترجمہ:

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ..... الخ

یہ صفت مادحہ ہے، ربکم کی۔ اور اس کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم کی عظمت اور عبادت کے حکم کی علت کو بیان کیا جائے۔ اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ربکم کی صفت مقید یا صفت موضحہ ہو، بشرطیکہ خطاب مشرکین کے ساتھ خاص ہو۔ اور رب سے اعم معنیٰ مراد لیا جائے اور لفظ رب سے حقیقی رب مراد نہ ہو کیونکہ مشرک بھی اپنے باطل معبودوں کو بھی رب کہا کرتے تھے۔ اس لئے اَلَّذِی خلقکم کی صفت نے ربکم کو رب حقیقی کے ساتھ خاص کر دیا۔

خَلَقَ یہ خَلق سے مشتق ہے جس کا مطلب کسی چیز کو اندازہ کے مطابق صحیح اور برابر وجود عطا کرنا، خلق کا لغوی معنیٰ اندازہ لگانا ہے۔ اور جب کوئی آدمی جوتا اندازے سے بنائے اور اس کے بعد اس کو فریم میں رکھ کر درست کر دے تو کہتے ہیں کہ خلق النعل، اس نے جوتا اندازے کے ساتھ برابر بنا دیا۔

اس کے بعد فرمایا: **والذین من قبلکم**

کہ اس نے ان کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

آیت کریمہ کا یہ حصہ ان تمام اشیاء کو شامل ہے جو ذات اور زمانہ کے اعتبار سے ارواح اور مزاج مقدم ہیں اور زمانہ کے اعتبار سے آسمان، آباء، امہات اور زمین وغیرہ مقدم ہیں۔ اور

والذین من قبلکم خلقکم

کی ضمیر منصوب متصل پر معطوف کرنے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس جملہ کا ذکر کرنا اس اعتبار سے ہے کہ مشرکین خود اعتراف کرتے ہیں کہ آسمان و زمین ان کا خالق حقیقی اللہ کریم ہی ہے۔

فرمایا: **ولئن سالتھم من خلقھم لیقولن اللہ** (سورۃ الزخرف آیت نمبر 87)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔

یا اس اعتبار سے ذکر کیا کہ وہ تھوڑا سا غور و فکر کرنے سے، اس کا علم و عمل حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اور اس کو

الذی من قبلکم کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ دریں صورت اسم موصول مقحم ہوگا۔ جو پہلے اسم موصول اور اس کے صلہ کے درمیان تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کی جریر نے اپنے شعر میں تیم کا لفظ مقحم کر دیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

یا تیم تیمَ عُدَيٍّ لا أبا لَكمُو تیماً. الثانی بین الاول وما أضيف إليه

دوسرا تیم پہلے تیم اور اس کے مضاف الیہ کے درمیان مقحم ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ...

یہ حال ہے، اعبدوا کی ضمیر مرفوع متصل سے، جو فاعل ہے۔ گویا اللہ کریم نے یوں ارشاد فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ اس حال میں کہ تمہیں یہ امید ہو کہ وہ تمہیں ہدایت اور فلاح کے ساتھ کامیاب ہونے والے متقین میں شامل کر دے۔ وہ متقین جو اللہ کریم کے حریم قدس کے مستحق ہیں اور اس آیت کے ساتھ اللہ کریم نے متنبہ کیا ہے کہ سالکین کے درجات کی انتہاء تقویٰ ہے اور یہ وہ درجہ ہے کہ وہ اللہ کریم کے علاوہ ہر چیز سے براءت کرتے ہوئے اسی کی جناب میں پناہ حاصل کریں۔ اور یہ اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ عابد کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنی عبادت پر نازاں نہ ہو جائے اور خوف ورجا کی کیفیت کو اپنائے جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ وہ خوف اور لالچ سے اپنے رب کی بارگاہ میں التجاء کرتے ہیں۔ اس حال میں کہ وہ اپنے رب کریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے۔ اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اور یا یہ خلقکم کے مفعول اور جس کا اس پر عطف ہے اس سے حال ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو ایسی ذات کی صورت میں پیدا فرمایا ہے۔ جس سے تقویٰ کی امید کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ تقویٰ کے اسباب جمع ہونے کی وجہ سے اور اس کی طرف دعوت دینے والوں کی کثرت کی وجہ سے اس کا معاملہ راجح ہے۔ اور یہاں لفظ اور معنیٰ کے اعتبار سے مخاطبین کو غائبین پر غلبہ دیا گیا ہے۔ اس ارادہ سے کہ یہ خطاب سب کو شامل ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ لعلکم تتقون یہ خلقکم فعل کی علت بیان کر رہا ہے۔ جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں بیان کیا گیا ہے، سورۃ الذاریات آیت نمبر 56 میں ہے،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۃ الذاریات آیت نمبر 56)

اور میں نے جن اور آدمی اتنے ہی اسی لئے بنائے کہ میری بندگی کریں۔

لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ لغت میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں اور یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ کریم کی معرفت اور وحدانیت کے علم کا اور اس کے عبادت کے مستحق ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی صنعت میں غور وفکر کیا جائے اور اس کے افعال سے دلیل قائم کی جائے۔ مزید اس بات کی دلالت بھی واضح ہے کہ بندہ اپنی عبادت کی وجہ سے کسی قسم کے ثواب کا مستحق نہیں۔ کیونکہ اللہ کریم نے عبادت کرنے سے پہلے جو نعمتیں عطا کیں اس کا شکر ادا کرنا اس پر واجب ہے تو گویا اس کی حیثیت اس مزدور جیسی ہے جس نے قبل از مزدوری اجرت وصول کر لی ہو۔ بلکہ یہ تو صرف اور صرف اللہ کا فضل ہے کہ وہ اپنے

بندوں کو بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے۔

خلق کا معنیٰ:

(خ ل ق) الخلق (People,Mankind)

اصل میں خلق کے معنی کسی چیز کو بنانے کے لئے پوری طرح اندازہ لگانا کے ہیں۔ اور کبھی خلق بمعنی ابداع بھی آجاتا ہے یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے اور بغیر کسی کی تقلید کے پیدا کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

"خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر ۱)

اسی نے آسمانوں اور زمین کو مبنی بر حکمت پیدا کیا۔

اس میں خلق بمعنی ابداع ہی ہے

تحقیقِ لعل:

(لعل) لعل

(حرف) یہ طمع اور اشفاق (ڈرتے ہوئے چاہنے) کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ اپنے لئے استعمال کرے تو اس کے معنی میں قطیعت آجاتی ہے اس بنا پر بہت سی آیات میں لفظ کی سے اس کی تفسیر کی گئی ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ کے حق میں توقع اور اندیشے کے معنی صحیح نہیں ہیں۔ اور گو لعل کے معنی توقع اور امید کے ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا تعلق مخاطب سے ہوتا ہے اور کبھی متکلم سے اور کبھی ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص سے ہوتا ہے۔

لہٰذا آیت کریمہ:

"لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 40)

تاکہ ہم ان جادوگروں کے پیرو ہو جائیں۔ میں توقع کا تعلق قوم فرعون سے ہے۔

التقوی اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے اور اصطلاح شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقوی ہے جو گناہوں کا موجب ہو۔ اور یہ بات محظورات شرعیہ کے ترک کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے مگر اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لئے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

الحلال بین واحرام بین ومن وقع حول الحمی فحقیق ان یقع فیه "

کہ حلال بھی بین ہے اور حرام بھی بین ہے اور جو شخص چراگاہ کے اردگرد چرائے گا تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس میں داخل

ہوجائے (یعنی مشتبہ چیزیں اگر چہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں لیکن ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی چھوڑ دیا جائے) قرآن پاک میں ہے:

"فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 35)

تو جو پرہیزگاری کرے اور سنورے تو اس پر نہ کچھ خوف اور نہ کچھ غم۔

"اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا" (سورۃ النحل آیت نمبر 128)

کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہیں اللہ ان کا مددگار ہے۔

"وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 73)

اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کو گروہ بنا کر بہشت کی طرف لے جائیں گے۔

پھر تقویٰ کے چونکہ بہت سے مدارج ہیں اس لئے آیات،

"وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 281)

اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم خدا کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے۔

"وَاتَّقُوْا رَبَّكُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 1)

اپنے پروردگار سے ڈرو۔

اور اس خدا سے ڈرو جس کے نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو۔

"اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 102)

اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔

میں ہر جگہ تقویٰ کا ایک خاص معنی مراد ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے اور بعد بیان ہوگی۔ اتقی فلان بکذا کے معنی کسی چیز کے ذریعہ بچاؤ حاصل کرنے کے ہیں۔ اور آیت:

"اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 24)

بھلا جو شخص قیامت کے دن اپنے منہ سے برے عذاب کو روکتا ہوا۔

میں اس عذاب شدید پر تنبیہ کی ہے جو قیامت کے دن ان پر نازل ہوگا اور یہ کہ سب سے بڑی چیز جس کے ذریعہ وہ و عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے وہ ان کے چہرے ہی ہوں گے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا:

"وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ" (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 50)

اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔

"يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ" (سورۃ القمر آیت نمبر 48)

اس روز منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے۔

نوٹ: مندرجہ بالا آیت کریمہ میں مذکور خلق، عبادت، عبودیت ناس اور لفظِ رب کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 22]

الَّذِی جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِراشاً وَالسَّماءَ بِناءً وَاَنْزَلَ مِنَ السَّماءِ مَاء فَاَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَراتِ رِزْقاً لَكُمْ فَلا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْداداً وَاَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (22)

”جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا، تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ“۔

متن:

الَّذِی جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِراشاً

صفة ثانية، أو مدح منصوب، أو مرفوع، أو مبتدأ خبره فلا تجعلوا وجعل من الافعال العامة يجيء على ثلاثة أوجه: بمعنى صار، وطفق فلا يتعدى كقوله:

فَقَدْ جعلتْ قلوصُ بني سُهَيل ... مِنَ الأكوارِ مرتعُها قريبُ

وبمعنى أوجد فيتعدّى إلى مفعول واحد كقوله تعالى: وَجَعَلَ الظُّلُماتِ وَالنُّورَ وبمعنى صير، ويتعدى إلى مفعولين كقوله تعالى: جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِراشاً والتصيير يكون بالفعل تارة، وبالقول أو العقد أخرى.

ومعنى جعلها فراشاً أن جعل بعض جوانبها بارزاً ظاهراً عن الماء، مع ما في طبعه من الإحاطة بها، وصيرها متوسطة بين الصلاة واللطافة حتى صارت مهيأة لأن يقعدوا وينامو عليها كالفراش المبسوط. وذلك لا يستدعي كونها مسطحة. لأن كرية شكلها مع عظم حجمها. واتساع جرمها لا تأبي الافتراش عليها.

وَالسَّماءَ بِناءً قبة مضروبة عليكم. والسماء اسم جنس يقع على الواحد والمتعدد كالدينار والدرهم. وقيل: جمع سماءة. والبناء مصدر، سمي به المبني بيتاً كان أو قبة أو خباء، ومنه بنى على امرأته، لأنهم كانوا إذا تزوجوا ضربوا عليها خباءً جديداً.

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّماءِ مَاء فَاَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَراتِ رِزْقاً لَكُمْ

عطف على (جعل)، وخروج الثمار بقدرة الله تعالى ومشيئته. ولكن جعل الماء

الممزوج بالتراب سبباً فى إخراجها ومادة لها كالنطفة للحيوان، بأن أجرى عادته بإفاضة صورها و كيفياتها على المادة الممتزجة منهما. أو أودع فى الماء قوة فاعلة وفى الارض قوة قابلة يتولد من اجتماعهما أنواع الثمار. وهو قادر على أن يوجد الاشياء كلها بلا أسباب ومواد كما أبدع نفوس الاسباب والمواد. ولكن له فى إنشائها مدرجاً من حال إلى حال، صنائع وحكم يجدد فيها لأُولى الابصار عبراً. وسكوناً إلى عظيم قدرته ليس فى إيجادها دفعة. ومِنَ الاولى للابتداء سواء أريد بالسماء السحاب فإن ما علاك سماء، أو الفلك فإن المطر يبتدء من السماء إلى السحاب ومنه إلى الارض على ما دلت عليه الظواهر. أو من أسباب سماوية تثير الاجزاء الرطبة من أعماق الارض إلى جو الهواء فتنعقد سحاباً ماطراً. ومِنَ الثانية للتبعيض بدليل قوله تعالى: فَاَخْرَجْنا بِهِ ثَمَراتٍ واكتناف المنكرين له أعنى ماء ورزقاً كأنه قال: وأنزلنا من السماء بعض الماء فأخرجنا به بعض الثمرات ليكون بعض رزقكم، وهكذا الواقع إذ لم ينزل من السماء الماء كله، ولا أخرج بالمطر كل الثمرات، ولا جعل كل المرزوق ثماراً. أو للتبيين، ورزقاً مفعول بمعنى المرزوق كقولك أنفقت من الدراهم ألفاً. وإنما ساغ الثمرات والموضع موضع الكثرة، لأنه أراد بالثمرات جماعة الثمرة التى فى قولك أدركت ثمرة بستانه. ويؤيده قراءة من قرأ: »من الثمرة« على التوحيد.

أو لأن الجموع يتعاور بعضها موقع بعض كقوله تعالى: كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وقوله: ثَلاثَةَقُرُوءٍ. أو لأنها لما كانت محلاة باللامِ خرجت عن حد القلة. ولَكُمْ صفة رزقاً إن أريد به المرزوق ومفعوله إن أريد به المصدر كأنه قال: رزقاً إياكم.

فَلا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْداداً متعلق باعبدوا على أنه نهى معطوف عليه. أو نفى منصوب بإضمار أن جواب له. أو بلعل على أن نصب تجعلوا نصب فاطلع فى قوله تعالى: لَعَلِّیٓ اَبْلُغُ الْاَسْبابَ اَسْبابَ السَّماواتِ فَاَطَّلِعَ إلحاقاً لها بالاشياء الستة لاشتراكها فى أنها غير موجبة. والمعنى: إن تتقوا لا تجعلوا لله أنداداً. أو بالذى جعل، إن استأنفت به على أنه نهى وقع خبراً على تأويل مقول فيه: لا تجعلوا. والفاء للسنبية أدخلت عليه لتضمن المبتدأ معنى الشرط والمعنى: أن من خصكم بهذه النعم الجسام والآيات العظام ينبغى أن لا يُشْرَكَ به. والند: المثل المناوء. قال جرير:

أتيماً تجعلونَ إلىَّ ندًّا ... وما تيمٌ لِذى حَسَبٍ نَدِيدُ

من ند يند ندوداً: إذا نفر، وناددت الرَّجُلَ خالفته، خص بالمخالف المماثل فى الذات كما خص المساوى بالمماثل فى القدر، وتسمية ما يعبده المشركون من دون الله (أنداداً)، وما زعموا أنها تساويه فى ذاته وصفاته وَلاَ أنها تخالفه فى أفعاله لأنهم لما تركوا عبادته إلى عبادتها، وسموها آلهة شابهت حالهم حال من يعتقد أنها ذوات واجبة بالذات، قادرة على أن تدفع عنهم بأس الله، وتمنحهم ما لم يرد الله بهم من خير، فتهكم بهم وشنع عليهم بأن جعلوا أنداداً لمن يمتنع أن يكون له ند. ولهٰذَا قال موحد الجاهلية زيد بن عمرو بن نفيل:

أرَبّاً واحِداً أمْ ألفَ رَب ... أدِينُ إذا تقسَّمتِ الامورُ

تركتُ اللاتَ والعزَّى جميعًا ... كذلكَ يَفْعَلُ الرجُلُ البصِيرُ

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ حال من ضمير فلا تجعلوا، ومفعول تعلمون مطروح، أى: وحالكم أنكم من أهل العلم والنظر وإصابة الرأى، فلو تأملتم أدنى تأمل اضطر عقلكم إلى إثبات موجد للممكنات منفرد بوجوب الذات، متعال عن مشابهة المخلوقات. أو منوى وهو أنها لا تماثله ولا تقدر على مثل ما يفعله كقوله سبحانه وتعالى: هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِنْ شَيْءٍ وعلى هٰذَا فالمقصود منه التوبيخ والتثريب، لا تقييد الحكم وقصره عليه، فإن العالم والجاهل المتمكن من العلم سواء فى التكليف.

واعلم إن مضمون الآيتين هو الامر بعبادة الله سبحانه وتعالى، والنهى عن الإشراك به تعالى، والإشارة إلى ما هو العلة والمقتضى. وبيانه أنه رتب الامر بالعبادة على صفة الربوبية إشعاراً بأنها العلة لوجوبها، ثم بين ربوبيته بأنه تعالى خالقهم وخالق أصولهم وما يحتاجون إليه فى معاشهم من المقلة والمظلة والمطاعم والملابس، فإن الثمرة أعم من المطعوم، والرزق أعم من المأكول والمشروب. ثم لما كانت هذه الامور التى لا يقدر عليها غيره شاهدة على وحدانيته تعالى، رتّب تعالى عليها النهى عن الإشراك به، ولعله سبحانه أراد من الآية الاخيرة مع ما دل عليه الظاهر وسيق فيه الكلام، الإشارة إلى تفصيل خلق الإنسان وما أفاض عليه من المعانى

والصفات على طريقة التمثيل، فمثل البدن بالارض، والنفس بالسماء، والعقل بالماء، وما أفاض عليه من الفضائل العملية والنظرية المحصلة بواسطة استعمال العقل للحواس، وازدواج القوى النفسانية والبدنية، بالثمرات المتولدة من ازدواج القوى السماوية الفاعلة والارضية المنفعلة بقدرة الفاعل المختار. فإن لكل آية ظهراً وبطناً ولكل حد مطلعًا.

ترجمہ:

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرٰشًا

آیت کا یہ حصہ ربکم کی دوسری صفت ہے، یہ محل نصب میں ہے۔ اور یہ منصوب علی المدح ہے اور اس سے پہلے امدح محذوف ہے۔ یا یہ محل رفع میں ہے اور مرفوع علی المدح ہے، یا یہ مبتداء ہے۔ اس کی خبر لا تجعلوا للہ انداداً ہے۔ اور اس سے پہلے فاء جزائیہ ہے کیونکہ جب مبتداء اسم موصول ہو تو اس میں شرط کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے خبر سے پہلے فاء ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اور جعل افعال عامہ میں سے ہے۔ اور یہ تین معانی میں مستعمل ہے،

1۔ صار اور طفق کے معنیٰ میں اس صورت میں یہ متعدی نہیں ہوتا بلکہ یہ افعال شروع سے ہوتا ہے اور اپنے اسم خبر سے مل کر مکمل جملہ بن جاتا ہے۔ قول شاعر ملاحظہ ہو:

فَقَدْ جعلتُ قلوصَ بنی سُهَيل ... مِنْ الاَكوارِ مرتعُها قَريبُ

اونٹوں کا گلہ جو کہ بنی سہیل کا تھا اپنی چراگاہ میں چرنے لگا۔

یہاں جعلت، بمعنی اخذت اور طفقت ہے۔

2۔ اور کبھی کبھار اوجد کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس وقت یہ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے۔ اور یہ افعال قلوب میں سے بھی نہیں ہوتا، جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان ہے،

"وجعل الظلمات والنور"

3۔ اور یہ صیّر کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اس وقت یہ افعال تصییر میں سے ہوتا ہے۔ اور دو مفعولوں کو نصب دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد ہے،

جعل لکم الارض فراشا

اور تصییر تین قسموں کی ہوتی ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں،

بالقول، تصییر بالفعل اور تصییر بالاعتقاد

☆ بالقول

جیسا کہ کوئی کہے، جعلت زیداً امیراً۔ میں نے زید کو امیر بنا دیا۔

☆تصییر بالفعل

جیسا کہ کوئی کہے، جعلت الثوب قمیصاً۔ میں نے کپڑے کو قمیص بنا دیا۔

☆تصییر بالاعتقاد

اور کبھی تصییر بالاعتقاد بھی ہوتی ہے جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان،

وجعلو الملئکة الذین هم عباد الرحمان إناثًا.

کہ مشرکین نے ان ملائکہ کو جو رحمان کے بندے ہیں ان کو مؤنث اعتقاد کیا۔

اور زمین کو فرش بنانے کا معنی یہ ہوگا کہ زمین کا کچھ حصہ پانی سے ظاہر کر دیا اور اس کو نرمی اور سختی کی درمیانی کیفیت عطا کر دی اور اسے اس قابل بنا دیا کہ انسان اس پر بیٹھ سکیں اور سو سکیں، گویا زمین بچھا ہوا بستر اور فرش ہے۔ اور زمین کا بچھے ہوئے بستر کی طرح ہونا اس کی سطح کے ہموار ہونے کا تقاضا نہیں کرتا اور یہ زمین کے بیضاوی ہونے کے منافی نہیں کیونکہ اس کی سطح کا جرم بہت وسیع ہے اور اس پر ہر قسم کی آبادی درخت، پہاڑ وغیرہ ہیں اس لئے زمین کے بیضوی اور کروی ہونے کے باوجود آبادی کے قابل ہے۔

والسماء بناءً اور آسمان کو عمارت بنایا۔

ایسا گنبد بنایا جو ہم پر نصب ہے، سماء یا تو اسم جنس ہے جس کا اطلاق واحد اور متعدد پر ہتا رہتا ہے۔ جیاسے دینار اور درہم یا یہ سمائۃ کی جمع ہے اور اللہ کریم کا یہ فرمان اس کی تصدیق کرتا ہے۔

فسواهن سبع سموات کہ اس نے ان کو درست درست سات آسمان بنایا۔

بناء یہ مصدر ہے جو مفعول کے معنی میں ہے جیسا کہ لباس بمعنی ملبوس اور بساط بمعنی مبسوط اور یہ ایسے عمارت پر بھی دلالت کرتا ہے جس کو گھر بنایا گیا ہو۔ اسی طرح گنبد اور خیمہ کو بھی بناء کہتے ہیں بناء کو خیمہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عربوں میں یہ رواج تھاہ جب وہ شادی کرتے تو دلہا اور دلہن کے لئے پہلی شب گزارنے کے لئے الگ خیمہ نصب کرتے اور یہ کہا جاتا بنی فلان علی امراتہ کہ فلاں نے اپنی دلہن کے ساتھ شب باسی کی۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ

اس کا عطف جعل پر ہے پھلوں کا اگنا اگر چہ اللہ کریم کی مرضی سے ہے لیکن اللہ کریم نے پانی و مٹی کو ان کے اگنے کا سبب بنایا ہے۔ جیسا کہ نطفہ، حیوان کی پیدائش کا سبب ہے۔ اللہ کریم نے اس کی فطرت یہ بنا دی ہے کہ پھلوں کی صورتیں اور ان کی کیفیات اس مادہ پر ڈال دی جاتی ہیں جو مٹی و پانی دونوں کا مرغوبہ ہوتا ہے۔ یا اللہ کریم نے پانی میں قوت فاعلہ اور زمین میں قوت قابلہ رکھی ہے جن دونوں کے ملنے سے ہر قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کریم اس بات پر قادر ہے کہ وہ تمام

اشیاء کو بلا اسباب اور مادہ پیدا فرما دے جیسے اس نے بذات خود اسباب اور مواد کو بغیر سابقی مثال وجود عطا فرمایا۔ لیکن ان تمام چیزوں کو پیدا کرنے میں درجہ بدرجہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جانے میں بہت سی صنعتیں اور حکمتیں ہیں جن میں اہل علم اور اہل بصیرت لوگوں کی عبرتیں اور سکون نئے نئے انداز میں پیدا کئے جاتے ہیں جو اس کی عظیم قدرت پر دال ہیں اور اگر ان تمام اشیاء کو یکبارگی پیدا کیا جاتا تو ان میں یہ حکمتیں اور سکون نہ ہوتا۔

من الثمرات اور من السماء سے پہلے جو من مذکور ہے وہ من السماء میں ابتدائیہ ہے خواہ السماء سے مراد بادل لئے جائیں کیونکہ جو چیز سر کے اوپر ہو، اس کو سماء کہتے ہیں۔ اور چاہے اس سے مراد فلک لیا جائے کیونکہ بارش کا آغاز آسمان کیطرف سے ہی ہوتا ہے۔ اور پھر وہ زمین تک پہنچتی ہے۔ جس طرح ان آیات کا ظاہر اس پر دلالت کر رہا ہے یا بارش کا برسنا اسباب سماعیہ سے ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ زمین کی گہرائیوں سے تر اجزاء اڑاتے ہیں جو فضاء کی وسعتوں میں پہنچ کر بارش برسانے والا بادل بن جاتے ہیں۔

اور من الثمرات سے پہلے من تبعیضیہ ہے جس کی دلیل اللہ کریم کا قول،

واخرجنا به ثمرات

اور ہم نے اس کے ساتھ کچھ پھل پیدا کئے اور اس کا دو ٹکروں کے درمیان آنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ من تبعیضیہ ہے اور وہ دونوں ٹکرے ماء اور رزق ہیں جن کے وسط میں من الثمرات ہے گویا کہ اللہ کریم نے یوں ارشاد فرمایا:

ہم نے آسمان سے کچھ پانی نازل فرمایا اور اس کے ساتھ کچھ پھل پیدا فرمائے تاکہ وہ تمھارا کچھ رزق بن جائیں اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ نہ تو آسمان سے سارا پانی برسایا جاتا ہے اور نہ ہی بارش کے ذریعے سارے پھل اگائے جاتے ہیں اور نہ ہی تمام کا تمام پھل رزق ہیں۔

یا یہ من بیانیہ ہے اور رزقاً مرزوق کے معنیٰ میں مفعول ہے جیسے تیرا قول ہے،

أنفقت من الدراهم ألفًا

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر من کا بیانیہ کہا جائے جو رزق کی وضاحت کر رہا ہے تو لازم آئے گا کہ مبین مؤخر ہے اور بیان مقدم ہے اور یہ جائز نہیں اس وہم کا ازالہ کرنے کے لئے امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ مثال ذکر کی ہے کہ،

أنفقت من الدراهم ألفًا

اس مثال میں الفاً مبین ہے اور من الدراهم بیان، اس سے معلوم ہوا کہ بیان کو مبین سے مقدم کرنا جائز ہے۔ اس جگہ الثمرات کا لفظ جو جمع قلت کے اوزان سے ہے جمع کثرت کی جگہ جائز ہے کیونکہ ثمرات سے مراد پھلوں کی ایک جماعت ہے اور جماعت کے اندر بہت سارے افراد جمع ہوتے ہیں، جس طرح تیرے قول میں مذکور ہے،

ادرکت ثمرة بستانه

کہ اس کے باغ کے پھلوں کی ایک جماعت پک گئیں۔ اور قراء نے من الثمرات کی جگہ من الثمرۃ واحد پڑھنا بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جائز ہے کہ جمع قلت جمع کثرت کی جگہ اور جمع کثرت کا وزن جمع قلت کی جگہ استعمال ہوتا رہتا ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے،

کم ترکوا من جنات وعیون

یہاں پر عیون جمع قلت کی جگہ جمع کثرت کا صیغہ مذکور ہے اور بالکل اسی طرح ثلاثۃ قروءِ جمع قلت اقراء کی جگہ جمع کثرت کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا معرف باللام ہونا اس کو جمع قلت سے نکال کر جمع کثرت میں داخل کر دیتا ہے اور لکم، رزقاً کی صفت ہے بشرطیکہ رزق سے مراد مرزوق اور مفعول ہو۔

اور اگر رزق مصدری معنی میں ہو تو لکم اس کا مفعول ہوگا۔ گویا کہ اللہ کریم نے اس طرح ذکر فرمایا رزقاً ایاکم یہاں پر ایاکم رزقاً کا مفعول ہے۔

وَ انزل من السّماء.... الخ

اس کا عطف جعل پر ہے۔ اور اس آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی سبب ہے پھلوں کے اگنے کا، اب سوال یہ ہے کی یہ اسباب حقیقی مؤثر ہیں یا اللہ کریم کی ذات پاک؟

اس کے جواب میں متکلمین کا اختلاف ہے مسلم متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ مؤثر حقیقی اللہ کریم کی ذات ہے اور باقی یہ اسباب محض تاثیر ہیں خود یہ مؤثر نہیں بلکہ پھلوں کا اگنا، اللہ کریم کی قدرت و مشیّت سے ہے البتہ پانی اور زمین کو پھلوں کی شکلوں، ان کی خاصیتوں اور لذتوں کا صرف مادہ بنا دیا ہے۔ جیسا کہ حیوان کہ تخلیق کا مادہ نطفہ منی کو بنا دیا ہے۔

بعض اہلسنّت اور معتزلہ متکلمین کا نظریہ ہے کہ یہ اسباب اپنے مسببات میں مؤثر حقیقی ہیں۔ کیونکہ اللہ کریم نے پانی میں قوت فاعلی اور زمین میں قوت مفعولی پیدا فرمادی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے پھل نکلتے ہیں، چونکہ پانی میں قدرت فاعلی ہے وہ مؤثر حقیقی ہے حالانکہ اللہ کریم ان ساری اشیاء کو بغیر سبب و مواد بھی پیدا کرنے پر قادر ہے جیسا کہ اس نے بذات خود اسباب پیدا کئے ہیں۔

سوال: اسباب اور مسبب میں تدریج کا عمل کیوں جاری فرمایا؟

جواب: اس تدریج میں جو اللہ کریم کی حکمتیں اور صنعتیں ظاہر ہوتیں ہیں وہ اہل بصیرت کے لئے عبرت اور سکون حاصل کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ جس کی ترجمانی قلندر لاہوری نے کچھ یوں فرمائی،

کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب موسم کو کس نے سکھائی ہے خوئے انقلاب

فلا تجعلوا للہ انداداً...

اس آیت کی ماقبل آیت سے اعرابی تعلق کی تین صورتیں ہیں،

پہلی صورت یہ کہ اس سے پہلے فاء عاطفہ ہے اور یہ فعل نہی ہے۔ اور اس کا عطف اعبدوا پر ہے۔

دوسری صورت یہ کہ یہ فاء سببیہ ہے اور یہ فعل نفی ہے چونکہ یہ امر کے جواب میں ہے لہٰذا فاء کے بعد ان مقدرہ ہے جس کی وجہ سے یہ منصوب ہے۔

تیسری صورت یہ کہ یہ لعل کے جواب میں ہے اور فاء کے بعد ان مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے اگرچہ لعل کے جواب میں فعل مضارع آجائے اور اس سے قبل فاء سببیہ ہو تو اس کے بعد ان مقدرہ کے ساتھ نصب دینا جائز نہیں چونکہ یہ کلام کو غیر موجب بنانے میں ان چھ (6) چیزوں کے ساتھ شریک ہیں۔ جن کے بعد فعل مضارع کو ان مقدرہ کے ساتھ نصب دی جاتی ہے اس لئے ان کو اس کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے۔ اور وہ چھ کلمات مندرجہ ذیل ہیں،

امر، نہی، تمنی، استفہام، عرض اور نفی۔

جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں لعل کے جواب میں فعل مضارع کو ان مقدرہ کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔

لعلی ابلغ الاسباب اسباب السموات فاطلع

شاید کہ میں ایسے اسباب تک پہنچ جاؤں جو آسمانوں کے اسباب ہیں۔ تو میں اس پر آگاہی حاصل کروں۔ اس آیت میں فاطلع لعلّ بمعنی لیل کے جواب میں ہے۔ اور منصوب ہے تو معنیٰ یہ ہوگا اگر تم واقعی تقویٰ اختیار کرتے ہو تو اللہ کریم کے مد مقابل نہ بناؤ۔ اور یا یہ

الذی جعل لکم الارض.... الخ

کی خبر ہے اواس کے قبل فاء جزائیہ ہے اور جب مبتداء میں شرط کے معنیٰ پائے جائیں تو شرط پر فاء جزائیہ ذکر کرنا جائز ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہوگا جب

الذی جعل... الخ

سے آغازِ کلام کیا جائے۔ اور اس کو جملہ مستانفہ بنایا جائے تو اس کی تاویل یہ ہوگی۔ مقول فیہ لا تجعلوا۔ تو آیت کریمہ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ ذات پاک جس نے تمہیں ان عظیم الشان نعمتوں اور عظیم آیات سے نوازہ ہے وہی اس لائق ہے کہ اس کا شریک نہ بنایا جائے۔

اندادًا

یہ ند کی جمع ہے اور مد مقابل اور مخالف فی الذات کو کہتے ہیں۔ جیسی مساوی کا لفظ رتبہ میں مماثل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

جیسا کہ جریر کا قول،

أتیماً تجْعلونَ إلیَّ ندًّا ... وما تیمٌ لِذی حَسَبٍ نَدِیدُ

کیاتم بنوتیم کو میرا مد مقابل بناتے ہو حالانکہ وہ تو کسی ذی حسب کا مد مقابل بننے کے اہل نہیں۔

ند یہ ندّ ینِدّ، ندود سے مشتق ہے،

جس کا معنیٰ نفرت کرنا اور مخالفت کرنا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے،

نَاددت الرجل ای خالفته

کہ میں نے اس کی مخالفت کی لیکن اب اس کا استعمال اس مد مقابل کے لئے ہوتا ہے۔ جو ذات میں کسی کا مماثل ہو جیسے مساوی کا لفظ مرتبہ میں مماثل کے لئے خاص ہے مشرکین کے معبودان باطلہ کو جن کی وہ اللہ کریم کے علاوہ عبادت کرتے تھے، اندادا کہا گیا ہے حالانکہ وہ انہیں نہ تو اللہ کریم کی ذات میں اور نہ ہی صفات میں مساوی گمان کرتے تھے۔ اور نہ ہی اس کے افعال میں اس کے مخالف انہیں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کریم کی عبادت کو ترک کر دیا اور ان معبودان باطلہ کی عبادت کرنے لگے اور انہیں الہ کہنے لگے تو ان کی حالت اس بندے جیسی ہوگی جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ واجب بالذات ذاتیں اور وہ اس بات قادر ہے کہ وہ ان کو اللہ کے عذاب سے بچالیں گے اگر وہ انہیں وہ کچھ دین گے جو بھلائی میں سے اللہ کریم انہیں عطا کرنے کی مشیت پنہاں رکھتا،

پس اس لئے ان کے ساتھ استہزاء کیا گیا اور ان کے برے عقیدے پر ان کی مذمت کی گئی۔ کہ انہوں نے اس ذات پاک کے لئے کئی مد مقابل بنا لئے ہیں۔

جس کا ایک بھی مد مقابل نہیں ہو سکتا، اس لئے زمانہ جاہلیت کے موحد زید بن عمرو ابن نفیل نے کہا،

أرَبّاً واحِداً أمْ ألفُ رَب ... أدِینُ إذا تقسَّمتِ الامورُ
ترکْتُ اللاتَ والعزّیٰ جمیعًا ... کذلکَ یَفْعَلُ الرجُلُ البصِیرُ

کیا میں ایک رب یا ہزاروں ارباب کا دین اختیار کروں جب کہ امور تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ میں نے لات وعزیٰ تمام کو ترک کر دیا اور صاحب بصیرت شخص اس طرح کیا کرتا ہے۔

وَانتم تعلمون

اور انتم تعلمون سے پہلے واؤ حالیہ ہے اور یہ فلا تجعلوا کی ضمیر مرفوع متصل سے حال ہے اگرچہ تعلمون فعل متعدی ہے لیکن اس کے مفعول کو حذف کر دیا جاتا ہے، اور یہ ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ یہ فعل لازم ہے متعدی نہیں تو معنیٰ یہ ہوگا کہ تم اہل علم ونظر اور درست رائے کے مالک ہونے کے باوجود ان پتھروں سے گڑھے ہوئے بتوں کے خدا کا مد مقابل سمجھتے ہو۔

اگر تم تھوڑا سا بھی غور و فکر کرتے تو تم موجد حقیقی اور واجب باللذات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے اور کسی کو اس کا شریک نہ بناتے۔ اور تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اللہ کریم ایسی ذات ہے جو واجب الوجود ہے اور اس کا کوئی ہم مثل نہیں اور وہ مخلوق کی

مشابہت سے بلند ہے۔

یا تعلمون کا مفعول کو مقدر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا مماثل نہیں اور نہ ہی اس جیسے افعال کرنے پر یہ قادر ہے جیسے اللہ کریم کا ارشاد ہے،

کیا وہ جن کو تم اللہ کریم کا شریک ٹھہراتے ہو، ان میں سے کوئی ایسے افعال انجام دے سکتا ہے جیسے ان نے دیئے ہیں اور یہاں اس حکم کو مقید کرنا مقصود نہیں بلکہ انہیں جھڑکنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ عالم اور وہ جاہل جو علم حاصل کر سکتا ہے وہ احکام کا مکلف بننے میں مساوی ہے لہٰذا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر تم عالم ہو تو اس کا مد مقابل نہ بناؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی ذی روح انسان کو اس کا مد مقابل بنانے کی اجازت نہیں۔

تنبیہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ان دنوں آیات کا مضمون یہ ہے کہ ان آیات میں اللہ کریم نے اپنی عبادت کا حکم دیا۔ اپنا شریک بنانے سے نہی وادر کی اور عبادت کے حکم کی علت مقتضی کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ اس نے عبادت کے حکم کو ربوبیت کی صفت پر مرتب کیا ہے۔ یہ شعور دلانے کے لئے کہ عبادت کے واجب ہونے کی علت اس کی صفت ربوبیت ہے۔ پھر اس کی ربوبیت کی وضاحت فرمائی کہ وہ ان کا بھی خالق ہے اور ان کے اصولوں کا بھی۔ اور وہ ان چیزوں کا بھی خالق ہے جن کے وہ اپنی معیشت میں محتاج ہے۔ مثلاً زمین کو بچھانا، آسمان سے پانی برسا کر پھل نکالنا، کھانے، پینے اور پہننے کا سارا سامان مہیا کرنا وغیرہ یہاں آیت میں صرف ثمرۃ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، ملابس اور مطاعم کا ذکر نہیں فرمایا۔ کہ یہ مذکورہ بالا امور ایسے ہیں جن پر اللہ کریم کے علاوہ کوئی بھی قادر نہیں۔ یہ امور اس کی وحدانیت پر گواہی دے رہے ہیں۔ اسی لئے اللہ کریم نے نہی عن الشرک کو اس پر مرتب فرمایا ہے۔

اس دوسری آیت کی امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک اور توجیہہ فرمائی ہے جس پر آیات کا ظاہر دلالت کرتا ہے اور جس کے لئے یہ کلام چلایا گیا ہے فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ کریم نے انسان کی تخلیق کی تفصیلات اور ان صفات اور معانی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس نے ان کو عطا فرمائی ہیں۔ اور یہ بطور تمثیل اور تشبیہ ذکر فرمایا ہے یعنی بدن انسانی زمین کی مانند نفس انسانی آسمان اور عقل پانی کی مانند اور جو کمالات اور نوازشات انسانوں کو عطا فرمائی وہ ثمرات کی مانند یعنی جس طرح زمین اور آسمانی قوتوں کے اجتماع سے ثمرات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح نفسانی اور جسمانی قوتوں کے ساتھ عقل کے ملنے سے وہ کمالات اور فضائل پیدا ہوتے ہیں جو خالق کائنات نے اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ اس کو عطا فرمائے ہیں، ان کا سبب عقل، جسم اور نفس کو بنا دیا ہے کیونکہ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہوتا ہے اور ایک اس کا باطنی معنی ہوتا ہے اقور ہر ایک سے آگاہ ہونے کا ایک ذریعہ ہے نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

من عمل بما علم ورثه الله تعالیٰ علم ما لا یعلم

کہ جس نے اس علم کے مطابق عمل کیا جو اس نے حاصل کرلیا تو اللہ کریم اسے ایسے علم کا وارث بنا دیتا ہے جو اس نے سیکھا نہیں ہوتا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

لفظ فرش کی تحقیق عمیق:

(ف ر ش) الفرش (ن ض)

کے اصل معنی کپڑے کو بچھانے کے ہیں لیکن بطور اسم ہر اس چیز کو جو بچھائی جائے فرش و فراش کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:

" الَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشاً " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 22)

جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا۔

یعنی قابل رہائش بنایا اور اسے ابھرا ہوا نہیں بنایا جس پر سکونت ناممکن ہو اور الفراش کی جمع فرش آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

" وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ " (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 34)

اور بلند بچھونوں میں۔

"مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ" (سورۃ الرحمٰن آیت نمبر 54)

اور ایسے بچھونوں پر تکیہ لگائے جن کا اَستر قنادیز کا۔

اور فرش سے مراد وہ جانور بھی ہوتے ہیں جو بار برداری کے قابل نہ ہوں جیسے فرمایا:

" حَمُولَةً وَّفَرْشًا " (سورۃ الانعام آیت نمبر 142)

چوپایوں میں سے بڑی عمر کے جو بار برداری کے کام آتے ہیں اور چھوٹی عمر جو بار برادری کا کام نہیں دیتے اور زمین میں لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) بھی۔ اور کنایہ کے طور پر فراش کا لفظ میاں بیوی میں سے ہر ایک پر بولا جاتا ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الولد للفراش کہ بچہ خاوند کا ہے۔

اور محاورہ ہے۔ فلاں کریمہ المفارش یعنی اس کی بیگمات اعلیٰ مرتبہ کی ہیں۔ افرش الرجل صاحبہ اس نے اپنے ساتھی کی غیبت اور بدگوئی کی۔ افرش عنہ کسی چیز سے رک جانا (الفرشہ پروانہ تتلی وغیرہ اس کی جمع الفراش آتی ہے۔

قرآن میں ہے: " کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ " (سورۃ القارعۃ آیت نمبر 4) جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔

اور تشبیہ کے طور پر تالے کے کنڈے کو بھی فراشۃ القفل کہا جاتا ہے نیز فراشۃ کے معنی برتن میں تھوڑا سا پانی کے بھی آتے

ہیں۔

معنیٰ سماء:

(س م و) سماء (Sky)

ہر شے کے بالائی حصہ کو سماء کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سماء ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔ اور آیت:

"اللهُ الَّذِی خَلَقَ سَبْعَ سَماواتٍ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 12)

خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں۔ کو اسی معنیٰ پر محمول کیا ہے۔

لفظِ بنیٰ کی تحقیق:

(ب ن ی) بنی (Construct)

بنیت ابنی بناء و بنیتہ و بنیا کے معنیٰ تعمیر کرنے کے ہیں قرآن میں ہے۔

"وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا" (سورۃ النبأ آیت نمبر 12)

اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

"وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَاِنَّا لَمُوسِعُونَ" (سورۃ الذاریات آیت نمبر 47)

اور آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا۔

"وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 5)

اور آسمان اور اس ذات کی (قسم) جس نے اسے بنایا۔ البنیان یہ واحد ہے جمع نہیں ہے جیسا کہ آیات۔

"لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِی بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 110)

یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (موجب) خلجان رہے گی۔

"كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ" (سورۃ الصف آیت نمبر 4)

کہ گویا سیسا پلائی ہوئی دیوار ہیں:

"قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَاَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 97)

وہ کہنے لگے کہ اس کے لئے ایک عمارت بناؤ۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بنیانۃ کی جمع ہے اور یہ:

شعیر شعیر و تمر و تمر و نخل و نخلته
کی طرح ہے یعنی جمع اور مفرد میں تا کے ساتھ فرق کرتے ہیں اور جمع کی اس قسم میں تذکر و تانیث دونوں جائز ہوتے ہیں۔

"لَهُمْ غُرَفٌ مِنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَبْنِيَّةٌ " (سورۃ الزمر آیت نمبر 20)
ان کے لئے اونچے اونچے محل ہیں جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔ بناء (مصدر بمعنی مفعول) عمارت جمع ابنیته البنیته سے بیت اللہ مراد لیا جاتا ہے۔

ثمر کا اصل معنیٰ:

(ث م ر) الثمر
اصل میں درخت کے ان اجزاء کو کہتے ہیں جن کو کھایا جا سکے اس کا واحد ثمرۃ اور جمع ثمار و ثمرات آتی ہے قرآن میں ہے:
" اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 22)
اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لئے انواع واقسام کے میوے پیدا کیے۔

مفہوم نزول:

(ن ز ل) النزول (ض) (Descent)
اصل میں اس کے معنی بلند جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: نزل عن دابة وہ سواری سے اتر پڑا۔ نزل فی مکان کذا کسی جگہ پر ٹھہرنا انزل وافعال اتارنا قرآن میں ہے۔ عذاب کے متعلق انزال کا لفظ استعمال ہوا ہے قرآن اور فرشتوں کے نازل کرنے کے متعلق انزال اور تنزیل دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے کہ تنزیل کے معنی ایک چیز کو مرۃ بعد اخری اور متفرق طور نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور انزال کا لفظ عام ہے جو ایک ہی دفعہ مکمل طور کسی چیز نازل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ وہ آیات ملاحضہ ہو جہاں تنزیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

- **"نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ"** (سورۃ الشعراء ایت نمبر 193)
اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔ ایک قرات میں نزل ہے۔

"وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيْلًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 106)
اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہو جہاں تنزیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

"نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 193)
اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔

ایک قرأت میں نزل ہے:

"وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 106) اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا۔

ماء کی اصل:

(م ی ہ) الماء (Water)

کے معنی پانی کے ہیں قرآن میں ہے:

"وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" (سورۃ الانبیاء ایت نمبر 30)

اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

"وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوراً" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 48)

اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا پاک کرنے والا۔

پاک اور نتھرا ہوا پانی اور محاورہ ہے: ماء بنی فلان فلاں قبیلے کا پانی یعنی ان کی آبادی ماء اصل میں موہ ہے کیونکہ اس کی جمع امراۃ اور میاہ آتی ہے۔ اور تصغیر مویۃ پھر ہا کو حزف کر کے واؤ کو الف سے تبدیل کر لیا گیا ہے۔

خرج کا معنیٰ:

(خ ر ج) خرج۔ (ن) (Emit)

خروجاً کے معنی کسی کے اپنی قرارگاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قرارگاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا کپڑا ہو اور یا کوئی حالت نفسانی ہو جو اسباب خارجیہ کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو۔ قرآن میں ہے؛

"فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفاً يَتَرَقَّبُ" (سورۃ القصص آیت نمبر 21)

تو اس شہر سے نکلا ڈرتا ہوا اس انتظار میں کہ اب کیا ہوتا ہے۔

انداداً کا معنیٰ:

(ن د د) (Relative,Partner)

ندید الشئی۔ وہ جو کسی چیز کی ذات یا جوہر میں اس کا شریک ہو اور یہ ممانعت کی ایک قسم ہے کیونکہ مثل کا لفظ ہر قسم کی مشارکت پر بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر ہر ند کو مثل کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر مثل ند نہیں ہوتا۔ اور ند، ندید ندیدہ تینوں ہم معنی ہیں۔

قرآن میں ہے:

"فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَاداً" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 22)

پس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 165)

اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنا لیتے ہیں۔

"وَ تَجۡعَلُوۡنَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا" (سورۃ فصلت آیت نمبر 9)

اور بتوں کو اس کا مدمقابل بناتے ہو۔

اور ایک قرات میں یوم التناد تشدید دال کے ساتھ ہے اور یہ ندیند سے مشتق ہے جس کے معنی دور بھاگنے کے ہیں اور قیامت کے روز بھی چونکہ لوگ اپنے قرابتداروں سے دور بھاگیں گے جیسا کہ آیت کریمہ:

"يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ" (سورۃ عبس ایت نمبر 34)

اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی۔

میں مذکور ہے اس لئے روز قیامت کو یوم التناد بتشدید الدال کہا گیا ہے۔

علم کا معنی:

(ع ل م) العلم

کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا۔

نوٹ: مندرجہ بالا آیت کریمہ میں مذکور باقی الفاظ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 23]

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (23)

"اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ، اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو"۔

متن:

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ

لما قرر وحدانيته تعالى وبين الطريق الموصل إلى العلم بها، ذكر عقيبه ما هو الحجة على نبوة محمد صلّى الله عليه وسلّم، وهو القرآن المعجز بفصاحته التي بذت فصاحة كل منطيق وإفحامه، من طولب بمعارضته من مصاقع الخطباء من العرب العرباء مع كثرتهم وإفراطهم في المضادة والمضارة، وتهالكهم على المعازة والمعارة، وعرف ما

يتعرف به إعجازه ويتيقن أنه من عند الله كما يدعيه.

وإنما قال: مِّمَّا نَزَّلْنَا لأن نزوله نجماً منجماً بحسب الوقائع على ما ترى عليه أهل الشعر والخطابة مما يريبهم، كما حكى الله عنهم فقال وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً فكان الواجب تحديهم على هٰذا الوجه إزاحة للشبهة وإلزاماً للحجة. وأضاف العبد إلى نفسه تعالى تنويهاً بذكره وتنبيهاً على أنه مختص به منقاد لحكمه تعالى. وقرء "عبادنا" يريد محمداً صلّى الله عليه وسلّم وأمته. والسورة الطائفة من القرآن المترجمة التي أقلها ثلاث آيات، وهي إن جعلت واوها أصلية منقولة من سور المدينة لأنها محيطة بطائفة من القرآن مفرزة محوزة على حيالها، أو محتوية على أنواع من العلم احتواء سور المدينة على ما فيها، أو من السورة التي هي الرتبة. قال النابغة:

وَلرهطِ حرابٍ وَقدٍّ سُورةٌ ... في المجدِ ليسَ غرابُها بمَطارِ

لأن السُورَ كالمنازل والمراتب يترقى فيها القارىء، أولها مراتب في الطول والقصر والفضل والشرف وثواب القراءة. وإن جعلت مبدلة من الهمزة فمن السورة التي هي البقية والقطعة من الشيء. والحكمة في تقطيع القرآن سوراً: إفراد الانواع، وتلاحق الاشكال، وتجاوب النظم، وتنشيط القارىء، وتسهيل الحفظ، والترغيب فيه. فإنه إذا ختم سورة نَفَّسَ ذلك عنه، كالمسافر إذا علم أنه قطع ميلاً أو طوى بريداً، والحافظ متى حذفها اعتقد أنه أخذ من القرآن حظاً تاماً، وفاز بطائفة محدودة مستقلة بنفسها، فعظم ذلك عنده وابتهج به إلى غير ذلك من الفوائد.

ترجمہ:

اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (اس خاص) بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ۔

اس سے پہلی آیات میں اللہ کریم نے زبردست دلیلوں کے ساتھ اپنی وحدانیت کا ثابت کیا اور وہ طریقہ بھی بتا دیا جو اس کی وحدانیت کے علم تک پہنچاتا ہے اور اس کے بعد اب وہ دلیل ذکر کی جا رہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر واضح دلیل ہے۔ اور وہ دلیل قرآن کریم ہے جو آپ پر نازل کیا گیا ہے جس کی فصاحت زبردست گفتگو کرنے والے پر غالب آ گئی اور اس نے خالص عرب کے فصیح و بلیغ خطباء کو اس کے مقابلے میں کلام لانے کا مطالبہ کیا اور انہیں خاموش کر دیا کیونکہ وہ اپنی کثرت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور آپ کو نقصان پہنچانے میں افراط کی حد تک پہنچنے کے باوجود اور آپ پر غالب آنے اور آپ کو

شرمندہ کرنے پر شدید حرص کے باوجود ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز اور خاموش ہو گئے اور اللہ کریم نے انہیں وہ راستہ بتایا جس سے وہ قرآن کریم کے اعجاز کو پہچان سکتے ہیں اور جس سے وہ یہ یقین کر سکتے تھے یہ اللہ کریم کا کلام ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے اس کا دعویٰ فرمایا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایسا کلام پیش نہ کر سکے اور اس کی یہ وعید بھی سنا دی گئی کہ اگر وہ ایسا کلام پیش نہیں کریں گے تو انہیں اس دوزخ کے اندر پھینک دیا جائے گا جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے یہ اس کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے اور حضور ﷺ کی نبوت پر زبردست حجت بھی ہے۔

اس جگہ اللہ کریم نے نزلنا کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ جس کا معنیٰ تھوڑا تھوڑا حسب واقعہ نازل کرنا ہے۔ اور ایسا کلام خطباء اور شعراء پیش کرتے ہیں۔ اور یہ چیز بھی عرب کے فصحاء کو قرآن کریم میں شک کا سبب بننے والی چیزوں میں سے تھی۔ جس طرح اللہ کریم نے خود ذکر فرمایا ہے،

وقال الذین کفروا لو لا نزّل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ

اور کافروں نے کہا کہ یہ قرآن یکبارگی نازل کیوں نہ کیا گیا۔

تو اس کی کیا وجہ ہے؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو ان کے شک کا منشاء تھا اسی کے مطابق ان کو چیلنج کرنا واجب تھا۔ تاکہ ان کے شبہ کا ازالہ ہو جائے۔ اور ان پر دلیل بن جائے اور یہاں اللہ کریم نے عبد کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے تاکہ اس کے ذکر کرنے سے آپ کی عظمت شان کا اظہار ہو اور اس بات پر تنبیہ ہو کہ اللہ کریم کے محبوب کا اس کی ذات کے ساتھ خاص تعلق ہے اور آپ اس کے حکم کے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ اور بعض قراء نے یہاں پر عبادنا پڑھا ہے۔ جو عبد کی جمع ہے تو اس صورت میں اس سے مراد نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت ہیں اور قرآن کریم کا وہ حصہ جس میں جس میں کوئی خاص مضمون بیان کیا گیا ہو اور اس کو کسی عنوان کے ساتھ معنون بھی کیا گیا ہو اور اس میں کم از کم تین آیات ہوں۔ اور اس کے مادہ اشتقاق میں تین قول ہیں۔

(1) یہ سوز المدینہ سے مشتق ہے جس کا معنیٰ شہر کی فصیل اور مضبوط چاردیواری ہے یعنی جس طرح فصیل شہر اور جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے اس کو گھیر لیتی ہے۔ اسی طرح صورت بھی قرآن پاک کے ایک مستقل حصہ کا احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ اور مختلف علوم کو شامل ہوتی ہے۔

(2) یہ صورۃ بمعنی مرتبہ سے بنا ہوا ہے اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ قرآن پاک کے باعتبار عظمت مختلف درجات ہیں۔

نابغہ کا کہنا ہے،

وَلرھْطِ حرابٍ وَقدٍّ سُورۃٌ ... فی المجدِ لیسَ غرابُھا بمطَارِ

کہ حراب اور قد کے گروہ کا بزرگی میں ایسا مرتبہ ہے، کہ ان کی فصلوں سے کوے کو بھی نہیں اڑایا جاتا۔

کیونکہ سورتیں منازل اور مراتب کی طرح ہیں جن میں قاری ترقی حاصل کرتا جاتا ہے۔ یا ان صورتوں کے لمبا، چھوٹا، فضل، شرف اور قراءۃ کے ثواب میں مرتبے اور درجے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو سورۃ کہا گیا۔

(3) یہ سؤرۃ سے بنا ہے، بمعنی باقی ماندہ۔ تو معنی یہ ہوگا قرآن پاک کا وہ حصہ جو دوسرے حصہ سے الگ تھلگ اور باقی بچا ہوا ہے۔ وہ اس صورت سے ہے۔ اس صورت میں سورۃ کی واؤ ہمزہ سے بدلی ہوئی ہوگی۔ قرآن کریم کو الگ الگ سورتوں میں تقسیم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ مختلف قسم کے مضامین کا بیان علیحدہ علیحدہ کیا جائے اور ہم معنی و ہم شکل الفاظ کو یکجا ذکر کر کیا جائے، اور تلاوت کرنے والے کو خوشخبری سنائی جائے اور اس کو حفظ کرنا بھی آسان ہو جائے۔ اور طحفظ کی ترغیب بھی دلائی جائے کیونکہ جب کوئی ایک صورت یاد کر لیتا ہے تو اس کا بوجھ کم ہو جاتا ہے، جیسا مسافر ایک میل سفر کے بعد سکون محسوس کرتا ہے کہ کچھ راستہ کم ہوا اور جب حافظ ایک سورۃ یاد کر لیتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس نے قرآن سے کچھ یاد کر لیا ہے۔ اور قرآن کا مستقل بنفسہ حصہ حاصل کرنے میں کامران ہو گیا ہے۔ اور وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے اور اس کی تقطیع میں بے شمار فوائد ہیں جو اہل نظر پر چھپے ہوئے نہیں۔

متن:

مِنْ مِثْلِهِ صفة سورة أى: بسورة كائنة من مثله، والضمير لما نزلنا، و (من) للتبعيض أو للتبيين.

وزائدة عند الاخفش أى بسورةٍ مماثلة للقرآن العظيم فى البلاغة وحسن النظم. أو لعبدنا، و (من) للابتداء أى: بسورة كائنة ممن هو على حاله عليه الصلاة والسلام من كونه بشرًا أميًا لم يقرأ الكتب ولم يتعلم العلوم.

أو صلة فَأْتُوا، والضمير للعبد صلّى الله عليه وسلّم، والرد إلى المنزل أوجه لأنه المطابق لقوله تعالى: فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ

ولسائر آيات التحدى، ولأن الكلام فيه لا فى المنزل عليه فحقه أن لا ينفك عنه ليتسق الترتيب والنظم، ولأن مخاطبة الجم الغفير بأن يأتوا بمثل ما أتى به واحد من أبناء جلدتهم أبلغ فى التحدى من أن يقال لهم:

ليأت بنحو ما أتى به هٰذَا آخر مثله، ولأنه معجز فى نفسه لا بالنسبة إليه لقوله تعالى: قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ. ولأن رده إلى عبدنا يوهم إمكان صدوره ممن لم يكن على صفته، ولا يلائمه قوله تعالى:

وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللهِ

فإنه أمر بأن يستعينوا بكل من ينصرهم ويعينهم.

ترجمہ:

اس میں من جارہ مضاف ومضاف الیہ کے مثل مل کر کائنۃ کے مجرور ہو کر سورۃ کی صفت ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ تم ایسی سورۃ لاؤ جو حسن نظم اور عجیب اسلوب اور فصاحت وبلاغت میں قرآن پاک کی مثل ہو۔

اس سورۃ میں ہ ضمیر کا مرجع ما نزّلنا ہوگا یا من تبعیضیہ یا بیانیہ ہوگا اور اخفش کے قول کے مطابق من زائدہ ہے یا ضمیر کا مرجع عبدِنا ہے اور من ابتدائیہ ہے تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ایسی سورت لاؤ جس کو ایسا آدمی پیش کرے جو امی ہونے میں ہمارے بندہ خاص جیسا ہو جو نہ تو کسی کا شاگرد ہو اور نہ ہی اس نے کسی سے لکھنا پڑھنا سیکھا ہو۔

یا یہ من مثلیہ، فاتوا فعل کا صلہ ہوگا۔ اور اس صورت میں ضمیر سے مراد عبد خاص ﷺ ہوگا۔ لیکن امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ضمیر کا مرجع منزل کو بنانا کئی وجوہات سے بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں وہ،

فاتوا بسورة مّن مّثله

اور باقی ماندہ ان تمام آیات تحدی کے موافق ہوگا۔

اور ضمیر کا مرجع قرآن کو بنانے کی یہ بھی وجہ ہے کہ کلام اسی کے متعلق ہے، منزل علیہ کے متعلق نہیں ہو رہی تو اس کا حق یہ ہے کہ وہ اس سے جدا نہ ہو تا کہ ترتیب قرآن خراب نہ ہو۔

اور اس وجہ سے بھی کہ جم غفیر کو چیلنج کرنا کہ وہ اس جیسا کلام لائے جو انہیں میں سے ایک ہستی کر چکی ہے۔ چیلنج کا یہ انداز زیادہ بلیغ ہے۔ بنسبت اس کے کہ انہیں کہا جائے کہ ان میں سے کوئی ایک شخص ایسا کلام لائے جیسا کہ وہ لے کر آئے ہیں۔

اور اس وجہ سے بھی ضمیر کا مرجع منزل کو بنانا زیادہ اولیٰ ہے کہ وہ بذات خود معجز ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان ہے،

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اَنْ يَاْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهِ

کہ آپ فرما دیجئے کہ اگر تمام جن وانس جمع ہو جائیں کہ وہ اس قرآن جیسا کلام لائیں تو وہ اس جیسا کلام نہیں لا سکتے۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع عبدنا کو بنانا یہ وہم پیدا کرتا ہے کہ کہ آدمی کے لئے ایسا کلام لانا ممکن ہے جو آپ کی صفت پر نہ ہو یعنی وہ امی نہ ہو۔ آخری وجہ یہ ہے کہ اگر عبدنا کو ضمیر کا مرجع بنایا جائے تو یہ اللہ کریم کے اس فرمان کے مناسب نہیں رہتا جس میں اللہ کریم نے فرمایا کہ تم اللہ کے علاوہ تمام حمائیتوں کو بلاؤ۔ کیونکہ اس میں یہ حکم ہے کہ وہ ہر اس شخص سے مدد طلب کریں جو اس کے قابل ہے۔

متن:

وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

والشهداء جمع شهيد بمعنى الحاضر، أو القائم بالشهادة، أو الناصر، أو الإمام.

وكأنه سمي به لأنه يحضر النوادى وتبرم بمحضره الامور، إذ التركيب للحضور، إما بالذات أو بالتصور، ومنه قيل: للمقتول فى سبيل الله شهيد لأنه حضر ما كان يرجوه، أو الملائكة حضروه. ومعنى دُونِ أدنى مكان من الشيء ومنه تدوين الكتب، لأنه إدناء البعض من البعض، ودونك هٰذَا أى: خذه من أدنى مكان منك، ثم استعير للرُّتَب فقيل: زيد دون عمرو أى: فى الشرف، ومنه الشيء الدون، ثم اتسع فيه فاستعمل فى كل تجاوز حد إلى حد وتخطى أمر إلى آخر، قال تعالى:

لَاّ يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

أى لا يتجاوزوا ولاية المؤمنين إلى ولاية الكافرين. قال أمية:

يا نفسُ مَا لَكِ دونَ اللهِ منْ واق أى إذا تجاوزت وقاية الله فلا يقيك غيره. ومِنْ متعلقة ب ادْعُوا. والمعنى وَادْعُوا للمعارضة من حضركم، أو رجوتم معونته من إنسكم وجنكم وآلهتكم غير الله سبحانه وتعالى، فإنه لا يقدر على أن يأتى بمثله إلا الله. أو: وَادْعُوا من دون الله شهداء يشهدون لكم بأن ما أتيتم به مثله، ولا تستشهدوا بالله فإنه من ديدن المبهوت العاجز عن إقامة الحجة. أو ب شُهَدَاءَكُمْ أى الذين اتخذتموهم مِن دُونِ الله اَوْلِيَاءَ وآلهة، وزعمتم أنها تشهد لكم يوم القيامة. أو الذين يشهدون لكم بين يدى الله تعالى على زعمكم من قول الاعشى: تُرِيكَ القَذَى مِنْ دونِها وهى دُونَهُ ليعينوكم وفى أمرهم أن يستظهروا بالجماد فى معارضة القرآن العزيز غاية التبكيت والتهكم بهم. وقيل: مِنْ دُونِ اللهِ أى من دون أوليائه، يعنى فصحاء العرب ووجوه المشاهد ليشهدوا لكم أن ما أتيتم به مثله، فإن العاقل لا يرضى لنفسه أن يشهد بصحة ما اتضح فساده وبان اختلاله.

ترجمہ:

شهداء:

شہید یہ شہادۃ اور شہود سے بنا ہے، جس کا معنی

الحضور مع المشاهدة اما بالبصر واما بالبصيرة

یعنی شہادت کا معنی یہ ہے کہ انسان وہاں موجود بھی ہو اور اسے دیکھے بھی خواہ آنکھوں کی بینائی یا نورِ بصیرت سے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شہید کے پانچ معانی مع مناسبت کے بیان کئے ہیں۔

☆ حاضر مجلس

☆ گواہ

☆ مدد کرنے والا، حمایتی

☆ امام اور سردار

☆ المقتول فی سبیل اللہ

ان تمام میں شہید کے لفظ کو استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے ان میں سے کسی نہ کسی اعتبار سے حضور (موجودگی) کے معانی پائے جاتے ہیں۔

یعنی ان کی موجودگی میں فیصلے کئے جاتے ہیں اور معاملات طے ہوتے ہیں۔ اور فی سبیل اللہ مقتول کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جن نعمتوں کے حصول کی اسے امید ہوتی ہے وہ حاضر ہوتی ہیں یا ملائکہ اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔

من:

یہ اپنے مجرور سے مل کر ادعوا فعل کے متعلق ہوگا اس صورت میں یہ من ابتدائیہ ہوگا۔ اور معنی یہ ہوگا کہ تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ لیکن اس بلاوے کی ابتداء اللہ کریم کے علاوہ سے ہونی چاہئے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی مثل لانے پر قدرت نہیں رکھتا۔

یا یہ حال ہے ادعوا کے فاعل سے، دریں صورت اس کا معنی مددگار نہیں ہوگا بلکہ یہ گواہوں کے معنی میں ہوگا کہ تم اللہ کریم کے علاوہ ان گواہوں کو لاؤ جو گواہی دیں کہ جو کلام تم لائے ہو وہ اللہ کے کلام کی مثل ہے۔ لیکن عاجزوں اور بدحواسوں کی طرح یہ نہ کہو کہ اللہ کریم ہمارا گواہ ہے کیونکہ ان کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے دلیل قایم نہ کر سکیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ ہمارا گواہ ہے۔ کہ ہم اس دعویٰ میں سچے ہیں لیکن درحقیقت وہ عاجز ہیں۔

یا یہ اپنے مجرور سے مل کر شہداء کے متعلق ہوگا۔ تو معنی یہ ہوگا کہ تم اپنے ان معبودوں اور دوستوں کو بلاؤ جن کے متعلق تمہارا خیال ہے کہ بروزِ قیامت اللہ کریم کے سامنے تمہاری گواہی دیں گے۔ اس صورت میں دون کا لفظ قدام کے معنیٰ میں ہوگا جیسا کہ الاعشی کا قول

تُرِيكَ الْقَذٰى مِنْ دُوْنِهَا وَهِيَ دُوْنَهٗ

وہ شیشہ تجھے تنکا کو اپنے آگے اور سامنے دکھائے گا حالانکہ وہ خود اس کے سامنے ہے۔

انہیں اس لئے بلاؤ کہ وہ تمہاری مدد کریں۔

دون چار معانی میں مستعمل ہے،

1۔ جو چیز باعتبار مکان بہت قریب ہو اسے دون کہتے ہیں۔ اسی سے تدوین الکتب ہے کہ اس میں بھی کتابوں کے بعض اجزاء کو بعض دوسروں کے قریب کیا جاتا ہے۔ یہی اس کا حقیقی معنیٰ ہے۔

2۔ اس کا اطلاق مرتبہ و درجہ پر بھی مجازاً ہوتا ہے جیسا کہ زید دون عمرو کہ زید درجہ و مرتبہ میں عمرو سے کم ہے۔ اور حقیر چیز کو شییٔ دون کہتے ہیں۔

3۔ اس کے بعد اس میں وسعت پیدا کر دی گئی اور ایک حد سے دوسری حد کی طرف تجاوز کرنے اور ایک امر سے دوسرے امر کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ،

لَاْ یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ

کہ وہ مومنین کی دوستی سے کافروں کی دوستی کی طرف تجاوز نہ کریں۔

امیہ کا قول ہے،

یا نفسُ مَا لَكِ دونَ اللہِ منْ واق

اے نفس جب تو اللہ کی حفاظت سے تجاوز کرے گا تو تجھے اس کا غیر نہیں بچائے گا۔ بعض کا کہنا ہے کہ من دون اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کریم کے دوستوں اور حمایتوں کے علاوہ ان فصحاء عرب کو بلا لاؤ کہ وہ تمہارے لائے ہوئے کلام کی شہادت دیں کہ یہ اللہ کریم کے کلام کی مثل ہے مگر وہ یہ گواہی نہیں دیں گے کیونکہ جس کا فساد ظاہر ہو عقل مند آدمی ایسی چیز کی گواہی قطعاً نہیں دیتا۔ اور مشرکین کو یہ حکم دینا کہ قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کے لئے جمادات سے مدد حاصل کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بالکل خاموش کر دیا جائے اور ان کے ساتھ استہزاء کیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ معبودان باطلہ ان کی اس بارے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

متن:

اِنْ کُنْتُمْ صادِقِیْنَ

أنه من كلام البشر، وجوابه محذوف دل عليه ما قبله. والصدق: الإخبار المطابق، وقيل: مع اعتقاد المخبر أنه كذلك عن دلالة أو أمارة، لأنه تعالى كذب المنافقين فى قولهم: اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللهِ، لما لم يعتقدوا مطابقته، ورد بصرف التكذيب إلى قولهم نَشْهَدُ، لأن الشهادة إخبار عما علمه وهم ما كانوا عالمين به.

ترجمہ:

اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں۔ کہ یہ قرآن کریم بشر کا کلام ہے (تو اس کی مثل کلام لائیں۔)

ان کنتم صادقین

یہ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے جس کے حذف پر ماقبل کلام دال ہے اور وہ

فاتوا بسورۃ من مثلہ... الخ

ہے۔ اصل عبارت اس طرح تھی۔

ان کنتم صادقین فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا من یعینکم فی ذالک

کہا گرتم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ بشر کا کلام ہے تو اس کی مثل ایک صورت لاؤ اور ان لوگوں کو بلا لو جو تمہارے گمان کے مطابق تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔

صادقین

یہ صدق سے مشتق ہے اس کے معنی کے متعلق جمہور کا قول یہ ہے اس کا معنی یہ ہے کہ خبر دینے والے کا واقعہ کے مطابق خبر دینا خواہ وہ اس کے عقیدہ کے مطابق ہو یا نہ ہو، دوسرا قول جاحظ کا یہ ہے کہ مُخبرِ صادق وہ ہوگی جو واقع کے مطابق بھی ہو اور اعتقاد کے مطابق ہو۔ اور یہ عقیدہ بھی مدلل ہو جیسا کہ منافقین نے قسم اٹھا کر کہا،

نشھد انک رسول اللہ

تو اللہ کریم نے انکو اس خبر کے متعلق کاذب کہا۔

واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ خبر، مخبر کے اعتقاد کے مطابق نہ تھی جبکہ خبر واقع کے مطابق تھی۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اللہ کریم نے ان کو اس خبر کو شہادت کہنے کی وجہ سے جھوٹا فرمایا کیونکہ شہادت قلبی یقین کے ساتھ ہوتی ہے۔ خواہ وہ یقین انکھوں کے ذریعے حاصل ہو یا علم کے ساتھ، اور منافقین کو یہ حاصل نہ تھا اس لئے ان کو جھوٹا کہا گیا۔

تحقیق لفظ عبد:

(ع ب د) العبد (Slave, Seervant)

بمعنی غلام کا لفظ چار معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(1) العبد بمعنی غلام یعنی وہ انسان جس کی خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہو چنانچہ آیات کریمہ:

"اَلْعَبْدُ بِالْعَبْدِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 178) اور غلام کے بدلے غلام۔

"عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ" (سورۃ النحل آیت نمبر 75)

ایک غلام ہے جو بالکل دوسرے کے اختیار میں ہے۔

اس میں عبد کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے

(2) العبد بالایجاد یعنی وہ بندے جسے اللہ نے پیدا کیا ہے اس معنی میں عبودیۃ اللہ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا" (سورۃ مریم آیت نمبر 93)

آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں سب اس کے حضور بندے ہو کر حاضر ہوں گے۔

اس میں اسی معنی کی طرح اشارہ ہے۔

(3) عبد وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبودیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اس لحاظ سے جن پر عبد کا لفظ بولا گیا ہے وہ دو قسم پر ہیں:

ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا:

"وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ" (سورۃ ص آیت نمبر 41) اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔

"اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 3)

بیشک نوح (علیہ السلام) ہمارے شکر گزار بندے تھے۔

"نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 1)

جس نے اپنے بندے پر قرآن پاک میں نازل فرمایا:

"عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 1)

جس نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ کتاب نازل کی۔

"اِنَّ عِبَادِیْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 42)

جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

"كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 79)

کہ میرے بندے ہو جاؤ۔

"اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 40)

ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

"وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ" (سورۃ مریم آیت نمبر 61)

جو وعدہ رحمٰن نے اپنے بندوں سے غیب میں کیا۔

"وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 63)

اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

"فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا" (سورۃ الدخان آیت نمبر 23)
ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ۔

"فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا" (سورۃ الکھف آیت نمبر 65)
(وہاں) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ دیکھا۔

(2) دوسرے اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ اور اسی کی طرف مائل رہتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

تعس عبد الدرھم تعس عبد الدینار

درہم دینار کا بندہ ہلاک ہو عبد کے ان معانی کے پیش نظر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے یعنی بندہ مخلص نہیں ہے لہٰذا یہاں عبد کے معنی عابد یعنی عبادت گزار کے ہیں لیکن عبد عابد سے زیادہ بلیغ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ تمام لوگ اللہ کے ہیں یعنی اللہ ہی نے سب کو پیدا کیا ہے بلکہ تمام اشیاء کا یہی حکم ہے۔ بعض بعض عبد بالتسخیر ہیں اور بعض عبد بالاختیار اور جب عبد کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہو تو اس کی جمع عبید یا عبد آتی ہے اور جب عبد بمعنی عابد یعنی عبادت گزار کے ہو تو اس کی جمع عباد آئے گی لہٰذا جب عبید کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ عباد سے زیادہ عام ہوگا یہی وجہ ہے کہ آیت:

"وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ" (سورۃ ق آیت نمبر 29)
اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے۔

میں عبید سے ظلم کی نفی کر کے تنبیہ کی ہے وہ کسی بندے پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا خواہ وہ خدا کی پرستش کرتا ہو اور خواہ عبد الشمس یا عبد اللات ہونے کا مدعی ہو۔ ہموار راستہ جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔ بعیر معبد جس پر تار کول مل کر اسے خوب بدصورت کر دیا گیا ہو عبدت فلان میں نے اسے مطیع کر لیا محکوم بنا لیا قرآن میں ہے:

"اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 22)
کہ تم نے بنی اسرائیل کو محکوم بنا رکھا ہے۔

اتیان کی عمدہ تحقیق بالتفصیل:

(ا ت ی) الاتیان۔ (ض)

کے معنی کسی چیز کے بسہولت آنا کے ہیں۔ اسی سے سیلاب کو اتی کہا جاتا ہے اور اس سے بطور تشبیہ مسافر کو اتاوی کہہ دیتے ہیں۔ الغرض اتیان کے معنی "آنا" ہیں خواہ کوئی بذاتہ آئے یا اس کا حکم پہنچے یا اس کا نظم و نسق وہاں جاری ہو یہ لفظ خیر و شر اور اعیان و اعراض سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 40)
تو اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے یا قیامت قائم ہو۔

"اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 1) اب آتا ہے اللہ کا حکم۔

اور آیت کریمہ:

"فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 26)
میں اللہ کے آنے سے اس کے حکم کا عملاً نفوذ مراد ہے جس طرح کہ آیت

"وَجَآءَ رَبُّكَ" (سورۃ الفجر آیت نمبر 22)
میں ہے اور شاعر نے کہا ہے:

"اتیت المروءۃ من بابها" تو جوانمردی میں اس کے دروازہ سے داخل ہوا۔

اور آیت کریمہ:

"وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 54)
میں یاتون بمعنی یتعاطون ہے یعنی مشغول ہونا اور آیت کریمہ۔

"يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ" (سورۃ النساء آیت نمبر 15)
میں الفاحشہ (بدکاری) کے متعلق اتیان کا لفظ ایسے ہی استعمال ہوا ہے جس طرح کہ آیت کریمہ۔

"لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 27)
فری کے متعلق مجئی کا لفظ استعمال ہوا ہے (یعنی دونوں جگہ ارتکاب کے معنی ہیں) اور آیت (مذکورہ) میں ایک قرات تاتی الفاحشۃ دونوں طرح آتا ہے۔ چنانچہ (دودھ کے، مشکیزہ کو بلونے سے جو اس پر مکھن آجاتا ہے اسے اتوۃ کہا جاتا ہے لیکن اصل میں اتوۃ اس آنے والی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے حاصل ہو کر آئے لہٰذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔ ارض کثیرۃ الاباء۔ زرخیز زمین جس میں بکثرت پیداوار ہو۔

اور آیت کریمہ: "اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 61) بیشک اس کا وعدہ آیا ہوا ہے۔
میں ماتیا (فعل) اتیتہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں ماتیا بمعنی آتیا ہے (یعنی مفعول بمعنی فاعل) ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ محاورہ میں اتیت الامر و اتانی الامر دونوں طرح بولا جاتا ہے اتیتہ بکذا و اتیتہ کذا۔ کے معنی کوئی چیز لانا یا دینا کے ہیں قرآن میں ہے۔

"وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 25)
اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔

" فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُودٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا " (سورۃ النمل آیت نمبر 37)
ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس سے مقابلہ کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔

" مُلْكًا عَظِيمًا " (سورۃ النساء آیت نمبر 54) اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

جن مواضع میں کتاب الٰہی کے متعلق آتینا (صیغہ معروف متکلم) استعمال ہوا ہے وہ اوتوا (صیغہ مجہول غائب) سے ابلغ ہے (کیونکہ) اوتوا کا لفظ کبھی ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ جب دوسری طرف سے قبولیت نہ ہو مگر آتینا کا صیغہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت بھی پائی جائے اور آیت کریمہ،

"آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ " (سورۃ الکھف آیت نمبر 96)
تو تم لوہے کہ بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ۔

میں ہمزہ نے الف موصولہ (ائتونی) کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی جیئونی کے ہیں۔ الایتاء (افعال) اس کے معنی اعطاء یعنی دینا اور بخشا ہے ہیں۔ قرآن بالخصوص صدقات کے دینے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

" وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 277)
اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔

" وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ " (سورۃ الانبیاء آیت نمبر: 73)
اور نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے کا حکم بھیجا۔

" وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 229)
اور یہ جائز نہیں ہے کہ جو مہر تم ان کو دے چکو اس میں سے کچھ واپس لے لو۔

" وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر: 247)
اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔

لفظِ سورۃ سے کیا مراد ہے؟

السورۃ

کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں۔ اور سورۃ المدینۃ کے معنی شہر پناہ کے ہیں اور سورۃ القرآن (قرآن کی سورت) یا تو سور المدینۃ سے ماخوذ ہے کیونکہ سورۃ بھی شہر پناہ کی طرح قرآن کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے انہیں سورۃ القرآن کہا جاتا ہے اور یا سورۃ بمعنی مرتبہ سے مشتق ہے، اور سورۃ بھی منازل قمر کی طرح ایک منزلۃ ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور یہ دونوں اشتقاق اس وقت ہو سکتے ہیں جب اس میں واؤ کو اصلی مانا جائے لیکن اگر اسے اصل میں سورۃ مہموز مانا جائے تو یہ اسارت سے مشتق ہوگا جس کے معنی کچھ باقی چھوڑ دینے کے ہیں اور سورۃ بھی چونکہ قرآن ن کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہوتی ہے۔ اس

لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور آیت:

"سُوۡرَةٌ اَنۡزَلۡنٰهَا" (سورۃ النور آیت نمبر ۱)

یہ ایک سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا۔

میں سورۃ سے مراد احکام و حکم ہیں۔

لفظ دعا کا معنی:

(دعو) الدعاء (ن) (Blessing,Prayer)

کے معنی ندا کے ہیں مگر ندا کا لفظ کبھی صرف یا آیا وغیرہ ہما حروف ندا پر بولا جاتا ہے۔ اگر چہ ان کے بعد مناڈی مذکور نہ ہو لیکن دعاء کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب حرف ندا کے ساتھ اسم (منادی) بھی مزکور ہو جیسے یا فلاں۔ کبھی یہ دونوں یعنی دعاء اور نداء ایک دوسرے کی جگہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"كَمَثَلِ الَّذِيۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 171)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

تحقیق لفظِ شہید:

شہید یہ کبھی بمعنی شاہد یعنی گواہ آتا ہے چنانچہ آیت

"مَعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيۡدٌ" (سورۃ ق آیت نمبر 21)

اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ۔

میں شہید بمعنی گواہ ہی ہے جو اس کے لئے یا اس پر گواہی دیگا۔

اسی طرح آیت کریمہ:

"فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا" (سورۃ النساء ایت نمبر 41)

بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو لوگوں کا حال بتانے کو گواہ طلب کریں گے۔

میں بھی شہید بمعنی شاہد ہی ہے اور آیت کریمہ؛

"اَوۡ اَلۡقَى السَّمۡعَ وَهُوَ شَهِيۡدٌ" (سورۃ ق آیت نمبر 37) کان لگائے اور متوجہ ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں ان کے دل اس کی شہادت دیتے ہیں۔ بخلاف ان لوگوں کے جن کے متعلق فرمایا ہے:-

" أُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ "(سورۃ فصلت آیت نمبر 44)
ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

اور آیت کریمہ: " اَقِمِ الصَّلٰوةَ ۔ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا "
کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔

اس میں قرآن کے مشہود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قرات کرنے والے پر شفاء رحمت، توفیق، سکینت اور ارواح نازل ہوتی ہیں۔ جن کا کہ آیت؛

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ "(سورۃ الاسراء آیت نمبر 82)
اور ہم قرآن کے ذریعہ سے وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت:

"وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 23) اور جو تمہارے مددگار ہیں ان کو بلالو۔

میں شہداء کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جن پر معنی شہادت مشتمل ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کے معنی اعوان یعنی مددگار کے کئے ہیں اور مجاہدہ نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ جو تمہارے حق میں گواہی دیں۔ اور بعض نے شہداء سے وہ لوگ مراد لئے ہیں۔ جن کے موجود ہونے کو قابل قدر اور معتبر سمجھا جائے یعنی وہ ایسے لوگ نہ ہوں جن کے متعلق کہا گیا ہے؛

مخلّفون ویقضی اللہ أمر ھمو ... وھم بغیب وفی عمیاء ما شعروا

وہ پیچھے رہتے ہیں اور لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے ہیں وہ غیر حاضر اور بے خبر ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کو علم تک نہیں ہوتا۔

اور آیت کریمہ: "وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيْدًا "(سورۃ القصص آیت نمبر 75)
اور ہم امت میں سے گواہ نکال لیں گے۔

میں بھی شہید کا لفظ انہی معانی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ" (سورۃ العادیات ایت نمبر 7)
اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔

" اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ" (سورۃ فصلت آیت نمبر 53)
کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے۔

" وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا "(سورۃ النساء آیت نمبر 79)

اور اللہ کافی ہے گواہ۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

"لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ" (سورۃ غافر آیت نمبر 16)

اور کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں رہے گی۔

"يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 7)

وہ تو چھپے بھید اور پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

علی ہٰذا القیاس متعدد آیات ایسی ہیں جو اس معنی (یعنی علم باری تعالیٰ کے محیط ہونے) پر دال ہیں۔ اور قریب المرگ شخص کو بھی شہید کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں،

چنانچہ آیت کریمہ: "تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا ... الآیۃ" (سورۃ فصلت آیت نمبر 30)

ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ خوف نہ کرو۔

میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اور فرمایا: "وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ" (سورۃ الحدید آیت نمبر 19)

اور اپنے پروردگار کے نزدیک شہید ہیں ان کے لئے ان کے اعمال کا صلہ ہوگا۔

اور شہداء کو شہداء یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حالت نزع میں ان نعمتوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے ارواح باری تعالیٰ کے ہاں حاضر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 169-170)

اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں۔ شاد ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا۔

اور آیت کریمہ: "وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ" (سورۃ الحدید آیت نمبر 19)

گواہ اپنے رب کے یہاں ان کے لئے ان کا ثواب۔

بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ" (سورۃ البروج آیت نمبر 3)

اور اس دن کی جو گواہ ہے اور اس دن کی جس میں حاضر ہوتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مشہود سے یوم جمعہ مراد ہے اور بعض نے یوم عرفہ مراد لیا ہے۔ اور بعض نے یوم قیامت اور

شاھد سے ہر وہ شخص مراد ہوسکتا ہے جو اس روز میں حاضر ہوگا اور آیت کریمہ:

"يَوْمٌ مَشْهُوْدٌ" (سورۃ ھود آیت نمبر 103)

اور یہی وہ دن ہے جس میں خدا کے روبرو حاضر کئے جائیں گے۔

میں مشھود بمعنی مشاھد ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ وہ دن ضرور آکر رہے گا۔ التشھد کے معنی،

اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ

پڑھنے کے ہیں اور عرف میں تشہد کے معنی التحیات اور ان اذکار کے ہیں جو حالت تشہد (جلسہ) میں پڑھے جاتے ہیں۔

صدق کا معنیٰ:

(ص دق) الصدق۔ (Truth)

یہ ایک الکذب کی ضد ہے اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے۔ وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو۔ الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں پھر قول میں بھی صرف خبر کے لئے آتے ہیں اور اس کے ماسوا دیگر اصناف کلام میں استعمال نہیں ہوتے اسی لئے ارشاد ہے۔

"وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا" (سورۃ النساء ایت نمبر 122)

اور خدا سے زیادہ وہ بات کا سچا کون ہوسکتا ہے۔

نوٹ: اس آیت میں مذکوت باقی الفاظ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 24]

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (24)

"پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار رکھی ہے کافروں کے لئے"۔

متن:

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

لما بين لهم ما يتعرفون به أمر الرسول صلّى الله عليه وسلّم وما جاء به، وميز لهم الحق عن الباطل، رتب عليه ما هو كالفذلكة له، وهو أنكم إذا اجتهدتم في معارضته وعجزتم جميعًا عن الإتيان بما يساويه أو يدانيه، ظهر أنه معجز والتصديق به واجب،

فآمنوا به واتقوا العذاب المعد لمن كذب، فعبر عن الإتيان المكيف بالفعل الذى يعم الإتيان وغيره إيجازاً، ونزل لازم الجزاء منزلته على سبيل الكناية تقريراً للمكنى عنه، وتهويلاً لشأن العناد، وتصريحاً بالوعيد مع الإيجاز، وصدر الشرطية بإن التى للشك والحال يقتضى إذا الذى للوجوب، فإن القائل سبحانه وتعالى لم يكن شاكاً فى عجزهم، ولذلك نفى إتيانهم معترضاً بين الشرط والجزاء تهكماً بهم وخطاباً معهم على حسب ظنهم، فإن العجز قبل التأمل لم يكن محققاً عندهم. وتَفْعَلُوا جزم ب لَمْ لأنها واجبة الإعمال مختصة بالمضارع متصلة بالمعمول، ولأنها لما صيرته ماضياً صارت كالجزء منه.

وحرف الشرط كالداخل على المجموع فكأنه قال: فإن تركتم الفعل، ولذلك ساغ اجتماعهما. وَلَنْ كلا فى نفى المستقبل غير أنه أبلغ وهو حرف مقتضب عند سيبويه والخليل فى إحدى الروايتين عنه، وفى الرواية الاخرى أصله لا أن، وعند الفراء لا فأبدلت ألفها نوناً. والوَقود بالفتح ما توقد به النار، وبالضم المصدر وقد جاء المصدر بالفتح قال سيبويه:

وسمعنا من يقول وقدت النار وَقوداً عاليا، والاسم بالضم ولعله مصدر سمي به كما قيل: فلان فخر قومه وزين بلده، وقد قرئ به والظاهر أن المراد به الاسم، وإن أريد به المصدر فعلى حذف مضاف أى: وقودها احتراق الناس، والحجارة: وهى جمع حجر. كجمالة جمع جمل وهو قليل غير منقاس، والمراد بها الاصنام التى نحتوها وقرنوا بها أنفسهم وعبدوها طمعًا فى شفاعتها والانتفاع بها واستدفاع المضار لمكانتهم، ويدل عليه قوله تعالى: إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ. عذبوا بما هو منشأ جرمهم كما عذب الكافرون بما كنزوه. أو بنقيض ما كانوا يتوقعون زيادة فى تحسرهم. وقيل: الذهب والفضة التى كانوا يكنزونها ويغترون بها، وعلى هٰذا لم يكن لتخصيص إعداد هٰذا النوع من العذاب بالكفار وجه، وقيل: حجارة الكبريت وهو تخصيص بغير دليل وإبطال للمقصود، إذ الغرض تهويل شأنها وتفاقم لهبها بحيث تتقد بما لا يتقد به غيرها، والكبريت تتقد به كل نار وإن ضعفت، فإن صح هٰذا عن ابن عباس رضى الله تعالى عنهما فلعله عنى به أن الاحجار كلها لتلك النار كالحجارة

الكبريت لسائر النيران. ولما كانت الآية مدنية نزلت بعد ما نزل بمكة قوله تعالى فى سورة التحريم نَاراً وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ. وسمعوه صح تعريف النار. ووقوع الجملة صلة «بإزائها» فإنها يجب أن تكون قصة معلومة.

ترجمہ:

"پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں"

ماقبل آیت کریمہ میں ایسی چیزوں کا بیان ہوا جن کے ذریعے وہ نبی کریم کی نبوت وشریعت کی پہچان کر سکتے ہیں۔ اور ان کی آسانی کے لئے حق کو باطل سے علیحدہ کر دیا۔ اس آیت میں خلاصہ کلام پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے تمام مددگاروں کو بلا کو پوری کوشش کرلیں کہ اس کلام کی مثل لاؤ۔ پھر جب وہ عاجز آجائیں تو قرآن کریم کے حق ہونے کو تسلیم کرلو اور اس پر ایمان لاؤ۔ اور اس کلام کے پیش کرنے والے کو سچا نبی تسلیم کرلو۔ ورنہ اس عذاب کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جو کافروں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اور وہ آگ کا عذاب اتنا شدید ہے کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، ماقبل کلام کے تقاضا کے مطابق اس مقام پر،

فأن لم تاتوا فلن تاتوا

ہونا چاہئے تھا لیکن اتیان کا وہ فعل جو بسورۃ کے ساتھ مقید ہے اس کو فعل کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔ جو عام ہے اتیان اور اس کے علاوہ ہو وہ سب کو شامل ہے۔ اس کی حکمت ایجاز اور اختصار ہے اور اس مقام پر چاہئے تو یہ تھا جو جواب شرط،

فامنوا به واتر كوا العناد

ذکر کیا جاتا لیکن یہاں،

لازم الجزاء فاتقوا النار التى الى آخره

بطور کنایہ ذکر کیا گیا ہے اور وہ لازم سے ملزوم کی طرف انتقال ہے تا کہ مکنی عنہ ثابت ہو جائے اور عناد کی ہولنا کی ظاہر ہو جائے اور اختصار کے ساتھ وعید کی تصریح ہو جائے۔

یہاں جملہ شرطیہ کا آغاز اس حرف کے ساتھ کیا گیا ہے جو متکلم کے شک کو ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ ان ہے۔ حالانکہ سیاق و سباق کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں کمہ شرط اذا ذکر کیا جاتا۔ جو یقین کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ متکلم اللہ کریم کی ذات ہے جس کو ان کا اس کے مقابلے میں کلام نہ لانے میں ذرا برابر شک نہ تھا اور ان کا عجز مسلّم تھا اس وجہ سے اللہ کریم نے شرط اور جزاء کے درمیان بطور جملہ معترضہ ان کے کلام نہ لانے کی نفی ذکر فرما دی ہے اس کی وجہ کفار کا مذاق اڑانا اور اس کے ساتھ طنز کرنا مقصود تھا۔ اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ کتنے جاہل اور نادان ہیں کہ وہ اس چیز کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں جس کا وہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اور اس کے انسانی کلام نہ ہونے کو بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ پھر بھی وہ اسے اللہ کریم کا کلام تسلیم نہیں کرتے۔

نوٹ: اس مقام پر کلمہ شرط اِن ذکر فرمایا متکلم کے شک کو ظاہر کرتا ہے اور اذا ذکر نہیں فرمایا جو متکلم کے یقین کو ظاہر کرتا،

اس کی دو وجوہات تھیں۔

(1) یہ انداز تکلم بطور طنز اختیار کیا گیا ہے تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ ایسے عقل کے اندھے ہیں کہ جس کلام کا حق ہونا اظہر من الشمس ہے اسے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

(2) ان کا لفظ کفار کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے بیان کیا گیا ہے، نہ کہ متکلم کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے کیونکہ کافر لوگ اس کی مثل کلام پیش کرنے سے عاجز آنے میں شک کر رہے تھے۔ اور انہوں نے ابھی تک اس میں تدبر ہی نہیں کیا تھا اسی لئے وہ پریشان تھے کہ وہ ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں یا نہیں۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لم تفعلوا کے جملہ میں تفعلوا کا عامل ان شرطیہ ہے۔ یا لم نافیہ ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ تفعلوا کا عامل لم ہے ان نہیں جس کی چند وجوہات درج ذیل ہیں۔

☆ لم تفعلوا کے قریب ہے بنسبت ان کے اور عامل قریب عمل کرنے کا زیادہ حق دار ہوتا ہے۔

☆ لم کا عمل واجب ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ فعل مضارع پر ہی داخل ہوتا ہے۔ جبکہ ان کا اپنے مابعد میں عمل جائز ہوتا ہے اور وہ جملہ اسمیہ پر بھی داخل ہوتا ہے۔ اس لئے تفعلوا کا عامل لم ہی ہوگا۔

☆ لم اپنے مابعد کے ساتھ مل کر فعل ماضی منفی کا معنی دیتا ہے۔

گویا کہ وہ فعل کا جزء ہے اس لئے حرف ان، لم اور اس کے مابعد فعل کے مجموعہ پر داخل ہوگا اور عبارت اس طرح ہوگی۔

ان ترکتم الاتیان... الی اخرہ

اس لئے ان دونوں کا اجتماع جائز ہے۔ گویا ان دونوں کے مجموعہ پر داخل ہے۔

حرف لَنْ کی تحقیق:

یہ لا کی طرح زمانہ مستقبل میں فعل کی نفی کرنے کے لئے اور اس میں تاکید پیدا کرنے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے اور یہ لا سے زیادہ بلیغ ہے اس کی اصل میں دو قول ہیں، سیبویہ اور خلیل نحوی کی ایک روایت کے مطابق یہ حرف مرتجل ہے (یعنی کسی سے ماخوذ نہیں) اور خلیل نحوی کے نزدیک یہ اصل میں لا ان تھا ان کے ہمزہ کو کثرت استعمال کی وجہ سے گرا دیا اور اجتماع ساکنین سے الف کو بھی گرا دیا تو لن ہو گیا۔ فراء کے نزدیک اصل میں لام تھا الف کو نون سے بدل دیا تو لن ہو گیا۔

"النار"

یہاں اس کو معرفہ اس لئے ذکر کیا کہ سورۃ تحریم جو مکہ میں نازل ہوئی اس میں اس کا ذکر ہو چکا ہے اور اسی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے گویا یہ قصہ ان میں مشہور تھا۔

"وقود"

واؤ کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی ایندھن، اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے جس کا مطلب آگ جلانا ہے۔

"الحجارة"

اس کا مفرد الحجر ہے اور اس کا معنیٰ پتھر ہے۔ مگر یہاں اس سے مراد کفار کے معبودان باطلہ ہیں جن کو انہوں نے پتھروں سے تراش کر بنایا ہوا تھا۔ اور اُن کی پوجا کرتے تھے۔ اور انہی سے امیدیں بھی وابستہ کرتے تھے۔ اور ان کافروں کو ان کے معبودوں کے ساتھ عذاب دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ ان کے کفر وشرک کا سبب تھے۔ جس طرح سونے اور چاندی کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کو سونا اور چاندی پگھلا کر انہی کے ساتھ سزا دی جائے گی۔

کفار کے اس خیال کو رد کرنے کے لئے ان کے یہ خدا ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں یا انہیں عذاب سے بچا سکتے ہیں بلکہ یہ تو الٹا ان کے لئے شدید ترین عذاب ہوگا۔

حجارۃ کا دوسرا معنیٰ سونا اور چاندی ہے لیکن اس صورت میں اس عذاب کی کفار کے ساتھ تخصیص نہیں ہوگی کیونکہ سونا اور چاندی کی زکوٰۃ نہ دینے والے مومنوں کو بھی اس کے ساتھ سزا دی جائے گی۔

گندھک والے پتھر جن کے ساتھ آگ روشن کی جاتی ہے، لیکن امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں اس کے ساتھ خاص کرنا بغیر دلیل کے ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں۔ اور آیت کے مقصود کے خلاف ہے۔

متن:

أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ

هيئت لهم وجعلت عدة لعذابهم. وقرء: »أعتدت« من العتاد بمعنى العدة. والجملة استئناف، أو حال بإضمار قد من النار لا الضمير الذى فى وقودها، وإن جعلته مصدراً للفصل بينهما بالخبر. وفى الآيتين ما يدل على النبوة من وجوه:

الاول: ما فيهما من التحدى والتحريض على الجد وبذل الوسع فى المعارضة بالتقريع والتهديد، وتعليق الوعيد على عدم الإتيان بما يعارض أقصر سورة من سور القرآن، ثم إنهم مع كثرتهم واشتهارهم بالفصاحة وتهالكهم على المضادة لم يتصدوا لمعارضته، والتجؤوا إلى جلاء الوطن وبذل المهج.

الثانى: أنهما يتضمنان الإخبار عن الغيب على ما هو به، فإنهم لو عارضوه بشيء لامتنع خفاؤه عادة سيما والطاعنون فيه أكثر من الذابين عنه فى كل عصر.

الثالث: أنه صلّى الله عليه وسلّم لو شك فى أمره لما دعاهم إلى المعارضة بهذه المبالغة، مخافة أن يعارض فتدحض حجته.

وقوله تعالى: أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ دل على أن النار مخلوقة معدة الآن لهم.

ترجمہ:

اور وہ آگ جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اور یہ کافروں کی سزا کا انتظام ہے۔ اور "أعدت" کو "اعتدت" کر کے بھی پڑھا گیا ہے۔ اس وقت یہ "عتاد" سے مشتق ہوگا جو "عدۃ" کے معنی میں ہے اور "عدۃ" اس ساز وسامان کو کہا جاتا ہے۔ جو مشکلات میں بچاؤ کے لئے تیار کیا جاتا ہے جیسے گھوڑا وغیرہ اور ترکیب کلام میں یہ یا تو جملہ مستانفہ ہے یا "النار" سے حال ہے اگر اسے حال بنایا جائے تو اس سے پہلے "قد" محذوف ہوگا۔ "وقودھا" کی "ھا" ضمیر سے اسے حال بنانا جائز نہیں، جبکہ مصدر کو "وقود" کو مصدر کے معنی میں کیا جائے کیونکہ اس صورت میں حال اور ذوالحال کے درمیان خبر کے ساتھ فاصلہ لازم آتا ہے جو کہ "الناس" اور "الحجارۃ" ہے حال اور ذوالحال کے درمیان اجنبی چیز سے فاصلہ جائز نہیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیات نبی کریم ﷺ کی نبوت پر کئی طرح سے دلالت کرتی ہے۔ ان میں سے تین یہ ہیں،

1۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن پاک پیش کیا، اس کی مثل لانے کا چیلنج کیا۔ اور حمایتیوں اور مددگاروں سے مدد حاصل کرنے کا بھی کہا گیا۔ لیکن جب وہ مثل لانے سے عاجز ہو گئے تو عذاب کی وعید سنائی گئی۔ جو ان کے لئے تیار کیا گیا تھا اور پھر مزید ڈرایا اور قرآن کی مثل چھوٹی سی بھی صورت نہ لانے کے ساتھ عذاب کو معلق کر دیا، لیکن وہ اپنی فصاحت و بلاغت میں ماہر ہونے اور نبی کریم ﷺ کی مخالفت پر حریص ہونے کے باوجود ایسا کلام پیش نہ کر سکے۔ اور نبی کریم ﷺ پر ظلم و ستم اور شہید کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔

اس سے ثابت ہوا کہ کوئی بھی اس کلام کی مثل نہیں لا سکتا کیونکہ یہ کلام حق ہے اور اس کو نبی کریم ﷺ لے کر آئے جو کہ غائب تھا اور غائب کلام کا آپ پر نازل ہونا آپ کے نبی ہونے کی دلیل ہے۔

2۔ نبی کریم ﷺ نے "لن تفعلوا" کہہ کر غائب کی خبر دی اور یہ پیشین گوئی فرما دی کہ وہ ایسا کلام کبھی بھی نہیں لا سکتے، اور یہ چیلنج آج تک بھی موجود ہے جس کا کوئی بھی مقابلہ نہ کر سکا۔

3۔ اگر نبی کریم ﷺ کو ذرا برابر بھی شک ہوتا وہ اس کی زوردار انداز میں چیلنج نہ فرماتے اس ڈر سے کہ کہیں اس کے جواب میں کلام پیش کر کے آپ کی دلیل کو باطل ہی نہ کر دے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ جہنم اب مخلوق ہے اور وہ کفار کے لئے تیار کر دی گئی ہے۔

حرف لم کا استعمال:

(لم (حرف) لم۔

کے بعد اگرچہ فعل مستقبل آتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ اسے ماضی منفی بنا دیتا ہے۔ اور اس پر ہمزہ استفہام تقریر کے

لئے آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"اَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 18)

کیا ہم نے لڑکپن میں تمہاری پرورش نہیں کی تھی۔

فعل کا معنیٰ:

(ف ع ل) الفعل (Verb)

کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تاثیر عمدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عمدگی کے ہو اور علم سے ہو یا بغیر علم کے قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے پھر وہ تاثیر انسان کی طرف سے ہو یا دوسے حیوانات اور جمادات کی طرف سے ہو یہی معنی لفظ عمل کے ہیں۔

لفظ وقی کا مفہوم:

(و ق ی) وقی (ض) (Fear of ALLAH, Piety)

وقایتہ و وقاء کے معنی کسی چیز کو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَوَقَاهُمُ اللّٰهُ" (سورۃ الانسان آیت نمبر 11)   تو خدا ان کو بچالیگا۔

التقویٰ

اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 35)

جو شخص ان پر ایمان لا کر خدا سے ڈرتا رہے گا اور اپنی حالت درست رکھے گا۔ ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

"وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 56)

اور اللہ نے انہیں آگ کے عذاب سے بچالیا۔

"وَمَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَاقٍ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 34)

اور انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں۔

"مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 37)

تو اللہ کے آگے نہ تیرا کوئی حمایتی ہوگا نہ بچانے والا۔

"قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" (سورۃ التحریم آیت نمبر 6)

اپنے آپ کو اور اپنے اہل عیال کو آتش جہنم سے بچاؤ۔

نار کی تعریف:

(ن و ر) نار (Fire,Flame)

اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"اَفَرَاَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ" (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 71)

تو بھلا بتاؤ تو وہ آگ جو تم روشن کرتے ہو۔

حجر کسے کہتے ہیں؟:

(ح ج ر) الحجر (Stone)

سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع احجار وحجارۃ آتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 24)

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

تحقیق لفظِ عدد:

(ع د د) العدد (Number)

الاعداد تیار کرنا مہیا کرنا یہ عد سے ہے جیسے سقی سے اسقاء اور اعددت ھذا لک کے معنیٰ ہیں کہ یہ چیز میں نے تمہارے لئے تیار کردی ہے کہ تم اسے شمار کر سکتے ہو اور جس قدر چاہو اس سے حسب ضرورت لے سکتے ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 60)

اور ان کے لئے تیار رکھو جو قوت تمہیں بن پڑے۔

"اُولٰئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 18)

ایسے لوگوں کے لئے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔

"وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 11)

اور ہم نے جھٹلانے والوں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً" (سورۃ یوسف آیت نمبر 31)

اور ان کے لئے ایک محفل مرتب کی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اعتدت بھی اسی (عد) سے ہے اور آیت کریمہ:

"وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 185) تم روزوں کا شمار پورا کرلو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ماہ رمضان کی گنتی پوری کرلو۔

"اَيَّاماً مَّعْدُوداتٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 184)

گنتی کے چند روز میں ماہ رمضان کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَاذْكُرُوا اللهَ فِي اَيَّامٍ مَّعْدُوداتٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 203)

اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں میں۔

میں سے عید قربان کے بعد کے تین دن مراد ہیں اور معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ایام معدودۃ سے یوم النحر اور اس کے بعد کے دو دن مراد ہیں اس صورت میں یوم النحر بھی ان تین دنوں میں شامل ہوگا۔

العداد اس مقرروقت کو کہتے ہیں جس میں بیماری کا دورہ پڑتا ہو۔

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا مازالت امة خیبر تعادنی کہ خیبر کے دن جو مسموم کھانا میں نے کھایا تھا اس کی زہر بار بار عود کرتی رہی ہے عدان الشئی کے معنی کسی چیز کے موسم یا زمانہ کے ہیں۔

نوٹ: کفر اور ناس کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 25]

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهارُ كُلَّما رُزِقُوا مِنْها مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقاً قالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوا بِهِ مُتَشابِهاً وَلَهُمْ فِيها اَزْواجٌ مُطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيها خالِدُونَ (25)

"اور خوشخبری دے انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں جب انہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا صورت دیکھ کر کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور وہ (صورت میں) ملتا جلتا انہیں دیا گیا اور ان کے لئے ان باغوں میں ستھری بیبیاں ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے"۔

متن:

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ

عطف على الجملة السابقة، والمقصود عطف حال من آمن بالقرآن العظيم ووصف

ثوابه، على حال من كفر به، وكيفية عقابه على ما جرت به العادة الإلهية من أن يشفع الترغيب بالترهيب، تنشيطاً لاكتساب ما ينجي، وتثبيطاً عن اقتراف ما يردي، لا عطف الفعل نفسه حتى يجب أن يطلب له ما يشاكله من أمر أو نهي فيعطف عليه أو على فاتقوا، لأنهم إذا لم يأتوا بما يعارضه بعد التحدي ظهر إعجازه، وإذا ظهر ذلك فمن كفر به استوجب العقاب، ومن آمن به استحق الثواب، وذلك يستدعي أن يخوف هؤلاءِ ويبشر هؤلاء، وإنما أمر الرسول صلى الله عليه وسلم، أو عالم كل عصر، أو كل أحد يقدر على البشارة بأن يبشرهم. ولم يخاطبهم بالبشارة كما خاطب الكفرة تفخيماً لشأنهم وإيذاناً بأنهم أحقاء بأن يبشروا ويهنأوا بما أعد لهم.

وقرء «وَبُشِّرَ» على البناء للمفعول عطفاً على أعدت فيكون استئنافاً. والبشارة: الخبر السار فإنه يظهر أثر السرور في البَشَرة، ولذلك قال الفقهاء البشارة: هي الخبر الاول حتى لو قال الرجل لعبيده: من بشرني بقدوم ولدي فهو حر، فأخبروه فرادى عتق أوّلُهم، ولو قال: من أخبرني عتقوا جميعاً، وأما قوله تعالى:

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيمٍ فعلى التهكم أو على طريقة قوله: تَحِيَّةُ بينهم ضرب وجيع.

ترجمہ:

وبشر الذین اٰمنوا۔۔۔ الخ

کا عطف فاتقوا النار التی۔۔۔ الخ پر ہے۔ تو دریں صورت معنی یہ ہوگا کہ قرآن کریم کے مقابلے میں کلام لانے سے عاجز ہونے اور اسلام نہ قبول کرنے کے سبب عذاب کے مستحق ہیں اور جنہوں نے اسلام قبول کر لیا وہ ثواب کے مستحق۔ اسی وجہ سے کفار کو وعید اور مسلمانوں کو خوشخبری سنائی گئی اور یہ استحقاق مناسبت ہے معطوف و معطوف الیہ کے درمیان۔

ماقبل آیت میں حق قبول نہ کرنے والے بدبختوں کا ذکر وانجام بیان ہوا ہے۔ اللہ کریم کی یہ عادت وطریقہ ہے کہ جب بھی کافروں کو عذاب کی وعید سناتا ہے تو اس کے بعد مومنین، اطاعت کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری بھی سناتا ہے اور انعامات عطا کرنے کا وعدہ بھی کرتا ہے۔ تاکہ سامع کو دونوں کا انجام معلوم ہو جائے اور وہ عبرت حاصل کریں، یہاں پر بھی اللہ کریم نے اوّل ڈر کا بیان کیا اور بعد میں خوشخبری کی نوید سنائی۔

بشر یہ فعل امر کا صیغہ ہے اور تبشیر سے مشتق ہے اس کا معنی خوشخبری دینا ہے، یہ بشارت سے اخذ ہے اور بشارت اس خبر کو کہتے ہیں۔ جس کا اثر چہرے اور رخساروں پر ظاہر ہو اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جس آدمی نے اپنے غلاموں کو کہا

من بشرنی بقدوم ولدی فھو حر

تو آزاد وہی ہوگا جو سب سے پہلے خبر سنائے گا۔ اور جس نے ایسا کہا

من اخبرنی هذا فهو حر

اس صورت میں جتنے بھی غلام خبر دیں گے سب کے سب آزاد ہوں گے۔ کیونکہ خوشی کا اثر خبر اوّل سے ہی واضح ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بشات کا معنیٰ خوشخبری دینا ہے تو اس آیت سے کیا مراد ہوگا؟

فبشر هم بعذاب اليم

کیونکہ عذاب کی خبر باعث مسرت نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کفار کو چڑانے اور بطور استہزاء ہے۔ بشارت کے دو معانی ہے۔ متعارف وغیر متعارف

1۔ متعارف وہ ہے جس سے خوشی کا اثر ظاہر ہوتا ہے

2۔ غیر متعارف وہ ہے جو غم زدہ کرنے والی ہے جیسا کہ قولِ شاعر،

تَحِيَّةٌ بينهم ضرب وجيع.

یعنی ہمارے درمیان پہلا سلام دردناک ضرب ہے۔ حالانکہ تحیۃ سلامتی کی علامت ہے، نیز بشر کو بُشِر ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا گیا ہے اور اس صورت میں اس کا عطف،

أُعدت للكافرين

پر ہی ہوگا اور اعدت۔۔۔ الخ کی مثل یہ بھی جملہ مستانفہ ہے۔

متن:

والصَّالِحاتِ جمع صالحة وهى من الصفات الغالبة التى تجرى مجرى الاسماء كالحسنة. قال الخطيئة:

كَيْفَ الهِجَاءُ وما تَنْفَكُّ صالحة ... من آل لامٍ بظُهْرِ الغَيْبِ تَأْتِينى

وهى من الاعمال ما سوغه الشرع وحسنه. وتأنيثها على تأويل الخصلة. أو الخلة. واللام فيها للجنس، وعطف العمل على الإيمان مرتباً للحكم عليهما إشعاراً بأن السبب فى استحقاق هذه البشارة مجموع الامرين والجمع بين الوصفين. فإن الإيمان الذى هو عبارة عن التحقيق والتصديق اُسٌّ، والعمل الصالح كالبناء عليه. ولا غناءَ بأُسٍ لا بناء عليه، ولذلك قلما ذكرا منفردين. وفيه دليل على أنها خارجة عن مسمى الإيمان. إذ الاصل أن الشىء لا يعطفُ على نفسه ولا على ما هو داخل فيه.

اَنَّ لَهُمْ منصوب بنزع الخافض وإفضاء الفعل إليه، أو مجرور بإضماره مثل: الله

لأفعلن. والجنة:

المرة من الجن وهو مصدر جنة إذا ستره، ومدار التركيب على الستر، سمي بها الشجر المظلل لالتفاف أغصانه للمبالغة كأنه يستر ما تحته سترة واحدة قال زهير:

كأنَّ عَينِي فى غَربى مقتلَة ... من النواضِح تَسقى جَنَّةً سُحُقا

أى نخلاً طوالاً، ثم البستان، لما فيه من الاشجار المتكاثفة المظللة، ثم دار الثواب لما فيها من الجنان، وقيل: سميت بذلك لأنه ستر فى الدنيا ما أعد فيها للبشر من أفنان النعم كما قال سبحانه وتعالى:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ وجمعها وتنكيرها لأن الجنان على ما ذكره ابن عباس رضى الله عنهما سبع: جنة الفردوس، وجنة عدن، وجنة النعيم، ودار الخلد، وجنة المأوى، ودار السلام، وعِلِّيُون، وفى كل واحدة منها مراتب ودرجات متفاوتة على حسب تفاوت الاعمال والعمال. واللام فى لَهُمْ تدل على استحقاقهم إياها، لأجل ما ترتب عليه من الإيمان والعمل الصالح، لا لذاته فإنه لا يكافئ النعم السابقة، فضلاً عن أن يقتضى ثواباً وجزاء فيما يستقبل بل بجعل الشارع، ومقتضى وعده تعالى لا على الإطلاق، بل بشرط أن يستمر عليه حتى يموت وهو مؤمن لقوله تعالى: وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وقوله تعالى لنبيه صلّى الله عليه وسلّم لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وأشباه ذلك، ولعله سبحانه وتعالى لم يقيد هاهنا استغناء بها.

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ أى من تحت أشجارها، كما تراها جارية تحت الاشجار النابتة على شواطئها. وعن مسروق أنهار الجنة تجرى فى غير أخدود: واللام فى الْأَنْهَارُ للجنس، كما فى قولك لفلان: بستان فى الماء الجارى، أو للعهد، والمعهود: هى الانهار المذكورة فى قوله تعالى: فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ الآية. والنهر بالفتح والسكون: المجرى الواسع فوق الجدول ودون البحر، كالنيل والفرات، والتركيب للسعة، والمراد بها ماؤها على الإضمار، أو المجاز، أو المجارى أنفسها. وإسناد الجرى إليها مجاز كما فى قوله تعالى: وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا الآية.

ترجمہ:

وہ عمل جس کو شریعت جائز قرار دے اور غلبہ استعمال میں یہ ان اسمائے جامدہ کے قائمقام ہے جو موصوف کے بغیر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حسنۃ کا لفظ ہے اسی طرح حطیہ شاعر آل لام کی تعریف میں لکھتا ہے۔

كَيْفَ الهِجَاءُ وما تَنْفَكُّ صالحة ... من آل لامٍ بظُهْرِ الغَيْبِ تأْتِيني

مذمت کیونکہ ہو سکتی ہے جبکہ آل لام کی طرف سے میری عدم موجودگی میں بھی انعام مجھ تک پہنچتے رہتے ہیں۔ اس شعر میں صالحہ کا لفظ بغیر موصوف کے ذکر کیا گیا ہے۔ آیت طیبہ میں صالحات کو مؤنث ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گویا اس سے پہلے الخصال موصوف محذوف تصور کیا جائے گا، اصل عبارت یوں تھی،

"الخصال الصالحات"

حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ صالحہ وہ عمل ہو گا جس میں درج ذیل چار چیزیں ملحوظ خاطر ہوں گی۔

(1)علم (2)نیت (3)صبر (4)اخلاص

ہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پر "ال" کیسا ہے اور "امنوا" پر اس کے عطف سے کیا مراد ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ "ال جنسی ہے اور اس کے دخول کا مقصد تمام اعمال صالحہ کا استغراق نہیں بلکہ اس سے وہ اعمال مراد ہیں جن کے کرنے کی عام طور پر انسان سے توقع ہوتی ہے۔

نیز ایمان پر عطف کرنے کا مقصد اس بت کو واضح کرتا ہے کہ جنت کی بشارت کا حقدار وہی ہو گا جو ایمان اور اعمال صالحہ دونوں سے مزین ہو گا۔ کیونکہ ایمان اس بشارت کی بنیاد ہے۔ اور اعمال اس کی عمارت، اور بنیار بغیر تعمیر کے غیر مفید ہوتی ہے اسی طرح اعمال کے بغیر ایمان بھی غیر مفید ہو گا اور اس کو ایمان پر معطوف کر کے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ اعمال ایمان کے مفہوم میں داخل نہیں۔ بلکہ اس کے مفہوم سے خارج ہیں اور ایمان نفس تصدیق قلبی کا نام ہے، ورنہ معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان تغایر باقی نہیں رہے گا۔

"لھم" ہم سے پہلے لام اختصاص کے معنی میں ہے، اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مومنین ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے جنت کے مستحق ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں کیونکہ ان کے یہ اعمال اور ایمان، سابقہ نعمتوں کا بدل بھی نہیں ہو سکتے، قطع نظر اس کے کہ وہ مزید کے مستحق ہوں بلکہ وہ اس استحقاق کا سبب بھی اسی بنا پر ہیں کہ شارع نے ان کو جنت عطا کرنے کا وعدہ فرما دیا وہ بھی اس شرط پر کہ ان کی موت بھی ایمان پر ہوں ورنہ ان کے سارے اعمال ضائع ہوں گے۔

"ان لھم" یہ حرف جر کے حذف کے ساتھ یا تو منصوب ہے اور فعل کو بلا واسطہ اس کی طرف متعدی کر دیا گیا اور یا بتقدیر حرف جر یہ مجرور ہے جیسے "اللہ لافعلن" میں لفظ اللہ میں دونوں احتمال ہیں۔

"جنات" اس کا مفرد جنۃ ہے، یہ جن سے نکلا ہے جس کا معنی چھپانا اور جہاں بھی کسی چیز کو چھپانے اور مخفی ہونے کے معنی

پائے جائیں۔ وہاں اسی مادہ سے کوئی لفظ مشتق کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً گھنے درخت کو جنت کہتے ہیں۔

"مجنون" جس کی عقل پوشیدہ ہو۔

"جنین" وہ بچہ جو پیدا ہونے سے پہلے فوت ہو جائے، جنۃ کا معنی ڈھال ہے۔ لیکن یہاں اس سے مراد بساتین اور دارالثواب ہے کیونکہ وہ بھی اوجھل اور پوشیدہ ہے۔ اس کو نکرہ اور جمع ذکر کرنے کا سبب یہ ہے کہ جنت ایک نہیں بلکہ سات ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ جنتیں سات ہیں ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

☆جنت الفردوس ☆جنت عدن ☆جنت نعیم ☆دارالخلد
☆جنت الماوی ☆دارالسلام ☆علیون

ان تمام اجنات کے مختلف درجے اور مراتب ہیں جو مومنین کو ان کے اعمال کے اعتبار سے عطا کئے جائیں گے۔

"الانہار" اس کا معنی کشادہ کرنا ہے، جب کوئی اپنے مخالف کو نیزہ مار کر زخمی کر دیتا ہے تو کہا جاتا ہے۔

نهرته بالرمح

کہ میں نے اس کے زخم کے نیزے کے ساتھ کھلا کر دیا۔ اور دن کی روشنی کو بھی نہار کہتے ہیں۔ بوجہ وسیع ہونے کے، اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اصل میں "ماء الانہار" تھا۔ حضرت مسروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنت کی نہروں کا پانی بغیر اخدود اور کھائیوں کے بہتا ہے۔ اور اس پر الف لام کے دو احتمال ہیں۔

(1) جنسی: یعنی اس سے نہروں کا کوئی خاص فرد مراد نہیں۔

(2) عہد خارجی: اس سے مراد ایسی نہریں ہیں جن کا تذکرہ

فيها انهار غير اسن

میں ہے:

واسناد اجری مجاز كما فی قوله تعالىٰ واخرجت الارض اثقالها الآيه

متن:

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقاً

قَالُوا هٰذَا الَّذِی رُزِقْنَا صفة ثانية لجنات، أو خبر مبتدأ محذوف، أو جملة مستأنفة. كأنه لما قيل: إن لهم جنات، وقع فی خلد السامع أثمارها مثل ثمار الدنيا، أو أجناس أخر فأزيح بذلك، وكُلَّمَا نصب على الظرف، ورِزْقاً مفعول به، ومن الاولى والثانية للابتداء واقعتان موقع الحال، وأصل الكلام ومعناه: كل حين رزقوا مرزوقاً مبتدأ من الجنات مبتدأ من ثمرة. قيد الرزق بكونه مبتدأ من الجنات، وابتداؤه منها بابتدائه من ثمرة

فصاحب الحال الاولى رزقاً وصاحب الحال الثانية ضميره المستكن في الحال، ويحتمل أن يكون من ثمره. بياناً تقدم كما في قولك: رأيت منك أسداً. وهٰذا إشارة إلى نوع ما رزقوا كقولك مشيراً إلى نهر جار: هٰذا الماء لا ينقطع، فإنك لا تعني به العين المشاهدة منه، بل النوع المعلوم المستمر بتعاقب جريانه وإن كانت الإشارة إلى عينه. فالمعنى هٰذا مثل رزقنا ولكن لما استحكم الشبه بينهما جعل ذاته ذاته كقولك: أبو يوسف أبو حنيفة.

مِنْ قَبْلُ أي: من قبل هٰذا في الدنيا، جعل ثمر الجنة من جنس ثمر الدنيا لتميل النفس إليه أول ما يرى، فإن الطباع مائلة إلى المألوف متنفرة عن غيره، ويتبين لها مزيته و كنه النعمة فيه، إذ لو كان جنساً لم يعهد ظن أنه لا يكون إلا كذلك، أو في الجنة لأن طعامها متشابه في الصورة، كما حكى ابن كثير عن الحسن رضي الله عنهما: (أن أحدهم يؤتى بالصحفة فيأكل منها، ثم يؤتى بأخرى فيراها مثل الاولى فيقول ذلك، فيقول الملك: كل فاللون واحد والطعم مختلف). أو كما

روى أنه عليه الصلاة والسلام قال: »والذي نفس محمد بيده، إن الرجل من أهل الجنة ليتناول الثمرة ليأكلها فما هي بواصلة إلى فيه، حتى يبدل الله تعالى مكانها مثلها«

. فلعلهم إذا رأوها على الهيئة الاولى قالوا ذلك، والاول أظهر لمحافظته على عموم كُلَّما فإنه يدل على ترديدهم هٰذا القول كل مرة رزقوا، والداعي لهم إلى ذلك فرط استغرابهم وتبجحهم بما وجدوا من التفاوت العظيم في اللذة والتشابه البليغ في الصورة.

ترجمہ:

"کلّما" ظرف ہونے کے سبب منصوب اور تکرار کے لئے ہے یہ آیت کریمہ یا تو جنات کی صفت ثانیہ ہے یا پھر مبتداء محذوف کی خبر ہے جو "ھم" یا "ھی" ضمیر ہے، یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور منھا اور من ثمرات من ابتدائیہ یا بیانیہ ہیں۔ اور رزق بمعنی مرزوق مفعول بہ ذوالحال یا مبین ہے اور منھا اور من ثمرات اس سے حال ہے۔

"متشابھاً" کا معنی ملتا جلتا، ایک دوسرے کی مثل ہے۔ "ھذا" یہ اسم اشارہ ہے اور اس کا مشار الیہ رزق کی جنس ہے نہ کہ کوئی رزق کا خاص فرد۔

"ازواج" جمع ہے زوج کی اور یہ مذکر و مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ ہر اس چیز کے لئے جس کا اسی جنس سے کوئی فرد ہو جیسے "زوج الخف"۔

"ازواج مّطهرة"۔

صاف ستھری بیویاں یعنی حوریں۔ "مطهرة" مشتق من التطهیر ہے۔ اس کا معنی اجسام کو پاک کرنے کے ساتھ ساتھ افعال و اخلاق کو مہذب کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔ تو پر معنی یہ ہوگا کہ وہ ازواج جن کو ہر اس عیب سے پاک کر دیا گیا جو عورتوں میں معیوب ہوتے ہیں۔ مثلاً حیض، نفاس، میل اور بد اخلاقی وغیرہ اس کو مطہرات، طاہرہ اور مطہرۃ بھی پڑھا گیا ہے۔ لیکن باب تفعیل سے اسم مفعول کا صیغہ پڑھنا زیادہ بہتر اور قریب از قیاس ہے۔ یعنی وہ جن کو اللہ کریم نے صاف ستھرا کر دیا ازواج کے لفظ کو دیکھتے ہوئے جمع مؤنث کا صیغہ اور اس کو جماعۃ کے معنی میں کرتے ہوئے واحد مؤنث کے صیغہ کا موصوف بنانا جائز ہے۔ جیسے النساء فعلت فعلن پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح ازواج مطہرۃ اور طاہرۃ پڑھنا بھی روا ہے۔

"خالدون" یہ مشتق ہے خلد یخلد سے۔ جمہور کے نزدیک جس کا معنی عرصہ دراز تک رہنا ہے اسی وجہ سے وہ اشیاء جو طویل عرصہ تک باقی رہتی ہیں انہیں "خوالد" کہتے ہیں۔ جیسے چولہے کے پتھر وغیرہ اور وہ عضو جو تا حیات بدستور قائم رہتا ہے اس کو بھی "خلد" کہتے ہیں اور اکثر مقامات پر "خالدون" کے بعد ابداً کے لفظ کا آنا اور،

وما جعلنا لبشرٍ من قبلك الخلد

کہ ہم نے آپ سے پہلے کسی انسان کے لئے ہیشگی نہ رکھی۔

یہ بھی مذکورہ بالا معنی کی تائید کرتے ہیں البتہ معتزلہ اس سے ایسی ہیشگی مراد لیتے ہیں جو ختم نہیں ہونے والی اسی سبب سے وہ کبیرہ گناہ کرنے والے مومن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مستحق عذاب کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے (اہلسنت و جماعت) نزدیک وہ اپنی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں چلا جائے گا۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جنت اور اس کی نعمتیں ابدی ہیں جبکہ ابدان ایسے اجزاء سے مرکب ہے جن میں تغیر لازم ہے، تو جنتیوں کا جنت میں رہنا کیسے ممکن ہوگا؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جنتیوں کے ابدان ایسے اجزاء سے مرکب کئے جائیں گے جن میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جنت دار البقاء ہے، دار الفناء نہیں تو وہاں کھانا پینا کیسا جبکہ کھانے کا مقصد بھوک مٹانا اور نکاح کا مقصد بچے پیدا کرنا ہے، تو ایسی نعمتوں کا کیا مقصد؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جنت کی ابدی نعمتوں کو دنیا کی بعض چیزوں کے ساتھ صفات و اسماء میں اشتراک کی وجہ سے تشبیہ دی گئی ہے نہ کہ فی کل الوجوہ ان کی مثل قرار دیا ہے۔ اور وہ لذت و نفع کا حصول ہے، جو جنتی حاصل کریں گے۔ اور تشبیہ کے لئے اتنا قدر تشابہ ہی کافی ہے۔

جنتی لوگوں کو جو رزق دیا جائے گا وہ رزق اسی رزق کے مشابہ ہوگا جو وہ دنیا میں استعمال کرتے رہے۔ تاکہ اس اخروی رزق کی فضیلت ظاہر ہو۔ وہ بہت مزے دار ہوگا تاکہ جنتی خوشدلی کے ساتھ استعمال کریں۔ حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ جب جنتیوں کو ایک تھال رزق سے بھرا ہوا پیش کیا جائے گا جو کہ دنیاوی رزق کی مثل ہوگا تو جنتی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم دنیا میں استعمال کرتے تھے، فرشتے کہیں گے کھا کر تو دیکھو، اس کے ذائقہ میں بہت فرق ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے پہلی توجیہ کو زیادہ پسند کیا ہے۔ اور یہی "کلّما" کے عموم کے موافق ہے کیونکہ "کلّما" کا لفظ بار بار یہ الفاظ کہنے پر دلالت کرتا ہے کہ جب بھی انہیں رزق دیا جائے گا تو اس کو عجیب گردانتے ہوئے اور اس بات پر فخر سمجھتے ہوئے کہ وہ اس لذت میں بہت فرق اور ان کی شکلوں میں بہت مشابہت محسوس کر رہے ہیں۔

متن:

وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهاً اعتراض يقرر ذلك والضمير على الاول راجع إلى ما رزقوا فى الدارين فإنه مدلول عليه بقوله عز من قائل هٰذَا الَّذِى رُزِقْنا مِنْ قَبْلُ ونظيره قوله عز وجل: إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيراً فَاللهُ أَوْلى بِهِما أى بجنسى الغنى والفقير، وعلى الثانى إلى الرزق.

فإن قيل: التشابه هو التماثل فى الصفة وهو مفقود بين ثمرات الدنيا والآخرة كما قال ابن عباس رضى الله تعالى عنهما: ليس فى الجنة من أطعمة الدنيا إلا الاسماء.

قلت: التشابه بينهما حاصل فى الصورة التى هى مناط الاسم دون المقدار والطعم، وهو كاف فى إطلاق التشابه هنا: وإن للآية الكريمة محملاً آخر، وهو أن مستلذات أهل الجنة فى مقابلة ما رزقوا فى الدنيا من المعارف والطاعات، متفاوتة فى اللذة بحسب تفاوتها. فيحتمل أن يكون المراد من هٰذَا الَّذِى رُزِقْنا أنه ثوابه، ومن تشابهما تماثلهما فى الشرف والمزية وعلو الطبقة. فيكون هٰذَا فى الوعد نظير قوله:

ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ فى الوعيد.

وَلَهُمْ فِيها أَزْواجٌ مُطَهَّرَةٌ مما يستقذر من النساء ويذم من أحوالهن، كالحيض والدرن ودنس الطبع وسوء الخلق. فإن التطهير يستعمل فى الاجسام والاخلاق والافعال. وقرئ: «مطهرات» وهما لغتان فصيحتان يقال النساء فعلت وفعلن، وهن فاعلة وفواعل. قال:

وإذَا العَذَارى بالدّخَانِ تَقَنَّعَت ... واسْتَعجلتْ نَصْبَ القُدورِ فملَّت

فالجمع على اللفظ. والإفراد على تأويل الجماعة. ومطهرة بتشديد الطاء و كسر الهاء

بمعنى متطهرة، ومطهرة أبلغ من طاهرة ومطهرة للإشعار بأن مطهراً طهرهن وليس هو إلا الله عز وجل. والزوج يقال للذكر والانثى، وهو فى الاصل لما له قرين من جنسه كزوج الخف. فإن قيل: فائدة المطعوم هو التغذى ودفع ضرر الجوع، وفائدة المنكوح التوالد وحفظ النوع، وهى مستغنى عنها فى الجنة. قلت: مطاعم الجنة ومناكحها وسائر أحوالها إنما تشارك نظائرها الدنيوية فى بعض الصفات والاعتبارات، وتسمى بأسمائها على سبيل الاستعارة والتمثيل، ولا تشاركها فى تمام حقيقتها حتى تستلزم جميع ما يلزمها وتفيد عين فائدتها.

وَهُمْ فِيهَا خالِدُونَ دائمون. والخلد والخلود فى الاصل الثبات المديد دام أم لم يدم، ولذلك قيل للأثافى والاحجار خوالد، وللجزء الذى يبقى من الإنسان على حاله ما دام حياً خلد، ولو كان وضعه للدوام كان التقييد بالتأبيد فى قوله تعالى: خالِدِينَ فِيها أَبَداً لغوا واستعماله حيث لا دوام، كقولهم وقف مخلد، يوجب اشتراكاً، أو مجازاً. والاصل ينفيهما بخلاف ما لو وضع للأعم منه فاستعمل فيه بذلك الاعتبار، كإطلاق الجسم على الإنسان مثل قوله تعالى: وَما جَعَلْنا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ لكن المراد به هاهنا الدوام عند الجمهور لما يشهد له من الآيات والسنن.

فإن قيل: الابدان مركبة من أجزاء متضادة الكيفية، معرضة للاستحالات المؤدية إلى الانفكاك والانحلال فكيف يعقل خلودها فى الجنان. قلت: إنه تعالى يعيدها بحيث لا يعتورها الاستحالة بأن يجعل أجزاءها مثلاً متقاومة فى الكيفية، متساوية فى القوة لا يقوى شىء منها على إحالة الآخر، متعانقة متلازمة لا ينفك بعضها عن بعض كما يشاهد فى بعض المعادن.

هذا وإن قياس ذلك العالم وأحواله على ما نجده ونشاهده من نقص العقل وضعف البصيرة. واعلم أنه

متن:

واعلم انّه لما كان معظم اللذات الحسية مقصوراً على: المساكن والمطاعم، والمناكح، على ما دل عليه الاستقراء كان ملاك ذلك كله الدوام والثبات، فإن كل نعمة جليلة إذا قارنها خوف الزوال كانت منغصة غير صافية من شوائب الالم، بشر

المؤمنين بها ومثل ما أعد لهم فى الآخرة بأبهى ما يستلذ به منها. وأزال عنهم خوف الفوات بوعد الخلود ليدل على كمالهم فى التنعم والسرور.

ترجمہ:

اور جان لو کہ چونکہ عظیم ترین حسی لذتیں منحصر ہیں رہائش، خوراک اور ازدواج پر جیسا کہ تفتیش و تجسس سے معلوم ہوتا ہے۔ اوران سب باتوں کا مکمل ان کا ہمیشہ رہنا اور پائیدار ہونا ہے، کیونکہ ہر بڑی سے بڑی نعمت کے ساتھ جب اس کو زوال کا اندیشہ آجاتا ہے تو وہ نا خوشگواری کا باعث ہو جاتی ہے اور رنج والم کی آمیزش سے پاک نہیں رہتی تو اللہ کریم نے مومنین کو جنت کی خوشخبری دی اور جو اخروی لذتیں ان کے لئے رکھی گئیں ان کی منظر کشی فرمائی، ان لذتوں کے ذریعے جو ان میں حسین ترین ہیں اور فوت ہونے کے اندیشہ کو ان سے دور فرمایا اور دوام کا وعدہ فرمایا تا کہ یہ وعدہ ان کے لئے مکمل تعیش اور سرور پر دلالت کرے۔

بشر کی مفصل تحقیق:

(ب ش ر) البشر (Happy news)

التبشیر

کے معنی ہیں اس قسم کی خبر سنانا جسے سن کر چہرہ شدت فرحت سے تمتما اٹھے۔ مگر ان کے معانی میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔ تبیشتر میں کثرت کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور بشرتہ (مجرد) عام ہے جو اچھی و بری دونوں قسم کی خبر پر بولا جاتا ہے۔ اور البشرتہ احمدتہ کی طرح لازم و متعدی آتا ہے جیسے: بشرتہ فابشر یعنی وہ خوش ہوا: اور آیت کریمہ:

"اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُكِ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 45) اللہ تجھے بشارت دیتا ہے۔

میں ایک قرآت نیز فرمایا: "لا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلامٍ عَلِيمٍ قالَ: اَبَشَّرْتُمُونِي عَلٰى اَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ قالُوا: بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ "(سورۃ الحجر آیت نمبر 53۔ 54)

مہمانوں نے کہا ڈریے نہیں ہم آپ کو ایک دانشمند بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں وہ بولے کہ جب بڑھاپے نے آ پکڑا تو تم خوشخبری دینے لگے اب کاہے کی خوشخبری دیتے ہو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو سچی خوشخبری دیتے ہیں۔

"فَبَشِّرْ عِبَادِ "(سورۃ الزمر آیت نمبر 17)

تو میرے بندوں کو بشارت سنا دو۔

"فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَاَجْرٍ كَرِيمٍ "(سورۃ یس آیت نمبر 11)

سو اس کو مغفرت کے بشارت سنا دو۔

استبشر کے معنی خوش ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے

" وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 170)

اور خوشیاں منا رہے ہیں اپنے پچھلوں کی جو ابھی ان سے نہ ملے۔

" يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللهِ وَفَضْلٍ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 171)

خوشیاں مناتے ہیں اللہ کی نعمت اور فضل کی۔

" وَجَاءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ " (سورۃ الحجر آیت نمبر 67)

اور اہل شہر (لوط کے پاس) خوش خوش (دوڑے) آئے۔

بشارۃ اور بشریٰ:

اور خوش کن خبر کو بشارۃ اور بشریٰ کہا جاتا چنانچہ فرمایا:

" هُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ " (سورۃ یونس آیت نمبر 64)

ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

"لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ "[(سورۃ الفرقان آیت نمبر 22)

اس دن گنہگاروں کے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔

" وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى " (سورۃ ہود آیت نمبر 69)

اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے۔

" يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ " (سورۃ یوسف آیت نمبر 19)

زہے قسمت یہ تو حسین لڑکا ہے۔

" وَمَا جَعَلَهُ اللهُ اِلَّا بُشْرٰى " (سورۃ الانفال آیت نمبر 10)

اور یہ تو اللہ نے کیا مگر تمہاری خوشی کو۔

عمل کا معنیٰ:

(ع م ل) العمل (Work,Business)

ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃً صادر ہو یہ فعل سے اخص ہے کیونکہ فعل کا لفظ کبھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں جن سے بلا قصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے۔ مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف البقر العوامل ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لئے استعمال ہوا

ہے نیز عمل کا لفظ اچھے اور بری دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے، قرآن میں:

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 277)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے۔

لفظِ صالح کا استعمال:

(ص ل ح) الصالح (Good, Kind)

(درست، باترتیب) یہ فساد کی ضد ہے عام طور پر یہ دونوں لفظ افعال کے متعلق استعمال ہوتے ہیں قرآن کریم میں لفظ صلاح کبھی تو فساد کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور کبھی سیئۃ کے چنانچہ فرمایا:

"خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 102)

انہوں نے اچھے اور برے عملوں کے ملا دیا تھا۔

جنت کا معنیٰ:

الجنۃ (Paradise, Garden)

ہر وہ باغ جس کی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ آئے جنت کہلاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"لَقَدْ کَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْکَنِهِمْ اٰیَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّشِمَالٍ" (سورۃ سبأ آیت نمبر 15)

(اہل) سبا کے لئے ان کے مقام بود باش میں ایک نشانی تھی (یعنی دو باغ ایک دائیں طرف اور ایک) بائیں طرف۔

اقسام جنت اور ان کے نام:

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جنات جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔

(1) جنۃ الفردوس (2) جنۃ عدن (3) جنۃ النعیم (4) دار الخلد (5) جنۃ الماوٰی (6) دار السلام (7) علیین۔

تحقیق جری، یجری:

(ج ر ی) جری (ض) (Flow)

جریۃ وجریا وجریانا کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ پانی اور پانی کی طرح چلنے والی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 51)

اور یہ نہریں جو میرے (محلوں کے) نیچے بہہ رہی ہیں۔ میری نہیں ہیں۔

"جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 31)

باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

"وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ "(سورۃ الروم آیت نمبر 46)

اور تاکہ کشتیاں چلیں۔

"فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ "(سورۃ الغاشیۃ آیت نمبر 12)

اس میں چشمے بہ رہے ہوں گے۔

اور آیت کریمہ: "إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ "(سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 11)

جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تم لوگوں کو کشتی میں سوار کر لیا۔

میں جاریۃ سے مراد کشتی ہے اس کی جمع جوار آتی ہے جیسے فرمایا؛۔

"وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ "(سورۃ الرحمن آیت نمبر 24)

اور جہاز جو اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔

"وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ "(سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 32)

اور اس کی نشانیوں سے ہیں دریا میں چلنے والیاں جیسے پہاڑیاں۔،

اور پرند کے سنکدانہ کو جریۃ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کھانا چل کر وہاں پہنچتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ طعام کا مجری بنتا ہے۔ الاجریات عادت جس پر انسان چلتا ہے۔ الجری وکیل۔ یہ لفظ رسول اور وکیل سے اخص ہی۔ اور جرمت جریا کے معنی وکیل بنا کر بھیجنے کے ہیں اور حدیث میں ہے: یہاں یہ لفظ اپنے اصل معنی پر بھی محمول ہو سکتا ہے یعنی شیطان اپنے حکم کی بجا آوری اور اطاعت میں بہ جانے پر تمہیں برانگیختہ نہ کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ جری بمعنی رسول یا وکیل سے مشتق ہو اور معنی یہ ہونگے کہ شیطان کی وکالت اور رسالت کے سرپرست مت بنو گویا یہ آیت کریمہ؛

"فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ "(سورۃ النساء آیت نمبر 76)

تو شیطان کے دوستوں سے لڑو۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا:

"إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 175)

وہ تو شیطان ہی ہے کہ اپنے دوستوں سے دھمکاتا ہے۔

لفظ تحت کا مفہوم:

(ت ح ت) تحت (The Inferior Part)

(اسم ظرف) یہ فوق کی ضد ہے قرآن میں ہے:

"لَاَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 66)
تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

"جَنّٰتٍ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" (سورۃ الحج آیت نمبر 23)
(نعمت کے) باغ میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

"فَنَادٰهَا مِنْ تَحْتِهَا" (سورۃ مریم آیت نمبر 24)
اس وقت ان کے نیچے کی جانب سے آواز دی۔

تحت اور اسفل میں فرق:

تحت اور اسفل میں فرق یہ ہے کہ تحت اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے نیچے ہو مگر اسفل کسی چیز کے نچلا حصہ کو جیسے۔ المال تحته (مال اس کے نیچے ہے) اس کا نچلا حصہ اعلیٰ حصہ سے سخت ہے۔

حدیث میں ہے: لاتقوم الساعة حتیٰ یظھر النحوت
کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ کمینے لوگ غلبہ حاصل نہ کرلیں۔
بعض نے کہا ہے کہ حدیث میں آیت کریمہ:۔

"وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 3۔4)
اور جب یہ زمین ہموار کردی جائے گی اور جو کچھ اس میں سے اسے نکلا کر باہر ڈال دے گی۔
کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

نہر کی تعریف:

(ن ھ ر) النھر (Stream, Canal)
بافراط پانی بہنے کے مجری کو کہتے ہیں۔ کی جمع انہار آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا" (سورۃ الکھف آیت نمبر 33)
اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔

تشبیہ کا مفہوم:

(ش ب ہ)

الشیبة والشبة کے اصل معنی مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلا لون اور طعم میں باہم مماثل ہونا یا عدل ظلم میں اور دو چیزوں کا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوسکیں شبھة کہلاتا ہے پس آیت کریمہ:

"وَأُتُوا بِهٖ مُتَشَابِهاً" (سورة البقرة آیت نمبر 25)

اوران کوایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے میں متشابھا کے معنی یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اورمزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔

لفظ زوج کی تحقیقِ عمیق:

(ز و ج) الزوج (A Couple,Pair)

جن حیوانات میں نراور مادہ پایا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نراور مادہ دونوں میں سے ہر ایک پراس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیاء میں جفت کو زوج کہا جاتا ہے جیسے موزے اور جوتے وغیرہ پھر اس چیز کو جودوسری کی مماثل یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہووہ اس کا زوج کہلاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى" (سورة القيامة آیت نمبر 39)

اور (آخرکار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرداورعورت۔

"وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ" (سورة البقرة آیت 35) اور تیری بی بی جنت میں رہو۔

اور بیوی کو زوجة (تا کے ساتھ) کہنا عامی لغت ہے اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے:

فبكا بناتي شجوهنّ وزوجتيتو

میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔

اور زوج کی جمع ازواج آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ" (سورة یس آیت نمبر 56) وہ اوران کے جوڑے۔

اورآیت: "اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَأَزْوَاجَهُمْ" (سورة الصافات آیت نمبر 22)

جولوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کواوران کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کرو۔ میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو فعل میں ان کی اقتداء کیا کرتے تھے اورآیت کریمہ:

"إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ أَزْوَاجاً مِنْهُمْ" (سورة الحجر آیت نمبر 88)

اس کی طرف جومختلف قسم کے لوگوں کوہم نے (دنیاوی سامان) دے رکھے ہیں۔

اشباہ واقران یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ مراد ہیں اورآیت:

"سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ" (سورة یس آیت نمبر 36)

پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم کی) چیزیں پیدا کیں۔

نیز: "وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ" (سورة الذاریات آیت نمبر 49)

اورتمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنائیں۔ میں اس بات پر تنبیہ کی ہے۔ کہ تمام چیزیں جوہر ہوں یا عرض مادہ وصورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بتارہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور اس کے لئے صانع (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز تنبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس (خلقنا زوجین) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ اس میں ترکیب پائی جاتی ہے بلکہ نفس ترکیب سے تو کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جوہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے لہٰذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت،

"اَزْواجاً مِنْ نَبَاتٍ شَتّٰی" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 53)
طرح طرح کی مختلف روئیدگیاں۔

میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنی آیت:

"مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 10)
ہر قسم کی عمدہ چیزیں (اگائیں) اور آیت کریمہ:

"ثَمَانِيَةَ اَزْوَاجٍ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 143)
(نر اور مادہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔

میں مراد ہیں۔

اور آیت کریمہ: "وَكُنْتُمْ اَزْوَاجاً ثَلَاثَةً" (سورۃ الواقعہ آیت نمبر 7)

میں ازواج کے معنی ہیں قرناء یعنی امثال ونظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو چنانچہ اس کے بعد اصحاب المیمنۃ سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَاِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ" (سورۃ التکویر آیت نمبر 7) اور جب لوگ باہم ملادیئے جائیں گے۔

میں بعض نے زوجت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہر پیروکار کو اس پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کر دیا جائیگا۔ جیسا کہ آیت:

"اُحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجَهُمْ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 22)

میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اس روز روحوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملادیا جائیگا جیسا کہ آیت،

"يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً" (سورۃ الفجر آیت نمبر 27-28)

اے اطمینان پانے والی جان اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ میں بعض نے ربک کے معنی صاحبک یعنی بدن ہی کئے ہیں اور بعض کے نزدیک زوجت سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کردیا جائیگا جیسا کہ آیت کریمہ:

"يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ ما عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَراً وَما عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 30)

جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائیگا۔

میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

"وَزَوَّجْناهُمْ بِحُورٍ عِينٍ " (سورۃ الدخان آیت نمبر 54)

اور ہم انہیں حور عین کا ساتھی بنادیں گے۔

میں زوجنا کے معنی باہم ساتھی اور رفیق اور رفیق بنادینا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زوجنا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازواجی تعلقات نہیں ہوں گے کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بحور کی بجائے زوجناھم حورا کہتا جیسا کہ زوجتہ امرءۃ کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کردیا۔

لفظ طہارت کا معنی اور اقسام:

(ط ہ ر) طہرت (Cleanliness)

طہارت دو قسم پر ہے:

طہارت جسمانی اور طہارت قلبی اور قرآن پاک میں جہاں کہیں طہارت کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم دونوں قسم کی طہارت مراد ہے کہا جاتا ہے: طھرتہ فطھر و تطھر واطھر فھو طاھر و متطھر میں نے اسے پاک کیا چنانچہ وہ پاک ہوگیا۔ قرآن میں ہے:

"وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوا "(سورۃ المائدۃ آیت نمبر 6)

اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہوجایا کرو۔

یعنی یا جو چیز اس کے قائم مقام ہو اس کے ذریعہ طہارت کرلیا کرو۔ اور آیت کریمہ:

"وَلا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ فَإِذا تَطَهَّرْنَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 222)

اور جب تک پاک نہ ہوجائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔

مفہوم خلود:

(خ ل د) الخلودُ (ن) (Eternity)

کے معنی کسی چیز کے فساد کے عارضہ سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں۔ اور جب کسی چیز میں درازتک تغیر وفساد پیدا نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

"لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ "(سورۃ الشعراء آیت نمبر 129)

اس امید پر کہ تم ہمیشہ رہو گے۔

جنت میں خلود کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن میں ہے:

" أُولٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 82)

وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔

نوٹ:

اتی، ثمر، رزق کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 26]

اِنَّ اللهَ لا يَسْتَحْيِي اَنْ يَضْرِبَ مَثَلاً مَّا بَعُوضَةً فَما فَوْقَها فَاَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا اَرادَ اللهُ بِهٰذَا مَثَلاً يُضِلُّ بِهِ كَثِيراً وَيَهْدِي بِهِ كَثِيراً وَما يُضِلُّ بِهِ اِلاَّ الْفاسِقِينَ (26)

"بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے رہے کافر وہ کہتے ہیں ایسی کہاوت میں اللہ کا کیا مقصود ہے اللہ بہتیروں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتیروں کو ہدایت فرماتا ہے اور اس سے انہیں گمراہ کرتا ہے جو بے حکم ہیں"۔

متن:

اِنَّ اللهَ لا يَسْتَحْيِي اَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً

لما كانت الآيات السابقة متضمنة لأنواع من التمثيل، عقب ذلك ببيان حسنه، وما هو الحق له والشرط فيه، وهو أن يكون على وفق الممثل له من الجهة التى تعلق بها التمثيل فى العظم والصغر والخسة والشرف دون الممثل، فإن التمثيل إنما يصار إليه لكشف المعنى الممثل له ورفع الحجاب عنه وإبرازه فى صورة المشاهد المحسوس،

ليساعد فيه الوهم العقل ويصالحه عليه فإن المعنى الصرف إنما يدركه العقل مع منازعة من الوهم، لأن من طبعه الميل إلى الحس وحب المحاكاة، ولذلك شاعت الامثال فى الكتب الإلهية وفشت فى عبارات البلغاء، وإشارات الحكماء، فيمثل الحقير بالحقير كما يمثل العظيم بالعظيم، وإن كان المثل أعظم من كل عظيم، كما مثل فى الإنجيل غل الصدور بالنخالة، والقلوب القاسية بالحصاة. ومخاطبة السفهاء بإثارة الزنابير. وجاء فى كلام العرب: أسمع من قراد وأطيش من فراشه، وأعز من مخ البعوض. لا ما قالت الجهلة، من الكفار: لِمَا مثل الله حال المنافقين بحال المستوقدين؟

وأصحاب الصيب وعبادة الاصنام فى الوهن والضعف ببيت العنكبوت؟ وجعلها أقل من الذباب وأخس قدراً منه؟ الله سبحانه وتعالى أعلي وأجل من أن يضرب الامثال ويذكر الذباب والعنكبوت. وأيضاً، لِمَا أرشدهم إلى ما يدل على أن المتحدى به وحي منزل؟ ورتب عليه وعيد من كفر به ووعد من آمن به بعد ظهور أمره؟

شَرَعَ فى جواب ما طعنوا به فيه فقال تعالى: إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِي أى لا يترك ضرب المثل بالبعوضة ترك من يستحيي أن يمثل بها لحقارتها. والحياء: انقباض النفس عن القبيح مخافة الذم، وهو الوسط بين الوقاحة:

التى هى الجراءة على القبائح وعدم المبالاة بها، والخجل: الذى هو انحصار النفس عن الفعل مطلقاً.

واشتقاقه من الحياة فإنه انكسار يعترى القوة الحيوانية فيردها عن أفعالها فقيل: حيي الرجل كما يقال نسي وحشي، إذا اعتلت نساه وحشاه. وإذا وصف به البارى تعالى كما

جاء فى الحديث »إن الله يستحيي من ذى الشيبة المسلم أن يعذبه«

.»إن الله حى كريم يستحيي إذا رفع العبد يديه أن يردهما صفراً حتى يضع فيهما خيراً«

فالمراد به الترك اللازم للانقباض، كما أن المراد من رحمته وغضبه إصابة المعروف والمكروه اللازمين لمعنييهما، ونظيره قول من يصف إبلا:

إذا ما اسْتَحَيْنَ الماءَ يَعْرِضُ نَفْسَه ... كَرَعْنَ بِسَبْتٍ فى إناءٍ من الوَرْدِ

وإنما عدل به عن الترك، لما فيه من التمثيل والمبالغة، وتحتمل الآية خاصة أن يكون مجيئه على المقابلة لما وقع فى كلام الكفرة. وضرب المثل اعتماله من ضرب الخاتم، وأصله وقع شيء على آخر، وأنْ بصلتها مخفوض المحل عند الخليل بإضمار من، منصوب بإفضاء الفعل إليه بعد حذفها عند سيبويه. وما إبهامية تزيد النكرة إبهاماً وشياعًا وتسد عنها طرق التقييد، كقولك أعطنى كتاباً ما، أى: أى كتاب كان، أو مزيدة للتأكيد كالتى فى قوله تعالى: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ ولا نعنى بالمزيد اللغو الضائع، فإن القرآن كله هدى وبيان، بل ما لم يوضع لمعنى يراد منه، وإنما وضعت لأن تذكر مع غيرها فتفيد له وثاقةً وقوةً وهو زيادة فى الهدى غير قادح فيه. وبعوضة عطف بيان لمثلاً. أو مفعول ليضرب، ومثلاً حال تقدمت عليه لأنه نكرة. أو هما مفعولاه لتضمنه معنى الجعل. وقرئت بالرفع على أنه خبر مبتدأ محذوف، وعلى هٰذَا يحتمل مَا وجوهاً أخر: أن تكون موصولة حذف صدر صلتها، كما حذف فى قوله: تَمَاماً عَلَى الَّذِى أَحْسَنَ وموصوفة بصفة كذلك، ومحلها النصب بالبدلية على الوجهين. واستفهامية هى المبتدأ، كأنه لما رد استبعادهم ضرب الله الامثال، قال بعده: ما البعوضة فما فوقها حتى لا يضرب به المثل، بل له أن يمثل بما هو أحقر من ذلك. ونظيره فلان لا يبالى مما يهب ما دينار وديناران. والبعوض: فعول من البعض، وهو القطع كالبضع والعضب، غلب على هٰذَا النوع كالخموش.

فَمَا فَوْقَهَا عطف على بعوضة، أو ما إن جعل اسماً، ومعناه ما زاد عليها فى الجثة كالذباب والعنكبوت، كأنه قصد به رد ما استنكروه. والمعنى: أنه لا يستحيي ضرب المثل بالبعوض فضلاً عما هو أكبر منه، أو فى المعنى الذى جعلت فيه مثلاً، وهو الصغر والحقارة كجناحها فإنه عليه الصلاة والسلام ضربه مثلاً للدنيا، ونظيره فى الاحتمالين ما روى أن رجلاً بمنى خَرَّ على طنب فسطاط فقالت عائشة رضى الله عنها سمعت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال: »ما من مسلم يشاك شوكة فما فوقها، إلا كتبت له بها درجة، ومحيت عنه بها خطيئة«

فإنه يحتمل ما تجاوز الشوكة فى الالم كالخرور وما زاد عليها فى القلة كنخبة النملة، لقوله عليه الصلاة والسلام »ما أصاب المؤمن من مكروه فهو كفارة لخطاياه حتى

نخبة النملة».

ترجمہ:

"بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو"۔

جب اللہ کریم نے قرآن مجید کا منزل من اللہ ہونا عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کر دیا، اور منکرین کے لئے وعید فرمادی اور منافقوں اور کافروں کے احوال وعقائد کو بیان کرنے کے لئے بے شمار ضرب الامثال بیان فرمائیں، کبھی آگ میں جلانے اور کبھی مکڑی کے ساتھ تشبیہ دے کر ان کی حقارت وتذلیل کی اب اللہ کریم ان کے اعتراضات کے جواب ارشاد فرمارہا ہے۔ جو یہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر قرآن مجید اللہ کریم کی طرف سے نازل کردہ ہوتا تو اس میں حقیر چیزوں کا تذکرہ نہ ہوتا کیونکہ عام لوگ اپنے کلام میں ایسی اشیاء کا ذکر کرنا اچھا گمان نہیں کرتے۔ اور ایسی چیزوں کو انسانی طبیعت ناپسند کرتی ہے۔ تو اللہ کریم جو کہ "منزہ عن العیوب" ہے وہ اپنے کلام میں ایسی چیزوں کا ذکر کیوں کر رہا ہے۔

تو رب کریم نے ان کے اس فضول اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ضرب الامثال بیان کرنے کی حکمت اور شرائط یہ ہیں کہ جو بات مشبہ میں مخفی ہے اس کو مشبہ بہ کے ساتھ تشبیہ دے کر واضح کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان کے درمیان جو وجہ شبہ ہے اس میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں۔ اسی وجہ سے عظیم چیزوں کو عظیم چیزوں کے ساتھ اور حقیر چیزوں کو حقیر چیزوں کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ تاکہ مشبہ میں مخفی معنیٰ ظاہر ہو جائے۔ اور وہم اس کا انکار نہ کر سکے۔ اس مقصد کو ظاہر کرنے کے لئے صرف سابقہ کتب، حکماء اور ادباء کے اقوال ہی نہیں بلکہ عربوں کے کلام میں بھی یہ عام ہے مثلاً سابقہ کتب میں "غل الصدر" سینے کا کھوٹ، "قلوب قاسیه" سخت دل اور "مخاطبة السفهاء" یعنی بے وقوفوں سی بات کرنے کو بالترتیب نخالة یعنی چھان یا بھوسہ، حصاة یعنی پتھر اور "اثارة الزنابیر" بھڑوں کو بھڑکانا کے ساتھ تشبیہات دی گئی ہیں۔

اور ایسا آدمی جو قوت سماعت میں قوی ہو اس کو "قراد" یعنی چیچڑی کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور کہا جاتا ہے "انه اسمع من قراد" یہ چیچڑی سے بھی زیادہ سننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خفیف اور ہلکے کو "اطیش من فراشه" کے ساتھ اور نایاب اشیاء کو "اعزمن مخ البعوضة" کے ساتھ تشبیہات دی گئی ہیں۔

اگر سابقہ کتب اور لغت عرب میں ایسی ضرب الامثال قابل اعتراض نہیں تو پھر قرآن پاک پر اعتراض کیوں کیا جارہا ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب اگر آیت کریمہ کو میں تدبر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ کریم حق واضح کرنے کے لئے مچھر تو کیا، اس سے حقیر چیز کی مثال بیان کرنے سے بھی جھجک محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی کسی اعترض کی پرواہ کرتا ہے۔ خواہ وہ تشبیہ مچھر، مکھی یا اس سے بھی رذیل چیز کی ہو۔

لا یخشی ان یضرب مثل البعوضة لحقارتها وغیرها

مچھر یا اس جیسی حقیر چیز کی مثال اس کے حقیر ہونے کی وجہ سے ذکر کرنے کو ترک نہیں کرتا۔

اور حیات کا معنی وہ انکساری اور شکستگی ہے جو بدن کو اعتدال سے نکال دیتی ہے۔ اور اس کو اعمال وافعال سے روک دیتی ہے۔ کیسا کہ "حیی الرجل" آدمی عاجز آ گیا۔ اسی طرح نسی ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو جس کو عرق النساء کا درد ہو۔ اور "حشی" ایسے آدمی کو کہتے ہیں جس کو انتڑیوں کا مرض ہو۔ لیکن یہاں اس سے مراد لغوی معنی نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ معنیٰ ہے جو اس کی عاجزی اور انکساری کو لازم ہے اور وہ معنیٰ ہے چھوڑ دینا اور ڈرنا یعنی اللہ کریم ضرب الامثال بیان کرنے سے نہیں ڈرتا اور نہ ہی بوجہ حیاء اس کو چھوڑتا ہے۔

حیاء اصطلاح میں ایسی کیفیت کا نام ہے جو بے حیائی اور خجل (کسی کام کے کرنے سے رک جانا، اچھا ہو یا برا) کے درمیان ہوتی ہے۔ یا وہ حالت جو اللہ کریم کی نعمتوں اور اپنے گناہوں کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حیا کو جو لغوی معنی بیان ہوا ہے اس کے مطابق اس کی نسبت اللہ کریم کی طرف کرنا جائز نہی۔ کیونکہ اس کا تعلق اجسام سے ہے۔ اور اللہ کریم ایسے تمام اوصاف سے پاک اور منزہ ہے حالانکہ اس کی نسبت اللہ کریم کی طرف کی گئی ہے حدیث شریف کا مفہوم ہے،

ان اللہ یستحیی من ذی الشیبۃ المسلم أن یعذبہ

اللہ کریم بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے میں حیاء فرماتا ہے۔

إن اللہ حی کریم یستحیی إذا رفع العبد یدیہ أن یردھما صفراً حتی یضع فیھما خیرًا

اللہ کریم بہت ہی باحیاء سخی ہے، اسے حیا آتا ہے وہ جب اس کا کوئی بندہ اس کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ انہیں خالی واپس لٹادے یہاں تک اس کے ہاتھوں میں خیرات رکھ دیتا ہے۔

"یستحی" سے مراد ترک کرنا ہے۔ یعنی وہ اپنے بندے کے دونوں ہاتھوں کو خالی لوٹانے کو ترک کر دیتا ہے اور ترک کرنا یہ انقباض کے معنی کو لازم ہے، جیسا کہ اللہ کریم کی رحمت اور اس کے غضب سے مراد ان دونوں کو لازم ہے وہ مراد ہے یعنی رحمت کا معنی نیکی پہنچانا اور غضب کا معنی سزا دینا ہے اس کی مثال ایک شاعر کا قول ہے جو اپنے ہونٹوں کی صفت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے،

إذا ما اسْتَحيَنَ الماءَ يعْرِضُ نَفْسَه ... كَرَعْنَ بِسَبْتٍ فی إناءٍ من الوَرْدِ

یعنی میرے اونٹ اس پانی کو ترک کرنے کو رد کر دیتے ہیں جو اپنے آپ کو ان پر پیش کرتا ہے کہ اپنے پانی کو اپنے ہونٹوں کے ساتھ پیتے ہیں جو مشکیزے کی طرح ہے اس گھاٹ سے جو پھول کے برتنوں کی طرح ہے اس سے پیتے ہیں یعنی وہ گھاٹ جس کے کناروں پر گلاب کے پھول ہوں تو مطلب یہ ہوا کہ اس کے اونٹ اس گھاٹ سے پیاس کی وجہ سے پانی نہیں پیتے بلکہ وہ اس پانی سے حیاء کرتے ہوئے جو اپنے آپ کو ان پر پیش کرتا ہے، پیتے ہیں۔ اس مقام پر "یترک" کا ذکر نہ کرنا اور اس کی

جگہ "یستحی" ذکر کرنا اس کے اندر مبالغہ کا اظہار مطلوب ہے اور ترک عمل کو حیاء کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جو کنایۃ ضرب المثل کو لازم ہے اور اصول یہ ہے کہ،

الکنایۃ ابلغ من التصریح

کنایہ صراحۃً گفتگو کرنے سے بلیغ ہوتا ہے۔

یا یہ بطور مشاکلہ لفظ ذکر کئے گئے ہیں کہ کفار نے جب اپنے اعتراض میں یہ لفظ استعمال کئے،

اما یستحی رب محمد ان یضرب مثل الذباب والبعوضۃ والعنکبوت

تو اللہ کریم نے بطور مشاکلہ اس کی نفی میں وہی الفاظ دہرا دیئے۔

"ان یضرب" یہ ضرب المثل کے معنیٰ میں ہے اور ضرب المثل ضرب الخاتم سے مشتق ہے جس کا معنی ہے مہر لگانا مگر یہاں مثال بیان کرنے کے معنی میں ہے۔

ترکیب کلام میں "ان" مصدر یہ اپنے مابعد کے ساتھ مل کر خلیل کے نزدیک محل جر میں ہے اور اس سے پہلے "من" حرف جر مضمر ہے اور سیبویہ کے نزدیک حرف جر کو حذف کرنے کے بعد بلا واسطہ اس کی طرف متعدی کر دیا ہے۔ اس لئے یہ منصوب ہوگا اور اس میں مثلاً کے بعد "ما" کا لفظ ابہامیہ ہے جو اس نکرہ میں عموم و ابہام کا اضافہ کر رہا ہے۔ اور تخصیص کے سارے راستے بند کر رہا ہے جیسا تیرا کہنا "اعطنی کتاباً ما" یعنی تو مجھے کوئی سی کتاب عطا کر دے یا یہ "ما" معنی میں تاکید پیدا کرنے کے لئے زائدہ ہے، جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں،

فبما رحمۃٍ من اللہ

اس میں ما زائدہ ہے، زائدہ سے مراد بے معنی نہیں کیونکہ سارے کا سارا قرآن ہدایت اور بیان ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہاں یہ کسی مخصوص معنی کے لئے ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اپنے غیر کے ساتھ اسلئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس میں قوت اور مضبوطی کا فائدہ دے اور یہ ہدایت میں زیادتی ہے اور یہ باعث اعتراض نہیں۔ اور "بعوضۃ"، مثلاً سے عطف بیان ہوگا۔ یا یہ "یضرب" کا مفعول ہے اور مثلاً بعوضۃ سے حال ہے کیونکہ بعوضۃ نکرہ ہے اور جب ذوالحال نکرہ ہو تو حال کو اس سے مقدم ذکر کیا جاتا ہے، یا یضرب اپنے ضمن میں جعل کا معنی لئے ہوئے ہے اس وجہ سے "بعوضۃ" اور "مثلاً" دونوں اس کے مفعول ہوں گے، اور بعوضۃ کو مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی لہٰذا اس تاویل پر لفظ کے ترکیب میں کئی دوسرے احتمال ہوں گے۔

(1) پہلا احتمال یہ کہ یہ "ما" موصولہ ہو اور اس کا صلہ پہلا پہلا حرف محذوف ہوگا کیسا کہ،

تماماً الذی احسن

میں "احسن" سے قبل مبتداء محذوف ہے۔

(2) دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ "ما" موصولہ ہوگا اور اور اس کا مابعد اپنے مبتداء سے مل کر جملہ اسمیہ ہو کر "ما" کی صفت ہے۔

مندرجہ بالا دونوں توجیہات میں یہ بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔

(3) تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ "ما" استفہامیہ مبتداء ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے تو گویا جب اللہ کریم نے ان کے ضرب الامثال کو بعید سمجھنے کو رد فرمایا تو فرمایا:

ما بعوضة فما فوقها

کہ مچھر کیا ہے یا اس کے جسم میں چھوٹی اور بڑی چیز کیا ہے کہ اللہ کریم نے حق سمجھانے کے لئے اس کی ضرب المثل بیان نہ کرے بلکہ اسے حق حاصل ہے کہ وہ اس سے حقیر چیز کے ساتھ بھی مثال دے کر حق ظاہر کر دے۔

اس کی مثال یوں دی جاتی ہے کہ

فلان لا یبالی مما یھب ما دینار و دیناران

کہ فلاں اس چیز کی پرواہ نہیں کرتا جو بخشش کر رہا ہے کہ وہ ایک دینار عطا کر رہا ہے یا دو دینار۔

"بعوض" بروزن فعول، یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور بعض سے مشتق ہے کس کا معنی کاٹنا ہے کیسے "بضع" اور "عضب" کا معنی کاٹنا ہے لیکن اب یہ لفظ مچھر جیسی چیز کے کاٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ خموش کا لفظ جس کا معنی چہرے پر خراشیں مارنا لیکن اب یہ مچھر کے کاٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی چہرے پر ڈنگ مارتا ہے۔

فما فوقها

اس میں فاء عاطفہ اور اس کا عطف یا بعوضة پر ہے اور یا "ما" پر ہے اس شرط پر کہ ما کو اسم بنایا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ چیز جو مچھر سے جسم میں زائد ہو جیسے مکھی اور مکڑی، گویا اللہ کریم نے اس چیز کی تردید کا قصد فرمایا جس کو انہوں نے ناپسند کیا تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ کریم مچھر کے ساتھ مثال دینے کو حیاء کی وجہ سے ترک نہیں فرماتا چہ جائیکہ جسم میں اس سے زیادہ بڑی چیز میں اس سے زیادہ بڑی چیز کے ساتھ تشبیہ دینے کو وہ ترک فرما دے یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ صفت میں مچھر سے حقیر ہو جس صفت میں ضرب الامثال پیش کی جا رہی ہو اور وہ صغر اور حقارت ہے جیسے مچھر کا پر۔

نبی کریم ﷺ نے مچھر کے پر کے ساتھ دنیا کی مثال بیان فرمائی ہے فرمایا کہ اگر دنیا کی قدر اللہ کریم کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بنی آدم مناء میں خیمہ کے طنابوں سے گر پڑا۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا:

یقول ما من مسلم یشاك شوكة فما فوقها الا كتبت له بها درجة اور محبت عنه بها خطيئة

کہ کسی مسلمان کو کانٹا یا کانٹے سے چھوٹی یا کانٹے سے بڑی چیز سے تکلیف نہیں پہنچائی جاتی مگر اس کے بدلے میں اس کا ایک درجہ بلند کر دیا جاتا ہے اور اس سے اس کی تکلیف کی وجہ سے ایک گناہ کم کر دیا جاتا ہے اور اس مین یہ احتمال بھی ہے کہ درد میں جو چیز کانٹے سے زیادہ ہو جس طرح گرنا یا قلّت میں اس سے کم ہو جیسے چیونٹی کا ڈنگ مارنا جیسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا،

ما أصاب المؤمن من مكروه فهو كفارة لخطاياه حتى نخبة النملة

کہ کسی مومن کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی مگر وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی جس طرح چیونٹی کا کاٹنا وغیرہ۔

متن:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

أما حرف تفصيل يفصل ما أجمل ويؤكد ما به صدر ويتضمن معنى الشرط، ولذلك يجاب بالفاء. قال سيبويه: أما زيد فذاهب معناه، مهما يكن من شيء فزيد ذاهب، أي هو ذاهب لا محالة وأنه منه عزيمة، وكان الاصل دخول الفاء على الجملة لأنها الجزاء، لكن كرهوا إيلاءها حرف الشرط فأدخلوها على الخبر، وعوضوا المبتدأ عن الشرط لفظاً. وفى تصديره الجملتين به إحماد لأمر المؤمنين واعتداد بعلمهم، وذم بليغ للكافرين على قولهم، والضمير فى أَنَّهُ للمثل، أو لأن يضرب. والْحَقُّ الثابت الذى لا يسوغ إنكاره، يعم الاعيان الثابتة والافعال الصائبة والاقوال الصادقة، من قولهم حق الامر، إذا ثبت ومنه: ثوب محقق أي: محكم النسج.

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ كان من حقه: وأما الذين كفروا فلا يعلمون، ليطابق قرينه ويقابل قسيمه، لكن لما كان قولهم هٰذَا دليلاً واضحاً على كمال جهلهم عدل إليه على سبيل الكناية ليكون كالبرهان عليه.

مَاذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا يحتمل وجهين: أن تكون «مَا» استفهامية و «ذا» بمعنى الذى وما بعده صلته، والمجموع خبر ما. وأن تكون «ما» مع «ذا» اسماً واحداً بمعنى: أي شيء، منصوب المحل على المفعولية مثل ما أراد الله، والأحسن فى جوابه الرفع على الاول، والنصب على الثانى، ليطابق الجواب السؤال.

والإرادة: نزوع النفس وميلها إلى الفعل بحيث يحملها عليه، وتقال للقوة التى هى مبدأ النزوع، والاول مع الفعل والثانى قبله، وكلا المعنيين غير متصور اتصاف البارى تعالى به، ولذلك اختلف فى معنى إرادته فقيل:

إرادته لأفعاله أنه غير ساه ولا مكره، ولأفعال غيره أمره بها. فعلى هٰذا لم تكن المعاصي بإرادته. وقيل: علمه باشتمال الامر على النظام الاكمل، والوجه الاصلح فإنه يدعو القادر إلى تحصيله، والحق: أنه ترجيح أحد مقدوريه على الآخر وتخصيصه بوجه دون وجه، أو معنى يوجب هٰذا الترجيح، وهي أعم من الاختيار فإنه ميل مع تفضيل وفي هٰذا استحقار واسترذال. ومَثَلًا نصب على التمييز، أو الحال كقوله تعالى: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً.

ترجمہ:

اما یہ حرف تفسیر ہے اور ماقبل کلام میں یا متکلم کے ذہن میں جو اجمال ہوتا ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔ اور یہ جس سے پہلے آتا ہے اس میں تاکید پیدا کرتا ہے۔ یہ اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہوتا ہے اسی لئے اس کے جواب پر "فاء" داخل کیا جاتا ہے۔ سیبویہ کہتا ہے

اما زید فذاهب

کا معنی یہ ہوگا

مهما یکن من شئی فزید ذاهب

یعنی وہ ہر حالت میں جانے والا ہے اور اس نے جانے کا پختہ عزم کرلیا ہے۔ اس کلام میں اصل تو یہ تھا کہ فاء" جواب شرط کے پورے جملہ پر داخل کی جاتی، لیکن اس طرح عربوں نے حرف شرط کے فوراً بعد "فاء" جزائیہ کا ذکر کرنا پسند نہیں فرمایا، اس لئے وہ اس کو خبر پر داخل کر دیتے ہیں اور مبتداء کو لفظاً شرط کے قائم مقام رکھ دیتے ہیں۔ حقیقت میں شرط محذوف ہوتی ہے جس کی تقدیر

ماهما یکن من شئی

ہے۔ ادر "اما" کے بعد والا جملہ مکمل جواب شرط ہے۔ اس لئے "فاء" جزائیہ جواب شرط کے پہلے جز پر داخل کرنا مناسب ہوتا ہے لیکن اس طرح "اما" جو کلمہ شرط ہے اس کے فوراً بعد فاء داخل کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے بجائے مبتداء پر فاء داخل کرنے کے، اس کی خبر پر فاء داخل کر دیا گیا اور ان دونوں جملوں کے آغاز میں "اما" کو مکرر ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ مومنین کی تعریف کی جائے اور ان کے علم و یقین کی توصیف بیان کی جائے اور کفار کی مذمت اور ان کے عقیدہ اور کفر کے فساد کو ظاہر کیا جائے۔

انه الحق

میں ھاء ضمیر کا مرجع یا تو "مثلاً" ہے یا "ان یضربوا" ہے۔

"الحق" یہ حق سے مشتق ہے اور صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور حق کا معنی پختہ اور مضبوط ہونا ہے اور وہ کپڑا جس کی بُنائی پختہ اور مضبوط ہوا سے ثوب محقق کہتے ہیں اور اس کا اطلاق ایسی ثابت چیز پر ہوتا ہے جس کا انکار جائز نہیں اور اعیان ثابتہ، افعال اور اقوال صادقہ کے لئے یہ عام استعمال ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد مثل یا اس کا بیان مراد لیا گیا ہے۔

ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کلام کے سیاق وسباق کے مطابق یہاں،

امالذین کفروا فلا یعلمون

ہوتا لیکن اس جگہ یہ ذکر کیا گیا۔

امالذین کفروا فیقولون

اس کی کیا وجہ ہے؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حق تو یہی تھا کہ،

امالذین کفروا فلا یعلمون

ہوتا تا کہ اپنے قرین کے موافق ہو جاتا لیکن ان کا یہ کہنا، یہ کفار کی ضرب المثل سے جہالت اور ناواقفی کے کمال پر واضح دلیل ہے اس لئے کنایۃً ان کی جہالت کو واضح کرنے کے لئے یہ انداز اپنایا گیا۔ اور ان کی اس جہالت پر دلیل قائم کرنے کے لئے "لا یعلمون" کی جگہ "یقولون" کا لفظ ذکر کیا گیا جس میں کنایۃً ان کی جہالت ثابت ہوتی ہے اور کلیہ ہے کہ کنایۃً صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔ "ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً" ما استفہامیہ مبتداء، ذا اسم موصول اپنے مابد صلہ سے مل کر خبر ہے یا یہ دونوں (ما اور ذا) ای شئی کے معنی میں محلاً منصوب اور "اراد" کا مفعول بہ ہے۔

"اراد" یہ ارادۃ سے مشتق ہے اور اس کا معنی کسی کام کے کرنے کا دل میں شوق پیدا کرنا اس اعتبار سے کہ وہ شوق کام کرنے کی طرف ابھارے یا اس سے مراد وہ قوت ہے جو میلان اور اشتیاق کا سبب بنتی ہے، ان دونوں معانی کے اعتبار سے اراد کی نسبت اللہ کریم کی طرف کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ جسم کے خواص سے ہے اور اللہ کریم جسم سے پاک ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں اس سے لغوی معنی مراد نہیں بلکہ لازم معنی مراد ہے یعنی کہ اللہ کریم اپنے افعال سر انجام دینے میں نہ ہی مجبور ہے اور نہ ہی بھولنے والا ہے بلکہ اپنے اختیار اور مرضی سے افعال کو سرانجام دیتا ہے۔ اس تاویل پر معاصی اللہ کریم کی ارادہ سے نہیں ہوں گے۔

اور بعض نے کہا کہ اللہ کریم کے ارادہ سے مراد کسی امر کو اس کے علم کا کامل ترین نظام اور اصلح وجہ پر شامل ہونا ہے، کیونکہ یہ علم ہی قادر کو اس کے حصول کی طرف دعوت دیتا ہے اور حق یہ ہے کہ اللہ کریم کے ارادہ سے مراد یہ ہے کہ دو مقدوروں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا اور ایک وجہ کو چھوڑ کر دوسری وجہ کے ساتھ خاص کرنا ہے، یعنی حسن و قبح اور فائدہ و نقصان وغیرہ یا اس سے مراد وہ صفت ہے جو اس کا موجب اور سبب ہے اور اراد کا لفظ اختیار کے لفظ سے اعم ہے کیونکہ اختیار میں دوسری چیز کو

فضیلت دینے کے ساتھ اس کے کرنے کی طرف رغبت ہوتی ہے۔

"بهذا" یہ لفظ ان کے اس مثال کو حقیر و رذیل سمجھنے پر دلالت کر رہا ہے اس لئے یہ کفر ہے اور مثلاً کا لفظ تمیز یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں،

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللهِ لَكُمْ

میں اس آیت کریمہ کا لفظ تمیز یا حال کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔

متن:

یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا

جواب ماذا، أي: إضلال كثير وإهداء كثير، وضع الفعل موضع المصدر للإشعار بالحدوث والتجدد. أو بيان للجملتين المصدرتين بإما، وتسجيل بأن العلم بكونه حقاً هدى وبيان، وأن الجعل بوجه إيراده والإنكار لحسن مورده ضلال وفسوق، و كثرة كل واحد من القبيلتين بالنظر إلى أنفسهم لا بالقياس إلى مقابليهم. فإن المهديين قليلون بالإضافة إلى أهل الضلال كما قال تعالى: وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ، وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ويحتمل أن يكون كثرة الضالين من حيث العدد و كثرة المهديين باعتبار الفضل والشرف كما قال:

قَلِيلٌ إذا عُدُّوا كَثِيرٌ إذا شَدُّوا وقال:

إنَّ الكِرامَ كثيرٌ في البلادِ وإن ... قَلُّوا كما غيرَهُم قلٌّ وإنْ كَثُرُوا

وَما يُضِلُّ بِهٖ إِلَّا الْفاسِقِيْنَ أي الخارجين عن حد الإيمان، كقوله تعالى: اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ من قولهم: فسقت الرُّطَبة عن قشرها إذا خرجت. وأصل الفسق: الخروج عن القصد قال رؤبة:

فواسِقاً عَنْ قَصْدِهَا جَوائراً والفاسق في الشرع: الخارج عن أمر الله بارتكاب الكبيرة وله درجات ثلاث:

الاولى: التغابي وهو أن يرتكبها أحياناً مستقبحاً إياها.

الثانية: الانهماك وهو أن يعتاد ارتكابها غير مبال بها.

الثالثة: الجحود وهو أن يرتكبها مستصوباً إياها، فإذا شارف هٰذَا المقام و تخطى خططه

خلع ربقة الإيمان من عنقه، ولابس الكفر. وما دام هو في درجة التغابي أو الانهماك فلا يسلب عنه اسم المؤمن لاتصافه بالتصديق الذي هو مسمى الإيمان، ولقوله تعالى: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا والمعتزلة لما قالوا: الإيمان: عبارة عن مجموع التصديق والإقرار والعمل، والكفر تكذيب الحق وجحوده. جعلوه قسماً ثالثاً نازلاً بين منزلتي المؤمن والكافر لمشاركته كل واحد منهما في بعض الاحكام، وتخصيص الإضلال بهم مرتباً على صفة الفسق يدل على أنه الذي أعدهم للإضلال، وأدى بهم إلى الضلال. وذلك لأن كفرهم وعدولهم عن الحق وإصرارهم بالباطل صرفت وجوه أفكارهم عن حكمة المثل إلى حقارة الممثل به، حتى رسخت به جهالتهم وازدادت ضلالتهم فأنكروه واستهزءوا به. وقرء (يضل) بالبناء للمفعول و »الفاسقون« بالرفع.

ترجمہ:

يُضِلُّ بِهِ كَثِيراً وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا

یہ جملہ "ماذا اراد اللہ بہٖ" کا جواب ہے اور یہ مرفوع ہے اصل میں اضلال کثیرا اور اھداء کثیر تھا، فعل کو مصدر کی جگہ اس لئے رکھا گیا ہے تا کہ تجدد اور حدوث کا شعور دلایا جائے یا یہ ان دونوں جملوں کا بیان ہے جن کو "اما" کے ساتھ شروع کیا گیا ہے اور اس بات پر مہر تصدیق ثبت کرنا ہے کہ ضرب المثل کے حق ہونے کا علم ہونا ہدایت اور بیان ہے اور اس ضرب المثل کے ذکر کرنے کی جہت سے ناواقف ہونا اور اس کے مورد کے حسن کا اقرار نہ کرنا گمراہی اور فسق ہے۔

دونوں گروہوں کو کثیر کہا گیا حالانکہ کثرت ایک ہی جانب ہوتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ اپنے اپنے قبیلوں کے اعتبار سے کثیر ہیں، نہ کہ اپنے مقابلین کے اعتبار سے کیونکہ گمراہوں کے مقابلہ میں ہدایت یافتہ تعداد کے اعتبار سے تھوڑے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ

وقليل من عبادي الشكور

کہ ہدایت یافتہ تھوڑے ہی ہیں۔ اور میرے بندوں میں سے شکر کرنے والے تھوڑے ہی ہیں اور اس میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ تعداد کے اعتبار سے گمراہ زیادہ ہوں اور فضل وشرف کے اعتبار سے ہدایت یافتہ زیادہ ہوں، قول شاعر ملاحظہ ہو،

إِنَّ الكِرامَ كثيرٌ فی البلادِ وإن … قَلُّوا كما غيرَهُم قلٌّ وإنْ كَثُرُوا

سخی اگرچہ تعداد میں کم ہوتے ہیں لیکن علاقہ میں کثیر ہیں جیسے ان کے علاوہ اگرچہ وہ کثیر ہیں لیکن شرافت وبزرگی میں تھوڑے ہیں۔

وما يضلّ به الا الفسقين

اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے ساتھ وہی گمراہ ہوتے ہیں جو حدود ایمان سے نکلنے والے ہیں جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد،

ان المنافقین ھم الفاسقون

کہ بے شک منافق ہی دائرہ اسلام سے خارج ہونے والے ہیں اور یہ عربوں کے اس اقول سے مشتق ہے،

فسقت الرطبة عن قشرھا

کہ تر کھجور اپنے چھلکے سے باہر نکلی۔ فاسق، فسق سے مشتق ہے جس کا معنی درمیانی راستہ سے نکلنا ہے۔ اصطلاح شرع میں فاسق اس آدمی کو کہتے ہیں جو صغیرہ گناہ پر مصر ہو یا کبیرہ گناہ کر کے اللہ کریم کے حکم سے نکل جائے، اس کے تین درجے ہیں۔

گناہِ کبیرہ کے درجات:

1۔ تغابی: گناہ کبیرہ کو گناہ سمجھ کر کبھی کبھی اس کا ارتکاب کرنا۔

2۔ اُنھماک: گناہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کا عادی بن جانا اور اس کے ارتکاب میں جرے ہو جانا۔

3۔ جحود: گناہ کبیرہ کو جائز اور صحیح سمجھ کر کرنا، یہ فسق کا آخری درجہ ہے جب انسان اس درجہ میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔

یاد رہے جب تک انسان فسق کے پہلے دو درجوں میں رہتا ہے وہ گنہگار تو ہوتا ہے لیکن اسلام سے خارج نہیں ہوتا کیونکہ اس کو تصدیقِ قلبی حاصل ہوتی ہے جو کہ اصلِ ایمان ہے۔ اور قرآن میں بھی مرتکب کبیرہ کو مومن کہا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو،

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا

کہ اگر مومنین کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔ یہاں لڑائی کرنے والوں کو، جو کہ گناہِ کبیرہ ہے مومن کہا گیا ہے۔ چونکہ معتزلہ کے نزدیک ایمان تین چیزوں کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔

تصدیق بالقلب   عمل بالارکان   اقرار باللسان

اور کفر حق کی تکذیب کرنا اور اس کا انکار کرنا ہے اس لئے انہوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کے لئے ایک تیسرا درجہ بنایا ہے کہ نہ وہ مومن، نہ کافر اور دائمی عذاب کا مستحق ہے کیونکہ وہ بعض احکام میں مومن اور کافر دونوں کے ساتھ شریک ہے یعنی اسے تصدیق قلبی حاصل ہے لیکن اس کے مطابق عمل نہیں جو کہ کافروں کی عادت ہے۔ فاسقین کو گمراہی کے ساتھ خاص کرنے سے یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ اس گمراہی میں مبتلاء ہونے کا سبب ان کا فسق اور ضرب المثل کو حقیر سمجھنا ہے۔ چونکہ اس سے ناواقفی ان کے دلوں میں راسخ ہو چکی ہے اور ان کی گمراہی بڑھ گئی ہے۔ اس لئے انہوں نے ضرب المثل کا انکار کر دیا اور باطل نظریہ پر اصرار نے ان کی سوچ کے دھارے اس ضرب المثل کی حکمت سے پھیر کر اس کی حقارت کی طرف موڑ دیئے ہیں بعض قراء نے"

الفاسقین" کو حالت رفعی میں فاسقون کر کے پڑھا ہے اور اس صورت میں "یضل" کو مجہول کا صیغہ بنایا تو معنی یہ ہوگا کہ ضرب المثل کے ساتھ صرف فاسق ہی گمراہ ہوتے ہیں۔

معنی حیاۃ:

(ح ی ت) الحیاۃ (Life)

کے معنی قبائح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور بعض نے استحی فھو مستح (نحیف یاء) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ قرآن میں ہے،

"اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔

"وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 53)

لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔

ایک روایت میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے شرماتا ہے۔ پس اللہ کی طرف جب حیا کی نسبت ہو تو اس کے معنی انقباض نفس کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذات باری تعالیٰ منزہ ہے بلکہ اس سے مراد اسے عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ حی کہ اللہ حی ہے تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ قبائح کو چھوڑنے والا اور محاسن یعنی افعال حسنہ کو سرانجام دینے والا ہے۔

ضرب المثل کی تعریف:

ضرب اللبن الدراھم سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں کسی بات کو اس طرح بیان کرنے کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے۔

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 29)

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا" (سورۃ الکھف آیت نمبر 32)

اور ان سے قصہ بیان کرو۔

"ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ "(سورۃ الروم آیت نمبر 28)

وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ "(سورۃ الروم آیت نمبر 58)

اور ہم نے ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔

بعوضۃ:

"مَثَلًا مَا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز مثلاً مکھی۔

مکڑی کی مثال بیان فرمائے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ فما فوقھا سے مچھر سے بڑی چیز کی طرف اشارہ ہے جیسے مکڑی جس کی کہ دوسری جگہ مثال بیان کی گئی ہے اور بعض نے فوق بلحاظ صغر مراد لیا ہے یعنی مچھر سے بھی چھوٹا اور جنہوں نے اس کی تفسیر مادونہا سے کی ہے ان کی مراد بھی یہی ہے بعض اہل لغت نے اس سے یہ سمجھ لیا ہے کہ فوق بمعنی دون بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے اضداد میں شمار کیا ہے مگر یہ محض ان کی خام خیالی ہے۔

تحقیق فوق:

(ف و ق) فوق (Above,up)

یہ مکان، زمان، جسم، عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔

اوپر جیسے فرمایا۔

1۔ باعتبار علو جیسا کہ

"وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 63)

اور تم پر طور کو اونچا کیا۔

"مِنْ فَوْقِھِمْ ظُلَلٌ مِنَ النَّارِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 16)

اوپر آگ کے پہاڑ ہیں۔

"وَجَعَلَ فِیْھَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِھَا" (سورۃ فصلت آیت نمبر 10)

اور اسی نے زمین میں اس کے پہاڑ بنائے۔

اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں چنانچہ فرمایا۔

"قُلْ ھُوَ الْقَادِرُ عَلٰی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 65)

کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔

2۔ صعود یعنی بلندی کی جانب کے معنی میں اس کی ضد اسفل ہے جس کے معنی پستی کی جانب کے ہیں چنانچہ فرمایا:

"اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10)

جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔

3۔ کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے فرمایا:

"فَاِنۡ کُنَّ نِسَاۤءً فَوۡقَ اثۡنَتَیۡنِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 11)

اگر اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ۔

4۔ جسمانیت کے لحاظ سے بڑا یا چھوٹا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"مَثَلًا مَا بَعُوۡضَةً فَمَا فَوۡقَهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز مثلاً مکھی۔ مکڑی کی مثال بیان فرمائے۔

5۔ بلحاظ فضیلت دنیوی کے استعمال ہوتا ہے۔

جیسے فرمایا: "وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 32)

اور ایک دوسرے پر درجے بلند کئے۔

اور کبھی فضیلت اخروی کے لحاظ سے آتا ہے جیسے فرمایا:

"وَالَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا فَوۡقَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 212)

لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر فائق ہوں گے۔

"فَوۡقَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 55)

کافروں پر فائق۔

6۔ فوقیت معنی غلبہ اور تسلط

کے جیسے فرمایا: "وَهُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 18)

اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

"وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 127)

فرعون نے اور بلاشبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

حرف اَمّا کا استعمال:

(اما حرف) اما۔

یہ کبھی حرف تفصیل ہوتا ہے۔ اور احد الشیئین کے معنی دیتا ہے اور کلام میں مکرر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"اَمَّا اَحَدُکُمَا فَیَسۡقِیۡ رَبَّهٗ خَمۡرًا وَاَمَّا الۡاٰخَرُ فَیُصۡلَبُ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 41)

اے قید خانہ کے دونوں ساتھیو تم میں ایک تو اپنے رب (بادشاہ) کو شراب پلائے گا رہا دوسرا وہ سولی دیا جائے گا۔

اور کبھی ابتداء کلام کے لئے آتا ہے جیسے اما بعد فانہ کذا۔

علم کا مفہوم:

(ع ل م) العلم (Knowledge)

کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا اور یہ قسم پر ہے اول یہ کہ کسی چیز کی ذات کا ادراک کر لینا دوم ایک چیز پر کسی صفت کے ساتھ حکم لگانا جو (فی الواقع) اس کے لئے ثابت ہو یا ایک چیز کی دوسری چیز سے نفی کرنا جو (فی الواقع) اس سے منفی ہو۔ پہلی صورت میں یہ لفظ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

"لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 60)

جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے۔

اور دوسری صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَإِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ" (سورۃ الممتحنۃ آیت نمبر 10)

اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں۔

اور آیت: "يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ"

سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے ہوش وحواس قائم نہیں رہیں گے۔

علم کی اقسام:

ایک دوسری حیثیت سے علم کی دو قسمیں ہیں:

(1) نظری اور (2) عملی۔

نظری وہ ہے جو حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو جائے جیسے وہ عالم جس کا تعلق موجودات عالم سے ہے اور علم عمل وہ ہے جو عمل کے بغیر تکمیل نہ پائے جیسے عبادات کا علم ایک اور حیثیت سے بھی علم کی دو قسمیں ہیں۔

(1) عقلی یعنی وہ علم جو صرف عقل سے حاصل ہو سکے۔

(2) سمعی یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل نہ ہو بلکہ بذریعہ نقل وسماعت کے حاصل کیا جائے دراصل اعلمتہ وعلمتہ کے ایک معنی ہیں مگر اعلام جلدی سے بتا دینے کے ساتھ مختص ہے اور تعلیم کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتٰی کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ تعلیم کے معنی تصور کے لئے نفس کو متوجہ کرنا کے ہیں اور تعلم کے معنی ایسے تصور کی طرف متوجہ ہونا کے اور کبھی تعلیم کا لفظ اعلام کی جگہ آتا ہے جب کہ اس میں تاکید کے معنی مقصود ہوں جیسے فرمایا۔

" اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ " (سورۃ الحجرات آیت نمبر 16)

کیا تم اللہ کو اپنا دین بتاتے ہو۔

اور حسب ذیل آیات میں تعلیم کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا۔

" اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ " (سورۃ الرحمن آیت نمبر 1۔ 2)

رحمٰن نے، اپنے محبوب کو قرآن سکھایا۔

تحقیق حق:

(ح ق ق) الحق (حق) (Justice, True, Right)

کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے اور لفظ حق کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(1) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔

اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

" وَرُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ " (سورۃ یونس آیت نمبر 30)

اور اللہ کی طرف پھیرے جائیں گے جو ان کا سچا مولیٰ ہے۔

(2) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔

اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

" هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا " (سورۃ یونس آیت نمبر 5)

وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند چمکتا۔

(3) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا۔

جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ بعث ثواب و عقاب اور جنت دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔

قرآن میں ہے:

" فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 213)

تو اللہ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھا دی جس میں جھگڑ رہے تھے۔

(4) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے۔

اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

" كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ " (سورۃ یونس آیت نمبر 33)
یونہی ثابت ہو چکی ہے تیرے رب کی بات۔

القول اور القیل کا معنیٰ :

(ق و ل) القول (Talk)

القول اور القیل کے معنیٰ بات کے ہیں قرآن میں ہے:

" وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا " (سورۃ النساء آیت نمبر 122)
اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔

مفہوم ارادہ:

(ر و د) الرود (Intention, Desire)

الارادة یہ اراد یرود سے ہے جس کے معنیٰ کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں اور ارادۃ اصل میں اس قوۃ کا نام ہے، جس میں خواہش ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں۔ چنانچہ فرمایا:

"اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً " (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 17)
اگر وہ تمہارا برا چاہے یا تم پر مہر (امن وعافیت) فرمانا چاہے۔

اسمِ اشارہ ذا کا استعمال:

(ذا) ہاں ھذا میں ذا کا لفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ هذه وهذي وهاتا۔ ان میں سے صرف هاتا کا تثنیہ هاتان آتا ہے۔ هذه اور هذي کا تثنیہ استعمال نہیں ہوتا قرآن میں ہے:

"اَرَاَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ " (سورۃ الاسراء آیت نمبر 62)
کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

"هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ " (سورۃ ص آیت نمبر 53)
یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

" هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ " (سورۃ الذاریات آیت نمبر 14)
یہ وہی ہے جس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

" اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ " (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 63)
کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔

"هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ" (سورۃالطور آیت نمبر 14)

یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

" هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ " (سورۃالرحمن آیت نمبر 43)

یہی وہ جہنم ہے جسے گنہگار لوگ جھٹلاتے تھے۔

هذا کے بالمقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔ اس کے لئے ذاک اور ذالک استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا،

" الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ " (سورۃالبقرۃ آیت نمبر 1۔2)

یہ کتاب یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

" ذٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ " (سورۃالکہف آیت نمبر 17)

یہ اس لئے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ہلاک کردے۔

تعریفِ مثل:

(م ث ل) مثل (ک) (Instance,Exaple)

المثل کے معنی ہیں ایسی بات کے جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو۔ اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ دوسری کا مطلب واضح ہوجاتا ہو۔ اور معاملہ کی شکل سامنے آجاتی ہو۔ مثلاً

محاورہ:

عین ضرورت پر کسی چیز کو کھودینے کے لئے الصیف ضیعت اللبن کا محاورہ وہ ضرب المثل ہے۔

چنانچہ قرآن میں امثال بیان کرنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ " (سورۃالحشر آیت نمبر 21)

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ فکر نہ کریں۔

معنیِ کثرت:

(ک ث ر)

کثرت اور قلت، کمیت منفصل یعنی اعداد میں استعمال ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا:

" وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيراً "(سورۃالمائدۃ آیت نمبر 64)

اس سے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور بڑھے گا۔

تحقیقِ فسق:

(ف س ق) فسق (Impiety, Sin)

فسق فلان کے معنی کسی شخص کے دائرہ شریعت سے نکل جانے کے ہیں یہ فسق الرطب کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی گدری کھجور کے اپنے چھلکے سے باہر نکل آنا کے ہیں شرعا فسق کا مفہوم کفر سے اعم ہے کیونکہ فسق کا لفظ چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے گناہ کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اگرچہ عرف میں بڑے گناہوں کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اور عام طور پر فاسق کا لفظ اس شخص کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو احکام شریعت کا التزام اور اقرار کرنے کے بعد تمام یا بعض احکام کی خلاف ورزی کرے۔

نوٹ: ایمان، رب، کفر، ضال، ہدایت کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 27]

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِيثاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولئِكَ هُمُ الْخاسِرُونَ (27)

''وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان میں ہیں''۔

متن:

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللهِ

صفة للفاسقين للذم وتقرير الفسق. والنقض: فسخ التركيب، وأصله في طاقات الحبل، واستعماله في إبطال العهد من حيث إن العهد يستعار له الحبل لما فيه من ربط أحد المتعاهدين بالآخر. فإن أطلق مع لفظ الحبل كان ترشيحاً للمجاز، وإن ذكر مع العهد كان رمزاً إلى ما هو من روادفه وهو أن العهد حبل في ثبات الوصلة بين المتعاهدين كقولك شجاع يفترس أقرانه وعالم يغترف منه الناس فإن فيه تنبيها على أنه أسد في شجاعته بحر بالنظر إلى إفادته. والعهد: الموثق ووضعه لما من شأنه أن يراعى ويتعهد كالوصية واليمين، ويقال للدار، من حيث إنها تراعى بالرجوع إليها. والتاريخ لأنه يحفظ. وهذا العهد: إما العهد المأخوذ بالعقل، وهو الحجة القائمة على عباده الدالة على توحيده ووجوب وجوده وصدق رسوله، وعليه أُوِّلَ قوله تعالى:

وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ.

أو: المأخوذ بالرسل على الامم، بأنهم إذا بعث إليهم رسول مصدق بالمعجزات صدقوه واتبعوه، ولم يكتموا أمره ولم يخالفوا حكمه، وإليه أشار بقوله:

وَإِذْ أَخَذَ اللهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

ونظائره. وقيل: عهود الله تعالى ثلاثة: عهد أخذه على جميع ذرية آدم بأن يقروا بربوبيته، وعهد أخذه على النبيين بأن يقيموا الدين ولا يتفرقوا فيه، وعهد أخذه على العلماء بأن يبينوا الحق ولا يكتموه.

مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ الضمير للعهد والميثاق: اسم لما يقع به الوثاقة وهي الاستحكام، والمراد به ما وَثَّقَ الله به عهده من الآيات والكتب، أو ما وثقوه به من الالتزام والقبول ويحتمل أن يكون بمعنى المصدر. ومِنْ للابتداء فإن ابتداء النقض بعد الميثاق.

ترجمہ:

وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں۔

یہ الفاسقین کی صفت ہے اور ان کی مذمت اور ان کے فسق کی پختگی کے لئے لائی گئی ہے۔ نقض کا معنیٰ مرکب چیز کے اجزاء کو جدا جدا کرنا اور کھولنا ہے۔ یہ اصل میں رسی کے بٹے ہوئے اجزاء کو کھولنے میں استعمال ہوتا ہے اور عہد کو باطل کرنے کے معنیٰ میں نقض کا استعمال اس حیثیت سے ہے کہ عہد کے لئے مجازاً حبل یعنی رسی بطور استعارہ لی گئی ہے کیونکہ عہد بھی دو متعاہدین کو دوسرے کے ساتھ جوڑنے کا فائدہ دیتا ہے جس طرح رسی مختلف اجزاء کو جوڑتی ہے۔ اگر نقض کا لفظ حبل کے ساتھ استعمال کیا جائے جیسے

ینقض حبل الله

تو یہ ترشیح للمجاز کے لئے ہوگا۔ (مشبہ کے مناسبات میں سے ایک مناسب کا ذکر ہوگا) اور اگر اس کو عہد کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ مثل حبل کے ہوگا جیسے وہ دو چیزوں کو ثابت کرنے میں وسیلہ ہوتی ہے اسی عہد بھی دو متعاہدین کے درمیان تعلق برقرار رکھنے کا وسیلہ ہوتا ہے جیسا کہ آپکا کہنا،

شجاع يفترس اقرانه

کہ وہ ایسا بہادر ہے جو اپنے ہم جنسوں کا شکار کرتا ہے۔

وعالم يغترف منه الناس

اور وہ ایسا عام ہے کہ لوگ اس سے چلو بھر کر پیتے ہیں۔ یہاں پہلے جملہ میں مشبہ بہ شیر کا مناسب ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے فقرہ میں مشبہ بہ دریا کا مناسب ذکر کیا گیا ہے تو گویا یوں کہا کہ وہ شیر کی طرح بہادر ہے اور دریا کی طرح سخی ہے۔ اسی طرح لفظ نقض میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عہد اسی کی مانند ہے جسے وہ توڑتے ہیں۔

"والعہد" عہد سے مراد محکم اور مضبوط چیز ہے اور عہد اس چیز کے لئے وضع کیا گیا ہے جس شان یہ ہے اس کی رعایت اور حفاظت کی جائے جیسے وصیت اور قسم وغیرہ چونکہ عہد میں بھی اس کی رعایت اور حفاظت کرنا واجب ہوتا ہے اس کے لئے اسے عہد کہا جاتا ہے۔ گھر کو بھی عہد کہتے ہیں اس حیثیت سے گھر والا اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے تاریخ کو بھی عہد کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی گزشتہ اقوام کے کردار اور احوال کی حفاظت کرتی ہے اور یہاں اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ کریم نے اپنے بندوں کو عقل عطا فرما کر ان سے لیا تھا تو اس کائنات میں غور و فکر کرے اور اس کی ذرہ ذرہ میں بکھری ہوئی آیات کو دیکھ کر اس کی وحدانیت اور واجب الوجود ہونے پر دلیل قائم کریں گے۔ نبوت اور صداقت پر حجت پر قائم کریں گے۔ اور ان پر ایمان لائیں گے اور اللہ کریم کے اس ارشاد گرامی سے یہی مراد ہے کہ اللہ کریم نے انہیں خود ان کی ذات پر گواہ بنالیا یا اس سے مراد وہ عہد ہوگا جو اللہ کریم نے رسولوں کے ذریعے سے ان کی امتوں سے لیا کہ ان کی طرف کوئی ایسا رسول بھیجا جائے جس کی معجزات کے ساتھ تصدیق ہو جائے اور اس کی پیروی کریں اور وہ نبوت کے امور کو نہ چھپائیں اور نہ ہی اس کے حکم کی خلاف ورزی کریں بلکہ اس کی اتباع کریں اور اسی کی طرف اللہ کریم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے،

واذاخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب...... ع

اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا اور اسی طرح اس قسم کی دوسری آیات سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ اللہ کریم کے تین عہد ہیں۔

(1) جو اس نے ساری اولاد آدم سے لیا کہ وہ اس کے رب ہونے کا اقرار کریں۔

(2) وہ عہد جو اللہ کریم نے انبیاء سے لیا کہ وہ اس کے دین کو قائم کریں اور اس میں اختلاف نہ کریں۔

(3) وہ عہد جو اللہ کریم نے علماء سے لیا کہ وہ حق کو واضح کریں گے اور اس کو نہیں چھپائیں گے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو عالم حق بات چھپاتا ہے اور اس کو ظاہر نہیں کرتا تو قیامت کے دن جہنم کی آگ میں تپایا ہوا لوہے کا لگام اس کے منہ میں داخل کر لیا جائے۔

من بعد میثاقہ

اپنے عہد کو پختہ کرنے کے بعد۔

میثاقہ کی ضمیر کا مرجع لفظ عہد سے ہے اور میثاق ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کے ذریعے استحکام حاصل ہوتا ہے اور یہاں میثاق سے مراد وہ آیات اور کتابیں ہیں جن کے ساتھ اللہ کریم نے اس عہد کو پختہ کیا یا اس سے مراد وہ چیزیں ہوں گی جن

کے ذریعے بندوں نے اس عہد کو پختہ کیا یعنی اس کو لازم پکڑنا اور اس کو قبول کرنا ہے۔ میثاق اصل میں موثاق تھا، کسرہ کے بعد واؤ یا ہوگئی اور یہ بمعنی مصدر ہوگا اور اس آیت میں "مِن" سے مراد ہر دو صورتوں میں ابتداء ہوگی کیونکہ عہد کو توڑنے کی ابتداء اس کے بعد ہی ہوگی۔

متن:

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ يحتمل كل قطيعة لا يرضاها الله تعالى، كقطع الرحم، والإعراض عن موالاة المؤمنين، والتفرقة بين الانبياء عليهم السلام، والكتب في التصديق، وترك الجماعات المفروضة، وسائر ما فيه رفض خير. أو تعاطي شر فإنه يقطع الوصلة بين الله وبين العبد المقصودة بالذات من كل وصل وفصل، والامر هو للقول الطالب للفعل، وقيل: مع العلو، وقيل: مع الاستعلاء، وبه تسمي الامر الذي هو واحد الامور تسمية للمفعول به بالمصدر، فإنه مما يؤمر به كما قيل: له شأن وهو الطلب، والقصد يقال: شأنت شأنه، إذا قصدت قصده. وأَنْ يُوصَلَ يحتمل النصب والخفض على أنه بدل من ما، أو ضميره.

والثاني أحسن لفظاً ومعنى.

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ بالمنع عن الإيمان والاستهزاء بالحق، وقطع الوصل التي بها نظام العالم وصلاحه.

أُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ الذين خسروا بإهمال العقل عن النظر واقتناص ما يفيدهم الحياة الابدية، واستبدال الإنكار والطعن في الآيات بالإيمان بها، والنظر في حقائقها والاقتباس من أنوارها، واشتراء النقض بالوفاء، والفساد بالصلاح، والعقاب بالثواب.

ترجمہ:

اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہی نقصان میں ہیں۔

یہاں قطع سے ہر وہ قطع تعلقی ہے جس کو اللہ کریم ناپسند فرماتا ہے مثلاً قریبی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی نہ کرنا مومنین کے ساتھ دوستی سے اعراض کرنا اور انبیاء کرام اور آسمانی کتابوں میں تفریق کرنا یعنی بعض پر ایمان لانا اور بعض کا انکار کرنا، اور فرضی اجتماعات میں شرکت نہ کرنا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی بھلائی کو چھوڑنا اور برائی کو اپنانا وغیرہ کیونکہ بھلائی کو چھوڑنا اور برائی کو

اپنانا یہ اس تعلق اور واسطے کو توڑ دیتے ہیں جو بالذات اللہ کریم اور اس کے بندے کے درمیان مقصود ہوتا ہے ہر وصل اور فصل سے۔

والامر هو القول الطالب للفعل

اور امر ہر اس قول کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کسی فعل کی طلب کی جاتی ہے اور بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کوئی بلند مرتبہ اپنے سے کم مرتبہ والے سے فعل کی طلب کرے یا بذات خود بلند مرتبہ نہیں لیکن اپنے آپ کو بلند مرتبہ سمجھتا ہے۔ اس کا کسی کو کام کرنے کی طلب کرنا اور مجازاً امر کا لفظ اس کام کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کاموں میں سے ایک ہوتا ہے اس صورت میں مصدر بول کر مراد مفعول ہے کیونکہ یہ وہی چیز ہے جس کے کرنے کا کسی کو حکم دیا جاتا ہے جیسے لفظ شان کا معنیٰ طلب کرنا اور قصد کرنا ہے جیسے کہا جاتا ہے،

شانت شانه

میں نے اس کام کے کرنے کا قصد کیا۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو لفظ اور معنیٰ کے اعتبار سے یہ دوسرا احتمال پسند ہے کیونکہ اس کے قریب ہے، اسی لئے انہوں نے کہا

والثانی احسن لفظاً و معنیً۔

ویفسدون فی الارض...

یعنی لوگوں کو ایمان لانے سے روکتے ہیں اور حق کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں اور ان تعلقات کو منقطع کرتے ہیں جن پر نظام عالم قائم ہے اور ان کی اصلاح کا دارومدار ہے۔

أُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ

اور یہی لوگ ہمیشگی کے خسارے میں ہیں۔ یعنی انہوں نے عقل کو نظر و فکر سے مہمل چھوڑ دیا اور ان کاموں کے کرنے میں استعمال نہ کیا جن سے انہیں دائمی زندگی حاصل ہو سکتی ہے بلکہ وہ آیات طیبات پر ایمان لانے اور حقائق کو تسلیم کرنے کی بجائے ان پر اعتراضات کرتے ہیں اور ان کو جھٹلاتے ہیں کس کی وجہ سے وہ دائمی خسارہ میں ہیں اور ان آیات کے انوار کو حاصل نہیں کرتے اور وعدوں کی خلاف ورزی کو خریدتے ہیں اصلاح کی بجائے فساد برپا کرتے ہیں اور بجائے ثواب کے عذاب حاصل کرتے ہیں اسی لئے وہ ہمیشہ ہمیشہ عذاب کے مستحق ہیں۔

لفظ نقض کی تحقیق:

(ن ق ض) النقض (To Break, To Spoil)

یہ ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنیٰ کسی چیز کا شیرازہ بکھیرنے کے ہیں جیسے نقضت البناء عمارت کو ڈھانا الحبل رسی کے

بل اتارنا العقد گرہ کھولنا النقج والنقض یہ دونوں بمعنی منقوض آتے ہیں لیکن بکسر النون زیادہ تر عمارت کے لئے آتا ہے اور بفتح النون کا عام استعمال اشعار کے متعلق ہوتا ہے اسی سے دبلے اونٹ اور زمین کی پرت کو جو کھمبی وغیرہ کے نکلنے سے پھٹ جاتی ہے نقض کہا جاتا ہے پھر نقض الحبل والعقد سے استعارہ کے طور پر عہد شکنی کے لئے بھی نقض کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 27)

جو اللہ کے اقرار کو توڑ دیتے ہیں۔

"وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا" (سورۃ النحل آیت نمبر 91)

اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو نہ توڑو۔

لفظ عہد کی تحقیق:

(ع ہ د) العهد (ض) (Promise)

کے معنی ہیں کسی چیز کی پیہم نگہہ داشت اور خبر گیری کرنا اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عہد کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُلًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 34)

اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔

یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔

"لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 124)

کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔

میثاق کا معنی:

(و ث ق) وثق

وثقت بہ اثق ثقتہ۔ کسی پر اعتماد کرنا اور مطمئن ہونا۔ اوثقتہ انعال زنجیر میں جکڑنا رسی سے کس کر باندھنا۔ اولوثاق والوثاق اس زنجیر یا رسی کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کو باندھ دیا جائے۔ قرآن میں ہے:

"وَلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ" (سورۃ الفجر آیت نمبر 26)

اور نہ کوئی ایسا جکڑنا جکڑے گا۔

"حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ" (سورۃ محمد آیت نمبر 4)

یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو جو زندہ پکڑے جائیں ان کو قید کرلو۔

المیثاق کی تحقیق:

کے معنی پختہ عہد و پیمان کے ہیں جو قسموں کے ساتھ موکد کیا گیا ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 81)

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا۔

"وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 154)

اور عہد بھی ان سے پکا لیا۔

الموثق کا معنی:

(اسم)

پختہ عہد و پیمان کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 66)

جب تک تم مجھے اللہ کا یہ عہد نہ دے دو کہ ضرور اسے لے کر آؤ گے مگر یہ کہ تم گھر جاؤ پھر جب انہوں نے یعقوب کو عہد دے دیا۔

لفظِ قطع کی تعریف:

(ق ط ع) القطع (Cut From)

کے معنی کسی چیز کو علیحدہ کر دینے کے ہیں خواہ اس کا تعلق حاسہ بصر سے ہو جیسے اجسام اسی سے اعضاء کا قطع کرنا۔ قرآن میں ہے:

"لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 124)

میں پہلے تو تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسرے طرف کے پاؤں کٹوا دونگا۔

تحقیقِ امر:

(ا م ر) الامر (اسم) (Order)

کے معنی شان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع امور ہے اور امر تہ (ن) کا مصدر بھی امر آتا ہے جس کے معنی حکم دینا کے ہیں امر کا لفظ جملہ اقوال و افعال کے لئے عام ہے۔ چنانچہ آیات:

وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ" (سورۃ ھود آیت نمبر 123)

اورتمام امورکار جوع اسی طرف ہے۔

اتصال کا معنیٰ:

(و ص ل) الاتصال (Union)

کے معنی اشیاء کے باہم اس طرح متحد ہوجانے کے ہیں جس طرح کہ قطرہ دائرہ کی دونوں طرفین ملی ہوئی ہوتی ہیں اس کی ضد انفعال آتی ہے اور وصل کے معنی ملائے کے ہیں اور یہ اسم اور معنی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ وصلت فلانا صلہ رحمی کے معنی میں آتا ہے قرآن میں ہے

"وَيَقْطَعُوْنَ ما اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 27)

اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اسی کو قطع کئے ڈالتے ہیں۔

فسد کا معنیٰ:

(ف س د) الفساد (ن) (Quarrel)

یہ فسد الشئی فھو فاسد کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ قرآن میں ہے:

"لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 71)

تو آسمان وزمین سب درہم برہم ہوجائیں۔

تحقیقِ خسارہ:

(خ س ر) الخسر والخسران (The Damage)

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔ جیسے مال وجاہ وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت وسلامتی عقل وایمان اور ثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالیٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

" الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ"

(سورۃ الزمر آیت نمبر 15)

جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا۔ دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔

نوٹ: لفظ اللہ، ما، ارض کا ذکر ہو گیا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 28]

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (28)

”بھلاتم کیونکر خدا کے منکر ہوگے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جلائے گا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے“۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ

استخبار فيه إنكار، وتعجيب لكفرهم بإنكار الحال التى يقع عليها على الطريق البرهانى، فإن صدوره لا ينفك عن حال وصفة فإذا أنكر أن يكون لكفرهم حال يوجد عليها استلزم ذلك إنكار وجوده. فهو أبلغ وأقوى فى إنكار الكفر، من (أتكفرون) وأوفق لما بعده من الحال. والخطاب مع الذين كفروا لما وصفهم بالكفر وسوء المقال وخبث الفعال، خاطبهم على طريقة الالتفات، ووبخهم على كفرهم مع علمهم بحالهم المقتضية خلاف ذلك. والمعنى أخبرونى على أى حال تكفرون؟

وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا

أى أجساماً لا حياة لها، عناصر وأغذية، وأخلاطاً ونطفاً، ومضغاً مخلقة وغير مخلقة.

فَاَحْيَاكُمْ

بخلق الارواح ونفخها فيكم. وإنما عطفه بالفاء لأنه متصل بما عطف عليه غير متراخ عنه بخلاف البواقى.

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ

عند ما تقضى آجالكم. ثُمَّ يُحْيِيكُمْ بالنشور يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصور أو للسؤال فى القبور ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ بعد الحشر فيجازيكم بأعمالكم. أو تنشرون إليه من قبوركم للحساب. فما أعجب كفركم مع علمكم بحالكم هذه. فإن قيل: إن علموا أنهم كانوا أمواتاً فأحياهم ثم يميتهم، لم يعلموا أنه يحييهم ثم إليه يرجعون.

ترجمہ:

یہاں کیف کے ساتھ استفہام کرنے کا سبب یہ ہے کہ چونکہ کیف کے ساتھ مسؤل عنہ کی حالت کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے لیکن یہاں استفہام انکاری کے معنی میں ہے اور کفار سے یہ پوچھا جارہا ہے کہ کہ وہ کونسی حالت ہے جس پر تم

اللہ کریم کا انکار کرتے ہو اور ان کے اس انکار پر کفر پر تعجب دلیل منطقی کے طریقہ پر کیا جارہا ہے کیونکہ کفر اور انکار کا ثبوت کسی حالت یا صفت کے سوا نہیں ہوسکتا تو جب اس حالت کا ہی انکار کر دیا گیا کہ کوئی ایسی حالت ہے ہی نہیں کہ جس پر کفر پایا جائے تو لازماً یہ نتیجہ نکلے گا کہ اس کے وجود کا ہی انکار کر دیا جائے اور اس کے کفر کے انکار میں "اتکفرون" کے ساتھ سوال کرنے کی بنسبت یہ انداز اپنانا زیادہ بلیغ اور قوی ہے اور بعد میں بیان ہونے والے حالات کے زیادہ قریب ہے یہاں خطاب کافروں سے ہے کیونکہ جب ان کے کفر کو بیان فرمایا اور ان کی غلط بات کو ذکر کیا اور ان کے افعال کی خباثت کا تذکرہ کیا تو بطور التفات ان کے ساتھ خطاب کیا اور ان کے کفر پر انہیں زجر و توبیخ کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ایسی حالت پر ہیں جو مذکورہ بالا کے خلاف کا تقاضا کرتی ہے اور یہاں کیف، تکفرون، اخبرونی علی ای حال تکفرون کے معنی میں ہے یعنی مجھے خبر دو کہ تم کس حالت پر اس سے کفر کرتے ہو۔

و کنتم امواتا

اس کا معنی یہ ہے کہ تم ایسے اجسام تھے جن میں زندگی نہ تھی تم محض عناصر اور غذائیں تھے اور اخلاط، نطفے اور مضغے تھے بعض ان میں سے کامل اور بعض ناقص تھے۔

فاحیاکم

پس اس نے تمہیں زندہ کیا کہ ارواح پیدا فرما کر تمہارے اندر پھونک دیں اور اس کا ماقبل کلام پر عطف "فا" کے ساتھ کیا ہے۔ اس میں یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ جن پر اس کا عطف کیا گیا ہے یہ ان کے ساتھ متصل ہے ان کے درمیان اور اس کے درمیان بعد نہیں بخلاف ان حالات کے جو بعد میں مذکور ہو رہے ہیں کہ پھر وہ تمہیں مارے گا یعنی جب تمہاری عمریں ختم ہو جائیں گی پھر صور پھونکنے کے دن تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ یا قبر میں سوال جواب کے لئے تمہیں اٹھائے گا۔

ثم الیہ ترجعون

پھر بروز حشر تمہیں اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا اور وہ تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق سزا یا جزا دے گا یا تمہیں حساب و کتاب کے لئے قبروں سے اٹھا کر اس کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا تو پھر ان حالات کے جاننے کے باوجود تمہارا اس کی ذات سے کفر کرنا کتنا عجیب ہے۔

متن:

قلت: تمكنهم من العلم بهما لما نصب لهم من الدلائل منزل منزلة علمهم فى إزاحة العذر.

سيما وفى الآية تنبيه على ما يدل على صحتهما وهو: أنه تعالى لما قدر على إحيائهم أولاً قدر على أن يحييهم ثانياً. فإن بدء الخلق ليس بأهون عليه من إعادته. أو الخطاب مع

القبيلين فإنه سبحانه وتعالى لما بين دلائل التوحيد والنبوة، ووعدهم على الإيمان، وأوعدهم على الكفر، أكد ذلك بأن عدد عليهم النعم العامة والخاصة، واستقبح صدور الكفر منهم واستبعده عنهم مع تلك النعم الجليلة، فإن عظم النعم يوجب عظم معصية المنعم، فإن قيل: كيف تعد الإماتة من النعم المقتضية للشكر؟ قلت: لما كانت وصلة إلى الحياة الثانية التي هي الحياة الحقيقية كما قال الله تعالى: وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوانُ، كانت من النعم العظيمة مع أن المعدود عليهم نعمة هو المعنى المنتزع من القصة بأسرها، كما أن الواقع حالا هو العلم بها لا كل واحدة من الجمل، فإن بعضها ماض وبعضها مستقبل وكلاهما لا يصح أن يقع حالا. أو مع المؤمنين خاصة لتقرير المنة عليهم، وتبعيد الكفر عنهم على معنى، كيف يتصور منكم الكفر وكنتم أمواتاً جهالاً. فأحياكم بما أفادكم من العلم والإيمان، ثم يميتكم الموت المعروف، ثم يحييكم الحياة الحقيقية، ثم إليه ترجعون، فيثيبكم بما لا عين رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر على قلب بشر. والحياة حقيقة في القوة الحساسة، أو ما يقتضيها وبها سمي الحيوان حيواناً مجازاً في القوة النامية، لأنها من طلائعها ومقدماتها، وفيما يخص الإنسان من الفضائل، كالعقل والعلم والإيمان من حيث إنها كمالها وغايتها، والموت بإزائها يقال على ما يقابلها في كل مرتبة قال تعالى: قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ. وقال: اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وقال: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتاً فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْراً يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ وإذا وصف به الباري تعالى أريد بها صحة اتصافه بالعلم والقدرة اللازمة لهذه القوة فينا، أو معنى قائم بذاته يقتضي ذلك على الاستعارة. وقرأ يعقوب تُرْجَعُوْنَ بفتح التاء في جميع القرآن.

ترجمہ:

یہ اصل میں

اخبرونی علی حال تکفرونی...الخ

کے معنی میں ہے اخبرونی میں "انتم" ضمیر ذوالحال اور کیف تکفرون مکمل جملہ حال نیز تکفرون میں انتم ضمیر ذوالحال ہے

اور امواتاً الی آخرہ حال، حال ذوالحال سے مل کر تکفرون کا فاعل ہے۔

مندرجہ بالا آیت کریمہ میں تین گروہوں کے مخاطب ہونے کا احتمال ہے۔

پہلا یہ کہ صرف کافر ہوں۔ دوسرا یہ کہ مومن اور کافر دونوں مراد ہوں۔ تیسرا یہ کہ صرف مومن مراد ہوں۔

1۔ پہلا احتمال کہ اس کے مخاطب کافر ہوں، کیونکہ ماقبل کلام میں ان کے اقوال، افعال اور عقائد بیان کئے گئے ہیں۔ اب بطریق التفات ان کے کفر و انکار پر ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کی جا رہی ہے اور اس بات پر اظہار تعجب کیا جا رہا ہے کہ وہ باوجود اس حالت کو جاننے کے جو کفر نہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے، کیوں انکار کرتے ہیں یعنی نہ کوئی ایسی حالت ہے اور نہ ہی صفت جس پر اس ذات والا صفات کے ساتھ کفر کیا جائے اس وجہ سے کفار کا انکار کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

2۔ دوسرا احتمال یہ کہ آیت کے مخاطبین سے مراد کافر اور مومن دونوں ہوں، جس کہ وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم نے اس سے ماقبل اپنی توحید، نبوّت اور قرآن پاک کے حق ہونے پر بے شمار دلائل دیئے ہیں۔ مومنین کو جنت کی خوشخبری اور منکرین کی عذاب جہنم کی وعیدیں سنائی ہیں اب اللہ کریم ان پر اپنی خاص اور عام نعمتوں کا تذکرہ فرما کر مومنین کے ساتھ وعدہ اور کافروں پر وعید کو مؤکد کر رہا ہے اور عظیم الشان نعمتوں کے باوجود ان کا کفر اور ناشکری قبیح اور بعید از مکان ہے کیونکہ نعمت جتنی بڑی ہوتی ہے اس کا کفر اور ناشکری کی سزا بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا اے مومنو! تم میری ان نعمتوں کی ناشکری کیوں کرتے ہو، اور اے کافرو! تم میرا انکار کیوں کرتے ہو۔

3۔ تیسرا احتمال یہ کہ اس آیت کریمہ کے مخاطبین صرف مومن ہوں اور فرمایا کہ تم ہدایت قبول کرنے سے پہلے جاہل مطلق اور علم و عرفان سے خالی تھے میں نے تمہیں علم بھی دیا، اپنی نعمتوں سے بھی نوازا پھر تمہیں موت عطا فرما کر بصد عزت و احترام اس دار فانی سے رخصت فرمایا اور اس کے بعد تمہیں دوبارہ حقیقی زندگی عطا فرما کر ایسی نعمتوں سے نوازوں گا جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ ہی کسی کے دل میں خیال گزرا ہوگا تو اتنی نوازشات کے ہوتے ہوئے تم میری ناشکری کر سکتے ہو؟

مندرجہ بالا احتمالات میں سے جو بھی مراد لیا جائے تو آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ تم ایسے اجسام تھے جن میں زندگی نہ تھی تم محض غذائیں، عناصر، مضغہ اور نطفے تھے اللہ کریم نے روح پھونک کر زندگی عطا کی پھر مقررہ مدت کے بعد تمہیں موت عطا کرے گا اور پھر بعد صور پھونکنے کے تمہیں قبروں سے نکالے گا اور محشر میں جمع کرے گا یا اس سے مراد ہے کہ تمہیں قبروں میں ابتدائی سوالات کے لئے زندگی بخشے گا پھر حشر تک تم عالم برزخ میں رہو گے اس کے بعد تمہیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا اور اعمال کے مطابق سزا و جزا عطا فرمائے گا۔ جب تمہاری حالت یہ ہے حساب کے لئے رب کے سامنے کھڑے ہوگے تو تمہارا ناشکری کرنا کتنا عجب ہے۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ موت کو ان نعمتوں میں سے کیسے شمار کیا جائے جو شکر کا تقاضا کرتی ہیں کیونکہ وہ تو نعمتوں

کے زوال کا نام ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ موت دائمی اور ابدی نعمتوں کے حصول کا سبب ہے اور زندگی کے ختم ہونے کے بعد ہی اصل زندگی نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد،

وان الدار الأخرة لهي الحيوان

یعنی آخرت کا گھر ہی حقیقی زندگی ہے۔ تو اس لحاظ سے وہ عظیم نعمتوں سے ہوگی جیسے کہا جاتا ہے۔

"احیاء" یہ فعل مضارع کا صیغہ ہے اور احیاء سے مشتق ہے جس کا معنی حس اور حرکت پیدا کرنا ہے کیونکہ حیوان کو اس لئے حیوان کہا جاتا ہے کہ اس میں حرکت ہوتی ہے اور یہاں اس سے مراد زندہ کرنا اور حس وحرکت پیدا کرنا ہے مجازاً اس کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے۔

(1) قوت نامیہ

کیونکہ وہ حس اور حرکت کے مبادیات اور اس کے مقدمات سے ہوتی ہے۔

(2) فضائل وکمالات اور علم وایمان

فضائل وکمالات اور علم وایمان کا پیدا ہونا کیونکہ انسان کا کمال اور اس کی غایت انہی پر موقوف ہے۔

(3) اموات

موت بمعنی زوال حیات یعنی وہاں حیات کا نہ ہونا جس کی شان یہ ہے کہ وہ زندہ ہو اور موت کا اطلاق ان تمام معانی اور اوصاف کے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جن کا ذکر حیات کے معنی میں بیان ہو چکا ہے یعنی حس وحرکت، قوت نامیہ، فضائل و کمالات اور علم وعرفان کا نہ ہونا موت کہلاتا ہے کیسا کہ فرمان باری تعالیٰ،

قل الله يحييكم ثم يميتكم

آپ فرمایئے کہ اللہ کریم ہی تمہیں زندگی دیتا ہے اور پھر تمہیں مارتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا،

اعلموا انّ الله يحي الارض بعد موتها

کہ جان لو اللہ کریم ہی زمین کے مردہ ہونے کے بعد اس میں قوّت نامیہ پیدا فرما دیتا ہے۔ مزید ایک جگہ فرمایا،

اومن كان ميتاً فاحيينه وجعلناله نوراً يمشي به في الناس

کہ کیا وہ مردہ نہ تھا ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کو نور عطا فرمایا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے۔

حیات کے جو معانی اوپر بیان کئے گئے ہیں ان کا تعلق اجسام سے ہے اور اللہ کریم اجسام اور ان کے خواص اور اوصاف سے پاک اور منزہ ہے تو ان معانی کے اعتبار سے اللہ کریم پر ان کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ "حی" اللہ کریم کی صفت ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جب حیات کی نسبت اللہ کریم کی طرف ہوگی تو اس سے مراد اللہ کریم کا علم اور قدرت کی۔ صفت سے متصف ہونا ہے جو اس کو قوت کو لازم ہے جو ہمارے اندر پائی جاتی ہے۔ یا اس سے مراد وہ صفت ہوگی جو اللہ کریم

کی ذات کے ساتھ ہے جو اس علم کا تقاضا کرتی ہے اور بطور استعارہ ان کو ذکر کیا گیا ہے تو "حی" کا معنی یہ ہوگا کہ وہ عالم اور قدیر ہے۔

اشکال اور اس کا جواب:

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ قیامت اور حشر کے جو منکر ہیں ان کے لئے مذکورہ بالا آیات، قیامت کے ثبوت اور دوبارہ زندگی کے لئے دلیل کیسے بن سکتی ہے کیونکہ انہوں نے کسے کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا ہی نہیں جبکہ وہ پہلی زندگی اور موت کے تسلسل سے باخبر ہیں اب اگر وہ اس کا انکار کر دیں اور یہ کہیں دوبارہ زندگی ممکن ہی نہیں کیونکہ یہ ہڈیاں اور گوشت پوست جل کر خاکستر بن جاتے ہیں پھر دوبارہ انہیں کیسے جمع کیا جاتا ہے تو اس میں ان کا قصور کیا ہے جس پہ انہیں مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اللہ کریم نے ان کے سامنے ایسے عام فہم اور واضح دلائل پیش فرمائے ہیں جنہیں دیکھ کر وہ اس کا علم حاصل کر سکتے ہیں کہ جو ذات مذکورہ بالا واقعات پر قادر ہے وہ دوبارہ زندہ بھی کر سکتا ہے لہٰذا ان کے عدم علم کا عذر اس طرح زائل ہو سکتا ہے اور اسی کو دوبارہ زندگی کے علم کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ یعقوب نے تمام قرآن کریم میں "ترجعون" کو بفتحہ "تاء" پڑھا ہے۔

کیف کی کیفیات:

(ک ی ف)

کیف (اسم استفہام) اس چیز کی حالت دریافت کرنے کے لئے آتا ہے جس پر کہ شبیہ اور غیر شبیہ کا لفظ بولا جا سکتا ہو جیسے ابیض (سفید) اسود (سیاہی) صحیح (تندرست) سقیم (بیمار) وغیرہ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے متعلق اس کا استعمال جائز نہیں ہے اور کبھی اس چیز پر بھی کیف کا اطلاق کر دیتے ہیں جس کے متعلق سوال کرنا ہو مثلاً کہا جاتا ہے کہ اسود اور ابیض مقولہ کیف سے ہیں اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق کیف کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ تنبیہ یا توبیخ کے طور پر مخاطب سے استخبار کے لئے لایا گیا ہے جیسے فرمایا:

"كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 28)
بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہو گے۔

"كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 86)
کیونکر اللہ ایسی قوم کی ہدایت چاہے۔

"كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 7)

بھلا شرکوں کے لئے کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔

"اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 48)
دیکھو انہوں نے کس کس طرح کی تمہارے بارے میں باتیں بنائیں۔

"فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 20)
اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔

"اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 19)
کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا پھر کس طرح اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔

مفہوم رجوع:

(ر ج ع) الرجوع (To Return)
اس کے اصل معنی کسی چیز کے اپنے مبدا حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جز کے اور یا باعتبار فعل کے ہو الغرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رجع کے معنی لوٹانے کے ہیں۔

نوٹ: آیت بالا میں مذکور باقی الفاظ کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 29]

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ (29)

"وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے، پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے وہ سب کچھ جانتا ہے"۔

متن:

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا

بيان نعمة أخرى مرتبة على الاولى، فإنها خلقهم أحياء قادرين مرة بعد أخرى، وهذه خلق ما يتوقف عليه بقاؤهم وتم به معاشهم. ومعنى لَكُمْ لأجلكم وانتفاعكم في دنياكم باستنفاعكم بها في مصالح أبدانكم بوسط أو بغير وسط، ودينكم بالاستدلال والاعتبار والتعرف لما يلائمها من لذات الآخرة وآلامها، لا على وجه

الغرض، فإن الفاعل لغرض مستكمل به، بل على أنه كالغرض من حيث إنه عاقبة الفعل ومؤداه وهو يقتضى إباحة الاشياء النافعة، ولا يمنع اختصاص بعضها ببعض لأسباب عارضة، فإنه يدل على أن الكل للكل لا أن كل واحد لكل واحد. وما يعم كل ما فى الارض، إلا إذا أريد بها جهة السفل كما يراد بالسماء جهة العلو. وجميعاً: حال من الموصول الثانى.

ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ قصد إليها بإرادته، من قولهم استوى إليه كالسهم المرسل، إذا قصده قصداً مستوياً من غير أن يلوى على شيء. وأصل الاستواء طلب السواء، وإطلاقه على الاعتدال لما فيه من تسوية وضع الاجزاء، ولا يمكن حمله عليه لأنه من خواص الاجسام وقيل استوى أى: استولى ومَلَكَ، قال:

قَدِ اسْتَوَى بِشْرٌ على العِرَاق ... مِنْ غَيْرِ سَيْفٍ ودَمٍ مُهْرَاقِ

والاول أوفق للأصل والصلة المعدى بها والتسوية المترتبة عليه بالفاء، والمراد بالسماء هذه الاجرام العلوية، أو جهات العلو، وثُمَّ لعله لتفاوت ما بين الخلقين وفضل خلق السماء على خلق الارض كقوله تعالى:

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا

لا للتراخى فى الوقت، فإنه يخالف ظاهر قوله تعالى: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَا فإنه يدل على تأخر دحو الارض المتقدم على خلق ما فيها عن خلق السماء وتسويتها، إلا أن تستأنف بدحاها مقدراً لنصب الارض فعلاً آخر دل عليه ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقاً مثل تعرف الارض وتدبر أمرها بعد ذلك لكنه خلاف الظاهر فَسَوّٰهُنَّ عدلهن وخلقهن مصونة من العوج والفطور. وهن ضمير السماء إن فسرت بالاجرام لأنه جمع. أو هو فى معنى الجمع، وإلا فمبهم يفسره ما بعده كقولهم: ربه رجلاً.

سَبْعَ سَمٰوَاتٍ بدل أو تفسير. فإن قيل: أليس إن أصحاب الارصاد أثبتوا تسعة أفلاك؟ قلت: فيما ذكروه شكوك، وإن صح فليس فى الآية نفى الزائد مع أنه إن ضم إليها العرش والكرسى لم يبق خلاف.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ میں اللہ کریم ایک اور نعمت کا تذکرہ فرما رہا ہے اور وہ دوسری نعمت یہ ہے کہ جس سے نفع حاصل کرنا پہلی

نعمت یعنی زندگی پر موقوف ہے گویا زندگی کی بقاء اور دار و مدار اس دوسری نعمت پر ہے تو گویا یہ تمام نعمتیں، انسانی زندگی کی بقاء اور بدنوں کی سلامتی اور اس نعمت سے فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت پر موقوف ہے۔ اور یہ نعمتیں صرف دنیاوی فوائد حاصل کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ انسان ان میں تدبر کر کے دین اسلام کے حق ہونے پر دلائل قائم کر سکتا ہے اور ان نعمتوں کے زوال اور وجود سے اخروی نعمتوں کے زوال اور درد و آلام پر قیاس کر سکتا ہے کوئی کم فہم یہ نہ سمجھے کہ اللہ کریم کو ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں اور انسان کو عطا کرنے میں کوئی غرض ہے کیونکہ اللہ کریم کے افعال، اغراض کے مرہون منت نہیں کیونکہ جس کے افعال کسی غرض کے محتاج ہوں وہ اس غرض کے حاصل ہوئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا حالانکہ اللہ کریم کی ذات ایسے نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے۔

اس آیت طیبہ میں "ما" کا لفظ ذوالحال ہے اور جمیعًا اس سے حال ہے اور یہ مذکورہ بالا تفصیلات اس وقت ہوں گی جبکہ "مافی الارض" سے مراد وہ چیزیں لی جائیں جو زمین میں ہیں اور بذات خود اس سے مراد نہ ہوں ہاں اگر زمین سے نیچے والی جہت مراد لی جائے تو پھر لفظ "ما" زمین کو بھی شامل ہوگا جس طرح سماء کا لفظ بول کر اس سے اوپر والی جہت مراد لی جاتی ہے صرف آسمان مراد نہیں۔

قولہ استوٰی

یہ لفظ کئی معانی میں استعمال ہوا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ اپنے ارادی سے کسی چیز کی طرف قصد کرنا اور متوجہ ہونا ہے اور یہ اس قول سے مشتق ہے

استوی الیہ کالسھم المرسل اذا قصدہ قصدًا مستویًا... الخ

کہ اس نے اس کا سیدھا قصد کیا جیسے وہ تیر سیدھا نشانے پر جاتا ہے جس کو پھینکا جائے اور وہ ادھر اُدھر نہیں مڑتا۔

☆ اس کا لغوی معنیٰ برابری طلب کرنا ہے اور اس اطلاق اعتدال پر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس میں مختلف اجزاء کو برابر رکھا جاتا ہے لیکن اس کو اعتدال کے معنی میں استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ اجسام کے خواص سے ہے اور اللہ کریم کی ذات جس طرح جسم سے پاک ہے اسی طرح وہ جسم کے خواص سے بھی منزّہ ہے۔

☆ یہ معنی "استولی" اور "ملک" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی وہ اس پر غالب آیا اور مالک بن گیا۔ بطور دلیل قول شاعر ملاحظہ ہو،

قَدِ اسْتَوٰی بِشْرٌ علی العِرَاق ... مِنْ غَیرِ سَیْفٍ وَدَمٍ مُھْرَاقِ

کہ بشر عراق پر غالب آیا، بغیر تلوار چلائے اور بغیر خون بہائے۔

لیکن پہلا معنی یعنی ارادہ کے ساتھ کسی چیز کا سیدھا قصد کرنا لغوی معنی کے زیادہ قریب ہے اور جس صلہ کے ساتھ اس کو متعدی کیا گیا ہے (الی) وہ بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے اور "سواھن" کو فاء کے ساتھ اس پر معطوف کرنا جس کا معنی تمام

آسمانوں کو ٹیڑھا پن اور خلل کے بغیر صحیح صحیح اور درست بنایا بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے کہ استوی کا معنی سیدھا قصد کرنا ہے ورنہ ایک معنی کو ظاہر کرنے کے لئے دو لفظوں کا استعمال ہوگا جو جائز نہیں اور وہ الفاظ "استوٰی" اور "سوا ء" ہیں۔

"السماء" اس سے مراد جہات علویہ یا اجرام علویہ ہیں اس لئے "ھن" ضمیر کا مرجع "السماء" ہے ورنہ یہ ضمیر مبہم ہے اور "سبع سموات" اس کی تفسیر ہے جیسے "ربہ رجلا" میں "ۂ" ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر "رجلا" ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ علم فلسفہ کے ماہرین نے تجربات سے نو افلاک ثابت کئے ہیں اور اللہ کریم نے سات آسمان ذکر کئے ہیں ان میں تطبیق کیسے ممکن ہوگی؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک میں سات آسمانوں کا ذکر ہے زیادہ کی نفی نہیں اور خصوصا جب عرش اور کرسی بھی ساتھ ملائیں تو نو ہو جاتے ہیں اس لئے ان میں تضاد نہیں۔ نیز فلسفیوں نے نو افلاک ثابت کرنے کے لئے جو دلائل پیش کئے وہ شکوک اور شبہات سے خالی نہیں اس لئے ان کو عقیدے کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اس سوال کا تیسرا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نے سات آسمانوں کا ذکر کیا ہے اور فلسفیوں نے نو افلاک ثابت کئے ہیں محققین کے نزدیک آسمان اور فلک دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

متن:

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

فيه تعليل كأنه قال: ولكونه عالماً بكنه الاشياء كلها، خلق ما خلق على هٰذَا النمط الاكمل والوجه الانفع، واستدلال بأن من كان فعله على هٰذَا النسق العجيب، والترتيب الانيق كان عليماً، فإن إتقان الافعال وإحكامها و تخصيصها بالوجه الاحسن الانفع، لا يتصور إلا من عالم حكيم رحيم، وإزاحة لما يختلج في صدورهم من أن الابدان بعد ما تبددت، وتفتتت أجزاؤها، واتصلت بما يشاكلها، كيف تجمع أجزاء كل بدن مرة ثانية بحيث لا يشذ شيء منها، ولا ينضم إليها ما لم يكن معها فيعاد منها كما كان، ونظيره قوله تعالى: وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ.

واعلم أن صحة الحشر مبنية على ثلاث مقدمات، وقد برهن عليها في هاتين الآيتين:

أما الاولى فهي:

أن مواد الابدان قابلة للجمع والحياة وأشار إلى البرهان عليها بقوله: وَكُنْتُمْ أَمْوَاتاً فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ فإن تعاقب الافتراق والاجتماع والموت والحياة عليها يدل على أنها قابلة لها بذاتها، وما بالذات يأبى أن يزول ويتغير. وأما الثانية والثالثة: فإنه عز

وجل عالم بها وبمواقعها، قادر على جمعها وإحيائها. وأشار إلى وجه إثباتهما بأنه تعالى قادر على إبدائها وإبداء ما هو أعظم خلقاً وأعجب صنعًا فكان أقدر على إعادتهم وإحيائهم، وأنه تعالى خلق ما خلق خلقاً مستوياً محكماً من غير تفاوت واختلال مراعى فيه مصالحهم وسد حاجاتهم.

وذلك دليل على تناهي علمه وكمال حكمته جلت قدرته ودقت حكمته. وقد سَكَّنَ نافع وأبو عمرو والكسائي: الهاء من نحو فهو وهو تشبيهاً له بعضد.

ترجمہ:

یہ آیت کریمہ ماقبل آیت کریمہ میں بیان کردہ حکم کی علت ہے۔ وہ حکم یہ ہے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا ممکن اور اللہ کریم اس پر قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ ان تمام چیزوں کے مناسب اجزاء کا عالم ہے اس وجہ سے اس نے ہر چیز کو کامل طریقہ اور بہترین انداز میں بنایا، اور اس بات پر دلیل قائم کرنا مقصود ہے کہ کہ جس ذات پاک کا فعل اس عجیب تناسب پر اور شاندار ترتیب پر ہے وہ علیم ہے کیونکہ افعال کو مضبوط، خوبصوت اور منافع بخش جہت کے ساتھ خاص کرنا عالم، حکیم اور کریم کے بغیر ممکن نہیں اور انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق کفار کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا ہے ان کا یہ وہم تھا کہ جب سارے بدن ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ان کے اجزاء بکھر جائیں گے اور ہم شکلوں کے ساتھ مل جائیں گے تو ہر بدن کے اجزاء کو کس طرح دوبارہ زندہ کیا جائے گا جب کہ نہ تو کوئی چیز ان سے علیحدہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسی چیز ان کے ساتھ ملائی جائے جو پہلے ان کے ساتھ نہ تھی تو اللہ کریم نے ان کے اس شک کو اس طرح دور کیا کہ وہ ہر ایک چیز کو خوب جانتا ہے اور اس کے مناسب مواقع سے بھی باخبر ہے اس لئے اس کے نزدیک ان تمام چیزوں کو اکٹھا کر کے زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور اس کی مثال اللہ کریم نے بیان فرمائی،

وهو بكلّ خلقٍ عليم

کہ وہ اپنی تمام مخلوق کو خوب جاننے والا ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان دونوں آیات میں انسان کو دوبارہ زندہ کرنے اور بروزِ حشر جمع کرنے کی دلیل ذکر کی ہے کیونکہ دوبارہ زندہ کرنے کا دعویٰ کے درست ہونے کا دارومدار تین مقدمات پر ہے۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ جسم کے تمام اجزاء، جمع ہونے اور حیات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کی دلیل قرآن مجید میں مذکور ہے،

كنتم امواتًا فاحيا كم ثمّ يميتكم

کیونکہ افتراق اور اجتماع کا تسلسل اور زندگی وموت کی کشمکش اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اجزاء اجتماع وافتراق کو

قبول کرتے ہیں اور جو چیز بالذات کسی چیز کو قبول کرتی ہے وہ اس بات سے انکار کر دیتی ہے کہ وہ اس سے زائل ہو جائے اور اس میں تغیر و تبدّل پیدا ہو جائے،

دوسرا اور تیسرا مقدّمہ یہ ہے کہ اللہ کریم ہر چیز کو جانتا ہے اور اسے اس کی مناسب جگہوں کا بھی علم ہے اس لئے وہ انہیں جمع کرنے اور ان کو زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور ان دونوں کی طرف اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ وہ ذات ان تمام اجزاء کو جس طرح پہلی مرتبہ پیدا کرنے پر قادر ہے اسی طرح وہ خلق کے اعتبار سے عظیم اور صنعت کے اعتبار سے عجیب مخلوق کو ابتداء پیدا کرنے پر بھی قادر ہے تو جس کی شان یہ ہو وہ انہیں دوبارہ جوڑنے اور زندہ کرنے پر بھی قادر ہوگا۔

ایک اور بات یہ کہ اللہ کریم نے جو بھی چیز پیدا کی ہے وہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے اس میں ان کی مصلحتوں اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی رعائیت رکھی گئی ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کریم کا علم انتہاء کو پہنچنے والا ہے اور اس کی حکمت سب پر بھاری ہے تو ایسی ذات کے لئے دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

نافع، ابوعمر اور کسائی نے "ھو" کی "ھا" کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے جیسے "فھو" "وھو" اور اس کو عضد کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ وہ اسم ثلاثی ہے اور اس کے عین کلمہ کو عین کلمہ کے سکون کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

جمع کی تعریف:

(ج م ع) الجمع (ف) (Plus)

کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ملا دینا۔ محاورہ ہے: چنانچہ وہ اکٹھا ہو گیا۔ قرآن میں ہے۔

"وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ" (سورۃ القیامۃ آیت نمبر 9)

اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔

(مال) جمع کیا اور بند رکھا۔

"جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ" (سورۃ الھمزۃ آیت نمبر 2)

مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔

استواء کا معنٰی:

(س و ی) المساواۃ (Equality,Balance)

کسی چیز کے اپنی ذات کے اعتبار سے حالت اعتدال پر ہونے کے لئے بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

"ذُوْمِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی" (سورۃ النجم آیت نمبر 6)

پھر اس جلوہ نے قصد فرمایا۔

آسمان کسے کہتے ہیں؟

(س م و) سماء (Sky)

ہر شے کے بالائی حصہ کو سماء کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سماء ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔

اور آیت: "اللهُ الَّذِی خَلَقَ سَبْعَ سَمٰاوٰاتٍ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 12)

اللہ ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں۔

کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

مساواۃ اور تسویہ کا معنی:

(س و ی) المساواۃ (Equality,Balance)

کے معنی وزن کیل یا مساحت کے لحاظ سے دو چیزوں کے ایک دوسرے کے برابر ہونے کے ہیں۔

التسویۃ کے معنی کسی چیز کو ہموار کرنے ہیں اور آیت:

"الَّذِی خَلَقَكَ فَسَوّٰاكَ" (سورۃ الانفطار آیت نمبر 7)

وہی تو ہے جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضاء کو ٹھیک کیا۔

میں سواک سے مراد یہ ہے کہ انسان کی خلقت کو اپنی حکمت کے اقتضاء کے مطابق بنایا اور آیت:

"وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰاهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 7)

اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے قوی کو برابر بنایا۔

اسی طرح آیت کریمہ: "فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِی" (سورۃ الحجر ایت نمبر 29)

تو جب میں اسے ٹھیک کرلوں اور اس میں اپنی طرف کی خاص معزز روح پھونک دوں۔

تحقیق سبع:

(س ب ع) سبع (Seven)

السبع اصل میں "سبع" سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے؛

"سَبْعَ سَمٰاوٰاتٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 29) سات آسمان۔

"سَبْعًا شِدَادًا" (سورۃ النبأ آیت نمبر 16) سات مضبوط (آسمان بنائے)۔

"وَسَبْعَ سُنْبُلَاتٍ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 46) سات بالیں۔

"سَبْعَ لَيَالٍ" (سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 7) سات راتیں۔

"سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 22) سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔

"سَبْعُونَ ذِرَاعًا" (سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 32) ستر گز۔

"سَبْعِينَ مَرَّةً" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 80) ستر مرتبہ۔

اور آیت: "سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي" (سورۃ الحجر آیت نمبر 87)

(الحمد کی) سات آیتیں (عطا فرمائیں جو نماز کی ہر رکعت میں مکرر پڑھی جاتی ہیں میں بعض نے کہا ہے کہ سورۃ الحمد مراد ہے۔ کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ السبع الطوال یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک سات لمبی سورتیں مراد ہیں۔ اور قرآن پاک کی تمام سورتوں کو بھی مثانی کہا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں واقعات تکرار کے ساتھ مذکور ہیں من جملہ ان کے یہ سات سورتیں ہیں السبیع والسبع اونٹوں کو ساتویں روز پانی پر وارد کرتا۔ الاسبوع۔ ایک ہفتہ یعنی سات دن جمع اسابیع طفت بالبیت اسبوعا میں نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے سبعت القوم میں ان کا ساتواں بن گیا۔ اخذت سبع اموالھم میں نے ان کے اموال سے ساتواں حصہ وصول کیا۔ السبع۔ درندہ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے جیسا کہ سات کا عدد" عدد تام" ہوتا ہے۔

ھذلی نے کہا ہے:

كأنّه عبد لآل أبي ربيعة مسبعگويا

وہ آل ابی ربیعہ کا غلام ہے جس کی بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لئے درندے آگئے ہوں۔ بعض نے مسبع کا معنی مھمل مع السباع کئے ہیں یعنی وہ جو درندوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے اور بعض نے مسبع (بفتح باء) پڑھا ہے۔ اور یہ دعی سے کنایہ ہے یعنی وہ شخص جس کا نسب معلوم نہ ہو۔ سبع فلانا کسی کی غیبت کرنا اور درندہ کی طرح اس کا گوشت کھانا۔ المسبع۔ درندوں کی سرزمین۔

نوٹ: خلق، ارض، الی، شئ اور علم کے معانی کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 30]

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (30)

"اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، بولے کیا ایسے کو

نائب کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بولتے ہیں فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے"۔

متن:

وَاِذْ قالَ رَبُّكَ لِلْمَلائِكَةِ اِنِّي جاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيفَةً

تعداد لنعمة ثالثة تعم الناس كلهم، فإن خلق آدم وإكرامه وتفضيله على ملائكته بأن أمرهم بالسجود له، إنعام يعم ذريته. وإذ: ظرف وضع لزمان نسبة ماضية وقع فيه أخرى، كما وضع إذا لزمان نسبة مستقبلة يقع فيه أخرى، ولذلك يجب إضافتهما إلى الجمل كحيث فى المكان، وبنيتا تشبيهاً لهما بالموصولات، واستعملتا للتعليل والمجازاة، ومحلهما النصب أبداً بالظرفية فإنهما من الظروف الغير المتصرفة لما ذكرناه، وأما قوله تعالى: وَاذْكُرْ اَخَا عادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْاَحْقافِ ونحوه فعلى تأويل: اذكر الحادث إذ كان كذا، فحذف الحادث وأقيم الظرف مقامه، وعامله فى الآية قالوا، أو أذكر على التأويل المذكور لأنه جاء معمولاً له صريحاً فى القرآن كثيراً، أو مضمر دل عليه مضمون الآية المتقدمة، مثل وبدأ خلقكم إذ قال، وعلى هٰذا فالجملة معطوفة على خلق لكم داخلة فى حكم الصلة. وعن معمر أنه مزيد. والملائكة جمع ملأك على الاصل كالشمائل جمع شمأل، والتاء لتأنيث الجمع، وهو مقلوب مألك من الالوكة وهى: الرسالة، لأنهم وسائط بين الله تعالى، وبين الناس، فهم رسل الله. أو كالرسل إليهم. واختلف العقلاء فى حقيقتهم بعد اتفاقهم على أنها ذوات موجودة قائمة بأنفسها. فذهب أكثر المسلمين إلى أنها أجسام لطيفة قادرة على التشكل بأشكال مختلفة، مستدلين بأن الرسل كانوا يرونهم كذلك. وقالت طائفة من النصارى: هى النفوس الفاضلة البشرية المفارقة للأبدان، وزعم الحكماء أنهم جواهر مجردة مخالفة للنفوس الناطقة فى الحقيقة، منقسمة إلى قسمين: قسم شأنهم الاستغراق فى معرفة الحق جل جلاله والتنزه عن الاشتغال بغيره، كما وصفهم فى محكم تنزيله فقال تعالى: يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهارَ لاَ يَفْتُرُونَ وهم العليون والملائكة المقربون. وقسم يُدَبِّرُ الامر مِنَ السماء إلى الارض على ما سبق به القضاء وجرى به القلم الإلهى لاَ يَعْصُونَ اللهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ وهم المدبرات أمراً، فمنهم

سماوية، ومنهم أرضية، على تفصيل أثبته فى كتاب الطوالع.

والمقول لهم: الملائكة كلهم لعموم اللفظ وعدم المخصص، وقيل ملائكة الارض، وقيل إبليس ومن كان معه فى محاربة الجن، فإنه تعالى أسكنهم فى الارض أولاً فأفسدوا فيها، فبعث إليهم إبليس فى جند من الملائكة فدمرهم وفرقهم فى الجزائر والجبال. وجاعل: من جعل الذى له مفعولان وهما فى الْأَرْضِ خَلِيفَةً أعمل فيهما، لأنه بمعنى المستقبل ومعتمد على مسند إليه. ويجوز أن يكون بمعنى خالق. والخليفة من يخلف غيره وينوب منابه، والهاء فيه للمبالغة، والمراد به آدم عليه الصلاة والسلام لأنه كان خليفة الله فى أرضه، وكذلك كل نبى استخلفهم الله فى عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ أمره فيهم، لا لحاجة به تعالى إلى من ينوبه بل لقصور المستخلف عليه عن قبول فيضه، وتلقى أمره بغير وسط، ولذلك لم يستنبئ ملكاً كما قال الله تعالى: وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا ألا ترى أن الانبياء لما فاقت قوتهم، واشتعلت قريحتهم بحيث يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لم تمسسه نار، أرسل إليهم الملائكة ومن كان منهم أعلى رتبة كلمه بلا واسطة، كما كلم موسى عليه السلام فى الميقات، ومحمدا صلّى الله عليه وسلّم ليلة المعراج، ونظير ذلك فى الطبيعة أن العظم لما عجز عن قبول الغذاء من اللحم لما بينهما من التباعد، جعل البارى تعالى بحكمته بينهما الغضروف المناسب لهما ليأخذ من هٰذا ويعطى ذلك. أو خليفة من سكن الارض قبله، أو هو وذريته لأنهم يخلفون من قبلهم، أو يخلف بعضهم بعضاً. وإفراد اللفظ: إما للاستغناء بذكره عن ذكر بنيه كما استغنى بذكر أبي القبيلة فى قولهم: مضر وهاشم. أو على تأويل من يخلفكم، أو خلفاً يخلفكم. وفائدة قوله تعالى هٰذا للملائكة، تعليم المشاورة، وتعظيم شأن المجعول، بأن بشر عز وجل بوجود سكان ملكوته، ولقبه بالخليفة قبل خلقه، وإظهار فضله الراجح على ما فيه من المفاسد بسؤالهم، وجوابه وبيان أن الحكمة تقتضى إيجاد ما يغلب خيره، فإن ترك الخير الكثير لأجل الشر القليل شر كثير إلى غير ذلك.

ترجمہ:

ماقبل آیات میں اللہ کریم نے اپنے قادر مطلق، منعم حقیقی اور لائق عبادت ہونے کا تذکرہ فرمایا کہ تم میرا انکار نہ کرو اور میرا

شریک نہ بناؤ اور بنی آدم کو عطا کردہ نعمتوں کا تذکرہ کیا مثلاً فرمایا کہ تم مردہ تھے، تمہیں زندگی عطا کی وہ ہمیں پھر مارے گا اور اس کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

دوسرا نکتہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ بیان کیا کہ وہ ذات پاک ہے جس نے تمہارے لئے وہ تمام نعمتیں پیدا فرمائیں جو زمین و آسمان میں ہیں۔

اور تیسرا نکتہ یہ کہ اللہ کی نعمت کا تذکرہ فرمایا اور یہ نعمت اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی گئی اور ملائکہ پر آپ کو فضیلت دی گئی اور آپ کی عظمت کے اعتراف کے لئے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا مگر بالواسطہ یہ نعمت تمام اولادِ آدم کی فضیلت و شرافت کا اظہار ہے کیونکہ آدم علیہ السلام ان تمام کی اصل اور باپ ہیں تو اصل اور باپ کی عزت اولاد کا اکرام ہی ہوتا ہے کیونکہ جو اعزاز قبیلے کے باپ کو حاصل ہوتا ہے وہ پورے قبیلے کو حاصل ہوتا ہے اس لئے ارشاد فرمایا کہ اے اولاد آدم میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں اور تمہارے باپ کو خلافت فی الارض کا تاج پہنا کر عطا فرمائی اور ملائکہ کے اس استفسار کے باوجود کہ یہ فساد اور خونریزی کا مرتکب ہوگا اس کو خلیفہ کیوں بنایا جا رہا ہے اسے خلیفہ بنا دیا اور فرشتوں کو اپنے اس قول پر معذرت کرنے اور حضرت آدم علیہ السلام کا اعتراف کرنے کے لئے سجدہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو گویا یہ نعمت صرف حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل نہ ہوئی بلکہ تمام اولاد کو عطا ہوئی۔

"اذ، اذا اور حیث" یہ تینوں مبنی اور لازم الاضافت ہیں پہلے دونوں مبنی بر سکون ظرف زمان کے لئے اور اپنے مابعد کے ساتھ مل کر کلام میں مذکور فعل یا کسی محذوف فعل کا مفعول بنتے ہیں اس لئے عموماً محل نصب میں ہوتے ہیں۔ "اذا" یہ زمانہ زمانہ مستقبل میں واقع ہونے والی نسبت کو بیان کرنے کے لئے آتا ہے جس زمانہ میں دوسری نسبت بھی واقع ہو۔ "اذ" زمانہ ماضی میں نسبت حکمیہ کے واقع ہونے کو ظاہر کرتا ہے جس زمانہ میں دوسری نسبت بھی واقع ہو۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اذ زمانہ ماضی میں واقع ہونے والی دو نسبتوں کو ظاہر کرتا ہے مگر بعض جگہوں میں اس سے پہلے ایسا فعل آ جاتا ہے جو زمانہ مستقبل کا معنی دیتا ہے اس صورت میں ان دونوں کو یکجا کرنا کیسے ممکن ہے؟ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ میں ہے،

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ...الخ

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں "اذکر الحادث از کان کذا تھا" تو گویا اس سے پہلے الحادث شبہ فعل محذوف ہے الحادث زمانہ ماضی کو ہی شامل ہے یا اس سے پہلے فعل مضمر ہی ہوگا جس پر آیت کریمہ کا مضمون دلالت کرتا ہے تو اس کا عطف "خلق لکم" پر ہوگا اور صلہ کے حکم میں داخل ہوگا اور معمر کے نزدیک یہ زائدہ ہے۔

نوٹ: واؤ عاطفہ ہے اس کا مابعد معطوف ہے اذ ظرف زمانہ برائے ماضی مضاف

قال ربك للملائكة قول انّي جاعل في الارض خليفة مقوله

قول مقولہ مل کر "اذ" کا مضاف الیہ ہو کر فعل محذوف "اذکر یا قالوا" کی طرف ہے۔

"الملائکہ" اس کا مفرد "مَلَکٌ" ہے اصل مالک بروزن مفعل الوکۃ سے مشتق ہے جس کا معنی پیغام رسانی کرنا ہے۔ اس میں قلب کرنے کے بعد ہمزہ کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا، اور یہ بمعنی مرسل ہے۔ اب یہ ملائکہ یا تو اللہ کی طرف سے انبیاء کی طرف یا عام لوگوں کی طرف اس کے پیغام اور فیض پہچانے کا سبب ہیں۔

تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ فرشتے ایسی ذات ہیں جو موجود اور قائم بذاتہا ہیں مگر اس میں ان کا اختلاف یہ ہے کہ کیا یہ اجسام ہیں یا ارواح؟ لطیف ہیں یا کثیف؟ اس مسئلہ میں ان کے اقوال کی تفصیل یہ ہے کہ اہل اسلام سے اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ ہوا کی طرح لطیف اجسام ہیں اور مختلف شکلوں میں تبدیلی پر قادر ہیں کیونکہ انبیاء نے انہیں اسی طرح مختلف اشکال میں دیکھا ہے کبھی وہ اپنی اصلی شکل میں نورانی پروں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں اور کبھی کسی اور صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ فلاسفہ اسلام کے نزدیک جواہر مجردہ ہیں لیکن انسانی اجسام سے نکلنے والی روحیں نہیں جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور وہ علم و قوت میں، ان ارواح سے کہیں زیادہ ہیں۔

نصاریٰ کا کہنا ہے کہ ملائکہ وہ روحیں ہیں جو انسانی اجسام سے جدا ہوتی ہیں۔ اگر وہ نیک، پاکیزہ اور طیب ہوں تو ان کو ملائکہ کہا جاتا ہے، اور اگر وہ شریر اور خبیث ہوں تو انہیں شیطان اور جن کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ بعید از حقیقت ہے۔

اقسام ملائکہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرشتوں کی تین اقسام بیان فرمائی ہیں:

1۔ علیون 2۔ مقربون۔

ان دونوں کی ڈیوٹی اللہ کریم کا ذکر اور اس کی عبادت میں مشغول رہنا ہے۔

3۔ مدبرات الامر: ان کا کام اللہ کریم کے حکم کے مطابق انتظام کرتے ہیں ان میں بعض آسمان کا نظام سرانجام دیتے ہیں انہیں سماویہ کہتے ہیں اور بعض کی ڈیوٹی زمین کے انتظام میں ہے ان کو ارضیہ کہتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن فرشتوں کے سامنے اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کا ذکر کیا گیا اس سے مراد وہ تمام فرشتے تھے یا بعض؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس سے مراد تمام فرشتے ہیں کیونکہ یہاں جمع مکسر معرف باللام ذکر فرمائی ہے جو عموم کا فائدہ دیتی ہے اور اس کی تاکید بھی ایسے کلام کے ساتھ لائی جاتی ہے جن میں تخصیص کا کوئی مقام نہیں رہتا مثلاً "کلّھم اجمعون" البتہ بعض علماء کا خیال ہے کہ ان سے مراد صرف وہ ملائکہ ہیں جن کو زمین کا انتظام سونپا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک وہ فرشتے اور ابلیس ہے جن کو ابلیس کی معیت میں زمین سے جنات کو نکالنے اور بھگانے کے لئے بھیجا گیا تھا اور انہوں نے جنات کو پہاڑوں اور جزیروں میں بھگا دیا مگر اوّل حق ہے۔

"انّی جاعل" جاعل اسم فاعل ہے یہ جعل سے مشتق ہے جس کا معنی بنانا ہے اور یہ افعال تصییر میں سے ہونے کی وجہ سے دو مفعولوں کو نصب دیتا ہے اسی لئے جاعل کے دو مفعول ہیں۔

خلیفۃ اور فی الارض یا یہ خالق کے معنی میں ہوگا اس وقت اس کا مفعول خلیفہ ہوگا اور فی الارض، خلیفہ سے حال ہوگا۔

اور یہاں اسم فاعل کے عمل کی شرائط میں سے دو شرطیں موجود ہیں۔

پہلی یہ کہ وہ استقبال کے معنی میں ہے، دوسری یہ کہ اس سے پہلے مسند الیہ موجود ہے جو کہ "انّی" ہے۔

خلیفہ:

یہ فعیل کے وزن پر ہے اور صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور اس کے آخر میں تائے تانیث نہیں بلکہ مبالغہ پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ جیسے علامۃ کے آکر میں تاء ہے اس کی جمع خلفاء ہے خلائف نہیں اس کا معنی پیچھے آنے والا کسی کے قائم مقام ہونے والا اور اصطلاح میں خلیفہ اس کو کہتے ہیں ن جو کسی کے قائم مقام ہو کر ان تمام امور کو عملی جامہ پہنانے پر قادر ہو جس کو مستخلف علیہ سر انجام دیتا ہو۔

خلیفہ کا معنی سمجھنے کے بعد تین چیزوں کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

1۔ خلیفہ سے کون ہستی مراد ہے۔
2۔ خلیفہ کہنے کی وجہ۔
3۔ خلیفہ بنانے کی ضرورت

خلیفہ سے کون ہستی مراد ہے؟:

خلیفہ سے مراد یا تو حضرت آدم علیہ السلام ہیں جن کو اللہ کریم نے اپنا نائب مقرر کیا اور ان کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا فرمایا اور اور انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرشتوں کو یہ حکمت سمجھائی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کیوں خلیفہ بنایا گیا۔ اور فرمایا کہ خلیفہ وہ ہوتا ہے جو تمام امور سے باخبر ہو، بے خبر اور جاہل خلافت کے معاملات نہیں چلا سکتا۔

یا خلیفہ سے مراد آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد دونوں ہیں۔ اور واحد کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ آدم ابو البشر ہیں جب ان کا تذکرہ آ گیا تو اولاد خود بخود اس کے تحت داخل ہو، جیسے کوئی یہ کہتا ہے یہ کام مضر یا ہاشم نے کیا تو اس سے مراد پورا قبیلہ ہوتا ہے۔ یا خلیفہ کا لفظ اسم جنس ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور اولاد آدم دونوں ہوں گے۔

خلیفہ کہنے کی وجہ:

حضرت آدم علیہ اسلام اور اولاد آدم اللہ کریم کے نائب ہیں اس لئے ان کو خلیفہ کہا گیا۔

یا وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلیفہ بنتے رہتے ہیں اس لئے انہیں خلیفہ کہہ دیا گیا۔

خلیفہ بنانے کی ضرورت:

ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کریم جو قادر مطلق ہے اس کو زمین کا نظام چلانے کے لئے خلیفہ کی حاجت کیوں ہوئی؟ کیا وہ یہ کام خود انجام نہیں دے سکتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ زمین کا نظام چلانے کے لئے اللہ کریم کو کسی کی ضرورت نہیں وہ حاکم مطلق ہے کلمہ "کن" کے ساتھ ہر چیز کا انتظام فرما سکتا ہے لیکن جن کے لئے خلیفہ مقرر کیا گیا وہ اللہ کریم سے فیض حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ اللہ کریم کے علم میں یہ تھا کہ جن پر خلیفہ مقرر کر رہا ہوں وہ اس کے محتاج ہوں گے ان کی فطرت گناہوں کی ظلمت اور تکدر سے تاریک ہو گی۔ ان کے دل ودماغ مادیّت زدہ ہوں گے، ان کا ادراک واحساس اس قابل کہاں کہ اس نورِ مجرد اور لطیف وخبیر سے بلا واسطہ فیض حاصل کر سکیں اس وجہ سے یہ ضروری تھا کہ کوئی واسطہ ہو جس کے اندر اکتسابِ فیض اور دوسروں کو فیض پہنچانے کی صلاحیت موجود ہو۔ ایک طرف وہ اپنے روشن ضمیر اور طہارت، فکر ونظر اور اپنی مخصوص علمی اور نظریاتی قوتوں کے سبب عالم قسد اور بارگاہ ملکوت سے مناسبت رکھتا ہو، وہاں سے علم حاصل کرتا ہو، اور دوسری طرف انسانوں کے ساتھ مناسبت ہو اور ایسا واسطہ انبیاء کرام کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اللہ کریم نے انبیاء کو اپنا خلیفہ بنایا جو ایک طرف سے اللہ کریم سے کسب فیض کرتے ہیں اور دوسری جانب لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا:

اگر کوئی فرشتہ نبی ہوتا تو وہ بھی انسان ہوتا تا کہ اتحادِ جنس ہونے کی وجہ سے افادہ اور استفادہ ہوتا رہے۔ انبیاء کرام کی جسمانی قوتیں عام انسانوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور ان کے دل اللہ کریم کی معرفت کے نور سے منور اور روشن ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق بالواسطہ یا بلا واسطہ اللہ کریم سے علوم ومعارف حاصل کر کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے بلا واسطہ ستر ہزار پردوں کے اندر سے اور ہمارے آقا ﷺ نے بلا حجاب قابَ قوسین اوادنیٰ کے مقام پر "فاوحی الی عبدہ ما اوحی" کا فیض حاصل کیا۔ استفادہ اور افادہ کی مثال انسانی جسم میں بھی موجود ہے جس پر مذکورہ بالا حقیقت کو قیاس کیا جا سکتا ہے انسانی جسم دو چیزوں کا مجموعہ ہے،

1۔ گوشت   2۔ ہڈیاں

ہڈیاں سخت ہوتی ہیں جبکہ گوشت نرم۔ اور ہڈیاں گوشت سے غذا حاصل کرنے سے قاصر ہوتی ہیں اس لئے اللہ کریم نے ان کے درمیان غضروف یعنی (نرم ہڈی) واسطہ بنا دی، جو نہ گوشت کی طرح نرم اور نہ ہڈی کی طرح سخت ہے۔ اب وہ اپنی نرمی کی وجہ سے گوشت سے غذا حاصل کرتی ہے اور ہڈیوں کے ہم جنس ہونے کی وجہ سے ان تک پہنچاتی ہے۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہ السلام اللہ کریم سے فیض حاصل کر کے بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہ ان سے کسب فیض کرتے ہیں۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کا معاملہ فرشتوں کے سامنے کیوں رکھا؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ

☆ ہمیں باہمی مشاورت کی تعلیم کے لئے۔

☆ خلیفہ کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے

☆ اس فضیلت کو ظاہر کرنے کے لئے جو ممکن مفاسد پر غالب ہے۔

☆ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ خیر کثیر کو شر قلیل کے مقابلہ میں ترک کرنا بذات خود شر کثیر ہے۔

متن:

قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ

تَعَجُّبٌ من أن يستخلف لعمارة الارض وإصلاحها من يفسد فيها، أو يستخلف مكان أهل الطاعة أهل المعصية، واستكشاف عما خفي عليهم من الحكمة التي بهرت تلك المفاسد وألغتها، واستخبار عما يرشدهم ويزيح شبهتهم كسؤال المتعلم معلمه عما يختلج في صدره، وليس باعتراض على الله تعالى جلت قدرته، ولا طعن في بني آدم على وجه الغيبة، فإنهم أعلى من أن يظن بهم ذلك لقوله تعالى:

بَلْ عِبَادٌ مُكْرَمُونَ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ

وإنما عرفوا ذلك بإخبار من الله تعالى، أو تلق من اللوح، أو استنباط عما ركز في عقولهم أن العصمة من خواصهم، أو قياس لأحد الثقلين على الآخر. والسُفْكُ والسَّبْكُ والسَّفْحُ والشَّنُّ أنواع من الصب، فألسفك يقال في الدم والدمع، والسبك في الجواهر المذابة، والسفح في الصب من أعلى، والشن في الصب من فم القربة ونحوها، وكذلك السن، وقرء »يُسْفِكُ« على البناء للمفعول، فيكون الراجع إلى مَنْ، سواء جعل موصولاً أو موصوفًا محذوفاً، أي: يسفك الدماء فيهم.

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ حال مقررة لجهة الإشكال كقولك: أتحسن إلى أعدائك وأنا الصديق المحتاج القديم. والمعنى: أتستخلف عصاة ونحن معصومون أحقاء بذلك، والمقصود منه، الاستفسار عما رجحهم ومع ما هو متوقع منهم. على الملائكة المعصومين في الاستخلاف، لا العجب والتفاخر. وكأنهم علموا أن المجعول خليفة ذو ثلاث قوى عليها مدار أمره: شهوية وغضبية تؤديان به إلى الفساد وسفك الدماء، وعقلية تدعوه إلى المعرفة والطاعة. ونظروا إليها مفردة وقالوا: ما الحكمة في

استخلافه. وهو باعتبار تينك القوتين لا تقتضى الحكمة إيجاده فضلاً عن استخلافه. وأما باعتبار القوة العقلية فنحن نقيم ما يتوقع منها سليماً عن معارضة تلك المفاسد. وغفلوا عن فضيلة كل واحدة من القوتين إذا صارت مهذبة مطواعة للعقل، متمرنة على الخير كالعفة والشجاعة ومجاهدة الهوى والإنصاف. ولم يعلموا أن التركيب يفيد ما يقصر عنه الآحاد. كالإحاطة بالجزئيات واستنباط الصناعات واستخراج منافع الكائنات من القوة إلى الفعل الذى هو المقصود من الاستخلاف. وإليه أشار تعالى إجمالاً بقوله:

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

والتسبيح. تبعيد الله تعالى عن السوء وكذلك التقديس، من سَبَحَ فى الارض والماء، وقدس فى الارض إذا ذهب فيها وأبعد، ويقال قَدُسَ إذا طهر لأن مطهر الشيء مبعدله عن الاقذار. وبِحَمْدِكَ فى موضع الحال، أى: متلبسين بحمدك على ما ألهمتنا معرفتك ووفقتنا لتسبيحك، تداركوا به ما أوهم إسناد التسبيح إلى أنفسهم، ونقدس لك نطهر نفوسنا عن الذنوب لأجلك، كأنهم قابلوا الفساد المفسر بالشرك عند قوم بالتسبيح، وسفك الدماء الذى هو أعظم الافعال الذميمة بتطهير النفوس عن الآثام وقيل: نقدسك واللام مزيدة.

ترجمہ:

اس آیت میں اللہ کریم نے یہ بیان فرمایا کہ جب اس نے فرشتوں کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ مقرر کرنے کا معاملہ پیش فرمایا اور اپنے ارادہ کا اظہار کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ اللہ۔ تو اس کو زمین کی آبادی کے لئے خلیفہ بنا رہا ہے جو اس میں فساد پیدا کرے گا اور خوب بہائے گا کیونکہ یہ ایسے اجزاء سے مرکب ہے جن سے بھائی کی توقع کم، اور فتنہ وفساد کی زیادہ۔ اور ہمارے ہوتے ہوئے جو ہمیشہ تیری تسبیح وتہلیل بیان کرتے رہتے ہیں ایسے فسادی اور خون بہا کرنے والے کو خلیفہ کیوں بنایا جا رہا ہے تو اللہ کریم نے جواب دیا کہ جو میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے۔

فرشتوں کا اللہ کریم کی بارگاہ میں مذکورہ بالا خدشہ کا اظہار کرنا یہ نہ تو اللہ کریم کے اردہ پر اعتراض ہے اور نہ ہی حضرت آدم علیہ السلام میں مخفی عیوب کو ظاہر کرنا مقصود ہے اور نہ ہی اپنا تفاخر اور بڑائی ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جس کہ وجہ سے ملائکہ کی عصمت داغدار ہو اور انہیں گناہوں کا مرتکب تصور کیا جائے، کیونکہ ملائکہ کے سوالیہ انداز اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کریم ان کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کی حکمت ظاہر فرمائے اور ان کی رہنمائی فرمائے جن سے ان کا یہ شبہ زائل ہو جائے

نیز فرشتوں کی موجودگی میں حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے پر تعجب کا اظہار تھا اور فرشتوں کا یہ استفسار اللہ کریم سے اس طرح تھا جیسے کوئی شاگرد کسی مسئلہ سے متعلق اپنے دل میں پیدا ہونے والے شبہ کے ازالہ کے لئے اپنے استاذ سے سوال کرتا ہے۔ اور یہ گستاخی نہیں کہلاتا، یہی حالت فرشتوں کی تھی لہٰذا حو یہ کا یہ کہنا کہ مذکورہ بالا خدشہ کا اظہار فرشتوں کی عصمت کے خلاف ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام فساد اور خون ریزی کے مرتکب ہوں گے۔

1۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم نے فرشتوں کو یہ بتا دیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس قسم کے اوصاف سے متصف کر کے پیدا کیا جائے گا۔

2۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کریم نے قیامت تک ہونے والے واقعات اپنے علم اور فیصلہ کے مطابق لوحِ محفوظ پر لکھ دیئے تھے اور فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی مذکورہ بالا صفات اور اوصاف لوحِ محفوظ سے پڑھ لئے مگر ان کو خلیفہ بنانے کی حکمتوں کو نہ پڑھ سکے۔

3۔ فرشتوں نے انسان کو جنات پر قیاس کیا کہ وہ ناری مخلوق تھے، وہ زمین کی آبادی کی بجائے اس میں تخریب کاری کرتے رہے اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے اجزائے ترکیبی میں بھی ناری اجزاء ہیں لہٰذا وہ بھی ان خرابیوں کا مرتکب ہوں گے۔

4۔ فرشتوں نے یہ گمان کیا ہوگا کہ گناہوں سے محفوظ ہونا صرف انہی کا خاصہ ہے ان کے علاوہ جو بھی ہوگا وہ فسادی اور خون بہانے کا مرتکب ہوگا۔

5، فرشتوں کے دل میں نافرمان کو خلیفہ بنانے کی حکمت میں جو خلعش پیدا ہوئی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ملائکہ نے یہ کہا کہ اے مولا کریم کہ ہم تجھے ہر نقص و عیب سے پاک سمجھتے ہیں اور تیری تسبیح کرتے رہتے ہیں، یہ فخر و تکبر کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے یہ گمان کیا کہ جس کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے اس میں تین قوتیں ہوں گی۔ جن میں سے دو فساد تک پہنچانے والی ہیں۔

1۔ قوت غضبیہ

2۔ قوت شہویہ

یہ دونوں قوتیں فساد اور خونریزی تک پہنچاتی ہیں۔

3۔ قوت عقلیہ

یہ معرفت اور اطاعت کی دعوت دیتی ہے۔

تو ملائکہ نے یہ گمان کیا کہ قوت عقلیہ سے جن افعال کو انجام دینے کی تمنا کی جاسکتی ہے ہم وہ انجام دے رہے ہیں جن میں مذکورہ بالا مفاسد نہیں لہٰذا ہمارے ہوتے ہوئے انہیں کیوں خلیفہ بنایا جارہا ہے، لیکن فرشتے ان رازوں سے لاعلم تھے۔ جو ان دونوں قوتوں کے مہذب بن جانے اور عقل کے فرمانبردار ہو جانے کے بعد ان سے اظہار پذیر ہوتے ہیں، جن کو اکیلی قوت عاقلہ انجام دینے سے قاصر ہوتی ہے۔ مثلاً پاکدامن ہونا، شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کرنا، خواہشات نفس کے ساتھ مقابلہ کرنا، انصاف کرنا اور اس دنیا میں چھپی ہوئی منفعت کا اظہار صنعتوں کا قیام اور اسی قسم کے بے شمار جزئیات کو عملی جامہ پہنانا وغیرہ اس چیز کو اللہ کریم نے،

انّی اعلم مالا تعلمون

کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اور جو ذات ان تینوں قوتوں کی مظہر ہوگی وہی ان مذکورہ بالا امور کو انجام دے سکے گی۔ ان تمام مذکورہ بالا توجیہات کے باوجود فرشتوں کے لئے بہتر یہ تھا کہ وہ اس بات پر خاموش رہتے استفسار نہ کرتے یہاں تک کہ اللہ کریم خود ان کے سامنے یہ تمام حکمتیں بیان فرما دیتا ان کے خاموش نہ رہنے کی وجہ سے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک فرشتوں کی تسبیح کے الفاظ یہ ہیں:

سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں پہلے آسمان والے فرشتے یہ تسبیح کرتے ہیں،

سبحان ذی الملك والملکوت

دوسرے آسمان والے یہ

سبحان ذی العزت والجبروت

تیسرے آسمان والے یہ

سبحان الذی لا یموت

کے الفاظ سے اللہ کریم کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔

"لک" اس میں لام کے دو معانی ہیں پہلا سبب اور علت کے لئے اور دوسرا زائدہ۔

اگر لام سبب اور علت کے لئے ہو تو معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ ہم تیری وجہ سے اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھے ہوئے ہیں اور اگر لام زائدہ ہو تو معنی یہ ہوگا کہ ہم تجھے پاک اور مقدس تصور کرتے ہیں۔ بعض مفسرین نے فساد فی الارض سے شرک مراد لیا ہے اور "یفسد" کو "یشرک" کے معنی میں کیا ہے تو اس صورت میں "نسبح" کا معنی یہ ہوگا کہ ہم تجھ کو شرک سے پاک تصور کرتے ہیں اور یسفک الدّماء کے مقابلہ میں "نقدس" ہوگا معنی یہ ہوگا کہ ہم تجھے ایسے گناہوں سے پاک مانتے

ہیں یعنی خون ریزی وغیرہ سے، یہ مکمل جملہ "تجعل" کی حمیر "انت" سے حال ہے اور "بحمدک نسبح" کی ضمیر سے حال ہے۔

لفظِ ملائکہ کا اصل معنیٰ:

(ا ل ك) (Angel)

الملئکۃ (فرشتے) اور ملک اصل میں مالک ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ملاک سے مغلوب ہے اور مالک و مالکۃ والوک کے معنی رسالت یعنی پیغام کے ہیں اسی سے لکنی کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں اسے میرا پیغام پہنچادو،، ۔ الملائکۃ کا لفظ (اسم جنس ہے اور) واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

" اللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا " (سورۃ الحج آیت نمبر 75)

اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کرلیتا ہے۔

خلیل نے کہا ہے کہ مالکۃ کے معنی ہیں پیغام اور اسے مالکۃ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی منہ میں چبایا جاتا ہے اور یہ فرس یالک اللجام کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گھوڑے کا منہ میں لگام کو چبانا۔

تحقیق لفظِ خلیفہ:

(خ ل ف) خلیفہ (Successer)

(پیچھے) الخلافۃ کے معنی دوسرے کا نائب بننے کے ہیں۔ خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب ہو اور یا اس کے عجز کے سبب سے ہو اور یا محض نائب کو شرف بخشنے کی غرض سے ہو اس آخری معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے چنانچہ فرمایا:

" وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 165)

اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا۔

سفک کا معنیٰ:

(س ف ك) (ض) (Fool)

السفک کے معنی خون ریزی کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 30)

اور کشت و خون کرتا پھرے۔

ویسے یہ لفظ ہر سیال چیز اور آنسو بہانے کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔

دم کا اصل معنی:

(د م ی) الدم (Blood)

خون۔ یہ اصل میں دمامی تھا (یاء کو برائے تخفیف حذف کر دیا ہے) قرآن میں ہے:

"حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 3)

تم پر حرام ہے مُردار اور خون۔

دم کی جمع دماء ہے۔ قرآن میں ہے

"لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 84)

کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا۔

دمیت (د) الجراحۃ زخم سے خون بہنا۔ فرس مدعی۔ خون کی طرح نہایت سرخ رنگ کا گھوڑا۔ الدمیۃ گڑیا (جو خون کی مانند سرخ اور منقوش ہو) شکجۃ دامیۃ سر کا زخم جس سے خون بہہ رہا ہو۔

تحقیق لفظ سبح:

(س ب ح) السبح (Praise)

اس کے اصل معنی پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں سبح (ف) سبحا و سباحۃ وہ تیز رفتاری سے چلا پھر استعارہ یہ لفظ فلک میں نجوم کی گردش اور تیز رفتاری کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا:

"وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 33)

سب (اپنے اپنے) فلک یعنی دوائر میں تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اور گھوڑے کی تیز رفتاری پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

"وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا" (سورۃ النازعات آیت نمبر 3)

اور فرشتوں کی قسم جو آسمان و زمین کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں۔

اور کسی کام کو سرعت کے ساتھ کر گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

"إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا" (سورۃ المزمل آیت نمبر 7)

اور دن کے وقت کو تم بہت مشغول کار رہے ہو۔

التسبیح کے معنی تنزیہ الٰہی بیان کرنے کے ہیں اصل میں اس کے معنی عبادت الٰہی میں تیزی کرنا کے ہیں۔ پھر اس کا استعمال ہر فعل خیر پر ہونے لگا ہے جیسا کہ ابعاد کا لفظ شر پر بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے ابعد اللہ خدا سے ہلاک کرے پس تسبیح کا

لفظا قولی۔ فعلی اور قلبی ہر قسم کی عبادت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 143)

تو اگر وہ تسبیح کرنے والا نہ ہوتا۔

یہاں بعض نے مسبحین کے معنی مصلین کئے ہیں لیکن انسب یہ ہے کہ اسے تینوں قسم کی عبادت پر محمول کیا جائے۔

تقدیس کا معنیٰ:

(قدس) التقدیس (Sacred)

کے معنی اس تطہیر الٰہی کے ہیں جو کہ آیت،

"وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 33)

اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔

میں مذکور ہے۔ کہ اس کے معنی تطہیر بمعنی ازالہ نجاست محسوسہ کے نہیں ہے اور آیت کریمہ:

"وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 30)

اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے حکم کی بجا آوری میں اشیاء کو پاک وصاف کرتے ہیں اور بعض نے اُس کے معنی۔ نصفک بالتقدیس بھی لکھے ہیں۔ یعنی ہم تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

"قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 102)

تم فرماؤ اسے پاکیزگی کی روح نے اتارا۔

میں روح القدس سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قدس یعنی قرآن حکمت اور فیض الٰہی لے کر نازل ہوتے تھے۔ جس سے نفوس انسانی کی تطہیر ہوتی ہے۔ اور البیت المقدس کو بیت مقدس اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ نجاست شرک سے پاک وصاف ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:

"يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 21)

اے قوم اس پاک زمین میں داخل ہو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھی ہے۔

میں ارض مقدسہ کے معنی پاک سرزمین کے ہیں۔

اور

خطیرۃ القدس:

خطیرۃ القدس سے بعض کے نزدیک جنت اور بعض کے نزدیک شریعت مراد ہے اور یہ دونوں قول صحیح ہیں۔ کیونکہ

شریعت بھی ایک ایسا حظیرہ یعنی احاطہ ہے جس میں داخل ہونے والا پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

نوٹ: لفظ رب، جعل، ارض اور علم کے معنی گزر چکے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 31]

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْماءَ كُلَّها ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلائِكَةِ فَقالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْماءِ هؤُلاءِ إِنْ كُنْتُمْ صادِقِينَ (31)

”اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (اشیاء) کے نام سکھائے، پھر سب (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ“۔

متن:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْماءَ كُلَّها

إما بخلق علم ضروری بها فيه، أو إلقاء فی روعه، ولا يفتقر إلى سابقة اصطلاح ليتسلسل. والتعليم فعل يترتب عليه العلم غالباً. ولذلك يقال علمته فلم يتعلم. وآدَمَ اسم أعجمی كآزر وشالح. واشتقاقه من الأُدْمة أو الأَدْمة بالفتح بمعنى الاسوة. أو من أديم الارض لما روى عنه عليه الصلاة والسلام أنه تعالى قبض قبضة من جميع الارض سهلها وحزنها فخلق منها آدم فلذلك يأتی بنوه أخيافاً. أو من الادم أو الادمة بمعنى الالفة. تعسف كاشتقاق إدريس من الدرس، ويعقوب من العقب، وإبليس من الإبلاس. والاسم باعتبار الاشتقاق ما يكون علامة للشیء ودليلاً يرفعه إلى الذهن مع الالفاظ والصفات والافعال. واستعماله عرفاً فی اللفظ الموضوع لمعنی سواء كان مركباً أو مفرداً مخبراً عنه أو خبراً أو رابطة بينهما. واصطلاحاً: فی المفرد الدال على معنی فی نفسه غير مقترن بأحد الازمنة الثلاثة. والمراد فی الآية إما الاول أو الثانی وهو يستلزم الاول. لأن العلم بألفاظ من حيث الدلالة متوقف على العلم بالمعانی. والمعنى أنه تعالى خلقه من أجزاء مختلفة وقوى متباينة. مستعداً لإدراك أنواع المدركات من المعقولات والمحسوسات، والمتخيلات والموهومات. وألهمه معرفة ذوات الأشياء وخواصها وأسمائها وأصول العلوم وقوانين الصناعات وكيفية آلاتها.

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ الضمير فيه للمسميات المدلول عليها ضمناً إذ التقدير أسماء المسميات، فحذف المضاف إليه لدلالة المضاف عليه وعوض عنه اللام كقوله تعالى: وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْباً لأن العرض للسؤال عن أسماء المعروضات فلا يكون المعروض نفس الاشياء سيما إن أريد به الالفاظ. والمراد به ذوات الاشياء، أو مدلولات الالفاظ، وتذكيره ليغلب ما اشتمل عليه من العقلاء، وقرء عرضهن و عرضها على معنى عرض مسمياتهن أو مسمياتها.

فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هؤُلاءِ تبكيت لهم وتنبيه على عجزهم عن أمر الخلافة. فإن التصرف والتدبير إقامة المعدلة قبل تحقق المعرفة. والوقوف على مراتب الاستعدادات وقدر الحقوق محال، وليس بتكليف ليكون من باب التكليف بالمحال، والإنباء: إخبار فيه إعلام، ولذلك يجري مجرى كل واحد منهما.

إِنْ كُنْتُمْ صادِقِينَ فى زعمكم أنكم أحقاء بالخلافة لعصمتكم، أو أن خلقهم واستخلافهم وهذه صفتهم لا يليق بالحكيم، وهو وإن لم يصرحوا به لكنه لازم مقالهم. والتصديق كما يتطرق إلى الكلام باعتبار منطوقه قد يتطرق إليه بفرض ما يلزم مدلوله من الاخبار، وبهذا الاعتبار يعتري الإنشاءات.

ترجمہ:

اور اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام (اشیاء) کے نام سکھائے۔

لفظِ آدم عربی ہے یا عجمی؟

لفظ آدم یہ عربی زبان کا لفظ ہے یا عجمی زبان کا؟

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک یہ لفظ عربی نہیں عجمی ہے جیسے آذر اور شالح عجمی ہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جن لوگوں نے آدم لفظ کا مادہ اشتقاق لغتِ عرب میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے انہوں نے ہٹ دھرمی اور تعسّف سے کام لیا ہے۔ جیسے ادریس کا مادہ درس اور یعقوب کا عقب تصور کرنا تعسّف ہے۔ البتہ علماء کے نزدیک یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ اشتقاق اور معنی درج ذیل ہو سکتے ہیں۔

1۔ یہ ادمۃ سے بنا ہے جس کا معنی گندم گوں ہونا ہے یعنی گندم گوں رنگ والا۔

2۔ یہ آدمۃ سے مشتق ہے جس کا معنی اسوہ، نمونہ اور طریقہ ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تمام کائنات کے لئے نمونہ

تھے۔

3۔ یہ ادیم الارض سے مشتق ہے بمعنی زمین کا ظاہر اور سطح ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

قبض اللہ قبضه من جمیع الارض سهلها و حزنها

سخت اور نرم تمام زمین سے ایک مٹھی مٹی لی گئی جس سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ اسی وجہ سے اولاد آدم میں رنگت اور مزاج میں اختلاف ہے۔

4. یہ آدمۃ سے مشتق ہے یا ادم بمعنی الفت کیونکہ ان کی آپس میں باہمی محبت ہوتی ہے۔

تعلیم: کا معنی علم سکھانا ہے، قاضی صاحب کے نزیک یہ وہ عمل ہے جس پر اکثر علم مرتب ہوتا ہے مگر کبھی اس پر علم مرتب نہیں بھی ہوتا جیسے کہا جاتا ہے۔

علمته فلم یتعلم

میں نے اسے علم سکھایا اس نے نہیں سیکھا۔

الاسماء: یہ اسم کی جمع ہے اور یہ تین معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

1۔ معنی لغوی 2۔ عرفی 3۔ اصطلاحی

1۔ معنی لغوی: یہ سمۃ یا سمو سے مشتق ہے اگر سمۃ سے مشتق ہو تو اس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ کیونکہ یہ اپنے مسمی کے پہچاننے کی علامت اور نشانی ہوتا ہے۔ اور اگر سمو سے مشتق ہو تو معنی بلند کرنا ہوگا، کیونکہ اسم اپنے مسمی کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتا ہے جیسے دلیل اپنے مدلول کو اٹھاتی ہے۔ اب اس کا اطلاق الفاظ، افعال اور صفات تمام پر ہوگا۔ یعنی اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو معنی کے الفاظ، صفات اور افعال تمام سکھا دیئے۔

2۔ عرفی معنی

عرف عام میں اسم وہ لفظ ہے جو کسی معنی کو ادا کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہو، خواہ وہ مفرد، مرکب، مسند الیہ، خبر یا رابطہ ہو۔

3۔ اصطلاحی

وہ مفرد لفظ ہے جو اکیلا اپنا معنی ظاہر کرے اور وہ کسی زمانہ کے ساتھ مقترن نہ ہو۔ یہ معنی مراد نہیں کیونکہ یہ اصطلاحات بعد کی وضع کردہ ہیں۔

"عرضھم" ان کو ملائکہ پر پیش کیا۔ یعنی مسمیات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور ان کے اسماء ان سے دریافت کئے۔ اسماء کے بعد مضاف الیہ محذوف ہے۔ جو مسمیات ہے اور اس کے عوض میں اس پر الف لام داخل کر دیا گیا ہے جیسے "واشتعل الراس شیباً" الراس اصل میں راسی تھا۔ ی متکلم کے عوض اس پر الف لام داخل ہے اور مسمیات سے مراد ذوات اشیاء اور الفاظ کے مدلولات ہیں۔ "ھم" ضمیر عقلاً کو غیر عقلاً پر غلبہ کی وجہ سے ذکر کی گئی ہے۔ بعض نے عرضھن اور عرضھا بھی

پڑھا۔

"انبئوا" یہ انباء سے مشتق ہے جس کا معنی ایسی خبر دینا جس میں مخاطب کو نفع پہنچانا مقصود ہو، اس وجہ سے انبئوا اور اخبار ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب فرشتوں کو اسماء کا علم ہی نہیں دیا گیا تو ان سے اسماء کے متعلق سوال کرنا تکلیف مالا یطاق نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ تکلیف مالا یطاق نہیں بلکہ صرف فرشتوں کو چپ کرانے کے لئے تھا اور ان کو اس عجز پر آگاہ کرنا مقصود تھا کہ تم خلافت جیسا مشکل کام نہیں سنبھال سکتے لہٰذا اللہ کریم کے فیصلہ کو بغیر چون و چرا مان لو۔

مزید ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کی حکمت معلوم کرنے کے لئے جملہ استفہامیہ،

اتجعل فیہا من یفسد فیہا

لایا گیا جو کہ جملہ انشائیہ ہے اور اس کو،

نحن نسبح بحمدك...الخ

کے ساتھ مقید کیا جس سے ان کے معصوم ہونے اور خلافت کے حقدار ہونے کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا تو انہیں "ان کنتم صادقین" کے ساتھ خطاب کیوں کیا؟ جب کہ یہ صدق و کذب کا احتمال نہیں رکھتا، کیونکہ یہ جملہ انشائیہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح جملہ خبریہ اپنے ظاہر معنیٰ کے اعتبار سے صدق و کذب کا احتمال رکھتا ہے اسی طرح وہ غرض اور معنیٰ جو کلام کو لازم ہوتا ہے وہ بھی صدق و کذب کا احتمال رکھتے ہیں یہاں فرشتوں نے اگرچہ جملہ انشائیہ مقیدہ بالحال استعمال کیا تھا لیکن اس سے یہ خبر اور دعویٰ سمجھ آتا ہے کہ حکیم کے یہ لائق نہیں کہ وہ ایسے فسادی اور قتل و غارت کرنے والے کو پیدا فرمائے اور اسے خلیفہ بنائے جن کہ اس کی حمد اور تصدیق کا اظہار کرنے والے موجود ہیں لہٰذا یہ غرض اور معنیٰ صدق و کذب کا احتمال رکھتا ہے۔ اس لئے "ان کنتم صادقین" کے ساتھ خطاب فرمایا۔

لفظِ تعلیم کی تحقیق:

(ع ل م) تعلیم (Education, Teaching)

کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ تعلیم کے معنی تصور کے لئے نفس کو متوجہ کرنا کے ہیں اور تعلم کے معنی ایسے تصور کی طرف متوجہ ہونا کے اور کبھی تعلیم کا لفظ اعلام کی جگہ آتا ہے جب کہ اس میں تاکید کے معنی مقصود ہوں جیسے فرمایا۔

" اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ " (سورۃ الحجرات آیت نمبر 16)

تم فرماؤ کیا تم اللہ کو اپنا دین بتاتے ہو۔

اورحسب ذیل آیات میں تعلیم کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا۔

" اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ " (سورۃ الرحمٰن آیت نمبر 1۔2)
رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا۔
قلم کے ذریعہ (لکھنا) سکھایا؛

"وَعُلِّمْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 91)
اورتم کو وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے۔

" عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ " (سورۃ النمل آیت نمبر 16)
ہمیں اللہ کی طرف سب جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

"وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 129)
اوراللہ کی کتاب اورحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اورآیت کریمہ: "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 31)
اوراس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔

میں حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دینے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے اندر بولنے کی صلاحیت اوراستعداد رکھ دی جس کے ذریعہ اس نے ہرچیز کے لئے ایک نام وضع کرلیا یعنی اس کے دل میں القا کردیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو ان کے کام سکھادیئے ہیں جسے وہ سرانجام دیتے رہتے ہیں اورآواز دی ہے جسے وہ نکالتے رہتے ہیں۔

لفظِ آدم کی تحقیقِ اعظم:

(ادم) ادم (Adam,The First man,People)

ابوالبشر آدم علیہ السلام بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ ادیم لارض سے مشتق ہے اوران کا نام آدم اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان کے جسم کو بھی ادیم ارض یعنی روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اوربعض نے کہا ہے کہ یہ ادمۃ سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگ کے ہیں۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام بھی گندمی رنگ کے تھے اس لئے انہیں اس نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ رجل آدم کے معنی گندمی رنگ مرد کے ہیں۔ اوربعض آدم کی وجہ تسمیہ بیان ہے کہ وہ مختلف عناصر اورمتفرق قویٰ کے امتزاج سے پیدا کئے گئے تھے۔ جیسا کہ آیت،

"اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ "(سورۃ الدھر آیت نمبر 2)
بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا ملی ہوئی منی سے کہ وہ اسے جانچیں۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے جعلت فلانا ادمہ اھلی میں فلاں کو اپنے اہل وعیال میں ملالیا مخلوط کرلیا۔ بعض

نے کہا ہے کہ آدم ادام سے مشتق ہے اور ادام سالن وغیرہ ہر چیز کو کہتے ہیں جس سے طعام کو لذیذ اور خوشگوار محسوس ہو اور آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی روح ڈال کر اسے پاکیزہ بنا دیا تھا جیسے کہ آیت

" و نفخت فیہ من روحی " (سورۃ ص آیت نمبر 72)

اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکوں۔

میں مذکور ہے اور پھر اسے عقل وفہم اور فکر عطا کر کے دوسری مخلوق پر فضیلت بھی دی ہے جیسے فرمایا:

" وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا " (سورۃ الاسراء آیت نمبر 70)

اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

اس بناء پر ان کا نام آدم رکھا گیا ہے اور حدیث میں ہے

" لو نظرت الیھا فانہ احری ان یودم بینکما "

اگر تو اسے اپنی منگیتر کو ایک نظر دیکھ لے تو اس سے تمہارے درمیان الفت اور خوشگواری پیدا ہو جانے کا زیادہ امکان ہے۔

عرض کا معنی:

(ع ر ض) العرض (Profer,front)

اعرض الشئی اس کی ایک جانب ظاہر ہوگئی عرضت العود علی الاناء برتن پر لکڑی کو چوڑی جانب سے رکھا۔

عرضت الشئی علی فلان او لفلان میں نے فلاں کے سامنے وہ چیزیں پیش کی۔

چنانچہ فرمایا: " ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ".(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 31)

پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

لفظ نباء کا مفہوم:

(ن ب ء) النباء (News,Report)

کے معنی خیر مفید کے ہیں جو علم یا غلبہ ظن کا فائدہ دے اور حقیقی معنیٰ کے لحاظ سے کسی خبر تک اس میں تین چیزیں موجود نہ ہوں۔ یعنی نہایت مفید ہونا اور اس سے علم یا غلبہ ظن کا حاصل ہونا اور نبا صرف اس خبر کو کہا جاتا ہے جس میں کذب کا احتمال نہ ہو۔ جیسے خبر متواتر خبر الٰہی اور خبر نبوی جیسے فرمایا:

" قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ " (سورۃ ص آیت نمبر 68,67)

کہ تم فرما دو وہ بڑی خبر ہے تم اس سے غفلت میں ہو۔

صدق کا مفہوم:

(ص دق) الصدق۔ (Truth)

یہ ایک الکذب کی ضد ہے اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے۔ وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو۔ الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں پھر قول میں بھی صرف خبر کے لئے آتے ہیں اور اس کے ماسوا دیگر اصناف کلام میں استعمال نہیں ہوتے اسی لئے ارشاد ہے۔

"وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 122)

اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔

سچ کی فضیلت:

حضرت سیّدنا اَحنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے بیٹے سے ارشاد فرمایا:

اے میرے بیٹے! سچ کی فضیلت کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ سچے آدمی کی بات اس کے دشمن کے بارے میں بھی قبول کی جاتی ہے جبکہ جھوٹ کے بُرا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جھوٹے شخص کی بات نہ تو اس کے دوست کے بارے میں قبول کی جاتی ہے اور نہ دشمن کے بارے میں۔ (التذکرۃ الحمدونیۃ الباب الثامن فی الصدق والکذب، ۳/۶۴)

نوٹ: اسم، اَلّا اور ملائکہ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 32]

قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (32)

''بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے''۔

متن:

قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا

اعتراف بالعجز والقصور، وإشعار بأن سؤالهم كان استفساراً ولم يكن اعتراضاً، وأنه قد بان لهم ما خفي عليهم من فضل الإنسان والحكمة في خلقه، وإظهار لشكر نعمته بما عرفهم و كشف لهم ما اعتقل عليهم، ومراعاة للأدب بتفويض العلم كله إليه. وسبحان: مصدر كغفران ولا يكاد يستعمل إلا مضافاً منصوباً بإضمار فعله. كمعاذ الله. وقد أُجرِيَ علماً للتسبيح بمعنى التنزيه على الشذوذ في قوله: سبحان من علقمة الفاخر. وتصدير الكلام به اعتذار عن الاستفسار والجهل بحقيقة الحال، ولذلك جعل مفتاح

التوبة فقال موسى عليه السلام:

سُبْحَانَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ

وقال يونس: سُبْحَانَكَ اِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ.

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الذى لا يخفى عليه خافية. الْحَكِيْمُ المحكم لمبدعاته الذى لا يفعل إلا ما فيه حكمة بالغة. وأنت فصل، وقيل: تأكيد للكاف كما في قولك: مررت بك أنت، وإن لم يجز: مررت بأنت، إذ التابع يسوغ فيه ما لا يسوغ في المتبوع، ولذلك جاز: ياهٰذا الرجل، ولم يجز: يا الرجل، وقيل: مبتدأ خبره ما بعده والجملة خبر إن.

ترجمہ:

فرشتوں نے یہ کہہ کر اپنے عجز کا اقرار کرلیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ ان کا سوال کرنا صرف استفسار تھا نہ کہ خلافت آدم علیہ السلام پر اعتراض، نیز اللہ کریم نے خلیفہ بنانے کی حکمت کو بھی واضح کر دیا اور حضرت آدم علیہ السلام کے کمال اور فضیلت کو واضح کر دیا اور فرشتوں نے اس نعمت کا شکر یہ ادا کرنے اور ادب کی مراعات کا خیال کرتے ہوئے تمام علوم کو اللہ کریم کے سپرد کر دیا۔

"سبحان" یہ غفران کی طرح مصدر ہے اور مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ فعل محذوف سے منصوب ہوتا ہے یا یہ تسبیح بمعنی تنزیہ مصدر کا علم ہے اور تعجب کے اظہار کے لئے ذکر کیا جاتا ہے لیکن اس معنیٰ میں بہت کم استعمال ہوتا ہے جیسے،

سبحان من علقمة الفاخر

علقمہ کے فخر پر تعجب ہے یہ علم اس لئے ہے کہ یہاں یہ غیر منصرف ہے۔

سبحان کا لفظ توبہ کی قبولیت کی کنجی ہے۔ اسی لئے جب بھی کسی پیغمبر پر کوئی آزمائش آئی تو اس نے ان الفاظ کے ساتھ ع اللہ کریم کی بارگاہ میں نجات کی دعا کی تو اللہ کریم نے قبول فرمالیا جیسا کہ دعائے موسیٰ علیہ السلام،

سبحانك تبت اليك

اور حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں یہ دعا کی

لا اِلٰہ اِلَّا اَنت سُبْحَانَكَ اِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ.

تو اللہ کریم نے اس دعا کو قبول فرمایا، اور نجات عطا کی۔

فرشتوں کا اپنے کلام کے آغاز میں اس کا ذکر کرنا اس بات پر معذرت کرنے کے لئے تھا کہ انہوں نے استفسار کیوں کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کی حقیقت حال سے کیوں بے خبر رہے۔

"العلیم" وہ ذات جس پر کوئی چیز مخفی نہ ہو۔

"الحکیم" بمعنی دانا یعنی وہ ذات جو اپنی ایجادات کو مضبوط اور پختہ کرنے والی ہے پس حکیم وہ ہوتا ہے جو وہی کرتا ہے

جس میں کامل درجہ کی دانائی اور حکمت ہوتی ہے۔

انّك انت العليم الحكيم

مذکورہ بالا جملہ میں "انت" کے اضافہ کے دو فائدے ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) یہ ضمیر فصل ہے کہ جب مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہوں تو ان کے درمیان یہ ذکر کی جاتی ہے تا کہ یہ ظاہر ہو کہ اس ضمیر کے بعد واقع ہونے والے کلمات اس کے ماقبل کی خبر ہیں لہذا العلیم اور حکیم یہ دونوں ان کی خبر ہوں گے اور خبریں اس اسم کے ساتھ مختص ہیں۔

(2) "ک" ضمیر منصوب متصل مؤکد اور "انت" تاکید ہے۔ مؤکد اور تاکید ملکر ان کا اسم اور العلیم اور الحکیم اس کی خبریں ہیں "انت" اگرچہ ضمیر مرفوع منفصل ہے مگر اس کو "ک" ضمیر منصوب متصل کی تاکید بنانا جائز ہے۔ کیونکہ یہ تابع ہے اور تابع میں جو چیز پڑھنا جائز ہوتی ہے وہ متبوع میں جائز نہیں ہوتی جب کہ یاھذا الرجل جائز ہے۔ اور بعض کے نزدیک "انت" مبتداء" اور اس کے بعد خبریں ہیں اور یہ جملہ اسمیہ "انّ" کی خبر ہے۔

سبحان کی تعریف:

(س ب ح) السبح (Holy)

سبحان یہ اصل میں غفران کی طرح مصدر ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ" (سورۃ الروم آیت نمبر 17)

سو جس وقت تم لوگوں کو شام ہو اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ تو پاک ذات ہے ہم کو کچھ معلوم نہیں۔

شاعر نے کہا ہے:

سبحان من علقمة الفاخر

سبحان اللہ علقمہ بھی فخر کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سبحان علقمة ہے اس میں معنی اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے زائد ہے اور علقمۃ کی طرف سبحان کی اضافت بطور تحکم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں، سبحان اللہ من اجل علقمة ہے اس صورت میں اس کا مضاف الیہ محذوف ہوگا۔ السبوح القدوس یہ اسماء حسنیٰ سے ہے اور عربی زبان میں فعول کے وزن پر صرف یہ دو کلمے ہی آتے ہیں اور ان کو فاء کلمہ کی فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے کلوب و سمود السبحة بمعنی تسبیح ہے اور ان منکوں کو بھی سبحة کہا جاتا ہے جن پر تسبیح پڑھی جاتی ہے۔

حکمت کیا ہے؟:

(ح ك م) الحكمة (The Science of physic, wisdom)

کے معنی علم و عقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں۔ لہٰذا حکمت الٰہی کے معنی اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت

احکام کے ساتھ ان کو موجود کرتا ہیں اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کوموں کو سرانجام دینے کا نام ہے چنانچہ آیت کریمہ:

"وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 12)

اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی۔

میں حکمت کے یہی معنی مراد ہیں جو کہ حضرت لقمان کو عطا کی گئی تھی۔ لہٰذا جب اللہ تعالے کے متعلق حکیم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے کے ہوتے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا ہے۔

"اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ" (سورۃ التین آیت نمبر 8) کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

حکمت و دانائی کی باتیں:

حضرتِ سیِّدُنا یوسف بن حسین علیہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے: میں نے حضرتِ سیِّدُنا ذُوالنُّون مِصری علیہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سُنا:

مجھے ایک مغربی کے متعلق بتایا گیا کہ وہ بہت حکمت و دانائی کی باتیں کرنے والا مردِ صادق ہے۔ اس خبر نے مجھے اس کی ملاقات پر اُبھارا۔ میں نے رختِ سفر باندھا اور مطلوبہ منزل کی جانب چل پڑا، وہاں پہنچ کر ان کے دروازے پر تقریباً چالیس (40) دن تک ٹھہرا رہا۔ وہ نماز کے وقت گھر سے نکلتے نماز پڑھ کر واپس چلے آتے۔ کسی کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا:

اے بندۂ خدا! میں چالیس دن سے آپ کے دروازے پر ٹھہرا ہوا ہوں لیکن آپ نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے گفتگو نہیں کی۔

اس نے کہا: اے میرے بھائی! میری زبان خونخوار درندہ ہے۔ اگر میں اسے چھوڑ دوں گا تو یہ مجھے کھا جائے گی۔ میں نے کہا: اللہ عَزَّ وَجَلَّ آپ پر رحم فرمائے! مجھے کچھ نصیحت کرو تا کہ میں اسے یاد کرلوں۔ کہا: کیا تم ایسا کرسکو گے؟ میں نے کہا: اِنْ شَاءَ اللہ عَزَّ وَجَلَّ۔ فرمایا: سنو! دنیا سے محبت نہ کرو۔ فقر کو غناء سمجھو۔ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی طرف سے آنے والی آزمائش کو نعمت جانو، اگر اس کی طرف سے کچھ نہ ملے تو اس نہ ملنے کو عطا سمجھو۔ اللہ عزَّ وَجلّ کا ساتھ ہوتے ہوئے تنہائی بھی اُنس ہے۔ اے بھائی! ذلت کو عزت جانو۔ زندگی کو موت سمجھو۔ اطاعت و فرمانبرداری کو پیشہ اور توکل کو معاش سمجھو۔ بخدا! ہر شدت کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ اتنا کہہ کر وہ شخص چلا گیا۔ پھر ایک ماہ تک اس نے مجھ سے کلام نہ کیا۔ میں نے کہا: اے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے بندے! اب میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں اگر مناسب سمجھو تو مزید کچھ نصیحت کرو۔ کہا: جان لو! بے شک زاہد (یعنی دنیا کو چھوڑنے والا) وہ ہے کہ اسے جو ملے اسی پر گزارہ کرے۔ جہاں چاہے رہے۔ اس کا لباس اتنا ہی ہو جو ستر پوشی کا کام دے

سکے۔ تنہائی اس کی مجلس اور تلاوتِ قرآن اس کا مشغلہ ہو۔ اللہ ربُّ العزّت اس کا محبوب، ذکرِ الٰہی عَزَّ وَجَلَّ اس کی غذا، خاموشی اس کی جنت، خوف اس کی عادت وفطرت، شوق اس کا مطلوب، نصیحت اس کی ہمت اور اس کا غور وفکر عبرت، صبر اس کا تکیہ اور صدِّیقین اس کے بھائی ہوں۔ اس کا کلام حکمت، عقل اس کی دلیل، حلم اس کا دوست، بھوک اس کا سالن اور آہ وزاری اس کی عادت ہوتی ہے اور اس کا مطلوب ومقصود صرف اور صرف اللہ ربُّ العزّت کی ذات ہوتی ہے۔

حضرتِ سیِّدُنا ذُوالنُّون مِصری علیہ رحمۃ اللہ القوی فرماتے ہیں: اس کی یہ حکمت بھری عارفانہ باتیں سن کر میں نے اس سے پوچھا:

انسان اپنی غلطیوں اور نقصان پر کب مطلع ہوتا ہے؟ فرمایا:

جب وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرنے والے لوگوں کے پاس بیٹھے گا تو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے خوب واقف ہو جائے گا۔

اتنا کہہ کر وہ حکیم ودانا شخص اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ (عیون الحکایات حصہ دوم صفحہ نمبر 269)

نوٹ: تعلیم، تسبیح اور قول کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 33]

قَالَ يا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمائِهِمْ قالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّماواتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَما كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ (33)

"فرمایا اے آدم بتا دے انہیں سب (اشیاء کے) نام جب اس نے (یعنی آدم نے) انہیں سب کے نام بتا دیئے، فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو"۔

متن:

قَالَ يا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمائِهِمْ

أي: أعلمهم، وقرئ بقلب الهمزة ياء وحذفها بكسر الهاء فيهما.

فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمائِهِمْ

قالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّماواتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَما كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ استحضار لقوله تعالى: إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ لكنه جاء به على وجه أبسط ليكون كالحجة عليه، فإنه تعالى لما علم ما خفي عليهم من أمور السماوات والأرض وما ظهر لهم من أحوالهم الظاهرة والباطنة علم ما لا يعلمون، وفيه تعريض

بمعاتبتهم على ترك الاولى، وهو أن يتوقفوا مترصدين لأن يبين لهم، وقيل: مَا تُبْدُونَ قولهم: أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فيها. وما تَكْتُمُونَ استبطانهم أنهم أحقاء بالخلافة، وأنه تعالى لا يخلق خلقاً أفضل منهم. وقيل: ما أظهروا من الطاعة، وأسر إبليس منهم من المعصية، والهمزة للإنكار دخلت حرف الجحد فأفادت الإثبات والتقرير.

واعلم أن هذه الآيات تدل على شرف الإنسان، ومزية العلم وفضله على العبادة، وأنه شرط في الخلافة بل العمدة فيها، وأن التعليم يصح إسناده إلى الله تعالى، وإن لم يصح إطلاق المعلم عليه لاختصاصه بمن يحترف به، وأن اللغات توقيفية. فإن الاسماء تدل على الالفاظ بخصوص أو عموم، وتعليمها ظاهر في إلقائها على المتعلم مبيناً له معانيها، وذلك يستدعي سابقة وضع، والاصل ينفي أن يكون ذلك الوضع ممن كان قبل آدم فيكون من الله سبحانه وتعالى، وأن مفهوم الحكمة زائد على مفهوم العلم وإلا لتكرر قوله: إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ وأن علوم الملائكة و كمالاتهم تقبل الزيادة، والحكماء منعوا ذلك في الطبقة العليا منهم، وحملوا عليه قوله تعالى: وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ وأن آدم أفضل من هؤلاء الملائكة لأنه أعلم منهم، والاعلم أفضل لقوله تعالى: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ وأنه تعالى يعلم الاشياء قبل حدوثها.

ترجمہ:

قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَائِهِمْ

،،فرمایا اے آدم بتادے انہیں سب (اشیاء کے) نام۔

فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ ...الخ

اس آیت کریمہ میں اللہ کریم اپنا یہ قول فرشتوں یاددلا رہا ہے جو فرمایا تھا،

انّی اعلم مالا تعلمون

لیکن یہاں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے تا کہ اس پر دلیل قائم ہو جائے کہ اللہ کریم جب زمین وآسمان کے ان تمام امور کو جانتا ہے جو ان پر مخفی تھے اور وہ انہیں بھی جانتا ہے جو ان کے ظاہر اور باطنی حالات ہیں لہذا وہ ہر اس چیز سے آگاہ ہوگا جسے وہ نہیں جانتے ہیں اس میں بطور تعریض فرشتوں کو ترک اولیٰ پر عتاب کیا جارہا ہے لیکن ان کے لئے بہتر تو یہ تھا کہ وہ

توقف کرتے اور انتظار کرتے یہاں تک کہ اللہ کریم خود انہیں اس حکمت پر مطلع کر دیتا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی چیز تھی جن کو فرشتے ظاہر کر رہے تھے اور وہ کیا تھا جسے چھپا رہے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام خلافت کے لائق نہیں کیونکہ وہ زمین میں خون ریزی اور فساد کریں گے اور کنایۃً کہہ رہے تھے کہ فرشتے اپنی اطاعت اور عصمت کی وجہ سے خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔

یا شیطان کے علاوہ تمام فرشتے اپنی اطاعت کا اظہار کر رہے تھے اور شیطان اپنے دل میں اللہ کریم کی نافرمانی چھپا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو میرے اوپر مسلط کیا گیا تو میں اس کی قطعاً اطاعت نہیں کروں گا اور مجھے اس پر غلبہ دیا گیا تو اسے ہلاک و برباد کر دوں گا۔ (تو اللہ کریم نے جواب میں یہ آیت نازل کی کہ میں شیطان کے ظاہر و باطن کو جانتا ہوں)

اس آیت کے تحت امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے چند نکات اخذ کئے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

☆ انسان کی شرافت ملائکہ پر، اور علم کی فضیلت عبادت پر ظاہر ہو رہی ہے۔

☆ زمین کا خلیفہ بننے کے لئے عالم ہونا شرط ہے۔

☆ تعلیم کے فعل کی نسبت اللہ کریم کی طرف کرنا جائز ہے لیکن اسے معلّم کہنا جائز نہیں کیونکہ معلّم وہ ہوتا ہے جس کا پیشہ تعلیم ہوتا ہے اور اللہ کریم پیشوں کا محتاج نہیں، البتہ تمام لغتیں اور معانی اسی نے القاء فرمائے ہیں۔

☆ تمام لغات توقیفی ہیں اختراعی نہیں کیونکہ سکھانے کی نسبت اللہ کریم کی طرف ہے۔

☆ فرشتوں کے علوم زیادتی اور نقصان کو قبول کرتے ہیں، البتہ حکماء نے یہ کہا ہے کہ جو طبقہ علیاء کے فرشتے ہیں ان کے علوم کمی اور زیادتی کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ان کا کہنا ہے،

وما منّا الّا هو مقام معلوم

کہ فرشتوں نے کہا کہ ہم میں سے ہر ایک کا مقام معلوم ہے۔

☆ اشیاء کے وجود میں آنے سے پہلے بھی اللہ کریم ان کو جانتا ہے نہ کہ ان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے جیسا کہ قدریہ کا عقیدہ ہے۔

☆ تکبر کرنا قبیح عمل ہے اور یہ انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

☆ کامیابی و ناکامی کا دارومدار خاتمہ اور انجام پر ہے اور اللہ کریم کے امر کی اتباع پر ابھارنا اور ترغیب دینا ہے۔

☆ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل ہیں کیونکہ وہ ان سے زیادہ عالم ہیں۔

☆ امر وجوب کے لئے ہے اسی لئے شیطان کی مذمت کی کہ وہ وجوب کا تارک تھا ورنہ اس کی مذمت نہ ہوتی۔

بدا کا اصل معنیٰ :

(ب د و) بدا (ن) (Evidend,Openly)

الشیٔ یبدو اوبداء کے معنی نمایاں طور پر ظاہر ہوجانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 47)

اور ان کی طرف سے وہ امر ظاہر ہوجائے گا جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔

تحقیق لفظ کتم:

(ک ت م) کتمہ (ن) (To Hide, To Cover)

کتما و کتمانا کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 140)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

"وَإِنَّ فَرِيقاً مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 146)

مگر ایک فریق ان میں سچی بات جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

"وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 283)

اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔

اور آیت کریمہ: "اَلَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 37)

جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں۔

میں کتمان فضل سے کفران نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا:

"وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَاباً مُهِيناً" (سورۃ النساء آیت نمبر 37)

اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثاً" (سورۃ النساء آیت نمبر 42)

اور اللہ سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔

قول ابن عباس رضی اللہ عنہ:

مندرجہ بالا حدیث پاک کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔ تو جھٹ سے پکار اٹھیں گے،

"وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 23)

اللہ کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔

قولِ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ:

اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپائی ہوتی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آخرت میں متعدد واقف ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کچھ چھپا نہ سکنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دینگے۔

تنگدستی چھپانا:

لوگوں سے اپنی تنگدستی اور فقر و فاقہ چھپانا بہت اچھا عمل ہے۔ دیکھئے ربّ تبارک وتعالیٰ نے اصحابِ صُفّہ کے اس عمل کی تعریف فرمائی کہ وہ سخت ضرورت اور بھوک و پیاس کے باوجود اپنی خُودداری کے سبب کسی کے سامنے دستِ سُوال دراز نہ کرتے تھے، جس بِناء پر ناواقف لوگ انہیں مالدار اور خوش حال سمجھتے تھے۔ اصحابِ صُفّہ کے فقر کی پہچان ان کی طرزِ پریشانی اور قدرتی علامات سے تھی کہ ان کے چہروں پر فاقوں کے آثار، آوازیں کمزور اور رفتار میں ضُعف تھا۔

(تفسیرِ نعیمی از مولانا احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ ج ۳ ص ۱۳۹)

علمِ دین کو چھپانا گناہ ہے:

حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

"جس شخص سے کچھ دریافت کیا گیا جس کو وہ جانتا ہے اور اس نے اس کو چھپایا روزِ قیامت اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ (ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی کتمان العلم، ۴/۲۹۵، الحدیث: ۲۶۵۸)

علماء پر واجب ہے کہ اپنے علم سے فائدہ پہنچائیں اور حق ظاہر کریں اور کسی غرض فاسد کے لئے اس میں سے کچھ نہ چھپائیں۔

دورانِ نماز منہ اور ناک چھپانا:

نماز میں عمامہ شریف پر چادر اس طرح اوڑھنا کہ منہ اور ناک چھپ جائے مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ حضرت علامہ شامی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں:

"نماز میں ناک اور منہ کو ڈھانپنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ یہ مجوسیوں (یعنی آتش پرستوں) کا طریقہ ہے کہ وہ آگ کی پوجا کرتے وقت اس طرح کرتے ہیں۔"

(درمختار و ردالمحتار، کتاب الصلوۃ، باب ما یفسد الصلوۃ و ما یکرہ فیہا، مطلب الکلام علی اتخاذ المسبحۃ، ۲/۵۱۱)

نوٹ: آیت بالا میں مذکور باقی الفاظ کی تحقیق بیان ہو چکی ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 34]

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (34)

"اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا"۔

متن:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ

لما أنبأهم بأسمائهم وعلمهم ما لم يعلموا أمرهم بالسجود له، اعترافاً بفضله، وأداء لحقه واعتذاراً عما قالوا فيه، وقيل: أمرهم به قبل أن يسوي خلقه لقوله تعالى:

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ امتحاناً لهم وإظهاراً لفضله. والعاطف عطف الظرف على الظرف السابق إن نصبته بمضمر، وإلا عطفه بما يقدر عاملاً فيه على الجملة المتقدمة، بل القصة بأسرها على القصة الاخرى، وهي نعمة رابعة عدها عليهم. والسجود في الاصل تذلل مع تطامن قال الشاعر:

تَرَى الأُكْمَ فيها سُجَّداً للحَوافِرِ

وقال آخر:

وَقُلْنَ لَه اسْجُدْ لِلَيلَى فَاسْجَدَا

يعني البعير إذا طأطأ رأسه، وفي الشرع: وضع الجبهة على قصد العبادة، والمأمور به إما المعنى الشرعي فالمسجود له بالحقيقة هو الله تعالى، وجعل آدم قبلة لسجودهم تفخيماً لشأنه، أو سبباً لوجوبه فكأنه تعالى لما خلقه بحيث يكون نموذجاً للمبدعات كلها بل الموجودات بأسرها، ونسخة لما في العالم الروحاني والجسماني وذريعة للملائكة إلى استيفاء ما قدر لهم من الكمالات، ووصلة إلى ظهور ما تباينوا فيه من المراتب والدرجات، أمرهم بالسجود تذللاً لما رأوا فيه من عظيم قدرته وباهر آياته، وشكراً لما أنعم عليهم بواسطته، فاللام فيه كاللام في قول حسان رضي الله تعالى عنه:

اَلَیْسَ اَوَّلَ مَنْ صَلّٰی لِقِبْلَتِکُمْ ... وَاَعْرَفَ النَّاسِ بِالْقرآنِ والسُّنَنِ

أو فی قوله تعالی:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ.

وأما المعنی اللغوی وهو التواضع لآدم تحية وتعظيماً له كسجود إخوة يوسف له. أو التذلل والإنقياد بالسعی فی تحصيل ما ينوط به معاشهم ويتم به كمالهم. والكلام فی أن المأمورين بالسجود الملائكة كلهم، أو طائفة منهم ما سبق.

فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ امتنع عما أمر به. استكباراً من أن يتخذه وصلة فی عبادة ربه أو يعظمه ويتلقاه بالتحية. أو يخدمه ويسعی فيما فيه خيره وصلاحه. والإباء: امتناع باختيار. والتكبر: أن يری الرجل نفسه أكبر من غيره. والاستكبار طلب ذلك بالتشبع

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مندرجہ بالا عبارت سے جو نکات اخذ کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

سجدہ کا معنیٰ اور اس کی اقسام:

س ج د (سجد) (Prostration)

اللہ کریم کا ارشاد ہے،

واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لاٰدم

اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ کو کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ سجدہ کرنے کا حکم کب نازل ہوا اس میں دو قول ہیں۔ پہلا یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کا فرشتوں کو اسماء سے آگاہ کرنے کے بعد حکم ہوا کہ وہ اسے سجدہ کریں۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے امتحان کے طور پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

1۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کو ساری اشیاء کے نام سے آگاہ کر دیا اور انہیں وہ کچھ بتا دیا جسے وہ نہیں جانتے تھے تو اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کا اعتراف کرنے اور اس کا حق ادا کرنے اور جو کچھ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق انہوں نے کہا تھا اسے معذرت کرنے کے لئے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا گویا گویا تعلیم اسماء کے بعد ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا اور یہی بات امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک راجح ہے۔

2۔ بعض کے نزدیک تخلیق آدم سے پہلے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم تا کہ وہ انہیں آزمائے اور حضرت آدم علیہ السلام کی

فضیلت کو ظاہر فرمائے جیسا کہ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ پھر جب میں آدم علیہ السلام کی تخلیق مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا، یہ قول امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک راجح نہیں بلکہ ضعیف ہے اس لئے اس کو" قیل" کے ساتھ بیان کیا گیا۔

واذ قلنا للملٰئکۃ۔۔۔الخ

امام بیضاوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس ظرف کا عطف ماقبل ظرف پر ہے یعنی "واذ قلنا للملٰئکۃ۔۔۔الخ "مضمر فعل "اذکر" کے متعلق ہوکر ماقبل ظرف "واذ قال ربک للملٰئکۃ" پر ہے تو گویا اصل عبارت اس طرح تھی اور "اذکر اذ قلنا للملٰئکۃ۔۔۔الخ" اس کی ترکیب میں دوسرا قول یہ ہے کہ "اذ قال ربک" کا عامل "قالوا اتجعل فیھا۔۔۔الخ" ہے اور" واذ قلنا للملٰئکۃ اسجدوا" کا عامل "فسجدوا۔۔۔الخ" اس لئے یہاں ایک ظرف کا عطف دوسری ظرف پر نہیں بلکہ ایک جملہ فعلیہ کا عطف دوسرے جملہ فعلیہ پر ہے بلکہ ایک واقع کا عطف دوسرے واقع پر یا ایک مضمون کا عطف دوسرے مضمون پر ہے، ایک پورے قصہ کا عطف دوسرے پورے قصہ پر ہے۔ اور یہ اللہ کریم کی چوتھی نعمت ہے جو وہ اولاد آدم علیہ السلام پر شمار فرما رہا ہے۔

"سجدوا" یہ سجود سے مشتق ہے جس کا لغوی معنی ہے جھک کر عاجزی ظاہر کرنا جیسے زید الخیل طائی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں،

الاکم فیھا سجد اللحوافر

پورا شعر کچھ اس طرح ہے،

بجمع تضل البلق فی حجراتہ تری الاکم فیھا سجدا للحوافر

کہ ایسا لشکر جس کے چتکبرے گھوڑے اس کے کناروں میں چھپ گئے تھے اور ہجوم کی وجہ سے نظر نہیں آتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گھاٹیاں گھوڑوں کے ٹاپوں کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔

اس شعر میں بطور استشہاد "سجدا "کا لفظ ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی سرنگوں ہونے والے ہیں۔

شریعت میں سجدہ کا معنی یہ ہے کہ کسی کو معبود سمجھ کر اس کی عبادت کا قصد کرتے ہوئے پیشانی کو زمین پر رکھنا۔ سجدہ کی دو اقسام ہیں:

(1) سجدہ تعظیمی (2) سجدہ عبادت

اگر یہاں سجدہ شرعی مراد لیا جائے تو حقیقت میں مسجود لہٗ اللہ کریم ہوگا اور حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کے لئے قبلہ بنا دیا جیسے بیت اللہ شریف مسجود نہیں بلکہ مسجود الیہ ہے یعنی اسے سجدہ عبادت کے لئے قبلہ بنا دیا گیا۔ سجدہ عبادت اللہ کریم کے علاوہ کسی کو جائز نہ تھا اور نہ ہی آج ہے بلکہ جو غیر اللہ کو معبود سمجھ کر سجدہ کرے پکّا کافر ہے اور یا آدم علیہ السلام کو وجوب سجدہ کا سبب بنا دیا گیا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کریم کی تمام مخلوقات کا بلکہ تمام موجودات کا نمونہ بن جائیں اور عالم روحانی اور

عالم جسمانی میں جو کچھ ہے اس کا خلاصہ ہو جائیں اور فرشتوں کے لئے ان کمالات کے حصول کا ذریعہ بن جائیں جوان کے لئے مقدر تھے اور فرشتے جن مراتب اور درجات میں مختلف تھے ان کے ظہور کا وسیلہ ہو جائیں۔ اس لئے انہیں آدم علیہ السلام کے سامنے ان کی پستی کو ظاہر کرنے کے لئے انہیں سجدہ کا حکم دیا، کیونکہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے اندر اللہ کریم کی عظیم قدرت اور اس کی واضح آیات کو دیکھ لیا ہے اور تا کہ وہ اس انعام کا شکر ادا کریں جو اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کے واسطہ سے انہیں عطا فرمائے تھے۔ اس لئے "لِآدم" سے پہلے لام یہ اسی طرح "الی" کے معنی میں ہے جیسا کہ حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس شعر میں ہے جو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کہا:

اَلَیْسَ اَوَّلَ مَنْ صَلّٰی لقبلتِکُمْ ... واَعْرَفَ الناسِ بالقرآنِ والسُّنَنِ

آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اے علی رضی اللہ عنہ کی شان کے منکرو۔۔! کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سب سے پہلے شخص نہیں جنہوں نے تمہارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرمائی اور کیا وہ تم میں سب سے زیادہ قرآن اور حدیث کو جاننے والے نہیں ہیں یا یہ لام سبب اور علّت کے لئے ہوگی۔ جیسا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد میں:

اقم الصلوٰۃ لدلوك الشمس

کہ زوال شمس کی وجہ سے نماز قائم کرو۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر سجدہ کا شرعی معنیٰ لیا جائے تو مسجود لہ حقیقت میں اللہ کریم کی ذات ہوگی اور حضرت آدم علیہ السلام قبلہ یا وجوب سجدہ کا سبب ہوں گے۔

اور اگر سجود کا لغوی معنیٰ لیا جائے تو معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ کریم نے ملائکہ کو حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کرنے اور کہنے کا حکم دیا۔ یہ اسی طرح ہوگا جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی آپ کی تعظیم کے لئے آپ کے سامنے عاجزی اور انکساری کرنے کی خاطر جھک گئے تھے، یا ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اطاعت کرنے کا اعتراف کرلیں اور اس کی خدمت انجام دیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی اطاعت کرتے ہوئے ان تمام کاموں میں جن پر ان کی معیشت کا دارومدار ہے اور جس کے ساتھ ان کے کمالات مکمل ہوتے ہیں بھرپور کوشش کریں۔

اب اس میں اختلاف ہے کہ تمام ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم تھا یا ان میں سے ایک گروہ کو یہ حکم دیا گیا تھا، اس کی تفصیل ماقبل کلام میں گزر چکی ہے۔

فَسَجَدُوْا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ

توسب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے منکر ہوا اور غرور کیا اور کافروں سے ہو گیا۔

یعنی اس حکم کو عملی جامہ پہنانے سے رک گیا۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے رب کی عبادت میں حضرت آدم علیہ السلام کو وسیلہ بنائے، یا ان کی تعظیم کرے، یا سلام کے ساتھ ان کا استقبال کرے، یا وہ ان کی خدمت

کرے اور ایسے کاموں میں وہ کوشش کرے جس میں حضرت آدم علیہ السلام اصلاح اور بھلائی ہو اور سجدہ نہ کرنے کا سبب اس کا تکبر اور غرور تھا، جس کا اس نے "انا خیر منہ" کہہ کر اعتراف بھی کر لیا تھا۔

"ابیٰ" یہ اباء سے مشتق ہے جس کا معنی اپنے اختیار اور ارادہ سے انکار کرنا ہے۔

تکبر: اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنا اور استکبار کا معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا بنانے کی کوشش اور طلب کرنا،

وکان من الکافرین

اور وہ کافروں سے ہو گیا۔

سجدہ کی فضیلت میں تین احادیثِ مبارکہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَاتَقَرَّبَ الْعَبْدُ اِلَی اللہِ تَعَالٰی بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِنْ سُجُوْدٍ خَفِیٍّ

ترجمہ: بندہ ایک پوشیدہ سجدے سے بڑھ کر کسی چیز کے ساتھ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کا قرب حاصل نہیں کرتا۔

(الزھد لابن المبارک، باب العمل والذکر الخفی، الحدیث ۱۵۴، ص ۵۰)

روایت میں ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم کی بارگاہ میں عرض کیا آپ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم اللہ عَزَّ وَجَلَّ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے آپ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم کی شفاعت کا مستحق بنا دے اور جنت میں مجھے آپ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم کی رفاقت عطا فرمائے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

سجدوں کی کثرت کے ساتھ میری مدد کرو۔ (الزھد لابن المبارک، الحدیث ۱۲۸۷، ص ۴۵۵، مختصراً)

حضرت سیِّدُنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

بندہ سجدے کی حالت میں اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہٰذا اس وقت کثرت سے دعا مانگا کرو۔

(صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال ــــــــ الخ؟، الحدیث ۱۰۸۳، ص ۷۵۴، مفہوما)

سجدے میں قُربِ الٰہی:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کی گیا سوال مع جواب ملاحظہ ہو،

عرض: بندوں کو قُرب اِلَی اللہ کا مرتبہ علاوہ نماز بھی ہوتا ہے؟

ارشاد: ہاں ہر سجدے میں ربّ عَزَّ وَجَلَّ کے قریب ہوتا ہے۔

(صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال فی الرکوع ـــ الخ، الحدیث ۴۸۲، ص ۲۵۰)

اقسام سجدہ:

اور سجدے چار قسم (کے) ہیں:

(۱) سجدہ نماز (۲) سجدہ تلاوت (۳) سجدہ سہو (۴) سجدہ شکر۔

نیز سجدہ شکر سنّتِ مستحبہ ہے۔

متن:

وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ

أي في علم الله تعالى، أو صار منهم باستقباحه أمر الله تعالى إياه بالسجود لآدم اعتقاداً بأنه أفضل منه، والافضل لا يحسن أن يؤمر بالتخضع للمفضول والتوسل به كما أشعر به قوله: أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ جواباً لقوله: مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ. لا بترك الواجب وحده. والآية تدل على أن آدم عليه السلام أفضل من الملائكة المأمورين بالسجود له، ولو من وجه، وأن إبليس كان من الملائكة وإلا لم يتناوله أمرهم ولا يصح استثناؤه منهم، ولا يرد على ذلك قوله سبحانه وتعالى:

إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ لجواز أن يقال إنه كان من الجن فعلاً ومن الملائكة نوعاً، ولأن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما روى: أن من الملائكة ضرباً يتوالدون يقال لهم الجن ومنهم إبليس. ولمن زعم أنه لم يكن من الملائكة أن يقول: إنه كان جنياً نشأ بين أظهر الملائكة، وكان مغموزاً بالالوف منهم فغلبوا عليه، أو الجن أيضاً كانوا

مأمورين مع الملائكة لكنه استغنى بذكر الملائكة عن ذكرهم، فإنه إذا علم أن الاكابر مأمورون بالتذلل لأحد والتوسل به، علم أن الاصاغر أيضاً مأمورون به. والضمير في فسجدوا راجع إلى القبيلين كأنه، قال فسجد المأمورون بالسجود إلا إبليس، وأن من الملائكة من ليس بمعصوم وإن كان الغالب فيهم العصمة، كما أن من الإنس معصومين والغالب فيهم عدم العصمة، ولعل ضرباً من الملائكة لا يخالف الشياطين بالذات، وإنما يخالفهم بالعوارض والصفات كالبررة والفسقة من الإنس والجن يشملهما.

وكان إبليس من هذا الصنف كما قاله ابن عباس رضي الله تعالى عنهما فلذلك صح عليه التغير عن حاله والهبوط من محله، كما أشار إليه بقوله عز وعلا: إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ لا يقال:

كيف يصح ذلك والملائكة خلقت من نور والجن من نار؛ لما روت عائشة رضى الله تعالى عنها أنه عليه الصلاة والسلام قال: »خلقت الملائكة من النور، وخلق الجن من مَّارِجٍ من نار«

لأنه كالتمثيل لما ذكرنا، فإن المراد بالنور الجوهر المضيء والنار كذلك، غير أن ضوءها مكدر مغمور بالدخان محذور عنه بسبب ما يصحبه من فرط الحرارة والإحراق فإذا صارت مهذبة مصفاة كانت محض نور، ومتى نكصت عادت الحالة الاولى جذعة ولا تزال تتزايد حتى ينطفئ نورها ويبقى الدخان الصرف، وهٰذا أشبه بالصواب وأوفق للجمع بين النصوص، والعلم عند الله سبحانه وتعالى.

ومن فوائد الآية استقباح الاستكبار وأنه قد يفضى بصاحبه إلى الكفر، والحث على الائتمار لأمره وترك الخوض فى سره، وأن الامر للوجوب، وأن الذى علم الله تعالى مّن حاله أنه يتوفى على الكفر هو الكافر على الحقيقة، إذ العبرة بالخواتم وإن كان بحكم الحال مؤمناً وهو الموافاة المنسوبة إلى شيخنا أبي الحسن الاشعرى رحمه الله تعالى.

ترجمہ:

اور کافر ہو گیا۔

اللہ کریم کے علم میں تھا کہ ابلیس یا تو سجدہ کرنے کے حکم سے انکار کرے گا اور کافر ہو جائے گا، یا اس نے اللہ کریم کے حکم کو قبیح سمجھا جس کی وجہ سے کافر ہو گیا کیونکہ اس کو عقیدہ تھا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہے اور افضل کو مفضول کے سامنے جھکنے کا حکم دینا جائز نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے لئے یہ مناسب ہوتا ہے کہ وہ اسے اللہ کریم کی عبادت کے لئے وسیلہ بنائے جس طرح اللہ کریم کا یہ ارشاد گرامی اس سے آگاہ کر رہا ہے جب اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اللہ کریم نے فرمایا اے ابلیس تجھے اس ذات کو سجدہ کرنے سے جس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ہے۔ کیا تو نے اپنے آپ کو بڑا سمجھا ہے اور یا تو بلند مرتبہ لوگوں سے ہے تو اس نے جواب دیا "انا خیر منہ" میں اس سے بہتر ہوں تو گویا اسے صرف ترکِ واجب کی وجہ سے راندہ درگاہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کے تکبر اور غرور کی وجہ سے اسے دھتکارہ گیا تھا۔

والآية تدل على ان آدم عليه السلام... الخ

یہ آیت کریمہ اس بات پر دالّ ہے کہ وہ فرشتے جنہیں حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا ان سے حضرت آدم علیہ السلام افضل ہیں اگرچہ یہ فضیلت من وجہ ہی ہے اور یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ابلیس جنسِ ملائکہ سے تھا، ورنہ اسے وہ حکم سجدہ شامل نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کی استثناء ان سے درست ہوگی اس سلسلہ میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے

بڑی عجیب وغریب بحث فرمائی ہے جس کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے آیت کا ظاہر تو اس بات پر دلالت کرتا ہے ابلیس جنسِ ملائکہ سے تھا اور سجدہ کا جو حکم ملائکہ کو دیا گیا وہ بھی اس حکم میں شامل تھا ورنہ ان سے اس کی استثناء درست نہیں ہوگی حالانکہ ملائکہ نوری ہیں اور ابلیس ناری ہے قرآن مجید کی ایک اور آیت میں اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان جنوں میں سے تھا،

كان من الجن ففسق عن امر ربه

یعنی وہ جنوں میں سے تھا اور اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

ظاہراً ان دونوں آیات میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ان میں تعارض کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ بعض علمائے کرام کے نزدیک ابلیس باعتبار جنس فرشتوں میں سے تھا اور بطور افعال جنوں میں سے تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا کہ ملائکہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گناہوں سے معصوم اور عبادت میں ہی مشغول رہتے ہیں۔

دوسرے وہ جن سے نسل چلتی اور اولاد بھی پیدا ہوتی ہے، قسمِ اوّل کو ملائکہ اور قسمِ ثانی کو جنات کیا جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ابلیس اگرچہ جنسِ ملائکہ سے نہ تھا لیکن سجدہ کے حکم میں ملائکہ کے ساتھ شریک تھا کیونکہ حکم سجدہ صرف فرشتوں کو نہ تھا بلکہ جن بھی اس میں داخل تھے لیکن ابلیس نے اس حکم کی پیروی کرنے سے انکار کردیا اور دھتکارا گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ نوری اور ناری کا فرق کرنا مناسب نہیں کیونکہ نور اور نار ایک ہی چیز ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ نار میں دھواں ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں حرارت ہوتی ہے اور جب آگ دھواں اور حرارت سے پاک ہوجائے تو وہی نور بن جاتی ہے لہٰذا فرشتے اپنی طہارت نفس اور پاکیزگی کی وجہ سے نور بن گئے اور یہ اپنی خباثت اور نافرمانی کی وجہ سے ناری بن گیا لہٰذا آیت میں کوئی تعارض نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

مندرجہ بالا آیت کے فوائد ملاحظہ ہوں،

☆ تکبر قبیح عمل ہے۔

☆ تکبر، متکبر کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

☆ اللہ کریم کے حکم کی اتباع پر ابھارنا۔

☆ اس کے مخفی رازوں میں غور وخوض کو ترک کرنا۔

☆ امر وجوب کا فائدہ دیتا ہے وہ شخص جس کے متعلق اللہ کریم جانتا ہے کہ اس کی موت کفر پر ہوگی وہ فی الحقیقت کافر ہے کیونکہ انجام کا اعتبار خاتمے پر ہوتا ہے اگرچہ اس کے اقرار کی وجہ سے اسے مومن ہی کہا جائے گا جیسا کہ ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا، ان کے قول کو موافات کہتے ہیں۔

حرف لام کی مفصّل تحقیق:

(اللام) حرف
یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔
اول حروف جارہ اور اس کی چند قسمیں ہیں۔

(1) لام للتعدیه:

لتعدیہ کے لئے اس وقت بعض اوقات تو اس کا حذف کرنا جائز نہیں ہوتا جیسے فرمایا:

"فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 103)

توجب ان دونوں نے ہمارے حکم پر گردن رکھی۔

اور کبھی حذف کرنا جائز ہوتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:

"يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَـكُمۡ" (سورۃ النساء آیت نمبر 26)

خدا چاہتا ہے کہ تم سے کھول کھول کر بیان فرمادے۔ میں لام مذکور ہے اور آیت:

"فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ‌ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 125)

اور جسے اللہ راہ دکھانا چاہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ اور جسے گمراہ کرنا چاہے اس کا سینہ تنگ خوب رکا ہوا کر دیتا ہے۔

میں اسے حذف کر دیا ہے یعنی اصل میں لایھدیہ ولان یضلہ ہے۔ یعنی اصل میں الان یھدی ولان یضلہ ہے۔

(2) لام بمعنی ملک اور استحقاق:

ملک اور استحقاق کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔

اور ملک سے ہمیشہ ملک عین ہی مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ ملکہ منافع اور ملک تصرف سب کو عام ہے چنانچہ فرمایا:

"وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 18)

اور آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت خدا ہی کی ہے۔

"وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمَاوَاتِ وَالۡاَرۡضِ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 7)

اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں۔ اور ملک تصرف کے لئے مثلا کسی شخص کے ساتھ لکڑی تصرف کے لئے مثلا کسی شخص کے ساتھ لکڑی اٹھاتے وقت تم اس سے یہ کہو۔ خذ طرفک لاخذنی کہ تم اپنی جانب سے پکڑ لو تا کہ میں اپنی جانب

پکڑوں۔ اور للہ در ک کی طرح جب للہ کذا کہا جاتا ہے تو اس میں تو اس میں بعض نے لام تملیک مانا ہی یعنی یہ چیز بلحاظ شرف و منزلت کے اتنی بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا سی پر کسی کا ملک نہیں ہونا چاہیے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں لام ایجاد کے لئے ہے یعنی اللہ نے اسے بطریق ابداع پیدا کیا ہے کیونکہ اللہ نے اسے بطریق ابداع پیدا کیا ہے کیونکہ موجودات دو قسم پر ہیں۔

ایک وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اسباب طبعی یا صنعت انسانی کے واسطہ سے ایجاد کیا ہے۔

اور دوم وہ جنہیں بغیر کسی تو اسطہ کے پیدا کیا ہے جیسے افلاک اور آسمان وغیرہ اور یہ دوسری قسم پہلی کی نسبت اشرف اور اعلیٰ ہے۔

اور آیت کریمہ: "لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 25)

اور ان کے لئے لعنت اور برا گھر ہے۔

اور

"وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ" (سورۃ المطففین آیت نمبر 1)

ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے کئے خرابی ہے۔

میں لام استحقاق کے معنی دیتا ہے یعنی یہ لوگ لعنت اور ویل کے مستحق ہیں۔ اور یہ سلام بھی لام ملک کی طرح ہے لیکن لام پال اسی چیز پر داخل ہوتا ہے جو ملک میں حاصل ہو چکی اس پر استحقاق ثابت ہونے کے لحاظ سے حاصل شدہ چیز کی طرح ہو بعض وعلمائے نحو کہا ہے کہ آیت کریمہ:

"لَهُمُ اللَّعْنَةُ"

میں لام بمعنی علی ہے۔ ای علیهم اللعنة (یعنی ان پر لعنت ہے) اسی طرح آیت کریمہ:

"لِكُلِّ امْرِءٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ" (سورۃ النور آیت نمبر 11)

ان میں جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ لیا اُس کے لئے اتنا ہی وبال ہے۔

میں بھی لام بمعنی علی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کبھی لام بمعنی الی بھی آتا ہے جیسا کہ آیت

"بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَى لَهَا" (سورۃ الزلزلة آیت نمبر 5)

کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کا حکم بھیجا ہوگا۔

میں ہے یعنی اوحی الیها مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں تو وحی تسخیری ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے اور یہ اس وحی کی طرح نہیں ہوتی جو انبیاء کرام علیہ السلام کی طرف بھیجی جاتی ہے لہذا لام بمعنی الی نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 105)

اور (دیکھو) دغابازوں کی حمایت میں کبھی بحث نہ کرنا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ لام اجل ہے اور سبب اور جالب کے معنی دیتا ہے یعنی تم ان کی حمایت میں مت بحث کرو جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:

"وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 107)

اور ان کی طرف سے نہ جھگڑو جو اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے ہیں۔

اور یہ لا تکن للہ خصیما کے لام کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہاں لام مفعول پر داخل ہوا ہے اور معنی یہ ہیں۔

"لا تکن خصیم اللہ"

کہ تم اللہ کے خصیم یعنی فریق مخالف مت بنو۔

(3) لام ابتداء:

لا ابتداء جیسے

فرمایا: "لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 108)

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

"لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا" (سورۃ یوسف آیت نمبر 8)

کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔

"لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً" (سورۃ الحشر آیت نمبر 13)

تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں بڑھ کر ہے۔

(4) لام جو ان کے بعد آتا ہے:

چہارم وہ لام جو ان کے بعد آتا ہے۔

یہ کبھی تو ان کے اسم پر داخل ہوتا ہے اور کبھی ان کی خبر اور کبھی متعلق خبر پر چنانچہ جب اسم خبر سے متاخر ہو تو اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 13)

اس میں بڑی عبرت ہے۔

اور خبر پر داخل ہونے کی مثال جیسے فرمایا:

"اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" (سورۃ الفجر آیت نمبر 14)

بے شک تمہارے رب کی نظر سے کچھ غائب نہیں.

"اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ" (سورۃ ھود آیت نمبر 75)
بیشک ابراہیم (علیہ السلام) بڑے تحمل والے نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

اور یہ لام متعلق خبر پر اس وقت آتا ہے جب متعلق خبر ان کی خبر پر مقدم ہو جیسے فرمایا:

"لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 72)
اے محمد ﷺ! تمہاری جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش ہو رہے تھے۔

(5) لام مخففہ:

وہ لام جو ان مخففہ کے ساتھ آتا ہے۔

جیسے فرمایا: "وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 35)
اور یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے۔

(6) لام قسم:

یہ کبھی اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 111)
بلکہ ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے۔ اور کبھی فعل ماضی پر آتا ہے جیسے فرمایا:

"لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 81)
ان کے قصے میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ اگر یہ لام فعل مستقبل پر آئے تو اس کے ساتھ نون تاکید ثقیلہ یا خفیفہ کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا: تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی۔ اور آیت کریمہ:

"وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ" (سورۃ ھود آیت نمبر 111)
اور تمہارا پروردگار ان سب کو قیامت کے دن ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیگا۔ میں لما کا لام ان کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ اور لیوفینهم کا لام قسم کا ہے۔

(7) لو کی خبر پر داخل ہونے والا لام:

وہ لام جو لو کی خبر پر داخل ہوتا ہے۔

جیسے فرمایا: "وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 103)
اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔

"لَوْ تَزَیَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 25)

اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے تو جو ان میں کافر تھے ان کو ہم عذاب دیتے۔

"وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوا اِلٰی قوله لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ "(سورۃ النساء آیت نمبر 46)

اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور آپ کو متوجہ کرنے کے لئے راعنا کی جگہ انظرنا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ اور کبھی لو کے جواب میں لام محذوف ہوتا ہے جیسے ہے۔

(8) وہ لام جو مدعا کے لئے استعمال ہو:

وہ لام جو مدعا یا مدعوالیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مدعو کے لئے یہ مفتوح ہوتا ہے۔ جیسے یالزید۔ اور مدعوالیہ آئے تو مکسور ہوتا ہے جیسے یالزید۔

(9) لام امر:

لام امر یہ ابتدا میں آئے تو مکسور ہوتا ہے۔

جیسے فرمایا: "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ "(سورۃ النور آیت نمبر 58)

مومنوں تمہارے غلام لونڈیاں تم سے اجازت لیا کریں۔

"لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ "(سورۃ الزخرف آیت نمبر 77)

تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔

اور اگر اس پر واؤ یا فا آجائے تو ساکن ہو جاتا ہے جیسے فرمایا:

"وَلْيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ "(سورۃ العنکبوت آیت نمبر 66)

اور فائدہ اٹھائیں عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا۔

"وفَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ "(سورۃ الکھف آیت نمبر 29)

تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

"فَلْيَفْرَحُوْا "(سورۃ یونس آیت نمبر 58)

اور جب اس پر ثم داخل ہو تو اسے ساکن اور متحرک دونوں طرح پڑھنا جائز ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ "(سورۃ الحج آیت نمبر 29)

پھر اپنا میل کچیل اتاریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس آزاد گھر کا طواف کریں۔

سجد کا معنیٰ:

(س ج د) السجود (ن) (Prostration)

اُس کے اصل معنی عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس کی عبادت کرنے کو سجود کہا جاتا ہے اور یہ انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے (کیونکہ)

سجود کی دو قسمیں ہیں۔

سجود اختیاری:

جو انسان کے ساتھ خاص ہے اور اسی سے وہ ثواب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا" (سورۃ النجم آیت نمبر 62)

سو اللہ کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

سجود تسخیری:

جو انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ"
(سورۃ الرعد آیت نمبر 15)

اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے خواہ مجبوری سے اور ان کی پرچھائیاں ہر صبح و شام۔

لفظِ ابلیس کا معنیٰ:

(ب ل س) الابلاس (افعال) (Devil,Satan)

کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں۔ ابلیس وہ مایوس ہونے کی وجہ سے مغموم ہوا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی سے ابلیس مشتق ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ" (سورۃ الروم آیت نمبر 12)

اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرموں کی آس ٹوٹ جائے گی۔

"اَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 44)

تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس میں وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔

"وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ" (سورۃ الروم آیت نمبر 49)

اگرچہ اس کے اتارنے سے پہلے آس توڑے ہوئے تھے۔

اور عام طور پر غم اور مایوسی کی وجہ سے انسان خاموش رہتا ہے اور اسے کچھ سوجھائی نہیں دیتا اس لئے ابلس فلان کے معنی خاموشی اور دلیل سے عاجز ہونے کے ہیں۔

لفظِ ابیٰ کا مفہوم:

(اب ی) الاباء۔ (Refusal, Objection)

کے معنی شدت امتناع یعنی سختی کے ساتھ انکار کرنا ہیں۔ یہ لفظ الامتناع سے خاص ہے لہٰذا ہر اباء کو امتناع کہہ سکتے ہیں مگر ہر امتناع کو اباء نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے۔

"وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 32)

اور اللہ نہ مانے گا مگر اپنے نور کا پورا کرنا۔

"وَتَأْبَى قُلُوبُهُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 8)

لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔

"أَبَى وَاسْتَكْبَرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 34)

اس نے سخت سے انکار کیا اور تکبیر کیا۔

"إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَى" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 34)

مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔

ایک روایت میں ہے: "کلکم فی الجنۃ الامن ابی"

(کہ) تم سب جنتی ہو مگر وہ شخص جس نے (اطاعت الٰہی سے) انکار کیا۔

رجل ابی۔ خوددار آدمی جو کسی کا ظلم برداشت نہ کرے۔ ابیت الضیر (مضارع تابی) تجھے اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رکھے۔ تیس آبی۔ وہ بکرا جو پہاڑی بکروں کا بول ملا ہوا پانی پی کر بیمار ہو جائے اور پانی نہ پی سکے اس کا مونث ابواء ہے۔

مفہوم کبیر:

(ک ب ر) کبیر (Pride)

اور الکبر والتکبیر والاستکبار کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں پہلی یہ ہے کہ وہ حالت ہے جس کے سبب سے انسان عجب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور عجب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرے اور سب سے بڑا تکبر قبول حق سے انکار اور عبادت سے انحراف کر کے اللہ تعالیٰ پر تکبر کرنا ہے۔

مفہوم استکبار:

الاستکبار

اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کا قصد کرے۔ اور یہ بات اگر منشائے شریعت کے مطابق اور برمحل ہو اور پھر ایسے موقع پر ہو۔ جس پر تکبر کرنا انسان کو سزاوار ہے تو محمود ہے۔

دوم یہ کہ انسان جھوٹ موٹ بڑائی کا اظہار کرے اور ایسے اوصاف کو اپنی طرف منسوب کرے جو اس میں موجود نہ ہوں۔ یہ مذموم ہے۔ اور قرآن میں یہی دوسرا معنی مراد ہے فرمایا؛

"أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 34)

مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آ گیا۔

کان کی مفصل تحقیق:

(ك و ن) کان۔

فعل ماضی کے معنی کو ظاہر کرتا ہے پیشتر صفات باری تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو ازلیت (یعنی ہمیشہ سے ہے) کے معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 40)

اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

"وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 27)

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور جب یہ کسی جنس کے ایسے وصف کے متعلق استعمال ہو جو اس میں موجود ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ وصف اس اسم کے ساتھ لازم و ملزوم رہتا ہے اور بہت ہی کم اس علیحدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات:

"وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 67)

اور انسان ہے ہی ناشکرا۔

"وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 100)

اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔

"وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 54)

اور انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے، میں تنبیہ کی ہے کہ یہ امور انسان کے اوصاف لازمہ سے ہیں اور شاذ و نادر ہی اس سے منفک ہوتے ہیں اسی طرح شیطان کے متعلق فرمایا:

"كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 29)

اور شیطان آدمی کو بے مدد چھوڑ دیتا ہے۔

"وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 27)

اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا یعنی نا قدرا ہے۔ جب یہ فعل زمانہ ماضی کے متعلق استعمال ہو تو اس میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ چیز تا حال اپنی پہلی حالت پر قائم ہو اور یہ بھی کہ اس کی وہ حالت متغیر ہوگئی ہو مثلاً کان فلان کذا ثم صار کذا۔ یعنی فلاں پہلے ایسا تھا لیکن اب اس کی حالت تبدیل ہوگئی ہے نیز یہ ماضی بعید کے لئے بھی آتا ہے جیسے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز پیدا کی تھی اور ماضی قریب کے لئے بھی حتیٰ کہ اگر وہ حالت زمانہ تکلم سے ایک لحہ بھی پہلے ہو تو اس کے متعلق کان کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے لہٰذا جس طرح کان ادم کذا کہہ سکتے ہیں اسی طرح کان زید ھھنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر آیت:

"كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 29)

وہ بولے ہم کیسے بات کریں اس سے جو پالنے میں بچّہ ہے۔

کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو ابھی گود کا بچہ تھا یعنی کم عمر ہے اور یہ بھی کہ جو ابھی گود کا بچہ ہے یعنی ماں کی گود میں ہے لیکن یہاں زمانہ حال مراد لینا بے معنی ہے اس میں زمانہ قریب ہے جیسے آیت:

"كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 110)

جتنی امتیں ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ کنتم زمانہ حال پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کے علم اور حکم کے مطابق بہتر تھے۔ اور آیت کریمہ:

"وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 280)

اور اگر (قرض لینے والا) تنگ دست ہو۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کان کے معنی کسی چیز کا واقع ہو جانا کے ہیں اور یہ فعل تام ہے۔ یعنی اگر وہ تنگدست ہو جائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کون کا لفظ کسی جوہر کے اپنے سے پست تر جو میں تبدیل ہونے کے لئے آتا ہے اور اکثر متکلمین اسے معنی ابداع میں استعمال کرتے ہیں بعض علمائے نحو کا خیال ہے کہ کینونۃ کا لفظ اصل میں کونونة بروزن فعلولة ہے۔ ثقل کی وجہ سے واؤ سے تبدیل ہوگئی ہے مگر سیبویہ کے نزدیک یہ اصل میں کیونونة بر وزن فیعلولة ہے۔ واؤ کو یا میں ادغام کرنے سے کینونة ہو گیا پھر ایک یاء کو تخفیف کے لئے گرا دیا تو کینونة بن گیا جیسا کہ میت سے میت بنا لیتے ہیں جو اصل میں میوت ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ کینونة (بتشدید یاء کے ساتھ اکثر استعمال ہوتا ہے المکان۔ بعض کے نزدیک یہ دراصل کان یکون (ک و ن) سے ہے مگر کثرت استعمال کے سبب میم کو اصلی تصور کر کے اس سے تمکن وغیرہ مشتقات استعمال ہونے لگے ہیں جیسا کہ مسکین سے تمسکن بنا لیتے ہیں حالانکہ یہ (ص ک ن) سے ہے۔

استکان فلان فلاں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ گویا وہ ٹھہر گیا اور ذلت کی وجہ سے سکون و طمانینت کو چھوڑ دیا، قرآن میں ہے:

"فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ " (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 76)

تو بھی انہوں نے اللہ کے آگے عاجزی نہ کی۔

تکبر کرنے والا پکڑا گیا:

نبی کریم ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے:

تم سے پہلے کا ایک شخص دو سبز چادریں اوڑھے اِتراتا ہوا نکلا، تو اللہ عزوجل نے زمین کو حکم دیا تو زمین نے اسے پکڑ لیا، اب وہ قیامت تک اسی طرح زمین میں دھنستا رہے گا۔

تکبر کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا:

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس کے دل میں رائی کے دانے جتنا بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ عرض کی گئی، آدمی تو یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اور جوتے اچھے ہوں۔ تو آپ صَلَّی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلَّم نے ارشاد فرمایا:

بے شک اللہ عزوجل جمیل ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے، جبکہ تکبر تو حق کی مخالفت اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام ہے۔

بُولَس اور طِيْنَةُ الْخَبَالِ:

قیامت کے دن متکبرین کو انسانی شکلوں میں چیونٹیوں کی مانند اٹھایا جائے گا، ہر جانب سے ان پر ذلت طاری ہوگی، انہیں جہنم کے "بُولَس" نامی قید خانے کی طرف ہانکا جائے گا اور بہت بڑی آگ انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر ان پر غالب آ جائے گی، انہیں "طِيْنَةُ الْخَبَالِ" یعنی جہنمیوں کی پیپ پلائی جائے گی۔

نوٹ: لفظ آدم، قول، ملائکہ کا ذکر ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 35]

وَقُلْنا يا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلا مِنْها رَغَداً حَيْثُ شِئْتُما وَلا تَقْرَبا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونا مِنَ الظَّالِمِينَ (35)

"اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے"۔

متن:

وَقُلْنا يا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

السكنى من السكون لأنها استقرار ولبث، وأنت تأكيد أكد به المستكن ليصح العطف عليه، وإنما لم يخاطبهما أولاً تنبيهاً على أنه المقصود بالحكم والمعطوف عليه تبع له. والجنة دار الثواب، لأن اللام للعهد ولا معهود غيرها. ومن زعم أنها لم تخلق بعد قال إنه بستان كان بأرض فلسطين، أو بين فارس وكرمان خلقه الله تعالى امتحاناً لآدم، وحمل الإهباط على الانتقال منه إلى أرض الهند كما في قوله تعالى:

اهْبِطُوا مِصْراً وَكُلَا مِنْهَا رَغَداً واسعًا رافهاً،

صفة مصدر محذوف.

حَيْثُ شِئْتُمَا أي مكان من الجنة شئتما، وسع الامر عليهما إزاحة للعلة، والعذر في التناول من الشجرة المنهي عنها من بين أشجارها الفائتة للحصر.

ترجمہ:

اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو۔

"اسکن" فعل امر کا صیغہ ہے، جو سکنی سے مشتق ہے اور سکنی ماخوذ ہے سکون سے۔ اور اس کا معنیٰ رہائش اختیار کرنا اور مسکن بنانا ہے کیونکہ وہ استقرار اور ٹھرنے کی جگہ ہے اور سکون کا معنیٰ حرکت نہ کرنا اور ٹھر جانا ہے چونکہ جہاں رہائش اختیار کرلی جائے وہاں سکون حاصل ہوتا ہے اس لئے یہ سکون سے ماخوذ ہے۔ اسکن میں "انت "ضمیر مؤکد اور یہ "انت" اس کی تاکید ہے۔ مؤکد اور تاکید مل کر معطوف علیہ، واؤ عاطفہ زوجک معطوف ہے یہاں "انت "ضمیر مرفوع منفصل اس لئے ذکر کی گئی ہے تاکہ اسی پر اسم ظاہر کا عطف صحیح ہو جائے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو اکٹھا خطاب نہیں فرمایا جس طرح "ولا تقربا" اور "فتکونا" میں خطاب فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات پر مطلع کیا جائے کہ حضرت آدم علی السلام مقصود بالحکم ہیں۔ اور "زوجک" ان کے تابع ہے، جس طرح معطوف، معطوف علیہ کے اعراب میں تابع ہوتا ہے۔

اور "الجنۃ" سے مراد دار الثواب ہے کیونکہ اس پر الف لام عہد خارجی کا ہے اور دارلثواب کے علاوہ کوئی اور مخصوص جنت نہیں ہے۔ معتزلہ کا کہنا ہے کہ دار الثواب ابھی تک تو پیدا ہی نہیں ہوا، اس لئے اس سے مراد وہ باغ ہے جو فلسطین، فارس اور کرمان کے درمیان پیدا فرد یا تھا تاکہ حضرت آدم علیہ السلام کو آزمایا جا سکے چونکہ اس سے آگے والی آیت میں اللہ کریم نے ارشاد فرمایا "اھبطوا" یہ اھباط سے مشتق ہے۔ جس کا معنیٰ اوپر سے نیچے اتارنا ہے، لہٰذا معتزلہ کا یہ کہنا درست نہیں۔ معتزلہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اھباط سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کو ہندوستان کی طرف منتقل کرنا ہے اور اھباط کا لفظ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے استعمال ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ اللہ کریم نے بنی اسرائیل کو ارشاد فرمایا:

اہبطو مصرًا

کہ صحرائی زمین سے شہری زمین کی طرف منتقل ہو جاؤ۔

اہلسنت کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جس جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کو داخل کیا گیا تھا۔ اس کے اوصاف یہ بیان کئے گئے ہیں کہ وہاں آپ کو نہ تو بھوک لگے گی اور نہ ہی آپ برہنہ ہوں گے اور نہ ہی اس میں آپ کو پیاس اور دھوپ لگے گی تو یہ اوصاف دار الثواب کے ہی ہو سکتے ہیں، زمین پر واقع کسی باغ یا غیچہ وغیرہ کے نہیں۔

وکلا منہا رغدًا

"رغدًا" کا معنی کشادگی اور آسانی کے ساتھ کھانا ہے اور رغداً یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اصل میں "أكلا رغداً" تھا۔

حیث شئتما

جہاں سے تم دونوں چاہو۔ یعنی جنت کی جس جگہ سے چاہو۔ بافراغت، سکون اور کشادگی کے ساتھ کھاؤ۔ تو یہاں اللہ کریم نے کھانے کے حکم میں ان دونوں (حضرت حوا و آدم علیہما السلام) کے لئے وسعت پیدا کر دی یعنی جہاں سے چاہو، وہاں سے کھاؤ تا کہ اس ممنوعہ درخت سے کھانے میں عذر اور علت زائل ہو جائے۔ یعنی اس ممنوعہ درخت کے علاوہ بہت سے ایسے درخت ہیں جن سے کھانے سے نہیں روکا گیا، وہاں سے کھانے کی اجازت تھی۔

متن:

وَلا تَقْرَبا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونا مِنَ الظّالِمِينَ

فيه مبالغات، تعليق النهي بالقرب الذى هو من مقدمات التناول مبالغة فى تحريمه، ووجوب الاجتناب عنه، وتنبيهاً على أن القرب من الشيء يورث داعية، وميلاً يأخذ بمجامع القلب ويلهيه عما هو مقتضى العقل والشرع، كماروى »حبك الشيء يعمي ويصم فينبغي أن لا يحوما حول ما حرم الله عليهما مخافة أن يقعا فيه، وجعله سبباً لأن يكونا من الظالمين الذين ظلموا أنفسهم بارتكاب المعاصى، أو بنقص حظهما بالإتيان بما يخل بالكرامة والنعيم، فإن الفاء تفيد السببية سواء جعلت للعطف على النهى أو الجواب له. والشجرة هى الحنطة، أو الكرمة، أو التينة، أو شجرة من أكل منها أحدث، والاولى أن لا تعين من غير قاطع كما لم تعين فى الآية لعدم توقف ما هو المقصود عليه. وقرئ بكسر الشين، و »تقربا« بكسر التاء و »هذى« بالياء.

ترجمہ:

ولا تقربا...الخ

یہ فعل نہی تثنیہ کا صیغہ ہے اور اس کے ساتھ ممنوعہ درخت کے نزدیک جانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ اس میں کئی مبالغے ہیں۔

پہلا یہ کہ نہی کو قرب کے ساتھ معلق کر دیا گیا ہے اور قرب کسی چیز کے حاصل کرنے کے مقدمات میں سے ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس درخت کی حرمت میں مبالغہ ظاہر کیا جائے اور اس سے اجتناب کے وجوب کو ثابت کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ کسی چیز کا قرب ایک ایسا جذبہ اور میلان پیدا کر دیتا ہے جو پورے دل پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور وہ جذبہ اسے اس چیز سے غافل کر دیتا ہے جس کا عقل اور شریعت تقاضا کرتی ہے۔ جیسے روایت کیا گیا ہے کہ تیرا کسی چیز سے محبت کرنا تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے۔ اس لئے حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے لئے مناسب یہی ہے کہ جس چیز کو اللہ کریم نے ان دونوں پر حرام قرار دے دیا، اس کے گرد نہ گھومیں کہ کہیں وہ اسے استعمال کرنے میں مبتلاء نہ ہو جائیں۔

تیسرا یہ کہ اس کے قرب کو اس بات کا سبب بنا دیا گیا ہے کہ اس کے استعمال کرنے سے وہ ان نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے جو گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو نقصان میں مبتلاء کر دیتے ہیں، یا اس سبب سے کہ وہ اس کے استعمال کرنے سے اپنا حصہ کم کر لیں گے جو ان کی کرامت اور نعمت کی کمی کا سبب بن جائے گا۔ کیونکہ یہاں "فاءسببیہ" ذکر کیا گیا ہے۔ خواہ اس کا عطف نہی پر قرار دیں اسے فعل نہی کا جواب تصور کریں تو معنی یہ ہوگا کہ اس درخت کے قریب جانا نقصان کا باعث ہوگا اور جنت، کرامت اور نعمتیں چھین کی جائیں گی اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

اس جگہ کونسا درخت مراد ہے اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض کے نزدیک گندم، انگور کی بیل، انجیر یا کوئی ایسا درخت ہے جس سے کوئی کھائے تو اسے حدث لاحق ہو جاتا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ اس پر کوئی قطعی دلیل موجود نہیں کہ کونسا درخت مراد ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اسے معین نہ کیا جائے، جس طرح آیت کریمہ میں اس کی تعیین نہیں کی گئی، کیونکہ اس پر مقصود موقوف نہیں اور "الشجرہ" کو بکسرہ شین اور تقربا بکسرہ تاء اور ھذہ کو ھذی یاء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

سکون کی تعریف:

(س ك ن) السکون (ن) (Silence, Quietness)

حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو سکون کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سکن فلان مکان کذا کے معنی ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کر لی۔ اسی اعتبار سے جائے رہائش کو مسکن کہا جاتا ہے اس کی جمع مساکن آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 25)
کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اور فرمایا: "وَلَهُ ما سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهارِ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 13)

اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔

"وِلِتَسْكُنُوا فِيهِ" (سورۃ یونس آیت نمبر 67)

تاکہ اس میں آرام کرو۔ تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سکنتہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اسکنتہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"رَبَّنا اِنِّي اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي " (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 37)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد لا بسائی ہے۔

"اَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ " (سورۃ الطلاق آیت نمبر 6)

عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہتے ہو اپنی طاقت بھر۔

زوج کا معنیٰ:

(ز و ج) الزوج (Pair)

جن حیوانات میں نر اور مادہ پایا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نر اور مادہ دونوں میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیاء میں جفت کو زوج کہا جاتا ہے جیسے موزے اور جوتے وغیرہ پھر اس چیز کو جو دوسری کی مماثل یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہو وہ اس کا زوج کہلاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى " (سورۃ القیامۃ آیت نمبر 39)

اور (آخرکار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرد اور عورت۔

"وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 35)

اور تیری بی بی جنت میں رہو۔

اور بیوی کو زوجۃ (تا کے ساتھ) کہنا عامی لغت ہے اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے

فبکا بناتی شجوھنّ وزوجتیتو میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔ اور زوج کی جمع ازواج آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

" هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ " (سورۃ یٰس آیت نمبر 56)

وہ اور ان کے جوڑے اور آیت:

" اُحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجَهُمْ " (سورۃ الصافات آیت نمبر 22)

جو لوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کرو۔

میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو فعل میں ان کی اقتدا کیا کرتے تھے اور آیت کریمہ:

"إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ " (سورۃ الحجر آیت نمبر 88)

اس کی طرف جو مختلف قسم کے لوگوں کو ہم نے (دنیاوی سامان) دے رکھے ہیں۔ اشباہ واقران یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ مراد ہیں اور آیت:

"سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ " (سورۃ یٰسٓ آیت نمبر 36)

پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم کی) چیزیں پیدا کیں۔ نیز:

"وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ " (سورۃ الذاریات آیت نمبر 49)

اور تمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنائیں۔

میں اس بات پر تنبیہ کی ہے۔ کہ تمام چیزیں جوہر ہوں یا عرض مادہ وصورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بتا رہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور اس کے لئے صانع (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز تنبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس (خلقنا زوجین) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ اس میں ترکیب پائی جاتی ہے بلکہ نفس ترکیب سے تو کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جوہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے لہٰذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت

"أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ " (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 53)

طرح طرح کی مختلف روئیدگیاں۔

میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنی آیت:

"مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ " (سورۃ لقمان آیت نمبر 10)

ہر قسم کی عمدہ چیزیں (اگائیں)۔

اور آیت کریمہ: "ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 143)

(نر اور مادہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔

میں مراد ہیں اور آیت کریمہ: "وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً " (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 7)

میں ازواج کے معنی ہیں قرناء یعنی امثال ونظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو چنانچہ اس کے بعد اصحاب المیمنۃ سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ " (سورۃ التکویر آیت نمبر 7)

اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔ میں بعض نے زوجت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہر پیروکار کو اس پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کر دیا جائیگا۔ جیسا کہ آیت:

"اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ " (سورۃ الصافات آیت نمبر 22)

میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اس روز روحوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملا دیا جائیگا جیسا کہ آیت

"يا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي اِلى رَبِّكِ راضِيَةً مَّرْضِيَّةً " (سورۃ الفجر آیت نمبر 27-28)

اے اطمینان پانے والی جان اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔

تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ میں بعض نے ربک کے معنی صاحبک یعنی بدن ہی کئے ہیں اور بعض کے نزدیک زوجت سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کر دیا جائیگا جیسا کہ آیت کریمہ:

"يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ ما عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَراً وَما عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 30)

جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائے گا۔

میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

"وَزَوَّجْناهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ " (سورۃ الدخان آیت نمبر 54)

اور ہم انہیں حور عین کا ساتھی بنا دیں گے۔ میں زوجنا کے معنی باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زوجنا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازدواجی تعلقات نہیں ہوں گے کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بحورٍ کی بجائے زوجناھم حورا کہتا جیسا کہ زوجتہ امرءۃ کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کر دیا۔

اکل کا لغوی ومجازی معنی:

(اک ل) الاکل (To eat, To Suffer)

کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً اکلت النار الحطب کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا ڈالا۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے اسے اکل بضم کاف وسکونا کہا جاتا ہے ارشاد ہے،

"اُكُلُهَا دَائِمٌ " (سورۃ الرعد آیت نمبر 35) اُس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

تحقیق لفظِ رغد:

(ر غ د) رغد

اور غیدا۔ آسودہ زندگی قرآن میں ہے:

" وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 35)

اور اس میں سے تم دونوں بافراغت کھاؤ۔

" يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ "(سورۃ النحل آیت نمبر 112)

ہر طرف سے ان کا رزق بافراغت ان کے پاس چلا آتا تھا۔

ارغد القوم آرام راحت میں بسر کرنا۔ ارغد ماشیتہ اس سے اپنے مویشی چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیئے۔ ان میں اول یعنی ارغد القوم جدب واجدب کی طرح لازم ہے اور دوسرا یعنی ارغد ماشیتہ ادخل کی طرح متعدی ہے۔

مرغاد کسے کہتے ہیں؟:

المرغاد ایک قسم کا کھانا جو دودھ میں خرما وغیرہ ڈال کر بنایا جاتا ہے اور وافر ہونے کی وجہ سے زندگی کی آسودگی پر دلالت کرتا تھا۔

حیث کا استعمال:

(ح ی ث) حیث

(یہ ظرف مکان مبنی برضم ہے) اور مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

" وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 144)

اور تم جہاں ہوا کرو۔

لفظ قرب کی تحقیق:

(ق ر ب) القرب (Near)

القرب والبعد یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے:

قربت منہ اقرب وقربتہ اقربہ قربا قربانا کسی کے قریب جانا اور مکان زمان، نسبی تعلق مرتبہ حفاظت اور قدرت سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرب مکانی کے متعلق فرمایا:

"وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 35)

مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

" وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيْمِ "(سورۃ الانعام آیت نمبر 152)

اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔

"وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 32)

اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔

"فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 28)

تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔

اور آیت کریمہ: "وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 222)

ان سے مقاربت نہ کرو۔

میں جماع سے کنایہ ہے۔

"فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ" (سورۃ الذاریات آیت نمبر 27) • اور (کھانے کے لئے) ان کے آگے رکھ دیا۔

اور قرب زمانی کے متعلق فرمایا:

"اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 1)

لوگوں کا حساب اعمال کا وقت نزدیک پہنچا۔

شجر کی تعریف:

(ش ج ر) الشجر (Tree)

درخت وہ نبات جس کا تنہ ہو۔ واحد شجرۃ جیسے ثمر و ثمرۃ۔ قرآن میں ہے:

"اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" (سورۃ الفتح آیت نمبر 18)

جب وہ اس پیڑ کے نیچے تمہاری بیعت کرتے تھے۔

"ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ" (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 72)

کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا۔

"وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 6)

اور سبزے اور پیڑ سجدہ کرتے ہیں۔

"مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ" (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 52)

تھوہر کے درخت سے۔

"اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 43)

بلاشبہ تھوہر کا درخت گنجان درختوں والی وادی۔

بہت درختوں والی جگہ۔ ھذا الوادی اشجر من ذالک اس وادی میں اس سے زیادہ درخت ہیں۔ الشجار والمشاجرۃ والتشاجر باہم جھگڑنا اور اختلاف کرنا۔ قرآن میں ہے۔

"فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 65) اپنے تنازعات میں۔

شجرنی عنہ مجھے اس سے جھگڑا کر کے دور ہٹا دیا یا روک دیا، حدیث شریف میں ہے۔

فان اشتجروا فالسلطان ولی من لا ولی له

اگر تنازع ہو جائے تو جس عورت کا ولی نہ ہو بادشاہ اس کا ولی ہے الشجار۔ ہودہ کی لکڑی چھوٹی پالکی۔

مشجر کسے کہتے ہیں؟:

المشجر لکڑی کا اسٹینڈ جس پر کپڑے رکھے یا پھیلائے جاتے ہیں۔ شجرہ بالرمح اسے نیزہ مارا یعنی نیزہ مار کر اس میں چھوڑ دیا۔

ایک عجیب وغریب درخت:

سبع سنابل میں ہے: نمرود کے دروازے پر ایک درخت تھا جس کا سایہ بالکل نہ تھا۔ جب ایک شخص اس کے نیچے آتا اس کے لائق سایہ ہو جاتا، دوسرا آتا تو دو کے لائق ہو جاتا۔ غرض ایک لاکھ تک آدمی اس کے سایہ میں رہ سکتے اور جہاں ایک لاکھ سے ایک بھی زیادہ ہوا سب دھوپ میں۔ (سبع سنابل، سنبلہ ششم، درحقائق وحدت، ص ۱۵۰)

مبارک درخت:

قرآن مجید میں مبارک درخت سے مراد "زیتون" کا درخت ہے۔ طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد یہ سب سے پہلا درخت ہے جو زمین پر اُگا اور سب سے پہلے جہاں اُگا وہ کوہِ طور ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے ہم کلام ہوئے۔ زیتون کے درخت کی عمر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض عالموں نے فرمایا ہے کہ تین ہزار برس تک یہ درخت باقی رہتا ہے۔ (تفسیر صاوی، ج ۴، ص ۱۳۶۰، پ ۱۸، المومنون: ۲۰)

ظلم کا لغوی معنیٰ:

(ظ ل م)۔ الظلم (Cruelty, Tyranny)

اہل لغت اور اکثر علماء کے نزدیک ظلم کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی زیادتی کر کے یا اسے اس کی صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر۔

ظلم کی اقسام:

بعض حکماء نے کہا ہے کہ ظلم تین قسم پر ہے۔

(1) پہلی قسم:

وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے اس کی کسب سے بڑی قسم کفر و شرک اور نفاق ہے۔ چنانچہ فرمایا،

"اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 13)

بیشک شرک بڑا ظلم ہے۔

(2) دوسری قسم:

دوسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان ایک دوسرے پر کرتا ہے۔

چنانچہ آیت کریمہ:

"وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ"

اور برائی کا بدلہ اسی کی برابر برائی ہے، تو جس نے معاف کیا اور کام سنوارا تو اس کا اجر اللہ پر ہے بیشک وہ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔

میں ظالمین سے اسی قسم کے لوگ مراد ہیں۔

(3) تیسری قسم:

تیسری قسم کا ظلم وہ ہے جو ایک انسان خود اپنے نفس پر کرتا ہے۔

چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

"فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 32)

تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

حکایت:

حضرت سیّدنا عبدالمنعم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے والد سے اور وہ حضرت سیّدنا وہب علیہ رحمۃ اللہ الاحد سے روایت کرتے ہیں کہ کسی ملک میں ایک ظالم و مغرور بادشاہ رہا کرتا تھا۔ اس نے ایک عظیم الشان محل بنوایا اور اس کی تعمیر پر کافی مال خرچ کیا، جب تعمیر مکمل ہو چکی تو اس نے ارادہ کیا کہ میں سارے محل کا دورہ کروں اور دیکھوں کہ یہ میری خواہش کے مطابق بنا ہے یا نہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور محل کو دیکھنے چل پڑا۔ اندر سے دیکھنے کے بعد اس نے محل کے بیرونی حصوں کو دیکھنا شروع کیا اور محل کے اردگرد چکر لگانے لگا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا اور ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

یہ ہمارے محل کے ساتھ جھونپڑی کس نے بنائی ہے؟

سپاہیوں نے جواب دیا: چند روز سے یہاں ایک مسلمان بوڑھی عورت آئی ہے، اس نے یہ جھونپڑی بنائی ہے اور وہ اس میں اللہ عزوجل کی عبادت کرتی ہے۔

جب بادشاہ نے یہ سنا تو بڑے مغرورانہ انداز میں بولا: اس غریب بڑھیا کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ہمارے محل کے قریب جھونپڑی بنائے، اس جھونپڑی کو فوراً گرا دو۔ حکم پاتے ہی سپاہی جھونپڑی کی طرف بڑھے، بڑھیا اس وقت وہاں موجود نہ تھی۔ سپاہیوں نے آن کی آن میں اس غریب بڑھیا کی جھونپڑی کو ملیا میٹ کر دیا۔ بادشاہ جھونپڑی گروانے کے بعد اپنے دوستوں کے ہمراہ اپنے نئے محل میں چلا گیا۔

جب بڑھیا واپس آئی تو اپنی ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کو دیکھ کر بڑی غمگین ہوئی اور لوگوں سے پوچھا:

میری جھونپڑی کس نے گرائی ہے۔ لوگوں نے بتایا: ابھی کچھ دیر قبل بادشاہ آیا تھا، اسی نے تمہاری جھونپڑی گروائی ہے۔ یہ سن کر بڑھیا بہت غمگین ہوئی اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر اللہ عزوجل کی بارگاہ میں یوں عرض گزار ہوئی:

اے میرے پاک پروردگار عزوجل! جس وقت میری جھونپڑی توڑی جا رہی تھی، میں موجود نہ تھی لیکن میرے رحیم و کریم پروردگار عزوجل! تُو تو ہر چیز دیکھتا ہے، تیری قدرت تو ہر شئے کو محیط ہے، میرے مولیٰ عزوجل! تیرے ہوتے ہوئے تیری ایک عاجز بندی کی جھونپڑی توڑ دی گئی۔

اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اس بڑھیا کی آہ و زاری اور دعا مقبول ہوئی۔ اللہ عزوجل نے حضرت سیّدنا جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس پورے محل کو بادشاہ اور اس کے سپاہیوں سمیت تباہ و برباد کر دے۔ حکم پاتے ہی حضرت سیّدنا جبرائیل علیہ السلام زمین پر تشریف لائے اور سارے محل کو اس ظالم بادشاہ اور اس کے سپاہیوں سمیت زمین بوس کر دیا۔

نوٹ: لفظِ آدم، جنت، شئی اور لا کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 36]

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ (36)

”تو شیطان نے جنت سے انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا اور ہم نے فرمایا نیچے اترو، آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے“۔

متن:

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ

عَنْهَا أصدر زلتهما عن الشجرة وحملهما على الزلة بسببها، ونظير »عن« هذه في قوله

تعالى وَما فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِى. أو أزلهما عن الجنة بمعنى أذهبهما، ويعضده قراءة حمزة «فأزالهما» وهما متقاربان فى المعنى، غير أن أزل يقتضى عثرة مع الزوال، وإزلاله قوله: هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى وقوله: مَا نَهٰاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ ومقاسمته إياهما بقوله: اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِيْنَ. واختلف فى أنه تمثل لهما فقاولهما بذلك، أو ألقاه إليهما على طريق الوسوسة، وأنه كيف توصل إلى إزلالهما بعد ما قيل له: فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ.

فقيل: إنه منع من الدخول على جهة التكرمة كما كان يدخل مع الملائكة، ولم يمنع أن يدخل للوسوسة ابتلاء لآدم وحواء.

وقيل: قام عند الباب فناداهما. وقيل: تمثل بصورة دابة فدخلُ ولم تعرفه الخزنة.

وقيل: دخل فى فم الحية

حتى دخلت به. وقيل: أرسل بعض أتباعه فأزلهما، والعلم عند الله سبحانه وتعالى.

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ أى من الكرامة والنعيم.

وَقُلْنَا اهْبِطُوا خطاب لآدم عليه الصلاة والسلام وحواء لقوله سبحانه وتعالى: قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعاً. وجمع الضمير لأنهما أصلا الجنس فكأنهما الإنس كلهم. أو هما وإبليس أخرج منها ثانيا بعد ما كان يدخلها للوسوسة، أو دخلها مسارقة أو من السماء.

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ حال استغنى فيها عن الواو بالضمير، والمعنى متعادين يبغى بعضكم على بعض بتضليله.

وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ موضع استقرار، أو استقرارٍ.

وَمَتَاعٌ تمتع. اِلٰى حِيْنٍ يريد به وقت الموت أو القيامة

ترجمہ:

تو ابلیس (شیطان) نے برانگیختہ کیا اور اس درخت کے سبب ان دونوں سے لغزش کروادی۔ "عنہا" سے پہلے "عن" اپنے حقیقی معنیٰ میں استعمال نہیں ہو رہا بلکہ بمعنی سبب ہے۔ اور عربی میں یہ سبب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا رہا ہے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ،

وما فعلته عن امری

اور میں نے وہ کام اپنے حکم کے سبب سے نہیں کیا۔

یا یہاں "عن" اپنے حقیقی معنیٰ میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس صورت میں "ازلّھما عن الجنۃ اذھب" "ھما" کے معنی میں ہوگا۔ یعنی "عنہا" کی ضمیر کا مرجع جنت ہوگا، یعنی ان دونوں کو جنت سے نکال دیا اور اس کو "ہمزہ" کا "ازالھما" پڑھنا بھی اسکی تائید کرتا ہے، کیونکہ ازل اور ازال دونوں قریب المعنیٰ ہیں۔ البتہ ازل زوال کے ساتھ لغزش کا بھی تقاضا کرتا ہے اور شیطان کا ان دونوں کو پھسلانا اس طرح تھا کہ اس نے کہا،

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى

کیا میں تمہاری ہمیشہ رہنے والے درخت اور ایسے ملک کی طرف رہنمائی کروں جو بوسیدہ نہیں ہوگا اور اس کا یہ کہنا،

مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ

اس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ تم اس سے کھا کر فرشتے نہ بن جاؤ یا تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں سے نہ ہو جاؤ اور اس نے ان دونوں کے سامنے قسم اٹھا کر کہا۔

انّی لکما لمن الصالحین

بخدا میں تمہارے لئے نصیحت کرنے والوں میں سے ہوں اور اب اس میں اختلاف ہے کہ شیطان نے وسوسہ اندازی کا طریقہ کیا اختیار کیا تھا، امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔

1۔ وہ مثالی شکل میں ان کے سامنے آیا اور نصیحت بھرا کلام کرنے لگا اور قسم اٹھائی، وہ سمجھے اللہ کریم کے نام کی کوئی جھوٹی قسم نہیں اٹھاتا تو انہوں نے اسے کھالیا۔

2۔ وہ جنت میں داخل نہیں ہوا بلکہ باہر سے ہی وسوسہ اندازی کے طریقہ پر القاء کرتا رہا۔

3۔ کسی جنتی جانور کی شکل میں متشکل ہو کر فرشتوں کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنّت میں داخل ہو گیا۔

4۔ دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی اور وہ دونوں دروازے تک آ گئے، وہاں سے بات شروع ہوئی اور سلسلہ کلام مکمل ہوا۔

5۔ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہو گیا اور وہیں سے ان سے کلام کیا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سانپ کو قتل کیا کرو، خواہ وہ حرم میں ہو یا باہر، ہم نے اس کے ساتھ صلح نہیں کی جب سے اس کے ساتھ ہماری دشمنی شروع ہوئی ہے۔ یہ خبر متواتر نہیں۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس نے حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو پھسلانے تک کیسے رسائی حاصل کی جب کہ اس کو یہ کہہ کر نکال دیا گیا تھا۔

فاخرج منہا فانّک رجیم

کہ تو اس سے نکل جا کیونکہ تو دھتکارہ جا چکا ہے۔

تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس کو جنت میں عزت و احترام کے ساتھ داخل ہونے سے منع کیا گیا تھا نہ کہ چپکے فرشتوں کے ساتھ مل کر جنت میں داخل ہوا تھا اور وسوسہ اندازی کے لئے داخل ہونے سے منع نہیں کیا گیا تھا۔ تا کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو آزمایا جا سکے۔

نوٹ: مذکورہ بالا تمام چیزوں کے باوجود حقیقت کا علم اللہ کریم کے پاس ہے کہ اس نے کیسے وسوسہ ڈالا، کیونکہ اس پر کوئی نص قطعی نہیں ہے۔ البتہ ہمیں یہ یقین ہے کہ ان دونوں کو جنت سے نکالنے کا سبب وہی لعین تھا۔ جس پر نص قطعی دلالت کرتی ہے جو مندرجہ ذیل ہے،

فاخرجهما مما كانا فيه

یعنی جس جنت اور کرامت میں وہ لطف اندوز ہو رہے تھے اس سے اس نے ان دونوں کو نکال دیا۔

قلنا اهبطوا...

یہاں یہ خطاب حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام دونوں کو ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اللہ کریم نے ان دونوں کو تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ خطاب فرمایا ہے "قال اهبطا منها جميعا" کہ دونوں اس سے اکٹھے نکل جاؤ تو جمع کا صیغہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے واسطہ سے تمام ذریّت آدم کو جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ وہی پوری جنس کی اصل ہیں تو گویا وہی تمام کے تمام انسان ہیں، یا اس سے مراد حضرت آدم، حضرت حوا اور ابلیس تینوں ہیں اور ابلیس کے اس حکم میں داخل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ وسوسہ ڈالنے کے لئے جنت میں داخل ہوا تھا یا چپکے چپکے اندر داخل ہو گیا تھا تو اسے بھی دوبارہ نکلنے کا حکم دیا گیا اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان تینوں کو آسمان سے نیچے اترنے کا حکم دیا ہے۔

بعضكم لبعضٍ عدو...

یہ جملہ "اهبطوا" میں ضمیر مرفوع متصل سے حال ہے۔ حال اور ذوالحال کے درمیان رابطہ کبھی واؤ ہوتی ہے کبھی ضمیر اور کبھی دونوں ہوتے ہیں مگر یہاں صرف ضمیر رابطہ کافی ہے اور وہ "کم" ضمیر ہے، معنیٰ یہ ہوگا کہ اس حال میں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور ایک دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہو گے۔ آیت کریمہ میں مستقر کا لفظ یا تو ظرف مکان کے معنیٰ میں ہے یعنی موضع استقرار یا بمعنی استقرار مصدر میمی ہے۔ متاع کا معنیٰ لطف اندوز ہونا ہے، اور "حین" کی معنیٰ موت کا وقت یا قیامت ہے۔ تو معنیٰ یہ ہوگا کہ زمین میں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ یا ٹھہرنا اور اللہ کریم کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا موت کے وقت تک یا قیامت تک ہے، گویا اس دارِ فانی میں تمہارا قیام عارضی ہے۔

الزلة کی تحقیق:

(ز ل ل) الزلة (ض) (Earth Quake)

کے اصل معنیٰ بلا قصد کے قدم پھسل جانے کے ہیں کہا جاتا ہے:

زلت رجل تزل اور پھسلنے کی جگہ کو زلۃ کہا جاتا ہے نیز جو گناہ بلا قصد سرزد ہو جائے اسے بھی بطور تشبیہ زلۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

"فَاِنْ زَلَلْتُمْ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 209)

اگر تم لغزش کھا جاؤ۔

"فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 36)

انہیں شیطان نے پھسلا دیا۔

استزلہ استفعال کسی کو پھسلانے کا قصد دارادہ کرنا اور آیت کریمہ:

"اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 155)

شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ شیطان انہیں آہستہ آہستہ پھسلانے کی کوشش کرتا رہا حتیٰ کہ وہ پھسل گئے کیونکہ جب انسان صغائر میں بے پرواہی سے کام لیتا ہے تو وہ شیطان کے تسلط کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔

حدیث پاک:

حدیث میں ہے: من أُزِلَّتْ إليه نعمةٌ فليشكرها

کہ جسے بلا طلب نعمت مل جائے اسے منعم کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ جب بلا قصد نعمت حاصل ہونے پر شکر گزاری لازم ہے تو جو احسان کسی کے قصد اور ارادہ سے ہو اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

التزلزل کا معنیٰ:

التزلزل اس کے معنی اضطراب کے ہیں اور اس میں تکرار حروف تکرار معنی پر دال ہے قرآن میں ہے:

"اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا"(سورۃ الزلزلۃ آیت نمبر ۱)

جب زمین بڑے زور سے ہلائی جائے گی۔

"اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ " (سورۃ الحج آیت نمبر ۱)

بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی (سخت) مصیبت ہوگی۔

"وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا " (سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۱۱)

اور خوب سختی سے جھنجوڑے گئے۔

لفظ خرج کا مفہوم:

(خ ر ج) خرج۔ (ن)

خروجا کے معنی کسی کے اپنی قرارگاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قرارگاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا کپڑا ہو اور یا کوئی حالت نفسانی ہو جو اسباب خارجیہ کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو۔ قرآن میں ہے؛

"فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ" (سورۃ القصص آیت نمبر 21)

موسیٰؑ وہاں سے ڈرتے نکل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

لفظ ہبوط کی مفصّل تحقیق:

(ہ ب ط) الھبوط (ض) (To Alight, To Get Down)

کے معنی کسی چیز کے قہراً یعنی بے اختیاری کی حالت میں نیچے اتر آنا کے ہیں جیسا کہ پتھر بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے اور الھبوط (بفتح الہاء) صیغہ صفت ہے یعنی نیچے گرنے والی چیز ھبط فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے جیسے انا میں نیچے اتار دیا۔ قرآن میں ہے:

"وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 74)

اور بعض پتھر ایسے بھی (ہوتے ہیں) جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔

اور جب لفظ ھبوط انسان کے لئے بولا جاتا ہے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے بخلاف لفظ انزال، الا فعال کے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر باشرف چیزوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جیسے ملائکہ قرآن بارش وغیرہ اور جہاں کہیں کسی چیز کے حقیر ہونے پر تنبیہ مقصود ہے وہاں لفظ ھبوط استعمال کیا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 36)

اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن۔

"فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 13)

تو یہاں سے اُتر جا تجھے نہیں پہنچتا کہ یہاں رہ کر غرور کرے نکل۔

"اهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَا سَاَلْتُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا۔

یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے ان کا شرف ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس کے مابعد کی آیت:

"وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

اور ان پر مقرر کردی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے۔

نیز قرآن مجید میں ہے،

" قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 38)

ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ۔

محاورہ:

محاورہ ہے ھیط المرض لھم العلیل بیمارینے اس کے گوشت کو کم کر دیا یعنی لاغر کر دیا اور الھبط اونٹ وغیرہ کو کہتے ہیں جو غذا کے ناقص اور مالک کی بے اعتنائی کی وجہ سے لاغر ہو جائے۔

لفظِ بعض کا معنیٰ:

(ب ع ض) بعض الشئ (Certain,some,Many)

ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اس لئے کل کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جیسے:

بعضہ وکلہ اس کی جمع ابعاض آتی ہے قرآن میں ہے:

" بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 36)

آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن۔

عدوّ کی تعریف:

(ع د و) العدو (Enemy)

کے معنی حد سے بڑھنے اور باہم ہم آہنگی نہ ہونا ہیں اگر اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہو تو یہ عداوۃ اور معاداۃ کہلاتی ہے اور اگر رفتار سے ہو تو اسے عدو کہا جاتا ہے اور اگر عدل و انصاف میں خلل اندازی کی صورت میں ہو تو اسے عدوان اور عدو کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

" وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 108)

اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے۔

اور اگر اس کا تعلق کسی جگہ کے اجزاء کے ساتھ ہو تو اسے عدواء کہہ دیتے ہیں جیسے مکان ذو عدوء ناہموار مقام۔ چنانچہ معاداۃ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے رجل عدو و قوم عدو اور یہ واحد جمع دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

" بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ " (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 123)

اب سے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

استقر" کا معنی ومفہوم:۔

استقر فلان قرار پکڑنے کا قصد کرنا اور کبھی یہ بمعنی قرر (قرار پکڑنا) بھی آجاتا ہے جیسے استجاب بمعنی اجاب چنانچہ جنت کے متعلق فرمایا:

"خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا " (سورۃ الفرقان آیت نمبر 24)

ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا۔

اور جہنم کے متعلق فرمایا:

"سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا " (سورۃ الفرقان آیت نمبر 66)

اور دوزخ ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

"فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 98)

تمہاری لئے ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی۔

اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک مستقر سے مراد زمین میں ٹھہرنا ہے اور مستودع سے مراد قبر میں ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مستقر سے مراد تو زمین ہی ہے لیکن مستودع سے مراد دنیا ہے۔ الحاصل ہر وہ حالت جس سے انسان منتقل ہو جائے وہ مستقر تام نہیں ہو سکتا ہے۔

تحقیق لفظِ متاع:

(م ت ع) المتوع (Profit,Benefit)

ہر وہ چیز جس سے کسی قسم کا نفع حاصل کیا جائے اسے متاع ومتعۃ کہا جاتا ہے اس معنی کے لحاظ آیت کریمہ:

"وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ " (سورۃ یوسف آیت نمبر 65)

جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔

میں غلہ کو متاع کہا ہے اور بعض نے غلہ کے تھیلے یا بوریاں مراد لئے ہیں اور یہ دونوں متاع میں داخل اور باہم متلازم ہیں کیونکہ غلہ ہمیشہ تھیلوں ہی میں ڈالا جاتا ہے۔

حین کا مطلب:

(ح ی ن) الحین

اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو۔ یہ ظرف مبہم ہے اور اس کی تعین ہمیشہ مضاف الیہ سے ہوتی ہے

جیسے فرمایا:

"وَلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ" (سورۃ ص آیت نمبر 3)

اور وہ رہائی کا وقت نہ تھا۔

نوٹ: شیطان اور ارض کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 37]

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (37)

"پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی، بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان"۔

متن:

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ استقبلها بالاخذ والقبول والعمل بها حين علمها. وقرأ ابن كثير بنصب آدَمُ ورفع الكلمات على أنها استقبلته وبلغته وهي قوله تعالى: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الآية، وقيل: سبحانك اللهم وبحمدك، وتبارك اسمك، وتعالى جدك لآ إله إلآ أنت ظلمت نفسي فاغفر لي، إنه لا يغفر الذنوب إلا أنت. وعن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: يا رب ألم تخلقني بيدك، قال: بلى، قال: يا رب ألم تنفخ فى الروح من روحك، قال: بلى، قال: يا رب ألم تسبق رحمتك غضبك، قال: بلى، قال: ألم تسكني جنتك، قال: بلى، قال: يا رب إن تبت وأصلحت أراجعي أنت إلى الجنة قال: نعم. وأصل الكلمة:

الكلم، وهو التأثير المدرك بإحدى الحاستين السمع والبصر كالكلام والجراحة والحركة.

فَتَابَ عَلَيْهِ رجع عليه بالرحمة وقبول التوبة، وإنما رتبه بالفاء على تلقي الكلمات لتضمنه معنى التوبة: وهو الإعتراف بالذنب والندم عليه والعزم على أن لا يعود إليه. وأكتفى بذكر آدم لأن حواء كانت تبعًا له فى الحكم ولذلك طوى ذكر النساء فى أكثر القرآن والسنن.

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرجاع على عباده بالمغفرة أو الذى يكثر إعانتهم على التوبة، وأصل التوبة:

الرجوع، فإذا وصف بها العبد كان رجوعًا عن المعصية، وإذا وصف بها الباري تعالى أريد بها الرجوع عن العقوبة إلى المغفرة.

الرَّحِيمُ المبالغ في الرحمة، وفي الجمع بين الوصفين، وعد للتائب بالإحسان مع العفو.

ترجمہ:

فتلقیٰ میں فاء تعقیبیہ ہے اور تلقی کا معنیٰ ہے کہ عمل اور قبول کرنے کے لئے کسی چیز کو حاصل کرنا تو معنیٰ یہ ہوگا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ سے کلمات سیکھے تو ان کو عملی جامہ پہنایا اور انہیں قبول کرلیا۔ علامہ ابن کثیر نے لفظ آدم کو منصوب پڑھا ہے اور "کلمات" کو رفع دیا ہے تو معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ کلمات حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچے اور انہوں نے آپ علیہ السلام کا استقبال کیا۔ وہ کلمات کون سے تھے، اس کے متعلق امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مندرجہ ذیل تین اقوال ذکر کئے ہیں۔

1۔ کلمات سے مراد

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنكوننّ من الخسرين۔

2۔ بعض کے نزدیک یہ کلمات سکھائے گئے،

سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالىٰ جدّك ولا اله الّا انت ظلمت نفسى فاغفرلى انّه لا يغفر الذنوب الا انت۔

3۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے پروردگار کیا تو نے مجھے اپنی قدرت کے ہاتھ سے پیدا نہیں فرمایا تو اللہ کریم نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر عرض کی اے میرے رب کیا تو نے میرے اندر اپنی خاص روح نہیں پھونکی، اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں، عرض کیا اگر میں توبہ کرلوں اور اصلاح کرلوں تو کیا تو مجھے دوبارہ جنّت میں لوٹا دے گا، رب تعالیٰ نے فرمایا ہاں۔

"کلمات" اس کا مفرد کلمہ ہے اور اس کا معنیٰ وہ چیز جس کے ادراک کی تاثیر، کان، آنکھ یا حرکت سے ہو۔ جیسے گفتگو کرنا زخمی ہونا وغیرہ۔ جنت سے نکلنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کئی سال روتے رہے، معافی مانگتے رہے مگر اللہ کریم کی بارگاہ کوئی جواب نہیں آیا، یہاں تک کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عاجزی اور انکساری کی انتہا کر دی اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اس پر شرمندگی ظاہر کی اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کا پکا ارادہ کیا اور حضور نبی کریم ﷺ کا واسطہ دیا، تب اللہ کریم عزوجل نے توجہ فرمائی اور معاف کیا۔

"فتاب" مشتق من التوبہ ہے اور اس کا معنیٰ اعتراف گناہ کرنا، اس پر شرمندہ ہونا اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنا اور رجوع کرنا ہے تو جب اس کی نسبت بندہ کی طرف ہو تو معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ اس نے گناہوں سے رجوع کرلیا اور جب اس کی نسبت

اللہ کریم کی طرف ہو اور اس کا صلہ "علی" ہو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ کریم نے اپنی بخشش اور مغفرت کے ساتھ بندہ کی توبہ قبول فرمالی۔ اور اسے عذاب وسزا دینے سے رجوع فرمالیا، کیونکہ بے حد توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

"تواب" اور "رحیم" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں تو ان دونوں صیغوں کو اکٹھا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ توبہ کرنے والے کے ساتھ گناہوں کی معافی اور احسان کرنے کا وعدہ ہے۔

تحقیق تلقی:

وتلقی السماحۃ منہ والندیٰ خلقا سخاوت اور بخشش کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ لقیت بکذا۔ میں فلاں چیز کے ساتھ اس کے سامنے پہنچا۔ قرآن میں ہے:

"وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 75)

اور وہاں ان کا استقبال دعا وسلام کے ساتھ کیا جائے گا۔

"وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا" (سورۃ الانسان آیت نمبر 11)

اور تازگی اور شادمانی سے ہمکنار فرمائے گا۔

تلقاہ کے معنی کسی چیز کو پالینے یا اس کے سامنے آنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

"وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 103)

اور فرشتے ان کو لینے آئیں گے۔

"وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ" (سورۃ النمل آیت نمبر 6)

اور تم کو قرآن عطا کیا جاتا ہے۔

کلم کی تعریف:

(ک ل م) الکلم۔ (Word, Speech)

یہ اصل میں اس تاثیر کو کہتے ہیں جس کا ادراک ذو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکے چنانچہ کلام کا ادراک قوت سامعہ کیساتھ ہوتا ہے۔ اور کلم (زخم) کا ادراک قوت بصر کے ساتھ۔ محاورہ ہے۔ کلمتہ۔ میں نے اسے ایسا زخم لگایا۔ جس کا نشان ظاہر ہوا اور چونکہ یہ دونوں (یعنی کلام اور کلم) معنی تاثیر میں مشترک ہیں۔

توبہ کا معنی:

(ت و ب) التوب (ن) (Repentance)

کے معنی گناہ کے باحسن وجود ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے۔

ابن سینا کی توبہ:

اور امام یافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "مِرْآۃُ الجِنان" میں ایک روایت یہ تحریر فرمائی کہ ابنِ سینا آخر عمر میں تائب ہو گیا تھا۔ (مرآۃ الجنان، السنۃ ثمان وعشرین واربع مائۃ، ج ۳، ص ۳۸، ۴۰)

موت سے کچھ مدت پہلے افیون کھانا چھوڑ دیا، باندی غلام سب آزاد کر دیے، رات دن نماز و تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتا تھا۔ اگر ایسا ہے تو اُس کے اِس شعر نے کام دیا کہ۔

آنجا کہ عنایتے تو باشد باشد ناکردہ چو کردہ کردہ چوں ناکردہ

یعنی: جس گنہگار پر تیرا اکرم ہو گیا تو اس کے گناہ ایسے ہونگے جیسے کئے ہی نہیں اور جو نیکیاں نہیں کر سکا وہ بھی درج ہوں گی۔ رحمتِ بے سبب کو متوجہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اَسّی برس کے بت پرست کو ایک آن (یعنی لمحے) میں مسلمان بلکہ قطبِ شہر بلکہ اَبدال سے بھی اعلیٰ بُدَلاء سَبْعَہ سے کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے (یعنی اگر تائب ہو کر فوت ہوا) تو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مگر اُمت میں بڑا فتنہ چھوڑ گیا۔

"وَحَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل"

اللہ ہمیں کافی ہے اور کیا ہی اچھا کارساز ہے۔

توبہ کرنے والے سے اللہ عزوجل خوش ہوتا ہے:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی نے فرمایا:

اللہ عَزَّ وَجَلَّ کا بندہ جب توبہ لاتا ہے ربّ عَزَّ وَجَلَّ کے حضور تو وہ اس سے زیادہ خُوش ہوتا ہے جتنا وہ شخص جس کی اُونٹنی مَع زادِراہ کے (یعنی سامان سفر کے ساتھ) گم گئی اس کے مِل جانے پر خوش ہو۔

(ماخوذ از صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی الحض علی التوبۃ۔۔۔۔۔۔الخ، الحدیث ۲۷۴۴، ص ۱۴۶۸) (ملفوظات اعلی حضرت صفحہ نمبر 380)

اعتذار کی صورتیں:

(Excuse)

کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔

پہلی صورت:

یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لم افعلہ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔

دوسری صورت:

یہ ہے کہ اس کے لئے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشنے لگ جائے۔

تیسری صورت:

یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلائے۔ اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے۔

شرعاً توبہ:

جب کہیں گے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پر نادم ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔ تاب الی اللہ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن میں ہے؛۔

"وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا " (سورۃ النور آیت نمبر 31)

اور اللہ کی طرف توبہ کرو۔

توّاب کا معنیٰ:

التواب

یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صنعت ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے چھوڑتے بالکل گناہ کو ترک کر دے اور جب ثواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 54)

بیشک وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اور آیت کریمہ:

"وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا " (سورۃ الفرقان آیت نمبر 71)

اور جو توبہ کرے اور اچھا کام کرے تو وہ اللہ کی طرف رجوع لایا جیسی چاہیے تھی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ترک کر کے عمل صالح کا نام ہی مکمل توبہ ہے۔

"عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ " (سورۃ الرعد آیت نمبر 30)

میں اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

نوٹ: لفظِ ربّ اور رحم کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 38]

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (38)

"ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم"۔

متن:

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا كرر للتأكيد، أو لاختلاف المقصود فإن الاول دل على أن هبوطهم إلى دار بلية يتعادون فيها ولا يخلدون، والثانى أشعر بأنهم أهبطوا للتكليف، فمن اهتدى الهدى نجا ومن ضله هلك. والتنبيه على أن مخافة الإهباط المقترن بأحد هذين الامرين وحدها كافية للحازم أن تعوقه عن مخالفة حكم الله سبحانه وتعالى، فكيف بالمقترن بهما. ولكنه نسي وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْماً. وأن كل واحد منهما كفى به نكالاً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ. وقيل الاول من الجنة إلى السماء الدنيا. والثانى منها إلى الارض وهو كما ترى. وجَمِيعًا حال فى اللفظ تأكيد فى المعنى كأنه قيل: اهبطوا أنتم أجمعون، ولذلك لا يستدعى اجتماعهم على الهبوط فى زمان واحد كقولك: جاءوا جميعًا **فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** الشرط الثانى مع جوابه جواب الشرط الاول، وما مزيدة أكدت به إن ولذلك حسن تأكيد الفعل بالنون وإن لم يكن فيه معنى الطلب، والمعنى: إن يأتينكم منى هدى بإنزال أو إرسال، فمن تبعه منكم نجا وفاز، وإنما جىء بحرف الشك، وإتيان الهدى كائن لا محالة لأنه محتمل فى نفسه غير واجب عقلاً. وكرر لفظ الهدى ولم يضمر لأنه أراد بالثانى أعم من الاول، وهو ما أتى به الرسل واقتضاه العقل، أى: فمن تبع ما أتاه مراعياً فيه ما يشهد به العقل فلا خوف عليهم فضلاً عن أن يحل بهم مكروه، ولا هم يفوت عنهم محبوب فيحزنوا عليه، فالخوف على المتوقع والحزن على الواقع نفى عنهم العقاب وأثبت لهم الثواب على آكد وجه وأبلغه. وقرء »هدى« على لغة هذيل و »لا خوف« بالفتح.

ترجمہ:

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے "کررہ بالتاکید" ذکر فرمایا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حوا علیہ السلام اور شیطان وغیرہ کو جنت سے نکالنے کا حکم ایک مرتبہ پہلے مذکور ہو چکا ہے تو اسے دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟

اس کے جواب میں امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی چند وجوہات بیان کی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ماقبل آیت میں جنت سے نکلنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس میں تاکید پیدا کرنے کے لئے اسے دوبارہ ذکر فرما دیا۔ یا ان دونوں کے مقصود میں اختلاف ہے اس طرح کہ اس سے ماقبل آیت میں جنت سے نکلنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ دنیا تمہارے لئے آزمائش کا گھر ہوگی اور تمہاری اولاد کے درمیان دشمنی کے آثار پیدا ہوں گے اور دنیا تمھارے لئے ہمیشگی کا گھر نہیں ہے۔ اور زیر بحث آیت میں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ انہیں احکام کا مکلف بنانے کے لئے اتاری جا رہا ہے اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس تمہاری ہدایت کے لئے کتابیں نازل کی جائیں گی اور رسول بھیجے جائیں گے جس نے اس ہدایت کو قبول کر لیا وہ کامیاب ہوگا اور ابدی نعمتوں کا حق دار ہوگا اور جس نے اس ہدایت کو قبول نہ کیا اور گمرہی کا راستہ اختیار کیا وہ ہلاک اور برباد ہو جائے گا اور عذابِ نار کا حق دار ہوگا۔

تیسری وجہ جو امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو ذکر فرمائی وہ یہ ہے کہ ہبوط کا دوبارہ حکم اس لئے ذکر فرمایا کہ انہیں اس بات پر مطلع کیا جائے کہ جنت سے نکالنے کا خوف جو ان دونوں باتوں سے مقترن ہے کہ وہ آپس میں دشمن رہیں گے اور زمین میں ہمیشہ نہیں رہیں گے اور دوسرا انہیں احکام کا مکلف بنایا جائے گا جو انہیں جزاء یا سزا تک پہنچائیں گے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک کو بھی ذکر کیا جاتا تو اللہ کریم کے حکم کی مخالفت کرنے سے محتاط آدمی کو روکنے کے لئے کافی تھا، لیکن یہاں دونوں امروں کے ساتھ ہبوط کو مقترن کر کے ذکر کیا گیا ہے تو پھر حضرت آدم علیہ السلام اس سے بچنے میں محتاط کیوں نہ ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے دانستہ حکم عدولی نہ ہوئی ہو بلکہ وہ بھول گئے تھے۔ اور اس حکم عدولی میں ان کے عزم کا دخل نہیں تھا اور اس بات پر بھی تنبیہ کرنا مقصود تھا کہ ان دونوں مذکورہ باتوں میں سے ہر ایک عبرت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے تو حضرت آدم علیہ السلام نے کیوں نصیحت حاصل نہ کی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ پہلی دفعہ جو حکم دیا گیا ہے وہ جنت سے آسمان دنیا کی طرف نکلنے کا حکم تھا اور دوسرے حکم میں آسمان سے زمین کی طرف نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک قول ضعیف ہے کیونکہ پہلے ہبوط کے ساتھ "استقرار فی الارض" کا ذکر ہے اور دوسرے ہبوط میں منھا کی ھا ضمیر ہے جس کا مرجع جنت ہے اس لئے یہ قول ضعیف ہے۔

"جمیعاً" یہ لفظاً حال ہے اور معنیً تاکید ہے گویا اللہ کریم نے یوں ارشاد فرمایا

اھبطوا انتم اجمعون

کہ تم سارے کے سارے نکل جاؤ لیکن یہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ وہ سارے کے سارے ایک ہی زمانے میں اکٹھے جنت سے نکل جائیں بلکہ ان کے خروج کے اوقات مختلف تھے جس طرح پر یہ قول "جاؤا جمیعاً" کہ وہ سارے آئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اکٹھے آئے۔

اس جملہ میں دو فعل شرط ہیں تو ان کا جواب کیا ہوگا۔ دوسری شرط،

فمن تبع ھدای

یہ اپنے جواب شرط کے ساتھ مل کر پہلی شرط،

فاما یاتینکم منی ھدیً

کا جوابِ شرط ہے اور "اما" اصل میں "ان ما" تھا۔ ان حرفِ شرط اور ما زائدہ ہے جو ان کے معنی میں تاکید پیدا کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے اس لئے اس کے فعل کی نون تاکید کے ساتھ تاکید لانا جائز ہے۔ حالانکہ فعل کے تاکید نون کے ساتھ اس وقت لگائی جاتی ہے جب کہ اس میں طلب کے معنی پائے جائیں کیونکہ یہ تاکید کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے اس کو قسم کے قائم مقام رکھتے ہوئے اس کے آخر میں نون تاکید لگا دیا ہے، تو معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر میری طرف سے رسول بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے ہدایت آجائے تو تم میں سے جو اس کی اتباع کرے گا وہ نجات پائے گا اور کامیاب ہوگا اس مقام پر "ان" حرف شرط ذکر کیا گیا ہے جو متکلم کے شک کو ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ کریم کی طرف سے ہدایت کا آنا ابدی امر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ عقلی طور پر بذات خود ہدایت کے آنے میں احتمال ہے کیونکہ وہ اللہ کریم پر واجب نہیں۔ اور لفظِ ہدایت کو دوبارہ ذکر فرمایا اس کی طرف ضمیر نہیں لوٹائی۔ حالانکہ یہاں کلام کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں ضمیر لوٹائی جاتی اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مقام پر جس ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے وہ پہلی ہدایت سے عام ہے۔ خواہ وہ کتابیں نازل فرما کر اور رسول بھیج کر عطا کی جائے یا عقل سلیم عطا کر دی جائے اور پہلی ہدایت سے مراد شرعی ہدایت یعنی کتاب و رسول بھیجنا اور دوسری سے شرعی اور عقلی دونوں مراد ہیں تو معنیٰ یہ ہوگا کہ جس نے اس کی اتباع کی جو ہدایت اللہ کریم نے اسے عطا فرمائی ہے اس میں اس بات کی رعائیت کی جس کی عقل شہادت دیتی ہے تو انہیں نہ تو آخرت میں نیکیوں کے ضائع ہونے کا خوف ہوگا اور نہ ہی ان کی کوئی محبوب چیز ان سے فوت ہوگی جس پر وہ خوزدہ ہوں گے کیونکہ خوف کا لفظ ایسے نقصان کے لئے استعمال ہوتا ہے جو مستقبل میں انسان کو پہنچنے والا ہو اور حزن و پریشانی اس نقصان پر ہوتی ہے جو اس سے پہلے ہو چکا ہو تو گویا اللہ کریم نے ہدایت قبول کرنے والوں سے آخرت کے عذاب کی نفی فرما دی اور مؤکد اور بلیغ طریقہ پر ان کے سابقہ نیک اعمال پر ثواب عطا کرنے کی خوشخبری سنا دی۔

لغت بنی ہذیل پر ھدیٰ کو ھدی کر کے پڑھا گیا ہے یعنی ھدیٰ کی یا کو مشدد پڑھا گیا ہے۔ اور لا خوف کے فاء کو مفتوح

پڑھا گیا ہے۔

جمع کا معنی:

(ج م ع) الجمع (ف) (To Add)
کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ملا دینا۔ محاورہ ہے: جَمَعْتُهُ فَاجْتَمَعَ چنانچہ وہ اکٹھا ہو گیا۔
قرآن میں ہے۔

"وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ" (سورۃ القیامۃ آیت نمبر 9)
اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔ (مال) جمع کیا اور بند رکھا۔

"جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ" (سورۃ الھمزۃ آیت نمبر 2)
مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔

تحقیق لفظِ تبع:

(ت ب ع) تبعہ واتبعہ (Follow)
کے معنی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں یہ کبھی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہوتا ہے جیسے فرمایا؛

"فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 38)
تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کوئی اندیشہ نہ کچھ غم۔

"قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ اتَّبِعُوا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا" (سورۃ یٰس آیت نمبر 20۔21)
کہنے لگا کہ اے میری قوم پیغمبروں کے پیچھے چلو ایسے کے جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔

"فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 123)
تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔

"اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 3)
اے لوگو اس پر چلو جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا۔

"قَالُوْا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُوْنَ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 111)
بولے کیا ہم تم پر ایمان لے آئیں اور تمہارے ساتھ کمینے ہوئے ہیں۔

"وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي" (سورۃ یوسف آیت نمبر 38)
اور اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلتا ہوں۔

"ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ"

(سورۃ الجاثیۃ آیت نمبر 18)

پھر ہم نے اس کام کے عمدہ راستہ پر تمہیں کیا تو اسی راہ چلو اور نادانوں کی خواہشوں کا ساتھ نہ دو۔

"وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 102)

اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے۔

خوف کی تعریف اور اس کا استعمال:

(خ و ف) الخوف (س)

کے معنی ہیں قرآن وشواہد سے کسی آنے والے کا خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ کا لفظ قرائن وشواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیوی اور آخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے: قرآن میں ہے:

"وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 57)

اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

حزن کی تعریف:

(ح ز ن) الحزن والحزن (Worry,Uncomfortableness)

کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔ نیز غم کی وجہ سے جو بیقراری سے طبیعت کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اسے بھی حزن یا حزن کہا جاتا ہے اس کی ضد فوح ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنی معتبر ہوتے ہیں اس لئے گم زدہ ہونے کے لئے خشنت بصررہ بھی کہا جاتا ہے حزن (س) غمزدہ ہونا غمگین کرنا۔ قرآن میں ہے:

"لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 153)

اور معافی اس لئے سنائی کہ جو ہاتھ سے گیا۔

نوٹ: اتی اور ہدایت کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 39]

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (39)

"اور وہ جو کفر کریں اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا"۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ عطف على فَمَنْ تَبِعَ إلى آخره قسيم له كأنه قال: ومن لم يتبع بل كفروا بالله، و كذبوا بآياته، أو كفروا

بالآيات جناناً. و كذبوا بها لساناً فيكون الفعلان متوجهين إلى الجار والمجرور. والآية فى الاصل العلامة الظاهرة. ويقال للمصنوعات من حيث إنها تدل على وجود الصانع وعلمه وقدرته. ولكل طائفة من كلمات القرآن المتميزة عن غيرها بفصل، واشتقاقها من آى لأنها تبين آياً من أى أو من أوى إليه. وأصلها أية أو أوية كتمرة. فأبدلت عينها ألفاً على غير قياس. أو أيية. أو أوية كرمكة فأعلت. أو آئية كقائلة فحذفت الهمزة تخفيفا. والمراد بِآيَاتِنا الآيات المنزلة. أو ما يعمها والمعقولة.

ترجمہ:

اس مذکورہ بالا آیت کا عطف "فمن تبع۔۔۔الخ" پر ہے اور یہ اس ماقبل آیت کا قسیم ہے یعنی اس کی ضد ہے گویا اللہ کریم نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ جس نے اس ہدایت کی اتباع نہ کی بلکہ اس نے اللہ کریم کے ساتھ کفر کیا اور اس کی آیات کو جھٹلایا تو وہی دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے یا اس نے دل کے ساتھ آیات کا انکار کیا، اور زبان کے ساتھ اس کی تکذیب کی اس آیت میں دو فعل ہیں اور دونوں "بایتنا" میں عمل کا تقاضا کرتے ہیں اور اس میں بصریوں اور کوفیوں کا اختلاف ہے کہ پہلے فعل کو عمل دیا جائے یا دوسرے کو۔ بصریوں کے نزدیک دوسرے فعل کو عمل دینا مختار ہے اس لئے وہ پہلے فعل کا معمول محذوف تصور کرتے ہیں لہٰذا تقدیر عبارت یوں ہوگی،

والذین کفروا باللہ و کذبوا بایتنا

اور کوفیوں کے نزدیک پہلے فعل کو عمل دینا مختار ہے اور وہ دوسرے فعل کا معمول محذوف تصور کرتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہوگی۔

کفروا بالآیات جنانًا و کذبوا بھا لسانًا

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے

فیکون فعلان متوجھین الی الجار والمجرور

کہہ کر اسی اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "آیات "جمع ہے اس کی مفرد آیۃ ہے جس کا معنیٰ ظاہری نشانی ہے۔ اور مصنوعات کو بھی آیات کہا جاتا ہے کیونکہ وہی صانع کے وجود، اس کے علم اور اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہے۔

قرآن پاک کے الفاظ کا وہ حصہ جس کو دوسرے حصہ سے وقف کے ساتھ الگ کر دیا جائے اس کو بھی آیت کہتے ہیں۔ اور یہ "ای " بمعنی جدا ہونا سے مشتق ہے یا "اؤی الیہ" سے مشتق ہے جس کا معنیٰ پناہ لینا ہے اور آیۃ اصل میں اییۃ یا اویۃ تھا، عین کلمہ کو خلاف قیاس الف سے بدل دیا۔ اور یا یہ آئیۃ، فاعلۃ کے وزن پر ہے، تخفیفاً ہمزہ مکسورہ کو حذف کر دیا گیا اور یہاں آیات سے مراد وہ تمام آیات ہیں جو نازل کی گئیں اور یا آیات منزلہ اور آیات منقولہ تمام مراد ہیں۔

متن:

وقد تمسكت الحشوية بهذه القصة على عدم عصمة الانبياء عليهم الصلاة والسلام من وجوه:

الاول: أن آدم صلوات الله عليه كان نبيًا، وارتكب المنهي عنه والمرتكب له عاص.

والثاني: أنه جعل بارتكابه من الظالمين والظالم ملعون لقوله تعالى: أَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظّٰالِمِينَ.

والثالث: أنه تعالى أسند إليه العصيان، فقال وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰى.

والرابع: أنه تعالى لقنه التوبة، وهي الرجوع عن الذنب والندم عليه.

والخامس: اعترافه بأنه خاسر لولا مغفرة الله تعالى إياه بقوله: وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ والخاسر من يكون ذا كبيرة.

والسادس: أنه لو لم يذنب لم يجر عليه ما جرى.

والجواب من وجوه.

الاول: أنه لم يكن نبياً حينئذ، والمدعي مطالب بالبيان.

والثاني: أن النهي للتنزيه، وإنما سمي ظالماً وخاسراً لأنه ظلم نفسه وخسر حظه بترك الاولى له. وأما إسناد الغي والعصيان إليه، فسيأتي الجواب عنه في موضعه إن شاء الله تعالى. وإنما أمر بالتوبة تلافياً لما فات عنه، وجرى عليه ما جرى معاتبة له على ترك الاولى، ووفاء بما قاله للملائكة قبل خلقه.

والثالث: أنه فعله ناسياً لقوله سبحانه وتعالى: فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْماً ولكنه عوتب بترك التحفظ عن أسباب النسيان، ولعله وإن حط عن الامة لم يحط عن الانبياء لعظم قدرهم كما

قال عليه الصلاة والسلام أشد الناس بلاء الانبياء، ثم الاولياء، ثم الامثل فالامثل

أو أدى فعله إلى ما جرى عليه على طريق السببية المقدرة دون المؤاخذة على تناوله. كتناول السم على الجاهل بشأنه.

لا يقال إنه باطل لقوله تعالى: مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا، وقاسمهما الآيتين، لأنه ليس فيهما

ما يدل على أن تناوله حين ما قال له إبليس، فلعل مقاله أورث فيه ميلاً طبيعياً، ثم إنه كف نفسه عنه مراعاة لحكم الله تعالى إلى أن نسي ذلك، وزال المانع فحمله الطبع عليه.

والرابع: أنه عليه السلام أقدم عليه بسبب اجتهاد أخطأ فيه، فإنه ظن أن النهي للتنزيه، أو الإشارة إلى عين تلك الشجرة فتناول من غيرها من نوعها وكان المراد بها الإشارة إلى النوع، كما

روى أنه عليه الصلاة والسلام أخذ حريراً وذهباً بيده وقال هذان حرام على ذكور أمتي حل لإناثها

وإنما جرى عليه ما جرى تعظيماً لشأن الخطيئة ليجتنبها أولاده.

وفيها دلالة على أن الجنة مخلوقة وأنها في جهة عالية، وأن التوبة مقبولة، وأن متبع الهدى مأمون العاقبة، وأن عذاب النار دائم، وأن الكافر فيه مخلد، وأن غيره لا يخلد فيه بمفهوم قوله تعالى: هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ.

ترجمہ:

فرقہ حشویہ نے اس قصہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام اور ان کے خروج من الجنۃ سے عدمِ عصمتِ انبیاء پر مختلف طریقوں سے استدلال کیا ہے۔ یاد رہے کہ فرقہ حشویہ کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام کا عمداً ارتکاب کبیرہ کو جائز سمجھتا ہے۔

ان کا پہلا استدلال یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور انہوں نے منہی عنہ کا ارتکاب کیا تھا اور منہی عنہ کا مرتکب عاصی ہے۔

دوسرا استدلال یہ ہے کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو ارتکابِ کبیرہ کی وجہ سے ظالمین میں سے شمار کیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک) اور ظالم پر لعنت آئی ہے، اللہ کریم کا ارشاد،

"أَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ" (سورۃ اعراف آیت نمبر 144)

کہ اللہ کی لعنت ظالموں پر۔

اور ظاہر ہے کہ لعنت صاحب کبیرہ پر ہی ہو سکتی ہے کیونکہ صاحب صغیرہ کا تو کفارہ سیات ہو جاتا ہے۔

تیسرا استدلال یہ ہے کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی جانب عصیان اور غیّ کی نسبت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے،

"وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 121)

اور آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی۔

چوتھا استدلال یہ ہے کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کی تلقین کی اور توبہ نام ہے گناہ سے رجوع ہونے اور اس پر نادم ہونے کا، اور توبہ کبیرہ سے ہی ہوا کرتی ہے۔

پانچواں استدلال یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ کہ کر،

"وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ" (سورۃ اعراف آیت نمبر 23)

تو اگر تُو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور نقصان والوں میں ہوئے۔

یعنی اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہ خسارے میں ہیں سوائے اس کے کہ اللہ کریم نے ان کی مغفرت فرما دے اور خاسر وہی ہو سکتا ہے جو مرتکب کبیرہ ہو۔

چھٹا استدلال یہ ہے کہ اگر حضرت آدم علیہ اسلام نے گناہ نہ کیا ہوتا تو ان کو وہ سب کچھ پیش ہی نہ آتا جو پیش آیا کیونکہ صغیرہ پر تو مؤاخذہ ہوتا ہی نہیں، اور اگر ہوتا بھی ہے تو اتنا سخت وشدید نہیں ہوتا۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان اعتراضات کے مختلف جوابات ارشاد فرمائے ہیں، پہلا جواب یہ ہے جس کو خلاصہ میں ہم نے پہلے رکھا ہے یعنی پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جس وقت ذنب کا صدور ہوا تھا اس وقت تک ان کو نبوّت نہیں ملی تھی، پس نبی سے صدورِ ذنب ثابت نہیں ہوتا، اور جو اس کے دعوے دار ہیں کہ نبوّت کے بعد صدور ہوا تھا اس سے ہمارا مطالبہ دلیل کا ہے وہ اپنی دلیل پیش کرے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نہی عن الشجرۃ تنزیہی طور پر تھی اور ان کو ظالم اور خاسر اس لئے کہا گیا کہ انہوں نے ترکِ اولیٰ اور ترکِ افضل کی وجہ سے اپنا حصہ گھٹا دیا اور اپنا نقصان کیا اور ہر ظالم ملعون نہیں۔

ظلم کی دو قسمیں ہیں:

ظلمِ قلیل اور ظلمِ کثیر۔

اسی طرح لعن کے معنی ہیں اللہ کریم کی رحمت سے دور ہونا اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ رحمتِ کاملہ سے دور ہونا یا مطلق رحمت سے دور ہونا۔ ملعون وہ ہے جو اللہ کریم کی مطلق رحمت سے دور ہو اور یہ صورت ظلمِ کبیر اور ظلمِ عظیم کی صورت میں ہوتی ہے نہ کی معمولی ظلم کی صورت میں اور غیّ اور عصیان کی نسبت جو حضرت آدم علیہ السلام کی جانب کی گئی ہے تو اس کا جواب ان شاء اللہ وہاں دیا جائے گا جہاں یہ آیات وارد ہوئیں۔ (یعنی سورۃ طٰہٰ میں۔)

اور توبہ کا حکم تو معمولی لغزش کی تلافی کے لئے بھی دیا جا سکتا ہے یعنی ترکِ اولیٰ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کا جو نقص حظ ہو گیا تھا اور درجہ میں معمولی سا نزول ہو گیا تھا اس کی تلافی اور مقامِ رفیع کی بازیابی کے لئے توبہ کا حکم دیا گیا تھا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ تناولِ شجرہ بھول کر اور نسیاناً ہوا تھا کیونکہ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا ہے،

"وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 115)

اور بیشک ہم نے آدم کو اس سے پہلے ایک تاکیدی حکم دیا تھا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس کا قصد نہ پایا۔

اب رہی یہ بات کہ اس پر ناراضگی کیوں ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ناراضگی ترکِ تحفظ پر ہوئی ہے نہ کہ نسیان پر، یعنی ناراضگی اس پر نہیں ہوئی کہ نسیان کیوں ہوا آدم بھول گئے؟ بلکہ اس پر ہوئی کہ نسیان کے اسباب کیوں پیدا کئے، ان اسباب کے سلسلے میں متیقظ کیوں نہ رہے۔

یہاں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نسیان اور خطا پر تو کوئی مؤاخذہ نہ ہونے کی نصِ صریح موجود ہے۔ پس اسباب نسیان پر مؤاخذہ نہ ہونے کی نصِ صریح موجود ہے پس اسباب نسیان پر مؤاخذہ کرنا درحقیقت نسیان پر مواخذہ کرنا ہے۔ اس شبہ کا جواب امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "لعله" سے دیا ہے یعنی شاید ایسا ہے کہ نسیان وخطا کا مؤاخذہ امت کے حق میں تو مرفوع ہے یعنی امت سے اٹھالیا گیا ہے، امت کو بھول چوک پر نہیں پکڑا جائے گا لیکن انبیاء کرام عظیم القدر ہیں ان کی شان بلند و بالا ہے، وہ ان چیزوں کے بارے میں بھی مسؤل ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے،

أشد الناس بلاء الانبياء، ثم الاولياء، ثم الامثل فالامثل

سب سے زیادہ شدید مصائب انبیاء کرام علیہم السلام پر آئے پھر اولیاء اللہ پر پھر جو جتنا اللہ کریم کا فرمانبردار ہے اسی کے مطابق مصائب کا اس پر نزول ہوتا ہے۔

او ادى فعله الى ما جرٰى عليه

یہ ہبوط آدم علیہ السلام کے استدلال کا ایک اور جواب ہے، حاصل یہ ہے کہ ہبوط آدم علیہ السلام سزا اور عتاب کے طور پر نہیں تھا بلکہ سبب عادی اور مسبب عادی کے طور پر تھا یعنی جس طرح بھولے سے آگ میں ہاتھ ڈالنے پر ہاتھ جل جاتا ہے یا نادانی اور لاعلمی میں زہر کھانے والے ہلاکت واقع ہو جاتی ہے اور یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہاتھ ڈالنے والے پر اللہ کریم کا عقاب ہوا یا زہر کھانے والے کو اللہ کریم نے سزا دی بلکہ یہی کہا جاتا ہے عادتاً ہاتھ کا آگ میں ڈال دینا جل جانے کا سبب ہے جب سبب عادی کو اختیار کیا جائے گا تو اس پر مسبب کا ترتب ہو جائے گا۔ اسی طرح اکل شجرہ سبب تھا اور ہبوط اس کا مسبب تھا گویا اللہ کریم نے اس شجرہ کی طبیعت و فطرت میں یہ سببیت پوشیدہ فرمادی تھی کہ اس کو جو کھائے گا وہ خود بخود نیچے اتر جائے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے نسیان ہوا تھا، امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اس جواب پر حشویہ فرقہ کی کی طرف سے اعتراض کیا جارہا ہے کہ نسیان کا قول باطل ہے حضرت آدم علیہ السلام کا یہ عمل نسیاناً نہیں تھا، عمداً تھا کیونکہ اللہ کریم کا ارشاد ہے،

مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ

(سورۃ اعراف آیت نمبر 19)

اور بولا تمہیں تمہارے رب نے اس پیڑ سے اسی لئے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ جینے والے۔

اس آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو نہی کی یاد دہانی کرادی گئی تھی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (سورۃ اعراف آیت نمبر 21)

اوران سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

یہ قسم کھانا بتارہا ہے کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام اکل شجرہ سے انکار کررہے تھے اور مخالفت کو یاد کرتے ہوئے ابلیس کو غیر معتبر سمجھ رہے تھے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شبہ یہاں وارد نہیں ہوسکتا کیونکہ پیش کردہ دونوں آیتوں میں اس کی صریح دلالت نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تناول شجرہ اسی وقت ہوا تھا جس وقت ابلیس نے ان سے یہ سب کچھ کہا تھا اس لئے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابلیس کے اس قول نے حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں ایک طبعی میلان پیدا کردیا تھا پھر انہوں نے اللہ کریم کے حکم کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے خود کو روک لیا یہاں تک کہ اللہ کریم کے حکم کو بھول گئے اور جو رکاوٹ تھی یعنی ذکر نہی وہ دور ہوگئی اور پھر طبیعت نے اسی پر آمادہ کردیا۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اکل من الشجرہ کا اقدام ایک اجتہادی وجہ سے کیا تھا جس میں ان سے خطا ہوگئی واضح رہے کہ یہ جواب ان حضرات کے نزدیک درست ہوسکتا ہے جن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہ السلام سے اجتہادی خطا ہوسکتی ہے لیکن وہ اس پر برقرار نہیں رہتے بلکہ اللہ کریم کی طرف سے فوراً ان کو متنبہ کردیا جاتا ہے۔ اجتہادی خطا کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت آدم علیہ السلام یہی سمجھے کہ نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں۔ یا ارشاد اس معین ومشخص درخت کی جانب مقصود ہے یہ سمجھ کر اسی نوع کے دوسرے درخت سے کھالیا، حالانکہ مقصود نہی اسی نوع کی جانب اشارہ کرنا تھا اور اس نوع کو ممنوع قرار دینا تھا جیسا کہ روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل نے ایک ٹکڑا ریشم اور ایک ٹکڑا سونے کا اپنے دست مبارک میں لیا اور فرمایا کہ یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں اور امت کی عورتوں کے لئے حلال ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں مقصود اس خاص شکل کے ٹکڑے کو حلال یا حرام کرنا نہیں ہے بلکہ اس نوع کی تحریم مقصود ہے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے اجتہادی خطا کے نتیجہ میں یہ ہوا تھا تو پھر یہ تمام سلوک یعنی اخراج من الجنۃ ان کے ساتھ کیوں کیا گیا؟ مجتہد مخطی تو معذور سمجھا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خطا کی خوفنا کی کو ظاہر کرنے کے لئے ایسا کیا گیا تا کہ اولاد آدم کو تنبیہ ہوجائے، اور وہ اس سے اجتناب کرے۔

وفيها دلالة على أن الجنة مخلوقة....الخ

یعنی آیات مذکورہ جن کا سلسلہ "وقلنا یا آدم اسکن" سے شروع ہوکر "خالدون" تک ہے ان میں اس مسئلہ پر دلالت ہوتی ہے کہ جنت پیدا کی جاچکی ہے اور یہ کہ جنت اوپر کی سمت میں واقع ہے اور یہ کہ توبہ قبول کی جاتی ہے اور یہ کہ ہدایت کی پیروی کرنے والا مامون العاقبت ہے، اور یہ کہ عذاب نار دائمی ہوگا اور یہ کہ کافر اس میں ہمیشہ رہے گا، کیونکہ خلود دوام کا نام ہے، پس اگر سلسلہ عذاب منقطع ہوگیا تو خلود دھمکی نہیں بن سکتا اور آیات میں اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے غیر کافر دوزخ میں

ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہے گا اس لئے کہ قولِ باری تعالیٰ:

"ھم فیھا خالدون"

میں صاحبِ کشاف علامہ زمخشری کے قول کے مطابق قصر ہے اور قصر کا مفہوم موافق یہ ہے کہ "خلود فی النار" کفار کے ساتھ مخصوص ہے اب اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ غیرِ کافر خلود کے ساتھ متصف نہیں ہے۔

متن:

واعلم أنه سبحانه وتعالى لما ذكر دلائل التوحيد والنبوة والمعاد، وعقبها تعداد النعم العامة تقريراً لها وتأكيداً، فإنها من حيث إنها حوادث محكمة تدل على محدث حكيم له الخلق والامر وحده لا شريك له، ومن حيث إن الإخبار بها على ما هو مثبت فى الكتب السابقة ممن لم يتعلمها، ولم يمارس شيئاً منها إخبار بالغيب معجز يدل على نبوة المخبر عنها، ومن حيث اشتمالها على خلق الإنسان وأصوله وما هو أعظم من ذلك، تدل على أنه قادر على الإعادة كما كان قادراً على الإبداء، خاطب أهل العلم والكتاب منهم، وأمرهم أن يذكروا نعم الله تعالى عليهم، ويوفوا بعهده فى اتباع الحق واقتفاء الحجج ليكونوا أول من آمن بمحمد صلّى الله عليه وسلّم وما أنزل عليه فقال.

ترجمہ:

اور واضح ہونا چاہئے کہ آئندہ آیات یعنی،

"یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم"

کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ اللہ کریم نے ماقبل میں دلائل توحید، دلائل نبوّت اور دلائل معاد کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد اپنے عام احسانات کا ذکر فرمایا تاکہ مذکورہ مضامین اور زیادہ پختگی کے ساتھ ثابت ہو جائیں، اس لئے کہ یہ احسانات اس حیثیت سے کہ وہ حکیمانی واقعات ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں سامنے آتے ہیں اور ان میں بے شمار حکمتوں کا اہل بصیرت کو ادراک ہوتا ہے یہ واقعات باحکمت خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک ہستی موجود ہے جو ان کو وجود عطا کرنے والی ہے اور جو حکمت کا سرچشمہ ہے اور جس سے تنہا کے لئے ہی خلق اور امر ثابت ہے۔ ان دونوں اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں اور ان واقعات زندگی کی ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ ان کو پیش کرنے والا، ان کی خبر دینے والا اور کتبِ سابقہ میں جس طرح درج ہے، ٹھیک اسی طرح خبر دینے والا ان میں سے ہے جس نے ان کتابوں میں سے کوئی کتاب نہ پڑھی، نہ کسی سے سیکھی اور نہ سنی، اس طرح کا اخبار، اخبار بالغیب ہے اور معجزہ ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خبریں دینے والا نبی برحق ہے، اور ایک

حیثیت یہ بھی ہے کہ یہ حوادث انسان کی تخلیق، اصولِ تخلیق اور اس سے بڑی اور عظیم چیزوں پر مشتمل ہے، اس بناء پر یہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ہستی جو ان حوادث کی ایجاد پر قادر تھی ان کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔

ان دلالتوں کو سامنے رکھ کر اللہ کریم نے اہلِ علم اور اہلِ کتاب کو مخاطب فرمایا اور ان کو اس کا حکم دیا کہ وہ اللہ کریم کے احسانات کو یاد کریں اور اتباعِ حق اور اتباعِ دلائل کے سلسلے میں کئے ہوئے وعدوں کو پورا کریں، تا کہ ان لوگوں میں سب سے سابق ہو جائیں جو حضرت محمد ﷺ پر اور اس کتاب پر ایمان لائے جو آپ ﷺ پر اتاری گئی، چنانچہ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا:

یبنی اسرائیل۔۔۔الخ

لفظِ آیت کا معنیٰ:

الآیۃ (Verse)

اسی کے معنی علامت ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں دراصل آیۃ ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو دوسری ایسی شے کو لازم ہو جو اس کی طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس ظاہر شے کا ادراک کرے گو اس دوسری (اصل) شے کا بذاتہ اس نے ادراک نہ کیا ہو مگر یقین کر لیا جائے کہ اس نے اصل شے کا بھی ادراک کر لیا کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے اور لزوم کا یہ سلسلہ محسوسات اور معقولات دونوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ کسی شخص کو معلوم ہو کہ فلاں راستے پر فلاں قسم کے نشانات ہیں اور پھر وہ نشان بھی مل جائے تو اسے یقین ہو جائیگا کہ اس نے راستہ پالیا ہے۔ اسی طرح کسی مصنوع کے علم سے لامحالہ اس کے صانع کا علم ہو جاتا ہے۔

لفظِ صاحب کی تحقیق و معنیٰ:

(ص ح ب) الصاحب (Companion)

کے معنی ہیں ہمیشہ ساتھ رہنے والا۔ خواہ وہ کسی انسان یا حیوان کے ساتھ رہے یا مکان یا زمان کے اور عام اس سے کہ وہ مصاحبت بدنی ہو جو کہ اصل اور اکثر ہے یا بذریعہ عنایت اور ہمت کے ہو جس کے متعلق کہ شاعر نے کہا ہے:

اگر تو میری نظروں سے غائب ہے تو دل سے تو غائب نہیں ہے۔

اور حذف میں صاحب صرف اسی کو کہا جاتا ہے جو عام طور پر ساتھ رہے اور کبھی کسی چیز کے مالک کو بھی ھو صاحبہ کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح اس کو بھی جو کسی چیز میں تصرف کا مالک ہو۔ قرآن میں ہے:

"اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 40)

جب اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کھا۔

"قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ یُحَاوِرُهٗ" (سورۃ الکہف آیت نمبر 34)

تو اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا۔

"اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ" (سورۃ الکھف آیت نمبر 9)
کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور لوح والے۔

"وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ" (سورۃ الحج آیت نمبر 44)
اور مدین کے رہنے والے بھی۔

"اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 82)
وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔

"وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ" (سورۃ القلم آیت نمبر 48)
اور اس مچھلی والے کی طرح نہ ہونا۔

اور آیت: "مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 6)
(تاکہ وہ) دوزخ والوں میں ہوں۔

اور آیت کریمہ: "وَمَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً" (سورۃ المدثر آیت نمبر 31)
اور ہم نے دوزخ کے داروغہ فرشتے بنائے ہیں۔

میں اصحاب النار سے دوزخی مراد نہیں ہیں بلکہ دوزخ کے داروغے مراد ہیں۔ پھر صاحب کا لفظ کبھی ان کی طرف مضاف ہوتو ہے جو کسی کے زیر نگرانی ہوتے ہیں جیسے صاحب الجیش (فوج کا حاکم اور کبھی حاکم کی طرف جیسے صاحب الاسیر (بادشاہ کا وزیر) المصاحبۃ والاصطحاب میں بنسبت لفظ الاجتماع کے مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ مصاحبۃ کا لفظ عرصہ دراز تک ساتھ رہنے کو مقتضی ہے اور لفظ اجتماع میں یہ شرط نہیں ہے لہٰذا اصطحاب کے موقعہ پر اجتماع کا لفظ تو بول سکتے ہیں مگر اجتماع کی جگہ پر ہر مقام میں اصطحاب کا لفظ نہیں بول سکتے اور آیت کریمہ:

"ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ" (سورۃ سبا آیت نمبر 46)
پھر سوچو کہ تمہارے ان صاحب میں جنون کی کوئی بات نہیں۔

تمہارے رفیق کو سودا نہیں میں نبی کریم ﷺ کو صاحبکم کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ زندگی بسر کی ہے ان کا تجربہ کر چکے ہو اور ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہو چکے ہو پھر بتاؤ کہ ان میں کوئی دماغی خلل یا دیوانگی پائی جاتی ہے یہی معنی آیت،

"وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ" (سورۃ التکویر آیت نمبر 22)
اور تمہارے صاحب مجنون نہیں۔

کے ہیں۔ الاصحاب للشئی کے معنی ہیں وہ فرمانبردار ہو گیا اصل میں اس کے معنی کسی کا مصاحب بن کر اس کے ساتھ

رہنے کے ہیں۔ چنانچہ اصحب فلان اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا بیٹا بڑا ہو کر اس کے ساتھ رہنے لگے۔ اور اصحب فلان فلانا کے معنی ہیں وہ اس کا ساتھی بنا دیا گیا۔

قرآن میں ہے: " وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ " (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 43)

اور نہ ہم سے پناہ ہی دیئے جائیں گے۔

یعنی ہماری طرف سے ان پر سکینت تسلی کشائش وغیرہ کی صورت میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی چیزوں سے اولیاء اللہ کی مدد کی جاتی ہے۔ ادیم مصجب: کچا چمڑہ جس سے بال نہ اتارے گئے ہوں۔

نار کی تعریف:

(ن و ر) نار (Fire, flame)

اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

" أَفَرَاَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ " (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 71)

بھلا دیکھو کہ جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔

خلد کیا ہے؟:

(خ ل د) الخلودُ (ن) (Eternity)

کے معنی کسی چیز کے فساد کے عارضہ سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں۔ اور جب کسی چیز میں دراز تک تغیر و فساد پیدا نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

" لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ " (سورۃ الشعراء آیت نمبر 129)

شاید تم ہمیشہ رہو گے۔ جنت میں خلود کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن میں ہے:

" أُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 82)

وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔

شعر:

امام اہلسنت، مجدد دین و ملت الحاج امام احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں:

خلد میں ہوگا ہمارا داخلہ اس شان سے
یا رسول اللہ ﷺ کا نعرہ لگاتے جائیں گے

نوٹ: لفظ کفر اور کذب کی تحقیق ہو چکی ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 40]

یَا بَنِیۡ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ (40)

"اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا ،اور خاص میرا ہی ڈر رکھو"۔

متن:

یَا بَنِیۡ اِسۡرَآءِیۡلَ أی أولاد يعقوب، والابن منَ البناء لأنه مبنى أبيه، ولذلك ينسب المصنوع إلى صانعه فيقال: أبو الحرب، وبنت الفكر. وإسرائيل لقب يعقوب عليه السلام ومعناه بالعبرية: صفوة الله، وقيل: عبد الله وقرئ إسرائل بحذف الياء وإسرال بحذفهما وإسراييل» بقلب الهمزة ياء.

اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ أى بالتفكر فيها والقيام بشكرها، وتقييد النعمة بهم لأن الإنسان غيور حسود بالطبع، فإذا نظر إلى ما أنعم الله على غيره حمله الغيرة والحسد على الكفران والسخط، وإن نظر إلى ما أنعم الله به عليه حمله حب النعمة على الرضى والشكر. وقيل أراد بها ما أنعم الله به على آبائهم من الإنجاء من فرعون والغرق، ومن العفو عن اتخاذ العجل، وعليهم من إدراك زمن محمد صلّى الله عليه وسلّم وقرئ اذۡكُرُوا والاصل إذتكروا. ونعمتى بإسكان الياء وقفاً وإسقاطها درجاً هو مذهب من لا يحرك الياء المكسور ما قبلها.

وَاَوۡفُوا بِعَهۡدِیۡ بالإيمان والطاعة.

اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ بحسن الإثابة والعهد يضاف إلى المعاهِد والمعاهَد ولعل الاول مضاف إلى الفاعل والثانى إلى المفعول، فإنه تعالى عهد إليهم بالإيمان والعمل الصالح بنصب الدلائل وإنزال الكتب، ووعدلهم بالثواب على حسناتهم، وللوفاء بهما

عرض عريض فأول مراتب الوفاء منا هو الإتيان بكلمتى الشهادة، ومن الله تعالى حقن الدم والمال، وآخرها منا الاستغراق فى بحر التوحيد بحيث يغفل عن نفسه فضلاً عن غيره، ومن الله تعالى الفوز باللقاء الدائم. وما روى عن ابن عباس رضى الله

تعالى عنهما: أوفوا بعهدى فى اتباع محمد صلّى الله عليه وسلّم، أوف بعهدكم فى رفع الآصار والإغلال. وعن غيره أوفوا بأداء الفرائض وترك الكبائر أوف بالمغفرة والثواب. أو أوفوا بالاستقامة على الطريق المستقيم، أوف بالكرامة والنعيم المقيم. فبالنظر إلى الوسائط. وقيل كلاهما مضاف إلى المفعول والمعنى: أوفوا بما عاهدتمونى من الإيمان والتزام الطاعة، أوف بما عاهدتكم من حسن الإثابة. وتفصيل العهدين فى سورة المائدة فى قوله تعالى: وَلَقَدْ اَخَذَ اللهُ مِيثَاقَ بَنِي اِسْرَائِيلَ إلى قوله: وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ. وقرء أوفِّ بالتشديد للمبالغة.

وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ فيما تأتون وتذرون وخصوصًا فى نقض العهد، وهو آكد فى إفادة التخصيص من إياك نعبد لما فيه مع التقديم من تكرير المفعول، والفاء الجزائية الدالة على تضمن الكلام معنى الشرط كأنه قيل:

إن كنتم راهبين شيئًا فارهبون. والرهبة: خوف مع تحرز. والآية متضمنة للوعد والوعيد دالة على وجوب الشكر والوفاء بالعهد، وأن المؤمن ينبغي أن لا يخف أحداً إلا الله تعالى.

ترجمہ:

بنی اصل میں بنین ہے جو کہ ابن کی جمع ہے اور یہ مشتق ہے بناء سے، جس کا معنیٰ بنیاد بنانا ہے۔ اور بیٹا چونکہ اپنے باپ کی نسل کی بقاء کی بنیاد ہوتا ہے اس لئے اسے ابن کہتے ہیں اسی وجہ سے مصنوع کو صانع کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں "ابن الحرث" کھیتی باڑی کا باپ اور "بنت الفکر" کسی کی سوچ کا نتیجہ۔

"اسرائیل" یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے اور یہ عبداللہ اور صفوۃ اللہ کے معنیٰ میں ہے۔ "اسر" بمعنی عبد اور "ئیل" بمعنی اللہ ہے مطلب اللہ کا بندہ۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور بنی اسرائیل سے مراد اولاد یعقوب ہے، اسرائیل کو اسرائل، اسرال اور سرائیل بھی پڑھا گیا ہے۔

میرا انعام یاد کرو یعنی ان انعامات میں غور کرو اور ان کا شکر ادا کرو اور انعام کو خصوصی طور پر بنی اسرائیل کی جانب منسوب کرنا اس وجہ سے ہے کہ انسان طبعی طور پر حاسد اور غیور ہے۔ تو اگر چہ اس کی توجہ ان انعامات کی طرف مبذول کرائی جائے جو دوسروں پر ہوئے ہیں۔ تو اس کو غیرت اور حسد کفر و ناراضگی پر آمادہ کر سکتے ہیں لیکن جب اس کی توجہ ان انعامات کی جانب ہوتی ہے جو خود اس پر ہوئے ہیں تو اس کو انعام کی محبت رہنا اور شکر پر آمادہ کرتی ہے۔ علماء نے کہا کہ انعامات سے مراد وہ

انعامات بھی ہیں جو ان کے آباؤ اجداد پر ہوئے ہیں۔ مثلاً فرعون سے نجات دینا، ڈوبنے سے بچا لینا اور بچھڑے کی پوجا سے درگزر کرنا۔ اور وہ انعامات بھی ہیں جو خود اس دور کے بنی اسرائیل پر ہوئے ہیں یعنی ان کا عہد نبوت کو پالینا۔ اور ایک قرات میں "اذکروا" ہے جس کی اصل باب افتعال ہے، افتعلوا کے وزن پر ہے نیز اس قرات میں بصورتِ وصل "نعمتی" کی یاء کو ساکن کر کے حذف کر دیا گیا ہے۔ اور جن کے نزدیک یاء ماقبل مکسور کو حرکت نہیں دی جاتی ان کا مذہب یہی ہے کہ ایسی یاء کو اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں۔

وَاَوۡفُوا بِعَهۡدِیۡ بالإیمان والطاعة.

اور میرا عہد پورا کرو۔

میرا حکم اور وصیّت جو ایمان کے بارے میں تھی تم اسے پورا کرو اور میں تمہارے ساتھ کیا ہوا عہد پورا کروں گا، یعنی حسن ثواب کا جو وعدہ میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ اور عہد کی اضافت عہد کرنے والے کی جانب بھی ہوتی ہے، اور اس کی جانب بھی ہوتی ہے جس سے عہد کیا جاتا ہے اور غالباً اوّل یعنی "بعہدی" کا عہد مضاف الی الفاعل ہے اور ثانی یعنی "بعہدکم" کا عہد مضاف الی المفعول ہے۔ کیونکہ اللہ کریم نے ان سے ایمان اور عمل صالح کا حکم دیا تھا جس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ ایمان اور علم صالح پر دلائل قائم کر دیئے تھے اور کتابیں نازل کر دی گئی تھیں اور ان سے ان کی نیکیوں پر ثواب کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور دونوں وعدوں کو پورا کرنے کا میدان بہت وسیع ہے۔ چنانچہ انسانوں کی جانب سے عہد کو پورا کرنے کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ دونوں کلموں پر ایمان لائیں۔ اور اللہ کریم کی جانب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہماری جان و مال کی حفاظت فرمائے۔ اور ہماری جانب سے اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ ہم اللہ کریم کی توحید میں اتنا مستغرق ہو جائیں کہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو جائیں۔ اور اللہ کریم کی طرف سے وفائے عہد کا آخری درجہ یہ ہے کہ اپنی دائمی ملاقات سے ہم کو سرفراز فرمائے۔ اور وہ جو روایت کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہ میرا وہ عہد پورا کرو جو تم سے میں نے اتباعِ محمد ﷺ کے سلسلہ میں لیا تھا۔ اور میں وہ عہد پورا کروں گا جو میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا کہ تم سے بوجھ اور طوق اتار دیا جائے گا۔ اسی طرح وہ تفسیر جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے اصحاب سے مروی ہے کہ اے بنی اسرائیل فرائض کو ادا کر کے اور کبیرہ گناہوں کو ترک کر کے میرا عہد پورا کرو۔ میں تمہاری مغفرت کر کے اور ثواب عطا کر کے تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں گا۔ نیز یہ کہ صراط مستقیم پر استقامت اختیار کر کے تم لوگ میرا عہد پورا کرو اور

میں تمہیں عزّت، بزرگی اور بے شمار نعمتیں عطا کر کے اپنا وعدہ پورا کروں گا۔

یہ تمام تفسیریں درمیانی درجہ کی ہیں، انتہائی درجہ وہی ہے ہم نے بیان کر دیا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ دونوں جگہ لفظِ عہد مفعول بہ کی جانب مضاف ہے، تو اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ تم نے جس چیز کا مجھ سے عہد کیا تھا یعنی ایمان اور التزام اطاعت کا، اس کو تم پورا کرو اور میں اچھی جزاء کا وعدہ پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہوا ہے۔ اور ان دونوں عہدوں کی تفصیل

اللہ کریم کے ارشاد،

ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل

سے لے کر

ولأدخلنکم جنّاتٍ

میں بیان ہوئی ہے۔

وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ

اور خاص میرا ہی ڈر رکھو،

یعنی جو کام کرتے ہو اور جو کام چھوڑتے ہو دونوں کے بارے میں مجھ ڈرو۔ تم پر لازم ہے کہ جن اوامر کی بجا آوری کر دوہ صرف میرے ڈر کی وجہ سے ہو اور ترکِ نواہی کا سبب بھی میرا خوف ہی ہو، جو تمہارے لئے تازیانہ ہو۔ خاص طور پر میرے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو توڑتے وقت میری عظمت اور قہاریت تمہارے ذہن میں ہو۔

خوف صرف اللہ کریم ہی کا ہو۔ اس تخصیصِ خوف کے معنیٰ کا فائدہ دینے میں "ایای فارهبون" بنسبت "ایّٰک نعبد" کے زیادہ پرزور ہے۔ یعنی جس قدر پرزور تخصیص "ایّای فارهبوْن" میں ہے اتنی پرزور "ایّٰک نعبد" میں نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں تقدیم مفعول کے ساتھ ساتھ تکرار مفعول بھی ہے۔ نیز فاء جزا ہے جو تعقیب و اشتراط کے مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ "ایّاک نعبد" میں مفعول بہ چونکہ مکرر نہیں اس لئے وہ جملہ واحدہ ہے اور "ایای فارهبون" میں بہ مکرر ہے اور فارهبون، ایای میں عامل نہیں ہے اس لئے ایّای کا عامل مقدر ہے۔ تقدیرِ عبارت یوں ہوگی،

ایای ارهبوا فارهبون

اس تقدیر کے تحت ڈرنے کا حکم مکرر ہوا اور تعقیب کے ساتھ ہوا۔ جس کا معنیٰ یہ ہوا کہ مجھ سے ہر وقت ڈرتے رہو، یہ خشیت تمہارے اندر مسلسل باقی رہے۔ اس کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ تقدیرِ عبارت سے واضح ہوگیا کہ "وایّای فارهبون" دو جملے ہیں۔

فارهبون کی فاء تعقیب اور شرط دونوں معانی پر دلالت کرتی ہے جس سے تفصیلی معنیٰ یہ نکلتے ہیں "ان کنتم راهبین شیئاً فارهبون" یعنی تم کسی شے سے بھی خوف رکھتے ہو تو وہ صرف میرا خوف ہونا چاہئے نہ کہ کسی اور کا خوف۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ "رهبة" کے معنیٰ ان خوف کے ہیں جس میں احتیاط و اجتناب بھی ہو۔

آیت کریمہ میں "اوف بعهدکم" وعدہ پر مشتمل ہے گویا یہ اعلان ہے کہ جو لوگ اپنے عہد کو پورا کریں گے ان کو بے شمار قسموں کے ثواب عطا کئے جائیں گے۔ نیز "اوفوا بعهدکم" امر کا صیغہ ہے یہ اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ کریم کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور وعدہ پورا کرنا ضروری ہے۔

"وایّای فارھبون" کی تخصیصات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مومن کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کریم کے سوا کسی سور چیز سے خوف کھائے۔

ذکر کی تحقیق:

الذکری۔(Recitation,Pryer)

کثرت سے ذکر الٰہی کرنا اس میں الذکر سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن میں ہے: ذَکَّرْتُہٗ کذا قرآن میں ہے:

"وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللهِ "(سورۃ ابراھیم آیت نمبر 5)

اور ان کو اللہ کے دن یاد دلاؤ۔

اور آیت کریمہ:

"فَتُذَكِّرَ إِحْدٰهُمَا الْأُخْرٰى "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 282)

تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلا وے۔ اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذکر بنا دے گی۔ بعض علماء نے آیت کریمہ:

"فَاذْكُرُوْنِيْ أَذْكُرْكُمْ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 152)

سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

"اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 40)

یاد کرو میرا وہ احسان۔

میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الٰہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس نے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔ اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الٰہی میں غور فکر کرتے رہو حتی کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔

پانچ باتوں کی وحی:

حضرت سیّدنا حارث اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اللہ عزوجل نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی طرف پانچ باتوں کی وحی فرمائی اور ان پر خود عمل کرنے اور بنی اسرائیل کو ان پر عمل کی ترغیب دلانے کا حکم دیا۔ پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں تمہیں کثرت سے ذکر کرنے کا حکم دیتا ہوں اور ذکر کرنے والے کی مثال اس شخص کی طرح ہے جسکے دشمن اس کی تلاش میں ہوں پھر وہ ایک قلعے کے پاس پہنچ کر اپنے آپ کو اس میں چھپا لے، اسی طرح بندہ ذکر اللہ عزوجل کے ذریعے ہی شیطان سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

(المستدرک، کتاب الصوم، باب وان ریح الصوم ریح المسک، رقم ۱۵۷۴، ج ۲، ص ۵۱)

ذکر کی فضیلت:

حضرتِ سیّدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور پاک، صاحب لولاک، سیاح افلاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب عزوجل فرماتا ہے،

اے ابن آدم! جب تو تنہائی میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی تنہا تیرا ذکر کرتا ہوں اور جب تو کسی مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس مجمع سے بہتر مجمع میں تیرا ذکر کرتا ہوں۔ (الترغیب والترہیب، کتاب الذکر والدعاء، الترغیب فی الاکثار من ذکر اللہ، رقم ۳، ج ۲، ص ۲۵۲)

رفیق اعلیٰ میں بندے کا ذکر:

حضرتِ سیّدنا معاذ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ اپنے دل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اپنے فرشتوں کی جماعت میں اس کا چرچا کرتا ہوں اور جب میرا بندہ کسی مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں رفیق اعلیٰ میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔

(الترغیب والترہیب، کتاب الذکر والدعاء، باب الترغیب فی الاکثار من ذکر اللہ الخ، رقم ۲، ج ۲، ص ۲۵۲)

نعمت کسے کہتے ہیں؟:

(ن ع م) النعمة (Blessing,Favour)

اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اور یہ فعلة کے وزن پر ہے جو کسی حالت کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے: جلسة ورکبة وغیرہ ذالک۔ اور نعمة کے معنی تنعم یعنی آرام و آسائش کے ہیں اور یہ فعلة کے وزن پر ہے جو مرة کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے:

ضربة وشتمة اور نعمة کا لفظ اسم جنس ہے جو قلیل و کثیر کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے،

"وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (سورۃ النحل آیت نمبر 18)

اور اگر اللہ کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔

لفظ اوفوا تحقیق:

(و ف ی) الوافی (Honour,keep,Make Good)

اور کبھی توفی کے معنی موت اور نیند کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 42)

اللہ لوگوں کی مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔

"اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ" (سورۃ یونس آیت نمبر 46)

یا تمہاری مدت حیات پوری کر دیں۔

عہد کا مفہوم:

(ع ہ د) العھد (ض) (Promis,Agreement)

کے معنی ہیں کسی چیز کی پیہم نگہہ داشت اور خبر گیری کرنا اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عہد کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَاَوْفُوْا بِالْعَھْدِ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْؤُلًا" (الاسراء آیت نمبر 34)

اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔

یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔

"لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 124)

کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔

ایفائے عہد کی بہترین مثال:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِی الْحَمْسَاءِ قَالَ بَایَعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ یُّبْعَثَ وَبَقِیَتْ لَہُ بَقِیَّۃٌ فَوَعَدْتُہُ اَنْ آتِیَہُ بِہَا فِی مَکَانِہٖ فَنَسِیْتُ فَذَکَرْتُ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَاِذَا ھُوَ فِی مَکَانِہٖ فَقَالَ لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَیَّ اَنَا ھَاھُنَا مُنْذُ ثَلَاثٍ اَنْتَظِرُکَ

روایت ہے حضرت عبداللہ ابن ابی الحمساء رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے ظہور سے پہلے حضور (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے خرید و فروخت کی اور آپ کا کچھ بقایا رہ گیا میں نے وعدہ کیا کہ میں اسی جگہ وہ چیز لاتا ہوں پھر میں بھول گیا تین دن کے بعد مجھے یاد آیا تو حضور انور (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) اسی جگہ تھے فرمایا کہ تم نے مجھ پر مشقت ڈال دی میں تین دن سے یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

(مشکوۃ المصابیح، کتاب الادب، باب الوعد، الفصل الثانی، الحدیث ۴۸۸۰، ج ۲، ص ۱۹۹)

عہد شکنی کی وعید:

حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قیامت کے دن تین شخصوں کا مدِّ مقابل ہوں گا، ایک وہ شخص جو میرے نام پر وعدہ دے پھر عہد شکنی کرے۔ دوسرا وہ شخص جو آزاد کو بیچے پھر اس کی قیمت کھائے۔ تیسرا وہ شخص جو مزدور سے کام پورا لے اور اس کی مزدوری نہ دے۔ (بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا، ۲/ ۵۲، الحدیث: ۲۲۲)

عہد توڑنے والے پر لعنت:

حضرت علی المرتضی کَرَّمَ اللہ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے، جو کسی مسلمان کا عہد توڑے تو اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، نہ اس کی کوئی فرض عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفل۔

(بخاری، کتاب فضائل المدینۃ، باب حرم المدینۃ، ۱/ ٦١٦، الحدیث: ۱۸۷۰)

تحقیق لفظ رھب:

(ر ہ ب) الرھب والرھبۃ

ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو قرآن میں:

"لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً " (سورۃ الحشر آیت نمبر 13)

تمہاری ہیبت تو ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر ہے۔

"جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ " (سورۃ القصص آیت نمبر 32)

اور دفع خوف کے لئے اپنے بازو سکیڑ لو۔

اس میں ایک قرآت رھب بضمہ الراء بھی ہے۔ جس کے معنی فزع یعنی گھبراہٹ کے ہیں۔

دلچسپ حکایت:

متقاتل کہتے ہیں کہ رھب کی تفسیر معلوم کرنے کی غرض سے نکلا دریں اثنا کہ میں کھانا کھا رہا تھا ایک اعرابی عورت آئی۔ اور اس نے کہا اے اللہ کے بندے مجھے کچھ خیرات دیجئے جب میں لپ بھر کر اسے دینے لگا تو کہنے لگے یہاں میری آستین میں ڈال دیجئے تو میں سمجھ گیا کہ آیت میں بھی (رھب بمعنی آستین ہے) لیکن پہلے معنی یعنی گھبراہٹ کے زیادہ صحیح ہیں۔

قرآن میں ہے:

"وَيَدْعُوْنَنَا رَغَباً وَّرَهَباً " (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 90)

ہمارے فضل کی توقع اور ہمارے عذاب کے خوف سے ہمیں پکارتے رہتے ہیں۔

" تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ "(سورۃ الانفال آیت نمبر 60)

اس سے تم اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے۔

اور آیت کریمہ:

"وَاسْتَرْهَبُوهُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 116)

اور ان کو دہشت میں ڈال دیا۔

میں استرھاب کے معنی دہشت زدہ کرنے کے ہیں۔

"وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 40) اور مجھ سے ہی ڈرو۔

ترھب کا معنی:

ترھب تفعیل کے معنی تعبد یعنی راہب بننے اور عبادت ہیں خوف سے کام لینے کے ہیں۔

رھبانیۃ کی تعریف:

فرط خوف سے عبادت گذاری میں غلو کرنے کو رھبانیۃ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے۔

"وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا" (سورۃ الحدید آیت نمبر 27)

اور رہبانیت لذت دنیا کا چوڑ بیٹھنا جو انہوں نے از خود ایجاد کی تھی۔ اور رھبان صومعہ لوگ واحد بھی ہوسکتا ہے اور جمع بھی جو اس کو واحد دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کی جمع رھابین آتی ہے لیکن اس کی جمع رھابنۃ بنانا زیادہ مناسب ہے۔

الارھاب کا معنی:

الارھاب (افعال) کے اصل معنی اونٹوں کو خوف زدہ کرنے کے ہیں یہ ارھبتغال کا مصدر ہے اور اسی سے زھب ہے جس کے معنی لاغر اونٹنی (یا شتر زقوی کلاں جثہ) کے میں مشہور محاورہ ہے:

رَهَبُوتٌ خیر من رحموت کہ رحم سے خوف بہتر ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 41]

وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ (41)

"اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو، اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو، اور مجھی سے ڈرو"۔

متن:

وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقاً لِما مَعَكُمْ إفراد للإيمان بالامر به والحث عليه لأنه المقصود

والعمدة للوفاء بالعهود. وتقييد المنزل بأنه مصدق لما معهم من الكتب الإلهية من حيث إنه نازل حسبما نعت فيها. أو مطابق لها فى القصص والمواعيد والدعاء إلى التوحيد والامر بالعبادة والعدل بين الناس والنهى عن المعاصى والفواحش، وفيما يخالفها من جزئيات الاحكام بسبب تفاوت الاعصار فى المصالح من حيث إن كل واحدة منها حق بالإضافة إلى زمانها. مراعى فيها صلاح من خوطب بها. حتى لو نزل المتقدم فى أيام المتأخر لنزل على وفقه. ولذلك

قال عليه الصلاة والسلام: "لو كان موسى حياً لما وسعه إلا اتباعى"

تنبيه على أن اتباعها لا ينافى الإيمان به. بل يوجبه ولذلك عرض بقوله:

وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ بأن الواجب أن يكونوا أول من آمن به. ولأنهم كانوا أهل النظر فى معجزاته والعلم بشأنه والمستفتحين به والمبشرين بزمانه. وأَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وقع خبراً عن ضمير الجمع بتقدير: أول فريق أو فوج أو بتأويل لا يكن كل واحد منكم أول كافر به. كقولك كسانا حلة فإن قيل كيف نهوا عن التقدم فى الكفر وقد سبقهم مشركوا العرب؟ قلت المراد به التعريض لا الدلالة على ما نطق به الظاهر كقولك أما أنا فلست بجاهل أو لا تكونوا أول كافر به. من أهل الكتاب. أو ممن كفر بما معه فإن من كفر بالقرآن فقد كفر بما يصدقه. أو مثل من كفر من مشركى مكة. وأَوَّلَ: أفعل لا فعل له. وقيل: أصله أوأل من وأل. فأبدلت همزته واواً تخفيفاً غير قياسى أو أأول من آل فقلبت همزته واواً وأدغمت.

وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَناً قَلِيلًا ولا تستبدلوا بالإيمان بها والاتباع لها حظوظ الدنيا. فإنها وإن جلت قليلة مسترذلة بالإضافة إلى ما يفوت عنكم من حظوظ الآخرة بترك الإيمان. قيل: كان لهم رئاسة فى قومهم ورسوم وهدايا منهم، فخافوا عليها لو اتبعوا رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فاختاروها عليه. وقيل: كانوا يأخذون الرشى فيحرفون الحق ويكتمونه.

وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ بالإيمان واتباع الحق والإعراض عن الدنيا. ولما كانت الآية السابقة مشتملة على ما هو كالمبادى لما فى الآية الثانية. فصلت بالرهبة التى هى مقدمة التقوى. ولأن الخطاب بها عم العالم والمقلد. أمرهم بالرهبة التى هى مبدأ السلوك.

والخطاب بالثانية لما خص أهل العلم، أمرهم بالتقوى التي هي منتهاه.

ترجمہ:

وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ

اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا۔

یہاں صرف ایمان کا ذکر کیا گیا ہے کہ بایں طور کہ ایمان کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر ابھارہ گیا ہے کیونکہ مقصود ایمان ہی ہے اور وفائے عہد کے لئے اصل رکن یہی ہے اور "منزل" میں یہ قید لگانا کہ وہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو اہلِ کتاب کے پاس ہیں اس حیثیت سے ہے کہ یہ قرآن اسی کے مطابق نازل ہوا ہے جو کتبِ سابقہ میں بیان ہوا ہے۔ یا یہ کہ یہ قرآن قصص اور مواعید میں نیز توحید کی دعوت اور امر عبادت میں اور عدل بین الناس اور نہی عن المعاصی والفواحش کے حکم میں، کتب سابقہ کے مطابق ہے۔ اور قرآن کریم کا کتبِ سابقہ سے جزوی احکام میں مختلف ہونا اس وجہ سے ہے کہ اوقات ادوار کی مصلحتیں مختلف ہوتی ہیں۔ یعنی ہر مصلحت جزئی اپنے دور کے لحاظ سے برحق ہے۔ اور اس میں ان لوگوں کی اصلاح وفلاح ملحوظ ہے، جو اس کے مخاطب ہیں۔ حالانکہ پہلے نازل ہونے والی چیزیں اگر بعد میں نازل ہوتیں تو بعد والے زمانے کے مطابق نازل ہوتیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لو كان موسى حيًا لما وسعه إلا اتباعي

اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ کسی چیز کی گنجائش نہ ہوتی۔

نیز "مصدّقاً لما معکم" کی قید اس حقیقت پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ کتبِ سابقہ کی اتباع، قرآن کریم پر ایمان لانے کے منافی نہیں۔ بلکہ ان کی اتباع اس پر ایمان لانے کا موجب ہے۔ اسی لئے اللہ کریم نے اس پر تعریضاً یہ ارشاد فرمایا:

ولا تكونوا اوّل كافرٍ به

اور سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو۔

اس آیت میں تعریضاً یہ مراد ہے کہ تم پر ضروری ہے کہ تم قرآن پر سب سے پہلے ایمان لانے والے بنو، اور اہلِ کتاب سے یہ بات تعریضاً اس لئے کہی گئی کہ وہ معجزاتِ قرآن میں غور کرنے کے اہل تھے نیز اس کی عظمت شان کو جاننے کے اہل تھے۔ نیز حامل قرآن کے ذریعے فتح ونصرت کے طالب تھے۔ اور اس کی آمد آمد کی بشارت دینے والے تھے۔ اور "اوّل کافرٍ لا تکونوا" کی ضمیر جمع سے خبر واقع ہے۔ اور "اوّل کافر" کی تاویل ہوگی "اوّل فریقٍ کافر" یا "اول فوجٍ کافر" یا،

لا یکن کلّ واحدٍ منکم اول کافرٍ به

کی تاویل میں لیا جائے گا۔ جیسے تمہارا قول "کسانا حلة"

اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ان کو کفر میں سبقت کرنے سے کیونکر منع کیا گیا، جب کہ مشرکین عرب ان پر کفر میں سبقت

لے چکے تھے تو میں جواب دوں گا کہ اس سے مقصود تعریض ہے وہ معنی مقصود نہیں ہیں جن پر منطوق ظاہری دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ تمہارا کہنا "اما انا فلست بجاھلٍ" یا یہ مراد ہے کہ اہل کتاب میں سب سے پہلے کفر کرنے والے نہ بنو۔ یا یہ کہ ان لوگوں میں سب سے پہلے کفر کرنے والے نہ بن جاؤ جنہوں نے اپنی کتاب کا کفر کیا کیونکہ جنہوں نے قرآن کا انکار کیا تو یقیناً ان کتابوں کا بھی انکار کیا جنہوں نے قرآن کی تصدیق کی۔ یا یہ مراد ہے کہ مشرکین مکہ جیسے نہ بن جاؤ جنہوں نے کفر کیا۔ اور "اوّل" افعل کا صیغہ ہے جس کا کوئی فعل نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل "اَواَل" ہے یہ "وال" سے مشتق ہے، ہمزہ کو بغرضِ تخفیف، خلاف قیاس واؤ سے بدل دیا گیا ہے۔ یا اس کی اصل "اَءوِل" ہے اور یہ آل بمعنی رجع سے مشتق ہے، ہمزہ کو واؤ سے بدل کر واؤ میں ادغام کر دیا گیا، اوّل ہو گیا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا

اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو۔

یعنی آیات پر ایمان لانے اور ان کی پیروی کرنے کے عوض، دنیاوی ساز و سامان حاصل نہ کرو۔ اس لئے کہ دنیاوی ساز و سامان کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اُخروی نعمتوں کے مقابلے میں قلیل و حقیر ہے۔ جو ترکِ ایمان کی وجہ سے تم سے فوت ہو جائے گا۔ مفسرین نے کہا کہ علماءِ یہود کو اپنی قوم میں سرداری حاصل تھی، اور ان کو قوم سے ہدیئے اور محصول وصول ہوتے تھے لہٰذا ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر وہ نبی کریم ﷺ کی پیروی کرتے ہیں تو وہ تمام چیزیں ہاتھ سے جاتی رہیں گی اس لئے انہوں نے اس دنیاوی مال کو، اتباع پر ترجیح دی، بعض نے کہا کہ وہ حق بات کو چھپا کر اور اس میں تحریف کر کے رشوتیں وصول کرتے تھے۔

وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ اور مجھی سے ڈرو۔

ایمان لا کر اور حق کی پیروی کر کے اور دنیا سے اعراض کر کے، اور آیات ثانیہ کے مشتملات آیت اولیٰ کے مشتملات چونکہ مبادی کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے پہلی آیت کا فاصلہ میں مصدر "رھبۃ" کا فعل لایا گیا ہے۔ جو تقویٰ کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے، اور یہ بات بھی ہے کہ پہلی آیت کریمہ کے مخاطب عام ہیں، عام بھی مخاطب ہیں اور مقلد بھی، اسلئے ان کو رھبت کا حکم دیا گیا جہاں سے سلوک کا آغاز ہوتا ہے۔ اور دوسرے آیت کے مخاطب خاص کر اہل علم ہیں اس لئے ان کو تقویٰ کا حکم دیا گیا جو سلوک کا منتہی ہے۔

ثمن کی تعریف:

(ث م ن) الثمن

اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو فروخت کرنے والا اپنی چیز کے عوض خریدار سے وصول کرتا ہے خواہ وہ زر نقد ہو یا سامان۔

قرآن میں ہے: "وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ" (سورۂ یوسف آیت نمبر 20)

اور اسے تھوڑی سی قیمت یعنی چند درہموں پر بیچ ڈالا۔

معنی قلت:

(ق ل ل) القلة والكثرة (To Diminish)

بلحاظ اصل وضع کے صفات عدد سے ہیں جیسا کہ عظم اور صغر صفات اجسام سے ہیں بعد کثرت وقلت اور عظم وصغر میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ بطور استعارہ استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ؛

"ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 60)

پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔

میں قلیلًا سے عرصہ قلیل مراد ہے۔

نوٹ: ایمان، ما، نزول، کفر، شراء، تقویٰ کے معانی گزر چکے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : آية 42]

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (42)

''اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدہ ودانستہ حق نہ چھپاؤ''۔

متن:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ عطف على ما قبله. واللبس الخلط وقد يلزمه جعل الشيء مشتبهاً بغيره. والمعنى لا تخلطوا الحق المنزل عليكم بالباطل الذى تخترعونه وتكتمونه حتى لا يميز بينهما، أو ولا تجعلوا الحق ملتبسًا بسبب خلط الباطل الذى تكتبونه فى خلاله. أو تذكرونه فى تأويله.

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ جزم داخل تحت حكم النهى كأنهم أمروا بالإيمان وترك الضلال. ونهوا عن الإضلال بالتلبيس على من سمع الحق والإخفاء على من لم يسمعه. أو نصب بإضمار أن على أن الواو للجمع بمعنى مع، أى لا تجمعوا لبس الحق بالباطل و كتمانه. ويعضده أنه فى مصحف ابن مسعود "وتكتمون" أى وأنتم تكتمون. بمعنى كاتمين. وفيه إشعار بأن استقباح اللبس لما يصحبه من كتمان الحق.

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ عالمين بأنكم لابسون كاتمون فإنه أقبح إذ الجاهل قد يعذر.

ترجمہ:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ	اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ۔

یہ ماقبل پر معطوف ہے، اور "لبس" کے معنی مخلوط کرنے کے ہیں۔ اور خلط کا لازمی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز دوسری چیز سے مخلوط ہو کر مشتبہ ہو جائے، یہاں مراد یہ ہے کہ حق منزل کو اس باطل کے ساتھ مخلوط نہ کرو جس کو تم خود اس غرض سے تراشتے اور لکھتے ہو کہ دونوں کے درمیان فرق نہ ہو سکے یا یہ مراد ہے کہ حق کو خلط باطل کی وجہ سے مشتبہ نہ کرو وہ باطل جس کو تم حق کے درمیان لکھ دیتے ہو، گویا ان کو ایمان اور ترک ضلال کا حکم دیا ہے، اور اضلال و تضلیل سے منع کیا گیا، تاکہ سامعین حق کے ساتھ تلبیس نہ کریں۔ اور غیر سامعین سے حق کو چھپا کر نہ رکھیں۔

یا "تکتموا الحق" منصوب بتقدیر آن ہے اس احتمال کی بنیا اس پر ہے کہ واؤ جمع کے لئے ہو اور معنی یہ کئے جائیں،

لا تجمعوا لبس الحق بالباطل و کتمانہ

تلبیس حق بالباطل اور کتمانِ حق کے جامع نہ بنو۔ اس توجیہہ کی تقویت اس سے ہوتی ہے کہ مصحف ابن مسعود میں "تکتمون الحق" نون کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں تقدیر یہ نکلے گی "وانتم تکتمون" یہ جملہ حالیہ ہوگا جو کاتمین کے معنی میں ہوگا، تو اس صورت میں ترجمہ کچھ یوں ہوگا، حق کو باطل کے ساتھ مخلوط نہ کرو اس حال میں کہ تم ان کو چھپا رہے ہو۔ اس ترکیب میں یہ آگاہی دینی ہے کہ حق و باطل کا خلط ملط اس لئے بھی قبیح ہے کہ اس سے کتمانِ حق لازم آتا ہے۔

وانتم تعلمون

اس حال میں کہ تم جانتے ہو کہ تم تلبیس اور کتمان کرنے والے ہو، اور باوجود علم کے ایسا کرنا بہت بُرا ہے کیونکہ جاہل و ناواقف کو تو کبھی معذور بھی سمجھا جاتا ہے۔

لبس کا معنیٰ:

(ل ب س) لبس الثوب (To put on, To wear)
کے معنی کپڑا پہننے کے ہیں اور البسہ کے معنی دوسرے کو پہنانا کے۔ قرآن میں ہے:

"یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا" (سورۃ الکھف آیت نمبر 31)
اور وہ سبز کپڑے پہنا کریں گے۔

اللباس واللبوس واللبس وہ چیز جو پہنی جائے۔ قرآن میں ہے:

"قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 26)
بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک لباس وہ اُتارا کہ تمہاری شرم کی چیزیں چھپائے۔

اور لباس کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو انسان کے برے کاموں پر پردہ ڈال سکے۔ چنانچہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو قبائح کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

"هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 187)

وہ تمہاری لباس ہیں اور تم ان کے لباس۔

چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے اپنی بیوی کو ازار کہا ہے۔

فدی لك من أخی ثقة إزاری

اے میرے قابل اعتماد بھائی پر میری ازار یعنی بیوی قربان ہو۔

اور تمثیل و تشبیہ کے طور پر تقوی کو بھی لباس قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 26)

اور جو پرہیزگاری کا لباس ہے۔

اور آیت کریمہ: "صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 80)

اسے تمہارا ایک پہناوا بنانا سکھایا۔

میں لبوس سے زرہیں مراد ہیں اور آیت کریمہ:

"فَأَذَاقَهَا اللهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 112)

تو اللہ نے اسے یہ سزا چکھائی کہ اسے بھوک اور ڈر کا پہناوا پہنایا۔

اس میں جوع یعنی بھوک اور خوف کی تصویر کھینچنے کے لئے اس لباس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

تحقیق لفظِ حق:

(ح ق ق) الحق (حق) (Right, Truth)

کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔

لفظ حق کا استعمال:

لفظ حق کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(1) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَرُدُّوْٓا اِلَى اللهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ" (سورۃ یونس ایت نمبر 30)

اور اللہ کی طرف پھیرے جائیں گے جو ان کا سچا مولیٰ ہے۔

(2) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔

قرآن میں ہے:

" هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا "(سورۃ یونس آیت نمبر 5)

وہی ہے جس نے سورج کو جگمگا تا بنایا اور چاند چمکتا۔

(3) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا، جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں۔ کہ بعث ثواب و عقاب اور جنت دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 213)

تو اللہ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھا دی جس میں جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے۔

(4) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے، اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

" كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ "(سورۃ یونس آیت نمبر 33)

یونہی ثابت ہو چکی ہے تیرے رب کی بات۔

تحقیقِ باطل:

(ب ط ل) الباطل (Invalid,Null)

یہ حق کا بالمقابل ہے اور تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے اسے باطل کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ "(سورۃ الحج آیت نمبر 62)

یہ اس لئے کہ اللہ ہی حق ہے اور اس کے سوا جسے پوجتے ہیں وہی باطل ہے۔

لفظ کتم کا معنی با تحقیق:

(ک ت م) کتمہ (ن) (Hid)

کتما و کتمانا کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 140)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس کتاب اللہ میں موجود ہے چھپائے۔

"وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 146)

مگر ایک فریق ان میں سچی بات جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

"وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 283)۔

اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔

اور آیت کریمہ:

"اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ"

(سورۃ النساء آیت نمبر 37)

جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) خدا نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں۔

اس میں کتمان فضل سے کفران نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا:

"وَاَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 37)

اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ: وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 42)

اور خدا سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔ تو جھٹ سے پکار اٹھیں گے

"وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 23)

خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔

مگر اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ خدا تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپائے ہوتی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ آخرت میں متعدد واقف ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کوئی چھپا نہ سکنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دینگے۔

نوٹ: لفظ علم کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 43]

وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ وَآتُوا الزَّكاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (43)

''اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو''۔

وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ وَآتُوا الزَّكاةَ يعنى صلاة المسلمين وزكاتهم فإن غيرهما كلا صلاة ولا زكاة. أمرهم بفروع الإسلام بعد ما أمرهم بأصوله. وفيه دليل على أن الكفار مخاطبون بها. والزَّكاةَ من زكا الزرع إذا نما، فإن إخراجها يستجلب بركة فى المال ويثمر للنفس فضيلة الكرم. أو من الزكاة بمعنى: الطهارة، فإنها تطهر المال من الخبث والنفس من البخل.

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ أى فى جماعتهم، فإن صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة لما فيها من تظاهر النفوس، وعبر عن الصلاة بالركوع احترازاً عن صلاة اليهود. وقيل الركوع: الخضوع والانقياد لما يلزمهم الشارع. قال الاضبط السعدى:

لا تذلّ الضَّعِيفَ عَلَّكَ أَنْ ………… تَرْكَعَ يَوماً والدهْرُ قَدْ رفعه

ترجمہ:

وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ وَآتُوا الزَّكاةَ

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو۔

یہاں نماز ادا کرنے سے مراد مسلمانوں کی نماز قائم کرنا اور ان کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی نماز وزکوٰۃ کے سوا دوسری نماز وزکوٰۃ تو ایسی ہے جیسی کوئی نماز وزکوٰۃ ہے ہی نہیں۔

علماء یہود کو اصول اسلام کا حکم دینے کے بعد اب فروعِ اسلام کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ فروع کے کفار مخاطب ہیں۔ اور "زکاۃ" ماخوذ ہے زکاہ الزرع سے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کھیتی میں نشوونما ہو جائے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال میں برکت پیدا ہو جاتی ہے اور انسانی دل میں جود وکرم جیسی صفات کا پھل دیتی ہے۔ یا یہ زکاء سے مشتق ہے جو طہارت کے معنیٰ میں ہے، زکوٰۃ مال کو میل اور دل کو بخل سے پاک کرتی ہے۔

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ

اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

یعنی نماز با جماعت ادا کرو۔ کیونکہ تنہا نماز پڑھنے سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر ستائیس گنا زیادہ ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ اور اس میں ایک دوسرے کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور صلوٰۃ کو رکوع کے ساتھ تعبیر کرنا اس لئے ہے کہ یہود کی نماز سے گریز ہو جائے اور بعض نے کہا کہ رکوع سے مراد شارع علیہ السلام کی لازم کردہ چیزوں کی فرمانبرداری کرنا اور ان کے لئے اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے جس پر اضبط سعدی کا شعر بھی دلالت کرتا ہے،

لا تبذلّ الضَّعِيفَ عَلَّكَ اَنْ .... تَرْكَعَ يَوْمًا وَّالدَّهْرُ قَدْ رَفَعَهٗ

کسی کو حقیر و فقیر اور کمزور و ناتواں سمجھ کر ذلیل مت کرو، ہوسکتا ہے کہ گردش زمانہ سے تم جھک جاؤ اور زمانہ اس کو اوپر اٹھا دے، تو تم کو اپنے کئے ہوئے پر ندامت ہوگی۔

تحقیق لفظِ اقامت:

الاقامتہ (افعال) فی المکان (Devout)

کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اقامتہ الشیئی (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

"قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 68)

کہو کہ اے اہل کتاب جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہوسکتے۔

یعنی جب تک کہ علم و عمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔ اسی طرح فرمایا:

"وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 66)

اور اگر وہ قائم رکھتے توریت اور انجیل۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ وہاں اقامتہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا ہے اسی بنا پر کئی ایک مقام پر اقیموا الصلوۃ اور المتقین الصلوۃ کہا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى" (سورۃ النساء آیت نمبر 142)

اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

میں قاموا اقامتہ سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے (جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں) اور آیت:

"رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ" (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 40)

اے میرے رب مجھے نماز کا قائم کرنے والا رکھ۔

میں دعا ہے کہ الٰہی مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما اور آیت کریمہ:

"فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 11)
پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اقامۃ سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے کے ہیں۔

لفظِ المقام کا معنی:

یہ مصدر میمی، ظرف، مکان ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف مصدر میمی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 66)
اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور مقامتہ (بضم المیم) معنی اقامتہ ہے جیسے فرمایا:

"الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 35)
جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ کے رہنے کے گھر میں اتارا۔

یہاں جنت کو دار المقامتہ کہا ہے جس طرح کہ اسے دار الخلد اور جنات عدن کہا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"لَا مَقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 13)
یہاں تمہارے لئے (ٹھہرنے کا) مقام نہیں ہے تو لوٹ چلو۔

اس آیت میں مقام کا لفظ قیام سے ہے یعنی تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور ایک قرات میں مقام (بضم المیم) اقام سے ہے اور کبھی اقامتہ سے معنی دوام مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"عَذَابٌ مُّقِيْمٌ" (سورۃ ھود آیت نمبر 39)
ہمیشہ کا عذاب۔

اور ایک قرات میں آیت کریمہ:

"اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 51)
بیشک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔

مقام بضمہ میم ہے۔ یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ تقویم الشی کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ" (سورۃ التین آیت نمبر 4)

کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

اس میں انسان کے عقل وفہم قد و قامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

الصلوٰۃ کا معنی:

(ص ل ی) الصلی (س) (Prayer)

کے اصل معنی آگ جلانے کے ہے ہیں صلی بالنار اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا۔ صلی بکذا اسے فلاں چیز سے پالا پڑا۔ صلیت الشاۃ میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مصلیۃ کہا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:

"اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ" (سورۃ یٰسٓ آیت نمبر 64)

آج اس میں داخل ہو جاؤ۔

الصلوٰۃ فی اللغت:

بہت سے اہل لغت کا خیال ہے کہ صلاۃ کے معنی دعا دینے۔ تحسین وتبریک اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے صلیت علیہ میں نے اسے دعا دی نشوونما دی اور بڑھایا اور حدیث میں ہے کہ،

"إذا دعی أحد کم إلی طعام فلیجب، وإن کان صائما فَلْيُصَلّ أی: لیدع لأھله"

جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کر لے اگر روزہ دار ہے تو وہ انکے لئے دعا کر کے واپس چلا آئے

اور قرآن میں ہے:

"وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 103)

اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔

اور انسانوں کی طرح فرشتوں کی طرف سے بھی صلاۃ کے معنی دعا اور استغفار ہی آتے ہیں

چنانچہ فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 56)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے (نبی) پر۔

اور الصلوٰۃ جو کہ ایک عبادت مخصوصہ کا نام ہے اس کی اصل بھی دعا ہی ہے اور نماز چونکہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے اسلئے اسے صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تسمیۃ الشئی باسم الجزء کے قبیل سے ہے یعنی کسی چیز کو اس کے ضمنی مفہوم کے نام سے موسوم

کرنا اور صلاۃ (نماز) ان عبادت سے ہے جن کا وجود شریعت میں ملتا ہے گو اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" (سورۃ النساء، آیت نمبر 103)

بیشک نماز مومنوں پر مقرر اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔

باجماعت نماز کی فضیلت:

حضرتِ سیِّدُنا عبید اللہ بن عمر قَوَارِیرِی علیہ رحمۃ اللہ الغنی فرماتے ہیں:

میں نے ہمیشہ عشاء کی نماز باجماعت ادا کی، مگر افسوس! ایک مرتبہ میری عشاء کی جماعت فوت ہوگئی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ میرے ہاں ایک مہمان آیا، میں اس کی خاطر مُدارات (مہمان نوازی) میں لگا رہا۔ فراغت کے بعد جب مسجد پہنچا تو جماعت ہو چکی تھی۔ اب میں سوچنے لگا کہ ایسا کون سا عمل کیا جائے جس سے اس نقصان کی تلافی ہو۔ یکایک مجھے اللہ کے پیارے حبیب، حبیب لبیب عَزَّوَجَلَّ و صلّی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلّم کا یہ فرمانِ عالیشان یاد آیا کہ

"باجماعت نماز، منفرد کی نماز پر اکیس درجے فضیلت رکھتی ہے۔ اسی طرح پچیس اور ستائیس درجے فضیلت کی حدیث بھی مروی ہے۔"

(صحیح البخاری، کِتابُ الاذان، باب فضل صلاۃ الجماعۃ، الحدیث ۶۴۵۔ ۶۴۶، ص ۵۲، "لم اجد" باحدی وعشرین")

میں نے سوچا، اگر میں ستائیس مرتبہ نماز پڑھ لوں تو شاید جماعت فوت ہوجانے سے جو کمی ہوئی وہ پوری ہوجائے۔ چنانچہ، میں نے ستائیس مرتبہ عشاء کی نماز پڑھی، پھر مجھے نیند نے آلیا۔ میں نے اپنے آپ کو چند گُھڑسواروں کے ساتھ دیکھا، ہم سب کہیں جارہے تھے۔ اتنے میں ایک گھڑسوار نے مجھ سے کہا:

تم اپنے گھوڑے کو مشقت میں نہ ڈالو، بے شک تم ہم سے نہیں مل سکتے۔ میں نے کہا:

میں آپ کے ساتھ کیوں نہیں مل سکتا؟ کہا:

اس لئے کہ ہم نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی ہے۔

لفظِ زکوۃ کی تحقیق:

(زك و) الزکاۃ (Zakat)

اس کے اصل معنی اس نمو (افزونی۔ بڑھوتری) کے ہیں جو برکت الٰہیہ سے حاصل ہو اس کا تعلق دنیاوی چیزوں سے بھی ہے اور اخروی امور کے ساتھ بھی چنانچہ کہا جاتا ہے زکا الزرع بز کو کھیتی کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا اور آیت:

"اَیُّہَآ اَزْکٰی طَعَامًا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 19)

کس کا کھانا زیادہ صاف ستھرا ہے۔ میں ازکی سے ایسا کھانا مراد ہے جو حلال اور خوش انجام ہو اور اسی سے زکوۃ کا لفظ

مشتق ہے یعنی وہ حصہ جو مال سے حق الٰہی کے طور پر نکال کر فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوۃ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعہ اس میں نمو ہوتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے تسمیہ میں ان ہر دو کا لحاظ کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ دونوں خوبیاں زکوۃ میں موجود ہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا:

"وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 43)

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔

اور تزکیہ نفس سے ہی انسان دنیا میں اوصاف حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب بھی اسی کی بدولت حاصل ہوگا اور تزکیہ نفس کا طریق یہ ہے کہ انسان ان باتوں کی کوشش میں لگ جائے جن سے طہارت نفس حاصل ہوتی ہے اور فعل تزکیہ کی نسبت تو انسان کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے جیسے فرمایا:

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰىهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 9)

کہ جس نے اپنی روح کو پاک کیا (وہ ضرور اپنی) مراد کو پہنچا۔

اور کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فی الحقیقت وہی اس کا فاعل ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"بَلِ اللّٰهُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 49)

بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔

اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَکِّیْهِمْ بِهَا" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 103)

کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو۔

"یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 151)

کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا۔

اور کبھی اس کی نسبت عبادت کی طرف ہوتی ہے کیونکہ عبادت تزکیہ کے حاصل کرنے میں بمنزلہ آلہ کے ہے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

"وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً" (سورۃ مریم آیت نمبر 13)

اور اپنی طرف سے مہربانی اور ستھرائی۔

"لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَکِیًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 19)

کہ میں تجھے ایک ستھرا بیٹا دوں۔

یعنی وہ فطرتاً پاکیزہ ہوگا اور فطرتی پاکیزگی جیسا کہ بیان کر چکے ہیں۔ بطریق اجتباء حاصل ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیتا ہے اور یہ پاکیزگی تعلیم و ممارست سے نہیں بلکہ محض توفیق الٰہی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اکثر انبیاء اور رسل کے ساتھ ہوا ہے۔ اور آیت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ لڑکا آئندہ چل کر پاکیزہ اخلاق ہوگا لہٰذا زکیا کا تعلق زمانۂ حال کے ساتھ نہیں بلکہ استقبال کے ساتھ ہے۔

قرآن میں ہے: "وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 4)

اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔ یعنی وہ عبادت اس غرض سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کر دے یا وہ اپنے نفوس کو پاک کرنے کی غرض سے عبادت کرتے ہیں والمال واحد۔ لہٰذا الزکوۃ میں لام تعلیل کے لیے ہے جسے لام علت و قصد کہتے ہیں اور لام تعدیہ نہیں ہے حتیٰ کہ یہ فاعلون کا مفعول ہو۔ انسان کے تزکیہ نفس کی دو صورتیں ہیں ایک تزکیہ بالفعل یعنی اچھے اعمال کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرنا یہ طریق محمود ہے چنانچہ آیت کریمہ:

"قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا" (سورۃ الشمس آیت نمبر 9)

بے شک مراد کو پہنچا جس نے اسے ستھرا کیا۔

اور آیت: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" (سورۃ الاعلیٰ آیت نمبر 14)

- میں تزکیہ سے یہی مراد ہیں۔

دوسرے تزکیہ بالقول ہے جیسا کہ ایک ثقہ شخص دوسرے کے اچھے ہونیکی شہادت دیتا ہے۔ اگر انسان خود اپنے اچھا ہونے کا دعوےٰ کرے اور خودستائی سے کام لے تو یہ مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تزکیہ سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ" (سورۃ النجم آیت نمبر32) اپنے آپ کو پاک نہ ٹھہراؤ۔

اور یہ نہی تادیبی ہے کیونکہ،

میاں مٹھو:

انسان کا اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا نہ تو عقلاً ہی درست ہے اور نہ ہی شرعاً۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دانشمند سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی بات ہے جو باوجود حق ہونے کے زیب نہیں دیتی تو اس نے جواب دیا مدح الانسان نفسہ کہ خودستائی کرنا۔

زکوٰۃ ادا کرنے کے جہاں بے شمار ثوابات ہیں نہ دینے والے کے لئے وہاں خوفناک عذابات بھی ہیں، چنانچہ اعلیٰ حضرت، امامِ اہلسنت، مولٰینا شاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن قران و حدیث میں بیان کردہ عذابات کا نقشہ کھینچتے ہوئے

فرماتے ہیں،

خُلاصہ یہ ہے کہ جس سونے چاندی کی زکوٰۃ نہ دی جائے، روزِ قیامت جہنّم کی آگ میں تپا کر اُس سے اُن کی پیشانیاں، کروٹیں، پیٹھیں داغی جائیں گی۔ اُن کے سر، پستان پر جہنّم کا گرم پتھر رکھیں گے کہ چھاتی توڑ کر شانے سے نکل جائیگا اور شانے کی ہڈّی پر رکھیں گے کہ ہڈّیاں توڑتا سینے سے نکل آئے گا، پیٹھ توڑ کر کروٹ سے نکلے گا، گُدّی توڑ کر پیشانی سے اُبھرے گا۔ جس مال کی زکوٰۃ نہ دی جائے گی روزِ قیامت پُرانا خبیث خونخوار اَژدہا بن کر اُس کے پیچھے دوڑے گا، یہ ہاتھ سے روکے گا، وہ ہاتھ چبالے گا، پھر گلے میں طوق بن کر پڑے گا، اس کا مُنہ اپنے مُنہ میں لے کر چبائے گا کہ میں ہوں تیرا مال، میں ہُوں تیرا خزانہ۔ پھر اسکا سارا بدن چباڈالے گا۔ والعِیاذ باللہ ربِ العٰلمین۔ (فتاوٰی رضویہ جدید ج۱۰ ص ۱۵۳)

گرم سکّہ:

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ زکوٰۃ نہ دینے والے کو قیامت کے عذاب سے ڈرا کر سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں، اے عزیز! کیا خدا اور رسول عَزَّ وَجَلَّ وصلّی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہٖ وسلَّم کے فرمان کو یونہی ہنسی ٹھٹّھا سمجھتا ہے یا (قیامت کے ایک دن یعنی) پچاس ہزار برس کی مدّت میں یہ جانکاہ مُصیبتیں جھیلنی سَہل جانتا ہے، ذرا یہیں کی آگ میں ایک آدھ روپیہ (چھوٹا سا سکّہ) گرم کر کے بدن پر رکھ کر دیکھ، پھر کہاں یہ خفیف (ہلکی سی) گرمی، کہاں وہ قہر آگ، کہاں یہ ایک ہی روپیہ کہاں وہ ساری عمر کا جوڑا ہوا مال، کہاں یہ مِنٹ بھر کی دیر کہاں وہ ہزار دن برس کی آفت، کہاں یہ ہلکا سا چہکا (یعنی معمولی سا داغ) کہاں وہ ہڈّیاں توڑ کر پار ہونے والا غضب۔ اللہ تعالیٰ مسلمان کو ہدایت بخشے۔ (فتاوٰی رضویہ از امام احمد رضا خان بریلوی جدید ج ۱۰ ص ۱۵۳)

لفظِ رکوع کا مفہوم:

(ر ك ع) الرکوع (Genuflection)

اس کے اصل معنی انحناء یعنی جھک جانے کے ہیں اور نماز میں خاص شکل میں جھکنے پر بولا جاتا ہے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے معنی میں آتا ہے خواہ بطورِ عبادت ہو یا بطورِ عبادت نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا" (سورۃ الحج آیت نمبر 77)

اے ایمان والو رکوع اور سجدہ کرو۔

"وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 43)

اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

"وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 125)

اعتکاف والوں اور رکوع و سجود والوں کے لئے۔

"الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 112)

رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے۔

شعر:

شاعر نے کہا ہے:

أخبّر أخبار القرون الّتی مضت   أدبّ کأنّی کلّما قمت راکع

ترجمہ: میں گذشتہ لوگوں کی خبر دیتا ہوں (میں سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے) رینگ کر چلتا ہوں اور خمیدہ پشت کھڑا ہوتا ہوں۔

صحابہ کرام اور رکوع:

امیر المؤمنین حضرت سیّدنا ابوبکر صدیق رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نماز میں میخ (ٹھوکنے) کی طرح اور حضرت سیّدنا عبداللہ بن زبیر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ ستون کی طرح کھڑے ہوتے اور بعض صحابہ رکوع میں اتنے پُرسکون ہوتے کہ ان پر چڑیاں بیٹھ جاتیں گویا وہ جمادات میں سے ہیں (جو حرکت نہیں کرتے)۔

نوٹ: لفظِ انّی کا بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 44]

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (44)

''کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں''۔

متن:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ تقریر مع توبیخ وتعجیب. والبر: التوسع فی الخیر، من البر وهو الفضاء الواسع یتناول کل خیر، ولذلك قیل البر ثلاثة: بر فی عبادة الله تعالى، وبر فی مراعاة الاقارب، وبر فی معاملة الاجانب.

وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وتترکونها من البر کالمنسیات، وعن ابن عباس رضی الله عنهما أنها نزلت فی أحبار المدینة، کانوا یأمرون سراً من نصحوه باتباع محمد صلّی الله علیه وسلّم ولا یتبعونه. وقیل: کانوا یأمرون بالصدقة ولا یتصدقون. وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ تبکیت کقوله: وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ أی تتلون التوراة، وفیها الوعید على العناد وترك البر ومخالفة القول العمل.

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ قبح صنیعکم فیصدکم عنه، أو أفلا عقل لکم یمنعکم عما تعلمون

وخامة عاقبته.

والعقل فى الاصل الحبس، سمى به الإدراك الإنسانى لأنه يحبسه عما يقبح، ويعقله على ما يحسن، ثم القوة التى بها النفس تدرك هٰذَا الإدراك. والآية ناعية على من يعظ غيره ولا يتعظ بنفسه سوء صنيعه وخبث نفسه، وأن فعله فعل الجاهل بالشرع أو الاحمق الخالى عن العقل، فإن الجامع بينهما تأبى عنه شكيمته، والمراد بها حث الواعظ على تزكية النفس والإقبال عليها بالتكميل لتقوم فيقيم غيره، لا منع الفاسق عن الوعظ فإن الإخلال بأحد الامرين المأمور بهما لا يوجب الإخلال بالآخر.

ترجمہ:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ　　کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں مقصود کا اقرار کرایا جا رہا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ زجر و توبیخ کی جا رہی ہے اور ان کو حیرت و تعجب کی دعوت بھی دی جا رہی ہے۔ "بِرّ" کا معنی خیر میں وسیع ہونے کا ہے۔ یہ "بر" باء کے فتحہ کے ساتھ ابّاء سے مشتق ہے بمعنی کشادہ فضاء۔ "بر" ہر طرح کی خیر کو شامل ہے اسی لئے کہا گیا کہ "بِرّ" تین ہیں۔ پہلی بِر فی عبادۃ اللہ۔۔۔الخ یعنی ایک نیکی وہ ہے جس کا مظاہرہ اللہ کریم کی عبادت کی صورت میں ہوتا ہے، دوسری وہ نیکی ہے جس کا اظہار رشتہ داروں کا لحاظ رکھنے کی صورت میں ہوتا ہے تیسری قسم کی وہ نیکی ہے جو اجانب سے معاملات کرتے ہوئے ظاہر ہوتی ہے۔

تنسون انفسکم

کا معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو نیکی سے ایسا دور چھوڑتے ہو جیسے بھولی بسری چیز کو چھوڑ دیا جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت علماء یہود کے متعلق نازل ہوئی جن کا عمل یہ تھا کہ جن کو ان کی خیر خواہی مقصود ہوتی انہیں چپکے سے حضرت محمد ﷺ کی اتباع کا حکم کرتے تھے اور خود اتباع نہیں کرتے تھے۔ بعض نے کہا کہ وہ صدقہ و خیرات کا حکم دیتے تھے اور خود صدقہ نہیں دیتے تھے۔

وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ　　حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔

اس جملہ کا مقصود عار دلانا اور دھمکی دینا مقصود ہے جیسا کہ ارشاد ہے "وانتم تعلمون" یہاں کتاب سے مراد تورات ہے، اور آیت میں عناد اور ترک برّ اور مخالفت قول و عمل پر وعید ہے۔

أَفَلَا تَعْقِلُونَ　　کیا تمہیں عقل نہیں۔

یعنی کیا تم اپنے عمل کی قباحت نہیں سوچتے کہ یہ سوچنا تم کو عملِ قبیح سے باز رکھے یا کیا تمہیں ذرا بھی عقل نہیں ہے جو تم کو اس چیز سے روک دے جس کے انجام کی خرابی کو تم جانتے ہو۔

اور عقل دراصل روکنے اور مقید کرنے کا نام ہے۔ اور ادراک انسانی کو عقل اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قبیح چیزوں سے انسان کو روکتا ہے۔ اور عمدہ چیزوں کو اس پر جما دیتا ہے۔ پھر عقل اس قوت کا نام ہے جس کے ذریعہ نفس انسانی ادراک کرتا ہے اور آیت کریمہ ان لوگوں ک بدعملی اور خبث نفس کا اظہار کر رہی ہے، جو دوسروں کو تو نصیحت کرتے ہیں لیکن خود نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ نیز آیت کریمہ یہ بتا رہی ہے کہ یہ عمل اسی شخص کا ہوسکتا ہے جو شریعت سے ناواقف ہے۔ یا ایسا احمق ہے جو عقل سے بالکل خالی ہے کیونکہ جو شخص عقل وشریعت دونوں کا جامع ہو اس کی طبیعت ایسے عمل سے اباء کرتی ہے۔

اور مقصود یہ ہے کہ واعظ کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے اور تزکیہ کی جانب پوری طرف متوجہ ہوتا کہ خود سیدھا ہو جائے، پھر دوسروں کو سیدھا کر سکے۔ مقصود یہ نہیں کہ فاسق کو وعظ گوئی سے روک دیا جائے، اس لئے کہ اگر دو چیزیں مامور بہ ہوں اور ان میں کسی ایک کی بجا آوری میں بھی کمی کی جائے۔

تحقیق حرفِ الف بالتکلّف :

(ا) : الف

بامعنی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شروع کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔ تیسرا وہ جو آخر کلام میں آئے۔

پہلی قسم :

وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے۔ اس کی چند قسمیں ہیں :

الف الاستخبار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے بجائے کہنا الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس میں عمومیت ہے جو استفہام وانکار نفی تبکیت پر زجر وتوبیخ تسویہ سب پر حاوی ہے۔ چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا۔

" اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 30)

(انہوں نے کہا) کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت وخون کرتا پھرے۔

اور تبکیت یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور کبھی غیر کو، چنانچہ (قسم اول کے متعلق) فرمایا:

" اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ " (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 20)

تم اپنی لذتیں حاصل کر چکے۔

" اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ عَهۡدًا " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 80)

کیا تم نے اللہ سے اقرار لے رکھا ہے؟

" آٰلۡـٰٔنَ وَقَدۡ عَصَيۡتَ قَبۡلُ " (سورۃ یونس آیت نمبر 91)

کیا اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟

اور غیر مخاطب کے متعلق فرمایا:

"اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا" (سورۃ یونس آیت نمبر 2)

کیا لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے؟

"اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

تو کیا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں؟

"اَفَاِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 34)

بھلا اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

"آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 143)

کیا اس نے دونوں نر حرام کئے یا دونوں مادہ۔

اور معنی تسویہ میں فرمایا:

"سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا" (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 21)

ہم پر ایک سا ہے چاہے بے قراری کریں یا صبر سے رہیں۔

"سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 6)

انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں۔

اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل ہو تو اسے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اخرج (وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں نفی خروج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر نفی کے معنی نہ ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا۔ اور جب کلام منفی پر داخل ہو تو اسے مثبت بنا دیتا ہے۔ کیونکہ کلام منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی ہوئی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ فرمایا:

"اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 172)

کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں (یعنی ضرور ہوں)۔

"اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ" (سورۃ التین آیت نمبر 8)

کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے یعنی ضرور ہے۔

"اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 41)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں۔

"اَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ " (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 133)

کیا ان کے پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔

"اَوَلَا يَرَوْنَ " (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 126)

اور کیا یہ نہیں دیکھتے۔

" اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم " (سورۃ فاطر آیت نمبر 37)

اور کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی۔

دوسری قسم:

الف جو مضارع کے صیغہ واحد متکلم کے شروع میں آتا ہے اور میں" کے معنی رکھتا ہے جیسے اسمع و ابصر یعنی میں سنتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں۔

تیسری قسم:

ہمزہ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی جیسے فرمایا:

" اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ "(سورۃ المائدۃ آیت نمبر 114)

ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

"رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ " (سورۃ التحریم آیت نمبر 11)

اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

چوتھی قسم:

الف جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے لئے آیا ہے جیسے فرمایا،

" اَلْعَالَمِيْنَ " (سورۃ الفاتحۃ آیت نمبر 2)

تمام جہانوں۔

پانچویں قسم:

پھر اس کی تین اقسام ہیں:

1۔ الف نداء جیسے ازید (اے زید)

2۔ وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس کی پہلی قسم الف تثنیہ ہے (مثلا رجلان) اور دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں پائی جاتی ہے مثلا مسلمات و مساکین۔

3۔ اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا ہے۔ وہ یا تو تانیث کے لئے ہوتا ہے جیسے حبلی اور بیضاء میں آخری الف یا پھر تثنیہ میں ضمیر کے لئے جیسا کہ

"اِذْهَبَا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 36)

میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے جیسے

"وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10)

"فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 67)

تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لئے آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے (جیسا کہ ابیات کے اواخر میں الف "اشباع بڑھا دیتے ہیں)

امر کا معنیٰ:

(ا م ر) الامر (اسم) (Behest)

کے معنی شان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع امور ہے اور امر تہ (ن) کا مصدر بھی امر آتا ہے جس کے معنی حکم دینا کے ہیں امر کا لفظ جملہ اقوال وافعال کے لئے عام ہے۔ چنانچہ آیات:

"وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ" (سورۃ ہود آیت نمبر 123)

اور تمام امور کا رجوع اسی طرف ہے۔

لفظِ برّ کا مفہوم:

(ب ر ر) البر (Goodness,Virtue)

یہ بحر کی ضد ہے (اور اس کے معنی خشکی کے ہیں) پھر معنی وسعت کے اعتبار سے اس سے البر کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جس کے معنی وسیع پیمانہ پر نیکی کرنا کے ہیں اس کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جیسے،

""اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ" (سورۃ الطور آیت نمبر 28)

بیشک وہ احسان کرنے والا مہربان ہے۔

اور کبھی بندہ کی طرف جیسے بدالعبدربہ (یعنی بندے نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی) چنانچہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ طرف ہو تو اس کے معنی ثواب عطا کرنا ہوتے ہیں اور جب بندہ کی طرف منسوب ہو تو اطاعت اور فرمانبرداری کے البر (نیکی) دو قسم پر ہے اعتقادی اور عملی اور آیت کریمہ:۔

"لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 177)

کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو.

دونوں قسم کی نیکی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسی بنا پر جب نبی کریم ﷺ سے بر کی تفسیر دریافت کی گئی تو آپ ﷺ نے جواباً یہی آیت تلاوت فرمائی کیونکہ اس آیت میں عقائد و اعمال فرائض و نوافل کی پوری تفصیل بتائی جاتی ہے۔ بر الوالدین کے معنی ہیں ماں اور باپ کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ اور احسان کرنا اس کی ضد عقوق ہے۔ قرآن میں ہے۔

" لَا یَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡكُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِیَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ "(سورۃ الممتحنۃ آیت نمبر 8)

جن لوگوں میں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا ہے۔

اور بر کے معنی سچائی بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی خیر ہے جس میں وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔

بر فی یمینه

اس نے اپنی قسم پوری کر دکھائی۔

اور شاعر کے قول،

اکون مکان البر منه۔

میں بعض نے کہا ہے کہ بر بمعنی فواد یعنی دل ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی بر بمعنی نیکی ہے یعنی میرا مقام اس کے ہاں بمنزلہ بر کے ہوگا۔ بر اباہ فھو بار و بر صیغہ صفت جو کہ صائف وصیف و طائف وطیف کی مثل دونوں طرح آتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے،

" وَبَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ " (سورۃ مریم آیت نمبر 32)

اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے۔

اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا (بنا) بر فی یمینه فھو باز ابر رته قسم پوری کرنا۔ برت یمینی میری قسم پوری ہوگئی۔ حج مبرور حج جس میں رفث و فسق اور جدال نہ ہو۔ البار کی جمع ابرار و بررۃ آتی ہے قرآن میں ہے۔

"اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ " (سورۃ الانفطار آیت نمبر 13)

بے شک نکوکار ضرور چین میں ہیں۔

مزید فرمایا: " كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الۡاَبۡرَارِ لَفِیۡ عِلِّیِّیۡنَ "(سورۃ المطففین آیت نمبر 18)

ہاں ہاں بے شک نیکوں کی لکھت سب سے اونچا محل علیین میں ہے۔

اور آیت کریمہ: " كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ "(سورۃ عبس آیت نمبر 16)

جو سردار اور نیکوکار ہیں۔

بررۃ اور البربر:

مندرجہ بالا میں خاص کر فرشتوں کو بررۃ کہا ہے کیونکہ ابرار (جمع) زیادہ بلیغ ہے۔ اس لئے کہ بررۃ، بر کی بنسبت عدل میں مبالغہ پایا جاتا ہے اسی طرح بد میں بار سے زیادہ مبالغہ ہے البربر خاص ربیلو کے درخت کے پھل کو کہتے ہیں عام محاورہ ہے:

بلی اور چوہا:

"فلان لایعرف البر من الھر "
وہ چوہے اور بلی میں تمیز نہیں کرسکتا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ حکایت کی صورت کے طور پر بولے جاتے ہیں مگر اس محاورہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خیرخواہ اور بدخواہ میں امتیاز نہیں کرسکتا۔ البربرۃ بڑبڑ کرنا یہ بھی حکایت صورت کے قبیل سے ہے۔

لفظِ نسیان کی تحقیق:

(ن س ی) النسیان (Forget)

یہ سنیتہ نسیانا کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کو ضبط میں نہ رکھنے کے ہیں خواہ یہ ترک ضبط ضعف قلب کی وجہ سے ہو یا ازارہ غفلت ہو یا قصدا کسی چیز کی یاد بھلادی جائے حتیٰ کہ وہ دل سے محو ہوجائے قرآن میں ہے:

"وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْماً " (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 115)
ہم نے پہلے آدم (علیہ السلام) سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ دیکھا۔

" فَذُوْقُوا بِمَا نَسِيْتُمْ " (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 14)
سو اب آگ کے مزے چکھو اس لئے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

" فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَا اَنْسَانِيْهُ اِلَّا الشَّيْطَانُ " (سورۃ الکہف آیت نمبر 63)
تو میں مچھلی وہیں بھول گیا۔ اور مجھے آپ سے اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

"لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ " (سورۃ الکہف آیت نمبر 73)
کہ جو بھول مجھ سے ہوئی اس پر مواخذہ نہ کیجئے۔

"" فَنَسُوْا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 14)
مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی ایک حصہ فراموش کردیا۔

" ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ " (سورۃ الزمر آیت نمبر 8)

پھر جب وہ اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دے دیتا ہے تو جس کام کے لئے پہلے اس کو پکارتا ہے اسے بھول جاتا ہے اور

آیت:

"سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى" (سورۃ الاعلیٰ ایت نمبر 6)

ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسا بنا دے گا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سنو گے اسے بھولنے نہیں پاؤ گے پھر ہر وہ نسیان جو انسان کے قصد اور ارداہ سے ہو وہ مذموم ہے اور جو بغیر قصد اور ارادہ کے ہو اس میں انسان معزور ہے۔

حدیث پاک:

اور حدیث میں جو مروی ہے رفع عن امتی الخطاء والنسیان کہ میری امت کو خطا اور نسیان معاف ہے۔

تو اس سے یہی دوسری قسم کا نسیان مراد ہے یعنی جس میں انسان کے ارادہ کو دخل نہ ہو اور آیت کریمہ:

"فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ" (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 14)

سو اب آگ کے مزے چکھو اس لئے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

اس آیت میں نسیان بمعنی اول ہے یعنی وہ جس میں انسان کے قصد اور ارادہ کو دخل ہو اور کسی چیز کو حقیر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا جائے۔ پھر جب نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے از راہ اہانت انسان کو چھوڑ دینے اور احکام الٰہی کے ترک کرنے کی وجہ سے اسے سزا دینے کے معنی مراد ہوتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 51)

تو جس طرح یہ لوگ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اس طرح آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔

"نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 67)

انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔

"وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ" (سورۃ الحشر آیت نمبر 19)

اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے۔

میں متنبہ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے سے ہی معرفت الٰہی حاصل کر سکتا ہے لہٰذا انسان کا اللہ تعالیٰ کو بھلا دینا خود اپنے آپکو بھال دینے کے مترادف ہے اور آیت کریمہ:

"وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ" (سورۃ الکھف آیت نمبر 24)

اور جب خدا کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو۔

کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ معنی کئے ہیں کہ جب تم کوئی بات کہو اور اس کے ساتھ انشاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو

یاد آنے پر انشاء اللہ کہہ لیا کرو۔ اسی لئے ابن عباس کے نزدیک حلف میں کچھ مدت کے بعد بھی انشاء اللہ کہنا جائز ہے اور عکرمہ نے کہا ہے کہ نسیت بمعنی ارتکبت ذنبا کے ہے۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب تمہیں کسی گناہ کے ارتکاب کا خیال آئے تو اس وسوسہ کو دفع کرنے کے لئے اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جایا کرو تا کہ وہ وسوسہ دفع ہو جائے۔ النسی کے اصل معنی ماینسی یعنی فراموش شدہ چیز کے ہیں جیسے نقض بمعنی ماینقض آتا ہے۔ مگر عرف میں نسی اس معمولی چیز کو کہتے ہیں جو در خود اعتناء نہ سمجھی جائے۔

لفظ تلا (تلاوت) کا معنی:

(ت ل و) تلاہ (ن) (Recate,Recital)

کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنا کے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی اجنبی چیز حائل نہ ہو یہ کہیں تو جسمانی طور ہوتا ہے اور کہیں اس کے احکام کا اتباع کرنے سے اس معنی میں اس کا مصدر تلو اور تلوآتا ہے اور کبھی یہ متابعت کسی کتاب کی قراءت (پڑھنے) اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے غور و فکر کرنے کی صورت میں ہوتی ہے اس معنی کے لئے اس کا مصدر تلاوۃ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَالْقَمَرِ اِذَا تَلاھَا "(سورۃ الشمس آیت نمبر 2)

اور چاند کی جب اس کے پیچھے آئے۔

تلاوت قرآن کی فضیلت:

اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی بارگاہ میں بروزِ قیامت قرآن پاک سے زیادہ کسی شفاعت کرنے والے کا مرتبہ نہ ہوگا۔ نہ کسی نبی کا، نہ فرشتے کا اور نہ ہی کسی اور کا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

بے شک اللہ عَزَّ وَجَلَّ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے سورہ طٰہٰ اور سورہ یٰسین کی تلاوت فرمائی۔ جب فرشتوں نے قرآن کو سنا تو کہا: مبارک ہو اس امت کے لئے جن پر یہ قرآن نازل ہوگا، مبارک ہیں وہ سینے جو اسے اٹھائیں گے اور خوشخبری ہے ان زبانوں کے لئے جو اس کی تلاوت کریں گی۔

(سنن الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل سورۃ طٰہٰ ویٰس، الحدیث ۳۴۱۴، ج ۲، ص ۵۴۷ تا ۵۴۸)

تلاوت نہ کرنے والے کا انجام:

حضرت سیّدُنا اَنس بن مالک رضی اللہ تعالٰی عنہ نے ارشاد فرمایا:

بہت سے تلاوتِ قرآن کرنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے۔

حضرت سیّدُنا ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ فرماتے ہیں:

دوزخ کے فرشتے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے نافرمان حاملین قرآن کو بت پرستوں سے بھی جلدی پکڑیں گے۔

قرآن اور دوست کا میسج :

توراتِ شریف میں ہے، اللہ عَزَّ وَجَلَّ ارشاد فرماتا ہے:

اے میرے بندے! کیا تجھے مجھ سے حیاء نہیں آتی؟ تیرے پاس کسی دوست کا خط آتا ہے اور تو راستے میں چل رہا ہو تو راستے سے ہٹ کر اسے پڑھنے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے ایک ایک حرف میں غور کرتا ہے حتی کہ تو اس سے کچھ بھی نہیں چھوڑتا اور یہ میری کتاب ہے جسے میں نے تیری طرف اتارا ہے، دیکھ! میں نے اس میں تیرے لئے کتنی باتوں کو تفصیل سے بیان کیا اور کتنی باتوں کو تکرار سے بیان کیا تاکہ تو اس کے طول و عرض میں غور و فکر کرے پھر تو اس سے منہ پھیرتا ہے، کیا میں تیرے نزدیک تیرے بھائی سے بھی پیچھے ہوں؟

اے میرے بندے! تیرا بھائی تجھے کوئی واقعہ سناتا ہے تو تُو پوری طرح متوجہ ہو کر سنتا ہے اور پوری دل جمعی سے اس کی باتوں کو سنتا ہے، اگر کوئی درمیان میں بات کرتا ہے یا تجھے اس کی بات سے بے توجہ کرتا ہے تو تو اشارے سے اسے روکتا ہے جب کہ میں تیری طرف متوجہ ہوں اور تجھ سے کلام کرتا ہوں اور تو اپنا دل مجھ سے پھیر لیتا ہے کیا تو نے مجھے اپنے بھائی سے بھی ہلکا سمجھ رکھا ہے؟ اللہ عَزَّ وَجَلَّ اس سے بہت زیادہ بلند و اعلیٰ ہے۔ (لباب الاحیاء (احیاء العلوم کا خلاصہ) صفحہ نمبر 117)

موسیقی کے ساتھ قرآن کی تاوت:

مَزامیر (یعنی آلاتِ موسیقی) کے ساتھ قرآنِ پاک پڑھنا کفر ہے۔ (بہارِ شریعت حصہ 9 ص 182)

عقل کی تعریف:

(ع ق ل) العقل (Intellect)

اس قوت کو کہتے ہیں جو قبول علم کے لئے تیار رہتی ہے اور وہ علم جو اس قوت کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اسے بھی عقل کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 43)

اور انہیں نہیں سمجھتے مگر علم والے۔

عقل کے معانی:

اس کے کئی معانی ہیں لیکن ہمارے یہاں اس سے مراد دو معانی ہیں۔

پہلا معنی:

اشیاء کے حقائق کا علم۔

دوسرا معنی:

عقل سے مراد وہ عالَم ہے جس کے لئے علم صفت کی طرح ہوتا ہے اور اس معنی سے مراد وہ لطیفۂ ربانی ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور عقل سے پہلا معنی مراد لینا ممکن نہیں کیونکہ حضور نبی کریم، رءُوف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اللہ عَزَّ وَجَلَّ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرمایا پھر اس سے فرمایا: آگے بڑھ۔

تو وہ بڑھی، پھر فرمایا: پیچھے ہو۔

تو وہ پیچھے ہوگئی۔ (حلیۃ الاولیاء، سفیان بن عیینۃ، الحدیث ۱۰۸۹۴، ج ۷، ص ۳۷۲)

حضرت سیِّدُنا سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

دل عرش (کی مثل) اور سینہ کرسی (کی طرح) ہے۔

یہ فرمان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی دل سے مراد صنوبری شکل کے گوشت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

آدھی دنیا سے زیادہ عقل:

حضرت سیِّدُنا علی بن عاصم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ارشاد فرمایا:

اگر نصف (یعنی آدھے) اہلِ زمین کی عقلوں سے امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عقل کا مُوازَنہ کیا جائے تو بھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عقل زیادہ ہوگی۔ (تبییض الصحیفۃ فی مناقب الامام ابی حنیفۃ للسیوطی ص ۱۲۸)

[سورة البقرة (2) : آية 45]

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلاةِ وَإِنَّها لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخاشِعِينَ (45)

”اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور بیشک نماز ضرور بھاری ہے مگر ان پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں“۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلاةِ متصل بما قبله، كأنهم لما أمروا بما يشق عليهم لما فيه من الكلفة وترك الرياسة والإعراض عن المال عولجوا بذلك، والمعنى استعينوا على حوائجكم بانتظار النجح والفرج توكلاً على الله أو بالصوم الذي هو صبر عن المفطرات لما فيه من كسر الشهوة، وتصفية النفس. والتوسل بالصلاة والالتجاء إليها، فإنها جامعة لأنواع العبادات النفسانية والبدنية، من الطهارة وستر العورة وصرف المال فيهما، والتوجه إلى الكعبة والعكوف للعبادة، وإظهار الخشوع بالجوارح، وإخلاص النية بالقلب، ومجاهدة الشيطان، ومناجاة الحق، وقراءة القرآن، والتكلم

بالشهادتين وكف النفس عن الاطيبين حتى تجابوا إلى تحصيل المآرب وجبر المصائب.

روى أنه عليه الصلاة والسلام كان إذا حزبه أمر فزع إلى الصلاة

ويجوز أن يراد بها الدعاء:

وَإِنَّهَا: أي وإن الاستعانة بهما أو الصلاة وتخصيصها برد الضمير إليها. لعظم شأنها واستجماعها ضروباً من الصبر. أو جملة ما أمروا بها ونهوا عنها.

لَكَبِيرَةٌ لثقيلة شاقة كقوله تعالى: كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ.

إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ أي المخبتين. والخشوع الإخبات ومنه الخشعة للرملة المتطامنة. والخضوع اللين والانقياد. ولذلك يقال الخشوع بالجوارح والخضوع بالقلب.

ترجمہ:

اس آیت کریمہ کا ماقبل سے تعلق ہے گویا ان کو جب اس چیز کا حکم دیا گیا جو آپ پر دشوار تھی کیونکہ اس میں کلفت تھی اور سرداری کا ترک تھا اور مال سے اعراض تھا تو اس حکم کے ذریعے ان کا علاج کیا گیا، تو آیت کریمہ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ کامیابی کا انتظار کر کے اور کشادگی غم کا انتظار کر کے اللہ کریم پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی ضروریات پر اللہ کریم سے مدد طلب کرنا، یا معنیٰ یہ ہوگا کہ روزہ کے ذریعے مدد طلب کرو کیونکہ روزہ نام ہے مفطرات سے صبر کرنے کا اس لئے اس میں شہوت کو توڑنا اور نفس کو پاک صاف رکھنا پایا جاتا ہے۔ اور مدد چاہو نماز کے ذریعے، نماز کو وسیلہ بناؤ، او نماز کی جانب پناہ پکڑو، کیونکہ نماز عبادات قلبیہ و بدنیہ کی تمام قسموں کو جائز ہے۔ اس میں طہارت ہے، سترِ عورت ہے، صَرفِ مال ہے، توجہ قبلہ ہے، عبادت کے لئے محبوس ہوتا ہے، اعضاء و جوارح کے ذریعے خشوع کا اظہار ہے، دل کی نیت کا خالص رکھنا، شیطان سے مجاہدہ ہے، اللہ کریم سے شرف مناجات کا حصول ہے، قراتِ قرآن ہے، شہادتین کی ادائیگی ہے اور نفس کو اطیبین یعنی دو لذیذ ترین چیزوں سے روکنا ہے۔ الغرض نماز کو وسیلہ بناؤ تا کہ تمہاری ضرورتیں پوری کی جائیں او مصائب کی تلافی کی جائے، حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جب کوئی اہم بات درپیش ہوتی تو آپ ﷺ نماز کی جانب پناہ پکڑتے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ صلوٰۃ سے مراد دعا ہو۔

وانّها لكبيرة

یعنی استعانت بالصبر والصلوٰۃ یا صرف صلوٰۃ اور صلوٰۃ کی تخصیص اور خاص طور پر اسی کی جانب ضمیر کا لوٹانا اس لئے ہے کہ صلوٰۃ عظیم الشان ہے اور صبر کی بہت سی قسموں کو جامع ہے، یا "انها" کا مرجع وہ تمام چیزیں ہیں جن کا،

یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی الّتی

ہے

واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ

تک حکم دیا گیا ہے، اور وہ تمام چیزیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔

کبیرۃ

اس کا معنی ثقیل اور دشوار ہے، کیونکہ اللہ کریم کا ارشاد ہے،

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ.

مشرکین پر وہ چیز شاق اور دشوار ہے جس کی طرف آپ ان کو دعوت دے رہے ہیں۔

اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ

خاشعین وہ ہیں جو عاجزی کرنے والے ہیں۔ خشوع کے معنی عاجزی کرنے کے ہیں، اسی سے خشعۃ لیا گیا ہے جس کا معنی بچھا ہوا اور زمین پر پھیلا ہوا ریت ہے۔۔ اور خضوع معنی نرم ہونا اور فرمانبردار ہونا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خشوع اعضاء و جوارح کا ہوتا ہے اور خضوع دل کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

استعانۃ:

الاستعانہ

مدد طلب کرنا قرآن میں ہے:

"اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 45)

صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔

صبر کی تعریف:

(ص ب ر) الصبر (Patience) کے معنی ہیں کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا۔ لہٰذا الصبر کے معنی ہوئے عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا۔

"وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 35)

صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور روزہ کو صبر کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ضبط نفس کی ایک قسم ہے۔

حدیث پاک:

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"صیام شهر الصَّبْرِ وثلاثةِ أیّام فی کلّ شهر یذهب وحر الصّدر"
ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں۔

تحقیقِ خشوع:

(خ ش ع) الخشوع (ن) (Humility)

کے معنی ضواعۃ یعنی عاجزی کرنے اور جھک جانے کے ہیں۔ مگر زیادہ تر خشوع کا لفظ جوارح اور ضراعت کا لفظ قلب کی عاجزی پر بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک روایت میں ہے:

اذا ضرعت القلب خشعت الجوارح جب دل میں فروتنی ہو تو اسی کا اثر جوارح پر ظاہر ہو جاتا ہے قرآن میں ہے:

"وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا "(سورۃ الاسراء آیت نمبر 109)
اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

""اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ "(سورۃ المؤمنون آیت نمبر 2)
جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں۔

"وَكَانُوْا لَنَا خَاشِعِيْنَ "(سورۃ الانبیاء آیت نمبر 90)
اور ہمارے آگے عاجزی کیا کرتے تھے۔

"وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ "(سورۃ طٰهٰ آیت نمبر 108)
آوازیں پست ہو جائیں گے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ (سورۃ النازعات آیت نمبر 9)
یہ ان کی نظروں کے مضطرب ہونے سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ زمین و آسمان کے متعلق بطور کنایہ کے فرمایا۔

"اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا "(سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 4)
جب زمین کانپے گی تھرتھرا کر۔

"وإذا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا "(سورۃ الزلزلۃ آیت نمبر ۱)
جب زمین تھرتھرا دی جائے جیسا اس کا تھرتھرانا ٹھہرا ہے۔

"يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَاءُ مَوْرًا وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا "(سورۃ الطور آیت نمبر 9-10)
جس دن آسمان ہلنا سا ہلنا ہلیں گے اور پہاڑ چلنا سا چلنا چلیں گے۔

[سورة البقرة (2) : آية 46]

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ راجِعُونَ (46)

”جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا“۔

متن:

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ راجِعُونَ أي يتوقعون لقاء الله تعالى ونيل ما عنده أو يتيقنون أنهم يحشرون إلى الله فيجازيهم، ويؤيده أن في مصحف ابن مسعود يعلمون وكأن الظن لما شابه العلم في الرجحان أطلق عليه لتضمن معنى التوقع، قال أوس بن حجر:

فأَرْسَلتُهُ مُستَيْقِنَ الظن أنَّه ... مُخالِطُ ما بينَ الشَّرا سِيفِ جائِفُ

وإنما لم تثقل عليهم ثقلها على غيرهم فإن نفوسهم مرتاضة بأمثالها، متوقعة في مقابلتها ما يستحقر لأجله مشاقها ويستلذ بسببه متاعبها، ومن ثمة قال عليه الصلاة والسلام «وجعلت قرة عيني في الصلاة».

ترجمہ:

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ راجِعُونَ۔

جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا

وہ اللہ کریم سے ملاقات کی امید رکھتے ہیں اور جو اجر ان کے پاس ہے اس کو پانے کی امید رکھتے ہیں۔ یا معنیٰ یہ ہیں کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کو اللہ کریم کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا۔ پھر ان کو بدلہ عطا فرمائے گا۔ اس معنیٰ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں "یعلمون" آیا ہے اور ظن اعتقاد راجح ہونے میں چونکہ یقین سے مشابہ ہے اس لئے "ظن" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ تا کہ توقع کے معنیٰ کی تضمین ہو جائے اور اوس بن حجر کا شعر ہے،

فأَرْسَلتُهُ مُستَيْقِنَ الظن أنَّه ... مُخالِطُ ما بينَ الشَّرا سِيفِ جائِفُ

میں نے تیر کو اس علم پر یقین کرتے ہوئے چھوڑا کہ وہ شکار کی پسلیوں کے درمیان سے جائے گا اور شکم میں نفوذ کرے گا۔

اور خاشعین پر نماز اتنی ثقیل نہیں جتنی کہ غیر خاشعین پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے وہ نماز جیسی چیزوں کے خوگر ہیں اور نماز کے بدلے وہ ان جزاؤں کی توقع رکھتے ہیں جن کی وجہ سے نماز کی مشقتیں معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان ہی جزاؤں کے سبب نماز کے تعب میں ڈالنے والی چیزیں ان کو لذیذ معلوم ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وجعلت قرة عینی فی الصلاة

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے۔

لفظ ظن کا مفہوم:

(ظ ن ن) الظن (Doubt, To Presume)

گمان:

جس بات کی طرف نفس جھک جائے اور دل اس کی طرف مائل ہو جائے اسے گمان کہتے ہیں۔

اور ظن چونکہ عام طور پر برا ہوتا ہے اس لئے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

"وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا" (سورۃ یونس آیت نمبر 36)

اوران میں اکثر تو نہیں چلتے مگر گمان پر۔

بدگمانی کی حرمت کا سبب:

بدگمانی حرام ہونے کا سبب یہ ہے کہ دل کے بھیدوں کو سوائے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے کوئی نہیں جانتا اور جب تک کسی شخص کی برائی اس طرح ظاہر نہ دیکھو کہ اس میں تاویل کی گنجائش باقی نہ رہے اس وقت تک تمہارے لئے اس کے بارے میں برائی کا عقیدہ رکھنا جائز نہیں اور جب اس طرح دیکھو کہ اس میں کوئی تاویل کی گنجائش باقی نہ رہے تو اس وقت جو بات تمہیں معلوم ہوئی یا جس کا تم نے آنکھوں سے مُشاہدہ کیا ہے اس کا اعتقاد رکھے بغیر تو کوئی چارہ نہیں لیکن جس بات کو تم نے آنکھوں سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کانوں سے سنا پھر بھی وہ تمہارے دل میں آ گئی تو یہ شیطان نے ڈالی ہے، لہٰذا اسے جھٹلانا چاہئے کہ شیطان سب سے بڑا فاسق ہے۔ (احیاء العلوم جلد نمبر 3 صفحہ نمبر 455)

[سورة البقرة (2) : آية 47]

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (47)

"اے اولادِ یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی"۔

متن:

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ كرره للتأكيد وتذكير التفضيل الذي هو أجل النعم خصوصاً، وربطه بالوعيد الشديد تخويفاً لمن غفل عنها وأخل بحقوقها.

وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عطف على نعمتي.

عَلَى الْعَالَمِيْنَ أي عالمي زمانهم، يريد به تفضيل آباءهم الذين كانوا في عصر موسى عليه الصلاة والسلام وبعده. قبل ان يغيروا بما منحهم الله تعالى من العلم والإيمان والعمل الصالح، وجعلهم أنبياء وملوكاً مقسطين. واستدل به على تفضيل البشر على المَلَك وهو ضعيف.

ترجمہ:

يَابَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

اے اولادِ یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا۔

یہ خطاب مکرر اس لئے لایا گیا ہے تا کہ تاکید ہو جائے اور اس تفضیل وتکریم کی یاددہانی ہو جائے۔ جو خاص طور پر اُن انعامات کی وجہ سے متحقق ہوئی، نیز تکرار کا مقصود یہ بھی ہے کہ اس خطاب کو شدید وعید کے ساتھ جوڑ دیا جائے تا کہ جو نعمتوں سے غافل ہیں ان کی ادائیگیِ حقوق میں کوتاہی کر رہے ہیں ان کی تخویف ہو اور وہ ڈریں۔

وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ۔

اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی۔

یہ عبارت "نعمتی" پر معطوف ہے۔ اور "العالمین" سے مراد ان کے دور کا عالم ہے، مراد یہ ہے کہ یہود کے وہ آباؤ اجداد جو حضرت موسیٰ علیہ اسلا مکے دور کے بعد ہوئے اور ابھی انہوں نے اللہ کریم کی عطا کردہ چیزوں مثلاً علم، ایمان اور عملِ صالح میں تبدیلی نہیں کی تھی، اُن کو فضیلت عطا کی، اور ان کو نبی بنایا اور منصف بادشاہ بنایا اور بعض نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ انسان افضل ہیں فرشتوں سے، لیکن یہ استدلال کمزور ہے۔

الذکریٰ کا معنیٰ:

الذکریٰ۔ کثرت سے ذکر الٰہی کرنا اس میں الذکر سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن میں ہے:

"ذَكَّرْتُهُ كذا"

قرآن میں ہے: " وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللهِ " (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 5)

اور ان کو اللہ کے دن یاد دلاؤ۔

اور آیت کریمہ: " فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰى " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 282)

تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔

کے بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلا دے۔ اور بعض نے یہ معنیٰ کئے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذکر

بنا دے گی۔ بعض علماء نے آیت کریمہ :۔

"فَاذْكُرُونِيْ أَذْكُرْكُمْ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 152)

سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

" اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 40)

یاد کرو میرا وہ احسان۔

میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ کے مخاطب نبی کریم ﷺ کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الٰہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس نے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔ اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الٰہی میں غور فکر کرتے رہو حتی کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔

تحقیق لفظِ فضل:

(ف ض ل) الفضل (Virtue) ۔

کے معنیٰ کسی چیز کے اقتضا (متوسط درجہ سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے محمود جیسے علم وحلم وغیرہ کی زیادتی مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا لیکن عام طور الفضل اچھی باتوں پر بولا جاتا ہے اور الفضول بری باتوں میں اور جب فضل کے معنیٰ ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(1) برتری بلحاظ جنس کے جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔

(2) برتری بلحاظ نوع کے جیسے نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا:

" وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ " (سورۃ الاسراء آیت نمبر 70)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

(3) فضیلت بلحاظ ذات مثلاً ایک شخص کا دوسرے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی فضیلت بلحاظ جو ہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا مثلاً گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لئے اس کا اکتساب عین ممکن ہے

چنانچہ آیات کریمہ:

" وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ "(سورۃ النحل آیت نمبر 71)

اور اللہ نے رزق (دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

" لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ " (سورۃ الاسراء آیت نمبر 12)

تا کہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔
میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔
نوٹ: لفظِ عالم اور نعمت کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 48]

وَاتَّقُوا يَوْماً لاَّ تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئاً وَلا يُقْبَلُ مِنْها شَفاعَةٌ وَلا يُؤْخَذُ مِنْها عَدْلٌ وَلا هُمْ يُنْصَرُونَ (48)

”اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے اور نہ ان کی مدد ہو“۔

متن:

وَاتَّقُوا يَوْماً أى ما فيه من الحساب والعذاب.

لا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئاً لا تقضى عنها شيئاً من الحقوق، أو شيئاً من الجزاء فيكون نصبه على المصدر، وقرء لا تجزء من أجزأ عنه إذا أغنى وعلى هٰذَا تعين أن يكون مصدراً، وإيراده منكراً مع تنكير النفسين للتعميم والإقناط الكلى والجملة صفة ليوماً، والعائد فيها محذوف تقديره لا تجزى فيه، ومن لم يجوز حذف العائد المجرور قال: اتسع فيه فحذف عنه الجار وأجرى مجرى المفعول به ثم حذف كما حذف من قوله: أم مال أصابوا.

وَلا يُقْبَلُ مِنْها شَفاعَةٌ وَلا يُؤْخَذُ مِنْها عَدْلٌ أى من النفس الثانية العاصية، أو من الاولى، وكأنه أريد بالآية نفى أن يدفع العذاب أحد عن أحد من كل وجه محتمل، فإنه إما أن يكون قهراً أو غيره، والاول النصرة، والثانى إما أن يكون مجاناً أو غيره. والاول أن يشفع له والثانى إما بأداء ما كان عليه وهو أن يجزى عنه، أو بغيره وهو أن يعطى عنه عدلاً. والشفاعة من الشفع كأن المشفوع له كان فرداً فجعله الشفيع شفعًا بضم نفسه إليه. والعدل الفدية. وقيل: البدل وأصله التسوية سمى به الفدية لأنها سويت بالمفدى، وقرأ ابن كثير وأبو عمرو ولا تقبل بالتاء.

وَلا هُمْ يُنْصَرُونَ يمنعون من عذاب الله. والضمير لما دلت عليه النفس الثانية

المنكرة الواقعة في سياق النفس من النفوس الكثيرة. وتذكيره بمعنى العباد. أو الاناسي والنصر أخص من المعونة لاختصاصه بدفع الضر. وقد تمسكت المعتزلة بهذه الآية على نفي الشفاعة لأهل الكبائر. وأجيب بأنها مخصوصة بالكفار للآيات والاحاديث الواردة في الشفاعة. ويؤيده أن الخطاب معهم. والآية نزلت رداً لما كانت اليهود تزعم أن آباءهم تشفع لهم.

ترجمہ:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا اور ڈرو اس دن سے۔

یہاں یوماً سے مراد وہ دن ہے جس دن حساب اور جزا و عذاب ہوگا۔

لا تجزی نفس عن نفس

جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی۔

یعنی کوئی بھی شخص کسی دوسرے کی طرف سے کوئی حق ادا نہیں کر کرے گا، اس تقدیر پر شئیاً کا نصب مصدر یعنی مفعول مطلق ہونے کی بنا پر ہوگا اور ایک قرات "لا تُجزیٔ" بھی ہے یہ "اجزاء عنہ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کام آیا۔ اس صورت میں شیئاً کا مفعول مطلق ہونا متعین ہے اور شیئاً کو اور دونوں "نفس" کو نکرہ لانا عموم پیدا کرنے اور کلی طور پر مایوس کرنے کے لئے ہے۔ اور "لا تجزی۔۔ الخ" کا جملہ یوماً کی صفت واقع ہے۔ اور جملہ موصوف کی جانب رجوع ہونے والی ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی "لا تجزی فیھا" اور جو لوگ ضمیر عائد مجرور کا حذف جائز قرار نہیں دیتے وہ کہتے ہیں کہ جملہ میں اتباع سے کام لیا گیا ہے یعنی "فیہ" کے حرف جار کو حذف کر کے عائد کو مفعول بہ کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ پھر اس مفعول بہ کو بھی حذف کر دیا گیا جیسا کہ شاعر کے اس کلام میں اسی طرح کا تصرف اور حذف ہوا ہے، کلام ہے

أم مال أصابوا. وَلا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْل

اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے۔

یہاں ضمیریں اب "نفس" کی طرف راجع ہیں۔ جو پہلے جملہ میں دوسرے نمبر پر مذکور ہیں یعنی نفسِ عاصی معنی یہ ہوں گے نہیں قبول کی جائے گی نفس ثانیہ عاصیہ کی طرف سے کوئی سفارش الخ۔ یا یہ کہ ضمیر نفس اولیٰ کی جانب راجع ہے معنی یہ ہوں گے کہ نفسِ اولیٰ اگر کوئی سفارش کرنا چاہے گا تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے گی اور گویا آیت کریمہ سے مقصود یہ ہے کہ کوئی بھی شخص ہو طرح کی کوشش کر لے تب بھی وہ کسی دوسرے سے عذاب کو دور نہیں کر سکتا اس لئے کہ دفع عذاب یا تو قہر اور غلبہ کے ذریعہ ہوگا یا اس کے بغیر، پہلی صورت نصرت کی ہے، اور دوسری صورت کی دو قسمیں ہیں پہلی یہ کہ دفع عذاب بلا عوض ہو اور دوسری یہ کہ بالعوض ہو۔

بلاعوض یہ ہے کہ اس کے لئے سفارش کی جائے اور بالعوض کی دوصورتیں ہیں یا تو اس حق کی ادائیگی کے ذریعہ جو اس پر عائد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مجرم کی جانب سے خود اپنے اعمال کو بدلے میں پیش کردے یا اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت ہو اور وہ یہ ہے کہ اس کی طرف سے فدیہ ادا کردے۔

"شفاعة" یہ مشتق ہے شفع سے جس کا معنیٰ :نت ہے گویا مشفوع لہ تنہا تھا اور شفیع نے اس کو جفت بنادیا بایں طور کہ خود کو اس کے ساتھ شامل کردیا اور "عدل" کے معنیٰ فدیہ کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنیٰ بدل ہے اور اس کا اصل معنیٰ ہے برابر رکھنا۔ اس نام کے ساتھ فدیہ کو اسلئے موسوم کیا گیا ہے کہ فدیہ مفدی کے برابر ہوتا ہے اور ابن کثیر اور ابوعمر نے "ولا تقبل" تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

ولا هم ينصرون اور نہ ان کی مدد ہو۔

یعنی ان کو اللہ کریم کے عذاب سے نہیں بچایا جائے گا۔ اور "ولا هم ينصرون" کی ضمیر ان نفوسِ کثیرہ کی جانب راجع ہے جن کے اوپر نفس ثانیہ دلالت کرتا ہے جو کہ نکرہ ہے اور نفی کے تحت داخل ہے اور اس کو مذکر لانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بندوں اور انسانوں کے معنیٰ میں ہے۔ اور نصرت معونہ کے معنیٰ میں خاص مطلق ہے، کیونکہ نصرت کے مفہوم میں مدد کے ساتھ ساتھ دفع ضرر کی خصوصیّت بھی ہے۔ اور معتزلہ نے اس آیت کے ذریعہ اس پر استدلال کیا ہے کہ اہل کبائر کی شفاعت نہیں ہوسکتی اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت کفّار کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرینہ وہ آیات واحادیث ہیں جو شفاعت کے سلسلہ میں وارد ہیں اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ خطاب کفار سے ہے اور آیت کریمہ یہود کے اس دعویٰ کی تردید کے لئے اتری کہ ان کے اباؤ اجداد ان کے لئے سفارش کریں گے۔

تعریفِ لفظِ یوم:

(ی و م) الیوم (ن) (Day)

یہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے اور عربی زبان میں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ زمانہ (ایک دن کا ہو یا ایک سال اور صدی کا یا ہزار سال کا ہو) کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو۔ قرآن میں ہے:

"اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 155)

بے شک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں۔

لفظ جزاء کا معنیٰ:

(ج ز ی) الجزاء (ض) (Reward)

کافی ہونا۔ قرآن میں ہے:

"لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 48-123)

کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا۔

الجزاء کا معنیٰ:

الجزاء (اسم)

کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو جیسے خیر کا بدلہ خیر سے اور شر کا بدلہ شر سے دیا جائے۔ کہا جاتا ہے۔ جزیتہ کذا بکذا میں نے فلاں کو اس کے عمل کا ایسا بدلہ دیا قرآن میں ہے:

"وَذٰلِكَ جَزَآءُ مَنْ تَزَكّٰى" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 76)

اور یہ صلہ ہے اس کا جو پاک ہوا۔

قبل و تقبل کی تحقیق:

قبل اور تقبل کے معنی کسی چیز کو اس طرح قبول کرنے کے ہیں کہ وہ عوض کی مقتضی ہو جیسے ہدیہ وغیرہ قرآن میں ہے:

"اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 16)

یہی لوگ ہیں جن کے اعمال نیک ہم قبول کریں گے۔

"اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 27)

اللہ اسی سے قبول کرتا ہے جسے ڈر ہے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر عیادت قبول نہیں ہوتی بلکہ وہی قبول کی جاتی ہے جو مخصوص طریق سے ادا کی جائے۔ فرمایا:

"مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 35)

تو اسے میری طرف سے قبول فرما۔

کفالۃ کو قبالۃ کہا جاتا ہے کیونکہ کفالۃ کے معنی مؤکی طور پر کسی چیز کو قبول کر لینے کے ہیں تو آیت فتقبل منی میں کفالت کے معنی معتبر ہیں اور لکھے ہوئے عہد کو قبالۃ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

"فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 37)

تو اُسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تقبلها کے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تکلفها کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے درحقیقت مجھے بہت بڑی کفالت کا ذمہ دار بنا دیا ہے۔

لفظ شفاعۃ کی عمدہ تحقیق:

الشفاعة (To Mediate,Entreaty)

کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا شفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں۔ عام طور پر کسی بڑے باعزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اسکی مدد کے لئے شامل ہو جانے پر بولا جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز شفاعت بھی اسی قبیل سے ہوگی۔ قرآن میں ہے،

"لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا" (سورۃ مریم آیت نمبر 87)

اس دن کسی کی شفاعت کام نہ دے گی مگر اس کی جسے رحمٰن نے اذن دے دیا ہے۔

" لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ "(سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 109)

لوگ شفاعت کے مالک نہیں مگر وہی جنہوں نے رحمٰن کے پاس قرار کر رکھا ہے۔

" لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا " (سورۃ النجم آیت نمبر 26)

جن کی شفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی۔

"وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى " (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 28)

وہ اس کے پاس کسی کی سفارش نہیں کر سکتے مگر اس شخص کی جس سے خدا خوش ہو۔

"فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِیْنَ" (سورۃ المدثر آیت نمبر 48)

تو انہیں سفارشیوں کی سفارش کام نہ دے گی۔

یعنی جن معبودوں کو یہ اللہ کے سو سفارش کے لئے پکارتے ہیں۔ وہ ان کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔

" مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ " (سورۃ مومن آیت نمبر 18)

نہ کوئی دوست نہ کوئی سفارشی۔

"مَنْ یَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً " (سورۃ النساء آیت نمبر 85)

جو اچھی سفارش کرے۔

اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔ یعنی جو شخص اچھے یا برے کام میں کسی کی مدد اور سفارش کرے گا وہ بھی اس فعل کے نفع و نقصان میں اس کا شریک ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں شفاعت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے لئے کسی اچھے یا برے مسلک کی بنیاد رکھے اور وہ اس کی اقتداء کرنے تو وہ ایک طرح سے اس کا شفیع بن جاتا ہے۔

حدیث پاک:

جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من سنّ سنّة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها، ومن سنّ سنّة سيّئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها"

کہ جس شخص نے اچھی رسم جاری کی اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اسے اجر ملے گا اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا گناہ ہوگا۔ اور جو اس پر عمل کرے گا اس کے گناہ میں بھی وہ شریک ہوگا۔ اور آیت کریمہ؛

"مَا مِنْ شَفِيعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ" (سورۃ یونس آیت نمبر 3)

کوئی (اس کے پاس) اس کا اذن لیے بغیر کسی کی سفارش نہیں کرسکتا۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اکیلا ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور نظام کائنات کے چلانے میں کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ ہاں جب وہ امور کی تدبیر و تقسیم کرنے والے فرشتوں کو اجازت دیتا ہے تو وہ اس کی اجازت سے تدبیر امر کرتے ہیں۔

شَفَّعَهُ اور شَفَّعَه کا معنی:

"واسْتَشْفَعْتُ بفلان على فلان فَتَشَفَّعَ لي"

میں نے فلاں سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد لی۔

وشَفَّعَهُ: کے معنی کسی کی شفارش قبول کرنے کے ہیں۔ اور اسی کا فرمان ہے،

القرآن شَافِعٌ مُشَفَّعٌ

کہ قرآن شافع اور مشفع ہوگا یعنی قرآن کی سفارش قبول کی جائے گی۔

الشُّفْعَة کے معنی ہیں کسی مشترکہ چیز کے فروخت ہونے پر اس کی قیمت ادا کرکے اسے اپنے ملک میں شامل کرلینا۔ یہ شفع سے مشتق ہے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

"إذا وقعت الحدود فلا شُفْعَة"

جب حدود مقرر ہوجائیں تو حق شفعہ باقی نہیں رہتا۔

حافِظ کتنے اَفراد کی شَفاعت کرے گا؟

عرض: حضور حافظ کتنوں کی شفاعت کرے گا سنا گیا ہے کہ اپنے اَعِزّا (یعنی رشتہ داروں میں) سے دس شخصوں کی؟

ارشاد: ہاں۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب فی فضل من تعلم القران وعلمہ، الحدیث ۲۱۶، ج ۱، ص ۱۴۱)

اور اُس کے ماں باپ کو قیامت کے دن ایسا تاج پہنایا جائے گا جس سے مشرق سے مغرب تک روشن ہو جائے اور شہید پچاس شخصوں کی، حاجی ستر کی، اور علما بے گنتی لوگوں کی شفاعت کریں گے۔ حتیٰ کہ عالم کے ساتھ جن لوگوں کو کچھ بھی تعلق ہوگا، اُس کی شفاعت کریں گے۔ کوئی کہے گا:

میں نے وُضو کے لئے پانی دیا تھا، کوئی کہے گا: میں نے فلاں کام کر دیا تھا۔ لوگوں کا حساب ہوتا جائے گا اور وہ جنّت کو بھیجے جائیں گے، علما کا حساب کب کا ہو چکا ہوگا اور وہ روکے جائیں گے۔ عرض کریں گے:

الٰہی (عَزَّ وَجَلَّ) لوگ جا رہے ہیں ہم کیوں روکے گئے ہیں؟ فرمایا جائے گا:

تم آج میرے نزدیک فرشتوں کی مانند ہو شفاعت کرو کہ تمہاری شفاعت سے لوگ بخشے جائیں۔ ہر سُنّی عالم سے فرمایا جائے گا اپنے شاگردوں کی شفاعت کر اگرچہ آسمان کے ستاروں کے برابر ہوں۔ (ملفوظات اعلیٰ حضرت صفحہ نمبر 92)

لفظِ اخذ کی تحقیق:

(اخ ذ) الاخذ (Hold, To Catch)

کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کر لینا جمع کر لینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 79)

کہا خدا کی پناہ کہ ہم لیں مگر اسی کو جس کے پاس ہمارا مال ملا۔

اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں جیسے فرمایا:

"لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 255)

اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند۔

تحقیق عمیق للفظ العدل:

(ع دل) العدالة والمعادلة (Justice)

کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں اور معنی اضافی کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے یعنی ایک دوسرے کے ہم وزن اور برابر ہوتا اور عدل عدل کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن عدل کا لفظ معنوی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے احکام شرعیہ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

"اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 95)

او عدل ذلک صیاما یا اس کے برابر روزے رکھنا اور عدل وعدیل کے الفاظ ان چیزوں کے لئے بولے جاتے ہیں جن

کا ادراک حواس ظاہرہ سے ہوتا ہے جیسے وہ چیزیں جن کا تعلق ماپ تول یا وزن سے ہوتا ہے پس عدل کے معنی دو چیزوں کا برابر ہونا کے ہیں چنانچہ اسی معنی میں مروی ہے،

"بالعدل قامت السموت والارض"

کہ عدل ہی سے آسمان وزمین قائم ہیں یعنی اگر عناصر اربعہ جن کا ئنات نے ترکیب پائی ہے میں سے ایک عنصر میں بھی اس کی معینہ مقدار سے کمی یا بیشی ہو جائے تو نظام کائنات قائم نہیں رہ سکتا،

العدل دو قسم پر ہے

عدل مطلق:

جو عقلاً مستحسن ہوتا ہے یہ نہ تو کسی زمانہ میں منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی کسی اعتبار سے تعدی کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے مثلاً کسی کے احسان کے بدلہ میں اس پر احسان کرنا اور جو تمہیں تکلیف نہ دے اسے ایذا رسانی سے باز رہنا وغیرہ۔

عدل شرعی:

جسے شریعت نے عدل کہا ہے اور یہ منسوخ بھی ہو سکتا ہے جیسے قصاص جنایات کی دیت اور مال مرتد کی اصل وغیرہ چنانچہ

آیات:

"فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 194)

پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے۔ واپس ہی تم اس پر کرو۔

"وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 40)

اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔ میں زیادتی اور برائی کی سزا کا کام بھی زیادتی اور برائی ہی قرار دیا ہے۔ اور

آیت کریمہ:

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 90)

خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

میں عدل کے یہی معنی مراد کیونکہ کسی چیز کے برابر اس کا بدلہ دینے کا نام عدل یعنی نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے اور نیکی کے مقابلہ میں زیادہ نیکی اور شر کے مقابلہ میں مسامحت سے کام لینے کا نام احسان ہے اور لفظ عدل واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے رجل عدل عادل ورجال عدل شاعر نے کہا ہے:

فهم رضا وهم عدل

وہ راضی رہنے والے اور عادل ہیں۔

دراصل عدل کا لفظ مصدر ہے چنانچہ آیت:

"وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 2)

اور اپنے میں سے دو منصب مردوں کو گواہ بنالو میں عدل کے معنی عدالہ ہیں قرآن میں ہے:

"وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ" (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 15)

اور مجھے حکم ہوا کہ تم میں انصاف کروں۔

"لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 8)

اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر امادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو۔

اور آیت کریمہ: "وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 129)

اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کرسکو گے۔

اس آیت میں انسان کے طبعی میلان کی طرف اشارہ ہے کہ تمام بیویوں سے برابر وجہ کی محبت اس کی قدرت سے باہر ہے۔

اور آیت کریمہ: "فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً" (سورۃ النساء آیت نمبر 3)

اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کرسکو گے تو ایک عورت کافی ہے۔

میں عدل سے نان ونفقہ اور ازدواجی تعلقات میں برابری مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:

"اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 95)

اس کے برابر روزے رکھنا۔ میں عدل سے مراد یہ ہے کہ وہ روزے طعام سے فدیہ کے برابر ہوں کیونکہ فدیہ میں مساوات کے معنی ملحوظ ہوں تو اسے بھی عدل کہہ دیا جاتا ہے اور

لا یقبل منہ صرف ولا عدل

میں بعض نے کہا ہے کہ عدل کا لفظ فریضہ سے کنایہ ہے مگر اس کے اصل معنی وہی ہیں جو ہم بیان کرچکے ہیں اور صرف کا لفظ نافلۃ سے اور یہ اصل فرض سے بڑھ کر کام کرنے کا نام ہے لہٰذا یہ باہم تقابل کے اعتبار سے عدل اور احسان کے ہم مثل ہیں اور لا یقبل منہ کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے پاس کسی قسم کی نیکی ہوگی جو قبول کی جائے اور یہ آیت:

"بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 1)

کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوسروں کو خدا کی مثل اور نظیر قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا یہ آیت: "هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 100)

کے ہم معنی ہوگی بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ وہ افعال الٰہیہ کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں بعض نے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے عدول کرنا مراد لیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ" (سورۃ النمل آیت نمبر 60)

بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

بھی اسی معنی پر محمول ہو سکتی ہے یعنی اس کے معنی یعدلون بہ کے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عدل عن الحق سے مشتق ہو جس کے معنی حق سے ہٹ جانا کے ہیں۔ ایام معتدلات معتدل زمانہ یعنی جب رات دن برابر ہوتے ہیں۔ عادل بین الامرین اس نے دو چیزوں کے درمیان موازنہ کیا عادل الامر کسی معاملہ میں پھنس گیا اور کسی ایک جانب فیصلہ نہ کر سکا اور جب کسی شخص کی زندگی سے مایوسی ہو جائے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے:

وضع علی یدی عَدْل

یعنی اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

نصرت کا معنی:

(ن ص ر) النصر والنصر (Help, Support)

کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"نَصْرٌ مِنَ اللهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ" (سورۃ الصف آیت نمبر 13)

اللہ کی مدد اور جلد آنے والی فتح۔

"إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ" (سورۃ النصر آیت نمبر 1)

جب اللہ کی مدد آ پہنچی۔

نوٹ: لفظ وقی، نفس اور شئی کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 49]

وَإِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ (49)

"اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی کہ تم پر برا عذاب کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام"۔

متن:

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ تفصيل لما أجمله في قوله: اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وعطف على نِعْمَتِيَ، وقرئ أنجيتكم. وأصل آلٍ أهل لأن تصغيره أهيل، وخص

بالإضافة إلى أولى الخطر كالانبياء والملوك. وفِرْعَوْنَ لقب لمن ملك العمالقة ككسرى وقيصر لملكي الفرس والروم. ولعتوهم اشتق منه تفرعن الرجل إذا عتا وتجبر. وكان فرعون موسى، مصعب بن ريان، وقيل ابنه وليد من بقايا عاد. وفرعون يوسف عليه السلام، ريان، وكان بينهما أكثر من أربعمائة سنة.

يَسُومُونَكُمْ يبغونكم، من سامه خسفاً إذا أولاه ظلماً، وأصل السوم الذهاب في طلب الشيء.

سُوءَ الْعَذَابِ أفظعه فإنه قبيح بالإضافة إلى سائره. والسوء مصدر ساء يسوء ونصبه على المفعول ليسومونكم، والجملة حال من الضمير في نجيناكم، أو من آلِ فِرْعَوْنَ أو منهما جميعًا لأن فيها ضمير كل واحد منهما.

يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ بيان ليسومونكم ولذلك لم يعطف، وقرئ «يَذْبَحُونَ» بالتخفيف.

وإنما فعلوا بهم ذلك لأن فرعون رأى في المنام، أو قال له الكهنة: سيولد منهم من يذهب بملكه فلم يرد اجتهادهم من قدر الله شيئاً.

وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ محنة، إن أشير بذلكم إلى صنيعهم، ونعمة إن أشير به إلى الإنجاء، وأصله الاختبار لكن لما كان اختبار الله تعالى عباده تارة بالمنحة أطلق عليهما، ويجوز أن يشار بذلكم إلى الجملة ويراد به الامتحان الشائع بينهما.

مِنْ رَبِّكُمْ بتسليطهم عليكم، أو ببعث موسى عليه السلام وتوفيقه لتخليصكم، أو بهما. عَظِيمٌ صفة بلاء. وفي الآية تنبيه على أن ما يصيب العبد من خير أو شر إختبار من الله تعالى، فعليه أن يشكر على مساره ويصبر على مضاره ليكون من خير المختبرين.

ترجمہ:

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ

اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی۔

"اذکروا نعمتی الّتی علیکم" میں جو بات مجمل تھی یہ اس کی تفصیل ہے وہاں مجملاً یہ فرمایا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل میرے انعامات کو یاد کرو۔ لیکن وہ انعامات کیا ہیں؟ ان کی تفصیل "واذ نجّیناکم" سے شروع ہوتی ہے۔ "اذ نجّیناکم" کا عطف نعمتی پر ہے نعمتی عام ہے اور اذ نجینا کم خاص ہے۔ لہذا یہ عطف خاص علی العام ہے۔ جیسے کہ الملائکہ پر

جبریل و میکائیل کا عطف، عطف خاص علی العام ہے۔ ایک قرات انجیناکم کی بھی ہے، مفہوم دونوں قراتوں کا ایک ہی ہے۔

آل کی اصل "اھل" ہے بدلیل أھیل کیونکہ یہ اس کی تصغیر ہے اور تصغیر اسماء کو ان کی اصل کی طرف لوٹاتی ہے۔ آل کا مضاف الیہ ہمیشہ مشہور اور اہم شخصیت ہوتی ہے جیسا کہ انبیاء و ملائکہ وغیرہ۔ نیز مفسر ابن جریر کہتے ہیں کہ عرب کے استعمال عام سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا مضاف الیہ ہمیشہ ذی عقل ہوتا ہے۔ لہٰذا آل مدینہ یا آل مکہ نہیں کہیں گے اور اگر کہیں ایسا ہو تو شاذ و نادر ہی ہے۔ قومِ عمالقہ کے بادشاہ کا لقب فرعون ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسریٰ، شاہ فارس کا اور قیصر شاہ روم کا لقب ہے چونکہ شاہانِ عمالقہ سرکش تھے اس لئے فرعون سے مشتق کر کے

تفرعن الرجل

بولتے ہیں یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی سرکشی کرے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جو فرعون تھا اس کا نام مصعب بن ریان تھا بعض نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاصر مصعب کا بیٹا ولید ہے، یہ قوم عاد کی نسل میں سے بچے ہوئے لوگوں میں سے ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کے فرعون کا نام ریان ہے۔ فرعونِ موسیٰ اور فرعونِ یوسف کے درمیان چار سو سال (400) سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔

"سوء العذاب"

قبیح ترین عذاب تھا۔

تمام کا تمام قبیح اور شنیع ہے اس کی تمام اقسام قبیح ہیں لہٰذا سوء العذاب کی تفسیر عذاب قبیح سے نہیں کی جا سکتی ورنہ سوء کا مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کا مفہوم اسی وقت ادا ہوگا جب کہ اس کی تفسیر قبیح ترین عذاب سے کی جائے۔

"السوء"۔ یہ ساء یسوء سے مصدر ہے جس کا معنیٰ ہے رنج پہنچانا، تکلیف دینا۔ "سوء العذاب یسومونکم" کا مفعول ثانی ہے اور اسی بناء پر منصوب ہے۔ جملہ "یسومونکم" نجیناکم کی ضمیر مفعول بہ یا آلِ فرعون سے حال ہے، یا یہ کہ دونوں سے حال واقع ہے کیونکہ اس میں دونوں کی ضمیریں موجود ہیں، ترجمہ یہ ہوگا، اور یاد کرو وہ وقت کہ جب ہم نے تم کو آلِ فرعون سے نجات بخشی اس حال میں کہ وہ تم کو بدترین عذاب چکھا رہے تھے۔

"یذبّحون ابناءکم ویستحیون نساءکم" یہ جملہ یسومونکم کا بیان ہے اور بیان و مبیّن کے درمیان چونکہ کمالِ اتصال ہوتا ہے اس لئے اس کا اُس پر عطف نہیں کیا گیا۔ اور ایک قرات "یذبحون" بغیر تشدید کے ہے، اور آلِ فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ یہ سلوک اس لئے کیا کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا یا اس سے نجومیوں نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں وہ شخص پیدا ہونے والا ہے جو تمہاری سلطنت کو ختم کر دے گا۔ لیکن فرعونیوں کی یہ تمام تر کوششیں اللہ کریم کی تقدیر کو کچھ بھی دور نہ کر سکیں۔

وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ

یہاں پر اگر "ذالکم" کا مشار الیہ آلِ فرعون کا سلوک قرار دیا جائے تو "بلاء" سے مراد محنت اور آزمائش ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ فرعونیوں کے اس سلوک میں تمہارے لئے بڑی آزمائش تھی، اور اگر "ذالکم" کا مشار الیہ "نجیناکم" کا مانا جائے تو بلاء کے معنیٰ نعمت ہوں کے ہوں گے، تو دریں صورت ترجمہ یہ ہوگا، اور ہمارے نجات دینے میں بہت بڑا انعام تھا۔ "بلاء" کے اصل معنیٰ امتحان لینے اور جانچنے کے ہیں لیکن اللہ کریم کا امتحان کبھی مصیبت کے ذریعہ ہوتا ہے اور کبھی انعام اور عطیات کے ذریعہ، اس لئے "بلاء" کا اطلاق دونوں معانی پر ہوسکتا ہے۔ اور ایک تیسری صورت یہ ہے کہ "ذالکم" کا مشار الیہ دونوں چیزوں کا مجموعہ قرار دیا جائے یعنی حق تعالیٰ کا انجاء اور آلِ فرعون کی تعذیب اور "بلاء" سے امتحان اور آزمائش کے معنی مراد لئے جائیں جو دونوں کے درمیان مشترک ہیں۔

بلاء من ربکم

ابتلاء یا انعام جو تمہارے رب کی طرف سے تھا ابتلاء کا اللہ کریم کی طرف سے ہونا اس لئے تھا کہ اس نے آلِ فرعون کو تمہارے اوپر مسلط کر دیا تھا، اور انعام کا اللہ کریم کی طرف سے ہونا اس طرح تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان کو اس کی توفیق بخشی کہ تم کو نجات دلائیں۔ اور جب "ذالکم" کا مشار الیہ دونوں چیزوں کا مجموعہ قرار دیا جائے تو "بلاء من ربکم" کی تفسیر یہ ہوگی کہ اللہ کریم نے یہ دونوں موقعے دیئے۔ آلِ فرعون کو تمہارے اوپر مسلط بھی کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے تمہیں نجات بھی عطا کی۔

"عظیم" یہ بلاء کی صفت ہے اور آیت کریمہ میں اس حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ بندہ کو جو خیر یا شر پیش آتا ہے وہ اللہ کریم کی جانب سے آزمائش ہے۔ بندے کا کام یہ ہے کہ اللہ کریم کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر ادا کرے اور اس کے بھیجے ہوئے مصائب پر صبر کرتا رہے تاکہ خیر المختبرین یعنی امتحان میں اچھا جانچا ہوا اور اچھا نکلا ہوا قرار پائے۔

نجو کا مفہوم:

(ن ج و) نجو (Forgiving)

اصل میں نجاء کے معنیٰ کسی چیز سے الگ ہونے کے ہیں۔ اسی سے نجا فلان من فلان کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ نجات پانے کے ہیں اور انجیتہ و نجیتہ کے معنیٰ نجات دینے کے چنانچہ فرمایا:

"وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (سورۃ النمل آیت نمبر 53)

اور جو لوگ ایمان لائے ان کو ہم نے نجات دی۔

لفظِ فرعون کا معنیٰ:

فرعون (Pharoha)

یہ علم عجمی ہے اور اس سے سرکش کے معنیٰ لے کر کہا جاتا ہے تفرعن فلان کہ فلاں فرعون بنا ہوا ہے جس طرح کہ ابلیس سے

ابلس و تبلس وغیرہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اس سے سرکشوں کو فراعنۃ جمع فرعون کی اور ابالسۃ (جمع ابلیس کی) کہا جاتا ہے۔

لفظ ساء کی عمدہ تحقیق:

ساء (Bad,Evil)

اور ساءنی کذا و سؤتنی کہا جاتا ہے۔ اور اسات الی فلان (بصلہ الی) بولتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"سِیٓـَٔتۡ وُجُوۡہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا" (سورۃ الملك آیت نمبر 27)

تو کافروں کے منہ برے ہو جائیں گے۔

"لِیَسُوۡٓءٗا وُجُوۡہَکُمۡ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 7)

تا کہ تمہارے چہروں کو بگاڑیں۔

اور آیت: "مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِہٖ" (سورۃ النساء آیت نمبر 123)

جو شخص برے عمل کرے گا اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائیگا۔

میں سوء سے اعمال قبیحہ مراد ہیں۔ اسی طرح آیت:

"زُیِّنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ اَعۡمَالِہِمۡ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 37)

ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور آیت:

"عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ" (سورۃ الفتح ایت نمبر 6)

انہیں پر ہے بُری گردش۔

میں دائرۃ السوء سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے۔ جو انجام کار غم کا موجب ہو اور آیت:

"وَسَآءَتۡ مَصِیۡرًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 97)

اور وہ بری جگہ ہے۔

"وَسَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 66)

(دوزخ) ٹھہرنے کی بری جگہ ہے۔

میں بھی یہی معنی مراد ہے۔ اور کبھی سائنس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ یعنی معنی ذم کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِہِمۡ فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 177)

مگر جب وہ ان کے مکان میں اتریگا تو جن کو ڈر سنایا گیا تھا ان کے لئے برا دن ہوگا۔

"وَسَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 66)
ان کے عمل برے ہیں۔

"سَآءَ مَثَلًا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 177)
مثال بری ہے۔

اور آیت: "سِيْئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (سورۃ الملک آیت نمبر 27)
(تو) کافروں کے منہ برے ہو جائیں گے۔

میں سیئت کی نسبت وجوہ کی طرف کی گئی ہے کیونکہ حزن وسرور کا اثر ہمیشہ چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور آیت:

"سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا" (سورۃ ھود آیت نمبر 77)
تو وہ (ان کے آنے سے) غم ناک اور تنگدل ہوئے۔ یعنی ان مہمانوں کو وہ حالات پیش آئے جن کی وجہ سے اسے صدمہ لاحق ہوا۔ اور فرمایا:

"سُوْٓءُ الْحِسَابِ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 21)
ایسے لوگوں کا حساب بھی برا ہوگا۔

"وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 25)
اور ان کے لئے گھر بھی برا ہے۔

اور کنایہ کے طور پر سوء کا لفظ عورت یا مرد کی شرمگاہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 31)
اپنے بھائی کی لاش کو کیونکہ چھپائے۔

"فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 31)
کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔

"يُوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 26)
کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔

"بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 22)
تو ان کے ستر کی چیزیں کھل گئیں۔

"لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 20)
کہ ان پر کھول دے ان کی شرم کی چیزیں جو ان سے چھپی تھیں۔

لفظِ ذبح کا اصل معنیٰ :

(ذ ب ح) الذبح (ف) (Secrifice,Slaughter,Killing)

اصل میں اس کے معنی حیوانات کے حلق کو قطع کرنے کے ہیں اور ذبح بمعنی مذبوح آتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ " (سورۃ الصافات آیت نمبر 107)

اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا۔

"اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 67)

کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو۔

ذبحت الفارۃ۔ میں نے نافہ مشک کو چیرا۔ یہ حیوان کے ذبح کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

اسی طرح ذبح الدن کا محاورہ ہے جس کے معنی مٹکے میں شگاف کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

"يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 49)

تمہارے بیٹوں کو توقتل کر ڈالتے تھے۔

میں صیغہ تفعیل برائے تکثیر ہے یعنی وہ کثرت کے ساتھ یکے بعد دیگرے تمہارے لڑکوں کو ذبح کر رہے تھے۔

سعد الذابح:

سعد الذابح (برج جدی کے ایک) ستارے کا نام ہے اور سیلاب کے گڑھوں کو مذابح کہا جاتا ہے۔

تحقیق لفظِ الابن:

(Son)

یہ اصل میں بنو ہے کیونکہ اس کی جمع ابناء اور تصغیر بنی آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰى اِخْوَتِكَ " (سورۃ یوسف آیت نمبر 5)

کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔

"يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ " (سورۃ الصافات آیت نمبر 102)

اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔

"يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ " (سورۃ لقمان آیت نمبر 13)

کہ بیٹا خدا کے ساتھ شریک نہ کرنا۔

"یا بنی لا تعبد الشیطان " بیٹا شیطان کی عبادت نہ کرنا۔

اور بیٹا بھی چونکہ اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے اس لئے اسے ابن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا بانی بنایا ہے اور بیٹے کی تکلیف میں باپ بمنزلہ معمار کے ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو دوسرے کے سبب اس کی تربیت دیکھ بھال اور نگرانی سے حاصل ہوا سے اس کا ابن کہا جاتا ہے۔ نیز جسے کسی چیز سے لگاؤ ہوا اسے بھی اس کا ابن کہا جاتا جیسے: فلان ابن حرب۔ فلان جنگ جو ہے۔ ابن السبیل مسافر ابن اللیل چور۔ ابن العلم پروردگار وہ علم۔ شاعر نے کہا ہے:

أولاك بنو خير وشرّ كليهما یہ لوگ خیروزر یعنی ہر حالت میں اچھے ہیں۔

فلان ابن بطنه پیٹ پرست فلان ابن فرجه شہوت پرست۔ ابن یومه جو کل کی فکر نہ کرے۔ قرآن میں ہے:

"وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 30)

اور یہودی بولے عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ اور نصرانی بولے مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

"اِنَّ ابْنِي مِنْ اَهْلِي" (سورۃ ھود آیت نمبر 45)

میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے۔

"اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 81)

بیشک آپ کے بیٹے نے چوری کی۔

ابن کی جمع ابناء اور بنون آتی ہے قرآن میں ہے:

"وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً" (سورۃ النحل آیت نمبر 72)

اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔

"يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 67)

کہ بیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔

"يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 31)

اے آدم کی اولاد اپنی زینت لو جب مسجد میں جاؤ۔

"يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 27)

اے آدم کی اولاد خبردار تمہیں شیطان فتنہ میں نہ ڈالے۔

اور ابن کی مونث ابنۃ وبنت اور ان کی جمع اور ابن کی مونث ابنۃ وبنت اور ان کی جمع بنات آتی ہے قرآن میں ہے:

"هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ" (سورۃ ھود آیت نمبر 78)

یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لئے ستھری ہیں۔

"لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ" (سورۃ ھود آیت نمبر 79)

تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری قوم کی بیٹیوں میں ہمارا کوئی حق نہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کا قوم سے خطاب:

بعض کہتے ہیں کہ حضرت لوط (علیہ السلام) نے اکابر کو قوم خطاب کیا تھا اور ان کے سامنے اپنی بیٹیاں پیش کی تھیں۔ مگر یہ ناممکن سی بات ہے کیونکہ نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ اپنی چند لڑکیاں مجمع کثیر کے سامنے پیش کرے اور بعض نے کہا ہے کہ بنات سے ان کی قوم کی عورتیں مراد ہیں اور ان کو بناتی اس لئے کہا ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے بلکہ والدین سے بھی اس کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے جیسا کہ اب کی تشریح میں گزر چکا ہے اور آیت کریمہ:

"وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ "(سورۃ النحل آیت نمبر 57)

اور اللہ کے لئے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں۔

کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

لفظِ حیاء کا مفہوم:

(ح ی ء) حیاء (Modesty,Regard,Shame)

الحیاۃ کے معنی قبائح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور بعض نے استحی فہو مستح (نحیف یاء) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيٓ اَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

خدا اس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ کی مثال بیان فرمائے۔

"وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ "(سورۃ الاحزاب آیت نمبر 53)

لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔

بوڑھا مسلمان:

ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے شرماتا ہے۔ پس اللہ کی طرف جب حیا کی نسبت
تو اس کے معنی انقباض نفس کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذات باری تعالیٰ منزہ ہے بلکہ اس سے مراد
عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ حی کہ اللہ حی ہے تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ قبائح کو چھوڑ
والا اور محاسن یعنی افعال حسنہ کو سرانجام دینے والا ہے۔

لفظ نساء کا مفہوم:

نساء (Woman,Female)

النساء والنسوان والنسوۃ یہ تینوں امراءۃ کی جمع من غیر لفظہ ہیں۔ جیسے مرء کی جمع قوم آجاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 11)

اے ایمان والو نہ مرد مَردوں سے ہنسیں عجب نہیں کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے دور نہیں کہ وہ ان ہنسے والیوں سے بہتر ہوں۔

"ما بال النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 50)

کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔

تحقیق بلی:

(ب ل ی)

بلی الونب۔ بلی وبلاء کے معنی کپڑے کا بوسیدہ اور پرانا ہونے کے ہیں اسی سے بلاہ السفرہ ای ابلاہ۔ کا تج اورہ ہے۔ یعنی سفر نے لاغر کردیا ہے اور بلوتہ کے معنی ہیں میں نے اسے آزمایا۔ گویا کثرت آزمائش سے میں نے اسے کہنہ کردیا اور آیت کریمہ:

"هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ" (سورۃ یونس آیت نمبر 30)

وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرلے گا۔

میں ایک قرآت نبلوا (بصیغہ جمع متکلم) بھی ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہاں ہم ہر نفس کے اعمال کی حقیقت کو پہنچان لیں گے اور اسی سے ابلیت فلان کے معنی کسی کا امتحان کرنا بھی آتے ہیں۔ اور غم کو بلاء کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جسم کو کھلا کر لاغر کردیتا ہے۔ قرآن میں ہے

"وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 49)

اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی سخت آزمائش تھی۔

عظم کا معنی:

(ع ظ م) العظم (Bone)

عظم الشئی کے اصل معنی کسی چیز کی ہڈی کے بڑا ہونے کے ہیں مجازاً ہر چیز کے بڑا ہونے پر بولا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق حس سے ہو یا عقل سے اور عام اس سے کہ وہ مادی چیز ہو یا مونسی قرآن میں ہے:

"عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ " (سورۃ الزمر آیت نمبر 13)

بڑے سخت دن کا عذاب تھا۔

" قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ " (سورۃ ص آیت نمبر 67)

کہہ دو کہ وہ ایک سخت حادثہ ہے۔

نوٹ: لفظ عذاب اور رب کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 50]

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ (50)

''اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچالیا اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا''۔

متن:

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فلقناه وفصلنا بين بعضه وبعض حتى حصلت فيه مسالك بسلوككم فيه. أو بسبب إنجائكم. أو ملتبساً بكم كقوله:

تَدُوسُ بِنَا الْجَمَاجِمَ والتَّرِيبا وقرء فَرَّقْنَا على بناء التكثير لأن المسالك كانت اثنى عشر بعدد الاسباط.

فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ أراد به فرعون وقومه. واقتصر على ذكرهم للعلم بأنه كان أولى به.

وقيل شخصه كما

روى أن الحسن رضى الله تعالى عنه كان يقول: اللهم صل على آل محمد

أى شخصه واستغنى بذكره عن ذكر أتباعه.

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ذلك. أى غرقهم وإطباق البحر عليهم. أو انفلاق البحر عن طرق يابسة مذللة. أو جثثهم التى قذفها البحر إلى الساحل. أو ينظر بعضكم بعضاً.

روى أنه تعالى أمر موسى عليه السلام أن يسرى ببنى إسرائيل. فخرج بهم فصبحهم فرعون وجنوده. وصادفوهم على شاطئ البحر. فأوحى الله تعالى إليه أنِ اضرب بّعَصَاكَ البحر. فضربه فظهر فيه اثنا عشر طريقاً يابساً فسلكوها فقالوا: يا موسى نخاف أن

يغرق بعضنا ولا نعلم، ففتح الله فيها كوى فتراؤوا وتسامعوا حتى عبروا البحر، ثم لما وصل إليه فرعون ورآه منفلقًا

اقتحم فيه هو وجنوده فالتطم عليهم وأغرقهم أجمعين.

واعلم أن هذه الواقعة من أعظم ما أنعم الله به على بني إسرائيل، ومن الآيات الملجئة إلى العلم بوجود الصانع الحكيم وتصديق موسى عليه الصلاة والسلام. ثم إنهم بعد ذلك اتخذوا العجل وقالوا: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللهَ جَهْرَةً ونحو ذلك. فهم بمعزل في الفطنة والذكاء وسلامة النفس وحسن الاتباع عن أمة محمد صلّى الله عليه وسلّم، مع أن ما تواتر من معجزاته أمور نظرية مثل: القرآن والتحدى به والفضائل المجتمعة فيه المشاهدة على نبوة محمد صلّى الله عليه وسلّم دقيقة تدركها الأذكياء، وإخباره عليه الصلاة والسلام عنها من جملة معجزاته على ما مر تقريره.

ترجمہ:

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ

اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا۔

یعنی ہم نے دریا کو پھاڑ دیا اور اس کے بعض حصہ کو بعض حصہ سے جدا کر دیا، یہاں تک کہ تمہارے اس میں سے گزرنے کے سبب بہت سے راستے بن گئے، یا یہ معنیٰ ہیں کہ ہم نے دریا کو اس لئے پھاڑا تھا کہ تم کو نجات دینی تھی، یا یہ کہ "بکم" کی باء مصاحبت اور ملابست کے لئے ہے اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ تمہاری دریا میں داخلہ کے ساتھ ہی ہم نے دریا کو پھاڑ دیا۔ یہ باء اسی طرح ملابست کے لئے ہے جس طرح متنبی کا شعر،

تَدُوسُ بِنَا الْجَمَاجِمَ وَالتَّرِيبَا

اس میں باء ملابست کے لئے ہے۔

اور "فرقنا" میں ایک قرات "فرّقنا" مبالغہ اور تکثیر کے صیغہ کے ساتھ، اب معنی یہ ہوں گے کہ اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو بیت زیادہ پھاڑ دیا تھا، اور یہ تکثیر اس لئے ہے کہ بنی اسرائیل کے گھرانوں کی گنتی کے مطابق دریا میں بارہ (12) راستے ہو گئے تھے، "فانجیناکم واغرقنا آل فرعون" سے مراد فرعون اور فرعون کی قوم ہے اور ذکر صرف قومِ فرعون کا کیا ہے، فرعون کا نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ فرعون تو اس سزا کا سب سے زیادہ مستحق ہے اور بعض مفسرین کی رائے ہے کہ آلِ فرعون سے مراد فرعون کی ذات ہے۔ جیسا کہ منقول ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے،

اللھم صل علی آل محمد

اس سے مراد ذات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھی۔ گویا اتباع فرعون کے ذکر کی بجائے خود فرعون کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔

وانتم تنظرون

تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا۔

اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے، یہاں تنظرون کا مفعول بہ محذوف ہے پس اس سے مراد یا تو مذکورہ بالا چیزیں ہیں، یعنی تم یہ تمام مذکورہ واقعات بچشم خود دیکھ رہے تھے یا مفعول بہ ان کا ڈبویا جانا ہے، اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ تم ان کے ڈبوئے جانے کو اور دریا کے ان پر ڈھک دینے کو دیکھ رہے تھے، یا یہ مراد ہے کہ دریا شق ہو رہا تھا اور قابو میں آنے والے خشک راستے ظاہر ہو رہے تھے یا یہ کہ تم آل فرعون کے جسم اور لاشے دیکھ رہے تھے جس کو دریا نے ساحل پر پھینک دیا تھا، یا یہ مراد ہے کہ تم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، منقول ہے کہ اللہ کریم نے حضرت موسی علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات نکل جائیں چنانچہ آپ ان کو لے کر نکل گئے صبح کے وقت فرعون اور لشکرِ فرعون نے ان کو آلیا، اور ان کو دریا کے کنارہ پر پایا تو اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب وحی بھیجی کہ اپنے عصا سے دریا کو مارو، چنانچہ انہوں نے دریا کو مارا تو اس میں سے بارہ خشک راستے بن گئے۔ بنی اسرائیل کا قافلہ ان راستوں پر چل پڑا، پھر کہنے لگے اے موسیٰ ہم کو اندیشہ ہے کہ ہم میں سے بعض افراد ڈوب جائیں اور ہمیں پتہ نہ چلے، تو اللہ کریم نے ان کے درمیان روشن دان کھول دیئے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور ایک دوسرے کی بات سُن سکیں اس طرح ان لوگوں نے دریا کو پار کرلیا۔ پھر جب فرعون دریا پر پہنچا اور دریا کا پانی پھٹا ہوا پایا تو اس میں اپنے لشکر سمیت گھس گیا، پس ان پر دریا مل گیا اور سب کو ڈبو دیا۔

یاد رہے یہ فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ اللہ کریم کی طرف سے بنی اسرائیل پر عظیم ترین احسان ہے اور ان نشانیوں میں سے ہے جو انسان کو اس جانب کھینچ لاتی ہیں کہ صانع (اللہ کریم) کے وجود کا یقین کریں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کریم کا سچا نبی مانیں، پھر بھی بنی اسرائیل نے بچھڑے کو معبود بنایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تمہارے کہنے کی وجہ سے ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تاوقتیکہ ہم خود اپنی آنکھوں سے برملا اللہ کریم کو نہ دیکھ لیں، اسی طرح ان کی اور بھی بہت سی باتیں تھیں، لہٰذا جو فطانت وذکاوت، سلامت طبع اور حسن اتباع امتِ محمد کو ملا ہے اس سے بنی اسرائیل کوسوں دور ہیں۔ معجزات کو ہی دیکھیئے کہ جو معجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تواتر سے ثابت ہیں وہ نظری ہیں، دقیق ہیں بغیر غور وفکر اور دقت نظر کے ان کا ادراک نہیں ہوسکتا اور امور نظریہ دقیقہ کا ادراک واذعان اذکیاء کے سوا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ پس جب امت محمد یہ معجزات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کرتی ہے تو ثابت ہوا کہ یہ امّت ذکاوت میں دوسری امم سے بدرجہا بہتر ہے، اسی واقعہ کو لے لیجئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس واقعہ کی خبر دینا اور جس طرح یہ واقعہ سرزمینِ مصر میں پیش آیا تھا اسی طرح بیان کرنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سابقہ کتب

کا مطالعہ نہیں کیا نہ آپ کی کسے یہودی عالم سے صحبت رہی پھر بھی آپ ﷺ اتنا راست اور صحیح واقعہ بیان فرما رہے ہیں، یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ اللہ کریم کے سچے رسول ہیں، اللہ کریم نے آپ ﷺ کے قلب پر اس کو نازل فرمایا۔

لفظ فرقنا کی تحقیق:

(ف ر ق) الفرق والفلق (To be Cracked,To Burst)

کے قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن معنی انشقاق یعنی پھٹ جانا کے لحاظ سے فلق کا لفظ بولا جاتا ہے اور معنی انفعال یعنی الگ الگ ہونے کے لحاظ سے فرق قرآن میں ہے:

"وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 50)

اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑ دیا۔

اور الفراق کے معنی الگ ہونے والا ٹکڑہ کے ہیں اسی سے فرقۃ ہے جس کے معنی لوگوں کا گروہ یا جماعت کے ہیں۔ اور طلوع فجر پر فرق اور فلق دونوں لفظ بولے جاتے ہیں قرآن میں ہے:

"فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 63)

تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا (کہ) گویا بڑا پہاڑ ہے۔

لفظِ بحر کی تحقیق:

(ب ح ر) البحر (See ,Ocean)

(سمندر) اصل میں اس وسیع مقام کو کہتے ہیں جہاں کثرت سے پانی جمع ہو پھر کبھی اس کی ظاہری وسعت کے اعتبار سے بطور تشبیہ بحرت کذا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سمندر کی طرح کسی چیز کو وسیع کر دینا کے ہیں اسی سے بحرت البعیر ہے یعنی میں نے بہت زیادہ اونٹ کے کان کو چیز ڈالا یا پھاڑ دیا اور اس طرح کان چرے ہوئے اونٹ کو البحیرۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 103)

اللہ نے مقرر نہیں کیا ہے کان چرا ہوا۔

یعنی للہ تعالیٰ نے بحیرہ جانور کا حکم نہیں دیا کفار کی عادت تھی کہ جو اونٹنی دس بچے جن چکتی تو اس کا کان پھاڑ کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے اور نہ بوجھ لادتے۔ اور جس کو کسی صنعت میں وسعت حاصل ہو جائے اسے بحر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کو بحر کہہ دیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک گھوڑے پر سواری کے بعد فرمایا:

وجدته بحرا   کہ میں نے اسے سمندر پایا۔

اسی طرح وسعت علمی کے اعتبار سے بھی بحر کہہ دیا جاتا ہے اور تبحر فی کذا کے معنی ہیں اس نے فلاں چیز میں بہت وسعت حاصل کر لی اور البتحر فی العلم علم میں وسعت حاصل کرنا۔ اور کبھی سمندر کی ملوحت اور تمکین کے اعتبار سے کھاری اور کڑوے پانی کو بحرانی کہہ دیتے ہیں۔ ابحر الماء۔ پانی کڑوا ہو گیا۔ شاعر نے کہا ہے:

قد عاد ماء الارض بحر فزادنی الی مرض ان ابحر المشراب العذاب

زمین کا پانی کڑوا ہو گیا تو شریں گھاٹ کے تلخ ہونے سے میرے مرض میں اضافہ کر دیا۔

اور آیت کریمہ:

"وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 53)

اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے رواں کئے دو سمندر یہ میٹھا ہے نہایت شیریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ۔

میں عذاب کو بحر کہنا ملح کے بالمقابل آنے کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورج اور چاند کو قمران کہا جاتا ہے اور بنات بحر کے معنی زیادہ بارش برسانے والے بادلوں کے ہیں۔ اور آیت:

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (سورۃ الروم آیت نمبر 41)

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ بحر سے سمندر مراد نہیں ہے بلکہ بر سے جنگلات اور بحر سے زرخیز علاقے مراد ہیں۔ لقیتہ صحرۃ بحرۃ میں اسے ایسے میدان میں ملا جہاں کوئی اوٹ نہ تھی؟

غرق کا معنیٰ:

(غ ر ق) الغرق (Drowned)

پانی میں تہ نشین ہو جانا کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانا۔ غرق (س) فلان یغرق غرق فلاں پانی میں ڈوب گیا۔ قرآن میں ہے:

"حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ" (سورۃ یونس آیت نمبر 90)

یہاں تک کہ جب اسے ڈوبنے نے آلیا۔

لفظِ نظر کا مفہوم:

(ن ظ ر) النظر (Slight,Vision)

کے معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اس کا ادراک کرنے کے لئے آنکھ یا فکر کو جولانی دینے کے ہیں۔ پھر کبھی اس سے محض غور و فکر کرنے کا معنی مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس معرفت کو کہتے ہیں جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ نظرت فلم تنظر۔ تو نے دیکھا لیکن غور نہیں کیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ "(سورۃ یونس آیت نمبر 101)

ان کفار سے کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔

اور النظر بمعنی انتظار بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ نظرتہ وانتظرتہ دونوں کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

"وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ "(سورۃ ھود آیت نمبر 122)

اور راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں۔

نوٹ: لفظِ نجا اور فرعون کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 51]

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (51)

"اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور تم ظالم تھے"۔

متن:

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً لما عادوا إلى مصر بعد هلاك فرعون وعد الله موسى أن يعطيه التوراة وضرب له ميقاتاً ذا القعدة وعشر ذى الحجة وعبر عنها بالليالى لأنها غرر الشهور. وقرأ ابن كثير ونافع وعاصم وابن عامر وحمزة والكسائى واعَدْنا لأنه تعالى وعده الوحى. ووعده موسى عليه السلام المجيء للميقات إلى الطور.

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ إلها أو معبوداً.

مِنْ بَعْدِهٖ من بعد موسى عليه السلام، أو مُضِيِّهِ.

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ بإشراككم.

ترجمہ:

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً

اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا۔

فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد جب بنی اسرائیل مصر کو واپس لوٹے تو اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا کہ ان کو توریت عطا کی جائے گی اور اعطاء توریت کے لئے جو میعاد مقرر ہوئی تھی وہ ماہِ ذی قعد اور دس ذی الحجہ گزر جانے کے بعد تھی۔ ایک ماہ دس دن کی مدت کو اللہ کریم نے چالیس راتوں سے تعبیر کیا ہے۔ تقویم عربی میں راتوں سے ہی مہینوں کا

آغاز ہوتا ہے۔ راتیں ہی "غرر الشہور" ہیں اس لئے حساب دنوں کی بجائے راتوں سے لگایا۔ ابن کثیر، نافع، ابن عاصم، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے "واعدنا" بصیغہ مفاعلت کی قرات اختیار کی ہے کیونکہ یہاں وعدہ میں مشارکت تھی۔ اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وحی کا وعدہ کیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وقتِ مقررہ کے مطابق کوہِ طور پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ

پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

یعنی تم نے بچھڑے کو الٰہ اور معبود بنالیا، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات پر چلے جانے کے بعد۔

وَاَنْتُمْ ظَالِمُوْنَ

اور تم ظالم تھے۔

یعنی تم اپنے شرک
کی وجہ سے ظلم کر رہے تھے۔

تحقیق لفظِ وعدہ:

(و ع د) الوعد (Primise)

(وعدہ کرنا) کا لفظ خیر و شر یعنی اچھے اور برے (وعدہ دونوں پر بولا جاتا ہے اور اس معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر الوعید کا لفظ خاص کر شر (یعنی دھمکی اور تہدید) کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں باب اوعد (توقد استعمال ہوتا ہے۔ اور واعدتہ مفاعلۃ) وتواعدنا (تفاعل) کے معنی باہم عہد و پیان کرنا کے ہیں (قرآن کریم میں ودع کا لفظ خیر و شر دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ وعدہ خیر کے متعلق فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ" (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 22)

جو وعدہ اللہ نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا۔

"اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ" (سورۃ القصص آیت نمبر 61)

بھلا جس شخص سے ہم نے نیک وعدہ کیا۔

لیل کا معنیٰ:

(ل ی ل) لیل ولیلۃ (Night)

کے معنی رات کے ہیں اس کی جمع لیال ولیائل ولیلات آتی ہے اور نہایت تاریک رات کو لیل الیل و لیلہ لیلاء کہا

جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ لیلۃ اصل میں لیلاۃ ہے کیونکہ اس کی تصغیر لیلیۃ اور جمع لیال آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ" (سورۃ القدر آیت نمبر 1)

ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع)۔

"وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ" (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 33)

اور رات اور دن کو تمہاری خاطر کام میں لگا دیا۔

لفظ عجل کا معنیٰ:

(ع ج ل)(A Calf)

العجلة بچھڑے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں پھرتی پائی جاتی ہے جو بیل کی عمر تک پہنچنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 148)

ایک بچھڑا بنا بیٹھی بے جان کا دھڑ۔

معجّل کسے کہتے ہیں؟:

اور وہ گائے جس کے ساتھ اس کا بچھڑ ہو اسے معجّل کہا جاتا ہے۔

نوٹ: اتخاذ اور ظلم کا معنیٰ گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 52 الى 53]

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○

''پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی، کہ کہیں تم احسان مانو، اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا کہ کہیں تم راہ پر آؤ''۔

متن:

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ حين تبتم، والعفو محو الجريمة، من عفا إذا درس. مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ أي الاتخاذ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ أي لكي تشكروا عفوه.

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ يعني التوراة الجامع بين كونه كتاباً منزلاً وحجة تفرق بين الحق والباطل. وقيل أراد بالفرقان معجزاته الفارقة بين المحق والمبطل

في الدعوى، أو بين الكفر والإيمان. وقيل الشرع الفارق بين الحلال والحرام، أو النصر الذي فرق بينه وبين عدوه كقوله تعالى: يَوْمَ الْفُرْقَانِ يريد به يوم بدر.

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ لكي تهتدوا بتدبر الكتاب والتفكر في الآيات.

ترجمہ:

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ

ہم نے تمہیں معافی دی۔

یہ اسوقت ہوا جب تم نے توبہ کی، "عفو" کے معنیٰ ہیں جرم کو مٹا دینا۔ یہ عفو سے مشتق ہے جس کا معنیٰ مٹا دینا، مٹ جانا ہے۔

من بعد ذٰلك

پھر اس کے بعد

یعنی اس معبود سازی کے بعد۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

کہ کہیں تم احسان مانو۔

تا کہ تم اللہ کریم کی نعمتِ عفو کا شکر ادا کرو۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا

کتابِ فرقان کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے توریت عطا کی جو دونوں وصفوں کی جامع تھی، وہ کتاب بھی تھی، اور ایک حجت بھی تھی جو حق و باطل کے درمیان فرق کر رہی تھی۔ اور بعض نے کہا کہ فرقان سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔ جو محقق و مبطل کے دعووں میں فرق کر رہے تھے۔ یا کفر و ایمان کے درمیان فرق کر رہے تھے، بعض نے کہا کہ شریعتِ موسیٰ مراد ہے جو حلال و حرام کے درمیان فارق تھی۔ بعض نے وہ نصرتِ الٰہی مراد لی ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے دشمنوں کے درمیان فرق و امتیاز قائم کر دیا تھا، جیسا اللہ کریم "یومِ فرقان" سے یومِ بدر مراد لیتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

کہ کہیں تم راہ پر آؤ۔

تا کہ تم کتاب میں تدبر کر کے اور اس کی آیات میں غور کر کے راہ پاؤ۔

لفظ عفو کی تحقیق:

(ع ف و) العفو (Forgiveness,Pardon)

کے معنی کسی چیز کو لینے کا قصد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ عفاہ واعتقادہ کسی کے پاس جو کچھ ہے وہ لینے کا قصد کیا۔ عفت الریح الدرا ہوا نے گھر کے نشانات مٹا دیئے اسی معنی کے لحاظ سے شاعر نے کہا ہے۔

اخز البلی ایا تھا

بوسیدگی نے اس کے نشانات مٹا ڈالے عفت الدار گھر کے نشانات مٹ گئے گویا ان اثار نے از خود مٹ جانے کا قصد کیا عفا النبت والشجر نباتات اور درخت بڑھ گئے جیسا کہ آخذ النبت فی الذیاد ۃکا محاورہ ہے یعنی پودے نے بڑھنا شروع کیا۔ عفوت عنہ کے معنی ہیں میں نے اس سے درگزر کرتے ہوئے اس کا گناہ مٹا دینے کا قصد کیا۔ لہٰذا یہاں اصل میں اس کا مفعول ترک کر دیا گیا ہے اور عن کا متعلق مخذوف ہے یا قصدت ازالتہ ذنبہ سارفا عنہ پس عفو کے معنی گناہ سے درگزر کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

"فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ" (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 40)

مگر جو درگزر کرے اور معاملہ کو درست کر لے۔

"وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 237)

اور اگر تم ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔

"ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 52)

پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا۔

"اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 66)

اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کر دیں۔

"فَاعْفُ عَنْهُمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 159)

تو ان کی خطائیں معاف کر دو۔

اور آیت کریمہ: "خُذِ الْعَفْوَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 199)

(اے محمد) عفو اختیار کرو۔

میں العفو ہر اس چیز کو کہا گیا جس کا قصد کرنا اور لینا آسان ہو۔ اور بعض نے اس کے معنی کئے ہیں درگزر کیجئے۔ اور آیت کریمہ:

"وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 219)

(اے محمد) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ خدا کی راہ میں کس طرح کا مال خرچ کریں کہہ دو جو مال خرچ کرو۔

اس آیت میں عفو سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ضروریات سے زائد ہو اور اس کے خرچ سے تکلیف نہ ہو اور اعطی عفوا اس نے اسے بے مانگے دے دیا یہاں عفوا مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے اور حال واقع ہوا ہے یعنی بخشش کرتے وقت اس کی حالت یہ تھی کہ گویا خود لے رہا ہے اور اس میں اس عمدہ معنی کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے،

كانك تعطيه الذى انت سائله

یعنی جب سائل اس کے پاس آتا ہے تو اس طرح خوش ہوتا ہے گویا جو چیز تم اس سے لے رہے ہو وہ اسے دے رہے ہو۔

اور دعائے ماثورہ میں ہے

"اسئلك العفو والعافيته"

یعنی اے اللہ تجھ سے عفو اور تندرستی طلب کرتا ہوں اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو عفو کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا" (سورۃ النساء، آیت نمبر 43)

بیشک خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

اور حدیث میں ہے:

ما اكلكت العافيته فهو صدقته

یعنی کھیتی سے جو کچھ پرندہ چرند اور ضرورت مند انسان کھا جائیں وہ وہ صدقہ ہے،۔

اعفیت کذا۔ یعنی میں نے اسے بڑھنے دیا اسی سے۔ اعفوا الحیی ہے۔ یعنی ڈاڑھی کے بال بڑھنے دو۔ العفاء اون یا پرندے کے پر جو بڑھ جائیں۔

المعافی کسے کہتے ہیں؟:

کسی سے دیگ مستعار لینے والا جو شوربہ اس کی دیگ میں اسے بھیجتا ہے اس شوربہ کو المعافی کہا جاتا ہے۔

شکر کا معنیٰ:

(ش ک ر) الشکر (Thanks,Gratitude)

کے معنی کسی نعمت کا تصور اور اس کے اظہار کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کشر سے مقلوب ہے جس کے معنی کشف یعنی کھولنا کے ہیں۔ شکر کی ضد کفر ہے۔ جس کے معنی نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا رکھنے کے ہیں اور دابۃ شکور اس چوپائے کو کہتے ہیں جو اپنی فربہی سے یہ ظاہر کر رہا ہو کہ اس کے مالک نے اس کی خوب پرورش اور حفاظت کی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عین شکریٰ سے ماخوذ ہے جس کے معنی آنسوؤں سے بھرپور آنکھ کے ہیں اس لحاظ سے شکر کے معنی ہوں گے منعم کے ذکر سے

بھر جانا۔

شکر کی قسمیں:

شکر تین قسم پر ہے۔

شکر قلبی یعنی نعمت کا تصور کرنا۔

شکر لسانی یعنی زبان سے منعم کی تعریف کرنا۔

شکر بالجوارح یعنی بقدر استحقاق نعمت کی مکافات کرنا۔

اور آیت کریمہ:

"اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا" (سورۃ سبا آیت نمبر 13)

اے داود کی آل میرا شکر کرو۔

الفرقان کی تحقیق:

(ف ر ق)الفرقان) The Holy Quran (as distinguished or separating truth from falsehod

یہ فرق سے ابلغ ہے کیونکہ یہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ رجل وقنعان (یعنی وہ آدمی جس کے حکم پر قناعت کی جائے) کی طرح اسم صفت ہے مصدر نہیں ہے اور فرق کا لفظ عام ہے جو حق کو باطل سے الگ کرنے کے لئے بھی آتا ہے اور دوسری چیزوں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا" (سورۃ الانفال آیت نمبر 29)

اے ایمان والو اگر اللہ سے ڈرو گے تو تمہیں وہ دے گا جس سے حق کو باطل سے جدا کر لو۔

یعنی تم کو ممتاز کر دے گا۔ میں فرقان سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر نور اور توفیق پیدا کر دیگا جس کے ذریعہ تم حق و باطل میں امتیاز کر سکو گے تو گویا یہاں فرقان کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ سکینۃ اور روح کے الفاظ ہیں اور قرآن نے یوم الفرقان اس دن کو کہا ہے جس روز کہ حق و باطل اور صحیح وغلط کے مابین فرق اور امتیاز ظاہر ہوا چنانچہ آیت:

"وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 41)

اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن اتارا۔

میں یوم الفرقان سے جنگ بدر کا دن مراد ہے کیونکہ وہ (تاریخ اسلام میں) پہلا دن ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا۔ اور کلام الہی (وحی) بھی فرقان ہوتی ہے کیونکہ وہ حق اور باطل عقائد میں فرق کر دیتی ہے سچی اور جھوٹی باتوں اور

اچھے برے اعمال کو بالکل الگ الگ بیان کر دیتی ہے اس لئے قرآن کریم تورات اور انجیل کو فرقان سے تعبیر فرمایا گیا ہے چنانچہ توراۃ کے متعلق فرمایا:

"وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)

اور بیشک ہم نے موسیٰؑ اور ہارون کو فیصلہ دیا۔

"شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ"

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 185)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کے لئے ہدایت اور رہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں۔

"تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر ۱)

وہ خدائے عزوجل بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا۔

"وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 53)

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کئے۔

"وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِلْمُتَّقِينَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 48)

اور بیشک ہم نے موسیٰؑ اور ہارون کو فیصلہ دیا اور اوجالا اور پرہیزگاروں کو نصیحت۔

لفظ اهتداء کی تحقیق بالتفصیل:

الاهتداء

(ہدایت پانا) کا لفظ خاص کر اس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو دنیوی یا اخروی کے متعلق انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 97)

اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں ان سے رستہ معلوم کرو۔

"إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 98)

اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں۔

لیکن کبھی اهتداء کے معنی طلب ہدایت بھی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

"وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 53)

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کئے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

" فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 150)

سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔

" فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 20)

اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بیشک ہدایت پالیں۔

" فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 137)

تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو تو ہدایت یاب ہو جائیں۔

المهتدی کی تعریف:

المهتدی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالم کی اقتدا کر رہا ہے ہو چنانچہ آیت:

" أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئاً وَلَا يَهْتَدُونَ "(سورۃ المائدۃ آیت نمبر 104)

بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے ہوں اور نہ کسی کی پیروی کرتے ہوں۔

اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ نہ وہ خود عالم تھے اور نہ ہی کسی عالم کی اقتداء کرتے تھے۔

اور آیت:

" فَمَنِ اهْتَدَى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنْذِرِينَ "

(سورۃ النمل آیت نمبر 92)

تو جو کوئی ہدایت حاصل کرے تو ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

میں اهتداء کا لفظ طلب ہدایت اقتدا اور تحری ہدایت تینوں کو شامل ہے اس طرح آیت:

" وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ "(سورۃ النمل آیت نمبر 24)

اور شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ . ے دکھائے ہیں اور ان کو رستے سے روک رکھا ہے پس وہ رستے پر نہیں آتے۔

میں بھی سے تینوں قسم کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے۔

اور آیت: " وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً ثُمَّ اهْتَدَى "(سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 82)

اور جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے پھر سیدھے راستہ پر چلے اس کو میں بخش دینے والا ہوں۔

میں اهتدی کے معنی لگاتار ہدایت طلب کرنے اور اس میں سستی نہ کرنے اور دوبارہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے

کے ہیں۔ اور آیت:

" اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ. (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 157)

کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا، یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی دُرودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔

میں مھتدون سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس کے حصول کے لئے کوشش کی اور اس کے مطابق عمل بھی کیا چنانچہ انہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔

"وَقَالُوْا یٰٓاَیُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ " (سورۃ الزخرف آیت نمبر 49)

اور بولے کہ اے جادوگر ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر اس عہد کے سبب جو اس کا تیرے پاس ہے۔

نوٹ: اِنّ، کتب اور لعل کا ذکر گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 54]

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو، یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان''۔

متن:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فاعزموا على التوبة والرجوع إلى من خلقكم براءٍ من التفاوت، ومميزاً بعضكم عن بعض بصور وهيئات مختلفة. وأصل التركيب لخلوص الشيء عن غيره، إما على سبيل التقصي كقولهم برء المريض من مرضه والمديون من دينه، أو الإنشاء كقولهم برأ الله آدم من الطين أو فتوبوا.

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ إتماماً لتوبتكم بالبخع، أو قطع الشهوات كما قيل من لم يعذب نفسه لم ينعمها ومن لم يقتلها لم يحيها. وقيل أمروا أن يقتل بعضهم بعضاً. وقيل

أمر من لم يعبد العجل أن يقتل العبدة.

روى أن الرجل كان يرى بعضه وقريبه فلم يقدر على المضى لأمر الله. فأرسل الله ضبابة وسحابة سوداء لا يتباصرون، فأخذوا يقتتلون من الغداة إلى العشى حتى دعا موسى وهارون فكشفت السحابة ونزلت التوبة، وكانت القتلى سبعين ألفاً. والفاء الاولى للتسبب، والثانية للتعقيب.

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ من حيث إنه طهرة من الشرك، ووصلة إلى الحياة الابدية والبهجة السرمدية.

فَتَابَ عَلَيْكُمْ متعلق بمحذوف إن جعلته من كلام موسى عليه السلام لهم تقديره: إن فعلتم ما أمرتم به فقد تاب عليكم، أو عطف على محذوف إن جعلته خطاباً من الله تعالى لهم على طريقة الالتفات، كأنه قال: ففعلتم ما أمرتم به فتاب عليكم بارئكم. وذكر البارء وترتيب الامر عليه إشعار بأنهم بلغوا غاية الجهالة والغباوة، حتى تركوا عبادة خالقهم الحكيم إلى عبادة البقر التى هى مثل فى الغباوة، وأن من لم يعرف حق منعمه حقيق بأن لا يسترد منه، ولذلك أمروا بالقتل وفك التركيب.

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

للذى يكثر توفيق التوبة، أو قبولها من المذنبين، ويبالغ فى الإنعام عليهم.

ترجمہ:

وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْا اِلٰى بَارِئِكُمْ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ۔

یہاں توبہ کرو کا معنیٰ یہ ہے کہ توبہ کا عزم کرو۔ اور اس ہستی کی طرف رجوع کرنے کا پکا ارادہ کرو جس نے تم کو تفاوت سے بری بنا کر پیدا کیا۔ یعنی تمہارے اعضاء وغیرہ میں توازن وتناسب کو ملحوظ رکھا، اور تم کو ایک دوسرے سے مختلف صورتوں اور مختلف ہیئتوں کے ذریعے ممتاز کیا۔ اور برء کی اصل ترکیب یا اس مادہ کے اصل معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کر دینا۔ یہ جدائی چھٹکارہ کے طور پر ہو۔ جیسا کہ،

برء المريض من مرضه

بیمار نے اپنی بیماری سے نجات پالی۔

برء المدیون من دینه

مقروض نے اپنے قرض سے نجات پائی۔

برء الله آدم من الطین

اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ یعنی مٹ میں ہستی آدم کی صلاحیت موجود تھی۔ پس اللہ کریم نے اس سے پیدا کیا۔

"فتوبوا" کے معنی اپنے ظاہر پر ہیں یعنی توبہ کرو، یعنی اپنوں کو قتل کرو، یہ قتلِ نفس تمہاری توبہ کی تکمیل کے لئے ہے، قتل کی تفسیر خودکشی کے ذریعے کی جائے یا نفس کشی کے ذریعے کی جائے جیسا کہ مقولہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کو عذاب نہیں دے گا وہ اس کو آسائش نہیں دے سکتا اور جس نے اپنے نفس کو قتل نہیں کیا اس نے اس کو زندگی نہیں دی۔ اور بعض کا قول ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں اور بعض کہتے ہیں کہ جنہوں نے بچھڑا کی پوجا نہیں کی تھی، ان کو حکم دیا گیا کہ وہ بچھڑا کی پوجا کرنے والوں کو قتل کریں، منقول ہے کہ آدمی اپنے لخت ہائے جگر یعنی باپ بیٹوں کو اور رشتہ داروں کو اپنے سامنے پاتا تھا تو اس کو اس پر قدرت نہیں ہوتی تھی کہ اللہ کریم کے امر کو کر گزرے، تو اللہ کریم نے ایک ہلکی بدلی اور سیاہ بادل بھیجا جس کے سبب وہ ایک دوسرے کی آنکھوں سے چھپ گئے، پھر قتل کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ حضرت موسی و حضرت ہارون علیہما السلام نے دعا کی تو بادل چھٹ گیا اور توبہ قبول ہو گئی اس وقت تک مقتولین کی تعداد ستر ہزار (70000) ہو چکی تھی۔ آیت کریمہ میں پہلی فاء سببیت پر دلالت کرنے کے لئے ہے اور دوسرے فاء تعقیب کے لئے ہے۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ

یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے۔

یہ اس لئے بہتر ہے کہ حیاتِ ابدی کا ذریعہ اور سرورِ سرمدی کا وسیلہ ہے، "فتاب علیکم" اگر یہ کلام موسیٰ کا جزو ہے تو جملہ محذوفہ کے متعلق ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی،

ان فعلتم ما امرتم به فقد تاب علیکم

اگر تم اس چیز کو بجالائے جس کا اس نے تمہیں حکم دیا ہے تو سمجھو کہ اللہ کریم نے تمہاری توبہ قبول فرمالی۔ اور اگر یہ قومِ موسی کو التفات کے اسلوب میں خطاب ہے تو جملہ محذوفہ پر معطوف ہے، گویا یوں ارشاد فرمایا گیا،

ففعلتم ما أمرتم به فتاب علیکم بارئکم۔

یعنی جن چیزوں کا حکم دیا گیا تھا وہ تم بجالائے تو پھر اللہ کریم نے تمہاری توبہ قبول کی۔ اور "باری" کا دوسری مرتبہ ذکر فرمانا اور امرِ توبہ کو اس پر مرتب کرنا، یہ بتانے کے لئے ہے کہ وہ جہالت اور غباوت میں انتہا کو پہنچ چکے تھے، حتیٰ کہ اپنے خالق حقیقی کی عبادت کو چھوڑ کر گائے اور بیل کی عبادت پر آ گئے تھے جو غباوت میں ضرب المثل ہے۔ نیز اس حقیقت پر آگاہ کرنے

کے لئے ہے جو اپنے منعم کا حق نہ پہچانے وہ اس لائق ہے کہ وہ نعمت اس سے واپس لے لی جائے اور اسی وجہ سے یہ حکم ہوا کہ ان کو قتل کر دیا جائے اور ان کی بندشِ جسم کو کھول دیا جائے۔

انه هو التواب الرحيم

بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

یعنی توبہ کی بہت زیادہ توفیق عطا کرنے والا، یا گنہگاروں کی طرف سے بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے والا۔ اور "الرحیم" جو ان کے اوپر بہت زیادہ انعام کرنے والا ہے۔

لفظِ قوم کا معنیٰ :

(ق و م) قوم (Tribe,Nation)

القوم۔ یہ اصل میں صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔ چنانچہ فرمایا

" یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ" (سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۱)

اے ایمان والو نہ مرد مردوں سے ہنسیں عجب نہیں کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے دور نہیں کہ وہ ان ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں۔

اخذ اور اتخاذ کا معنیٰ :

(ا خ ذ) الاخذ (Grab,Forge)

الاتخاذ (افتعال) ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو کر جعل کے جاری مجری ہوتا ہے جیسے فرمایا

" لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر ۵۱)

یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

" وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ " (سورۃ الزمر آیت نمبر ۳)

جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے۔

" فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِیًّا " (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 110)

تو تم نے اس تمسخر بنالیا۔

" ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 116)

کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنالو۔

اور آیت کریمہ: " وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ " (سورۃ النحل آیت نمبر ٦١)

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر گرفت کرتا۔

میں صیغہ مفاعلہ لا کر معنی مجازات اور مقابلہ پر تنبیہ کی ہے جو انعامات اللہ کریم کی طرف سے انہیں ملے ان کے مقابلہ میں انہوں نے شکر گزاری سے کام نہیں لیا۔

توبہ کا معنی اور اقسام:

(ت و ب) التوب (ن) (Repentance)

کے معنی گناہ کے باحسن وجود ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔

پہلی صورت:

یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لم افعلہ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔

دوسری صورت:

یہ ہے کہ اس کے لئے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشنے لگ جائے۔

تیسری صورت:

یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلائے فرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے۔

شرعاً توبہ:

جب کہیں گے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پر نادم ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔ تاب الی اللہ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن میں ہے:۔

"وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا" (سورۃ النور آیت نمبر 31)

سب اللہ کے آگے توبہ کرو۔

لفظ الباری کی تعریف:

الباری (Creater)

(پیدا کرنے والا) یہ اسماء حسنیٰ سے ہے۔ جیسے فرمایا:

"اَلْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى" (سورۃ الحشر آیت نمبر 24)

ایجاد واختراع کرنے والا صورتیں بنانے والا۔

"فَتُوْبُوْا اِلٰی بَارِئِکُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 54)

تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو۔

قتل کا معنی:

(ق ت ل) القتل (ن) (kill)

الموت کی طرح اس کے معنی بھی جسم سے روح کو زائل کرنے کے ہیں لیکن موت اور قتل میں فرق یہ ہے کہ اگر اس فعل کو سرا انجام دینے والے کا اعتبار کیا جائے تو اسے قتل کہا جاتا ہے اور اگر صرف روح کے فوت ہونے کا اعتبار کیا جائے تو اسے موت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں۔

تحقیق خیر وشر:

(خ ی ر) الخیر (Goodness)

وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو مثلاً عقل عدل وفضل اور تمام مفید چیزیں۔ یہ شر کی ضد ہے۔

اور خیر دو قسم پر ہے۔

خیر مطلق:

خیر مطلق جو ہر حال میں اور ہر ایک کے نزدیک پسندیدہ ہو جیسا کہ آنحضرت نے جنت کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خیر نہیں ہے جس کے بعد آگ ہو اور وہ شر کچھ بھی شر نہیں ہے جس کے بعد جنت حاصل ہو جائے

خیر وشر مقید:

خیر وشر مقید کی ہے۔ یعنی وہ چیز جو ایک کے حق میں خیر اور دوسرے کے لئے شر ہو مثلاً دولت کہ بسا اوقات یہ زید کے حق میں خیر اور عمرو کے حق میں شر بن جاتی ہے۔ اس بنا پر قرآن نے اسے خیر وشر دونوں سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"اِنْ تَرَکَ خَیْرًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 180)

اگر وہ کچھ مال چھوڑ جاتے۔

لفظ توّاب کس پر بولا جائے گا؟:

التواب

یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صنعت ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے چھوڑتے بالکل گناہ کو ترک کردے اور جب تواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 54)

بیشک وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اور آیت کریمہ:

"وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 71)

اور جو توبہ کرے اور اچھا کام کرے تو وہ اللہ کی طرف رجوع لایا جیسی چاہئے تھی۔

"عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ مَتَابِ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 30)

میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میری رجوع ہے۔

تحقیق لفظِ رحم:

(ر ح م) الرحم. (Merci,Kindness)

الرحمۃ وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔

اسی معنی میں نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے،

" انه لما خلق الله الرحم قال له انا الرحمن وانت الرحم شققت اسمك من اسمی فمن وصلك وصلته ومن قطعت قطعتة "

کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس سے فرمایا: تین رحمان ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے۔ پس جو تجھے ملائے گا۔ (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرلے گا میں اسے پارہ پارہ کردوں گا۔

اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کردی ہے احسان کو اپنے لئے خاص کرلیا ہے۔ تو جس طرح لفظ رحم رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنی جو لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس معنی سے ماخوذ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنی میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے، یہ دونوں فعلان و فعیل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں جیسے ندمان و ندیم پھر رحمن کا اطلاق ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سمالیا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ

کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنی بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:ؔ

"اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 182)

بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمایا:

" لَقَدْ جاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ ما عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَحِيمٌ " (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 128)

بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان۔

بعض نے رحمن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمن کا لفظ دنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت:

" وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُها لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ " (سورۃ الاعراف آیت نمبر 156)

ہماری جو رحمت ہے وہ (اہل و نا اہل) سب چیزوں کو شامل ہے۔ پھر اس کو خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ لیں گے۔ جو پرہیزگاری اختیار کریں گے۔

میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الٰہی عام ہے اور مومن و کافروں دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت میں مومنین کے ساتھ مختص ہوگی اور کفار اس سے کلیۃ محروم ہوں گے۔

نوٹ: قول، ظلم، نفس اور عجل کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 55]

وَإِذْ قُلْتُمْ يا مُوسى لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ○

"اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک اعلانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے"۔

متن:

وَإِذْ قُلْتُمْ يا مُوسى لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ أی لأجل قولك، أو لن نقر لَكَ.

حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً عياناً وهی فی الاصل مصدر قولك: جهرت بالقراءة، استعيرت

للمعاينة. ونصبها على المصدر لأنها نوع من الرؤية. أو الحال من الفاعل، أو المفعول. وقرئ جهرة بالفتح على أنها مصدر كالغلبة. أو جمع جاهر كالكتبة فيكون حالاً من الفاعِل قطعاً. والقائلون هم السبعون الذين اختارهم موسى عليه السلام للميقات. وقيل عشرة آلاف من قومه. والمؤمن به: إن الله الذى أعطاك التوراة وكلمك، أو إنك نبي.

فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ لفرط العناد والتعنت وطلب المستحيل، فإنهم ظنوا أنه تعالى يشبه الاجسام فطلبوا رؤيته رؤية الاجسام فى الجهات والاحياز المقابلة للرائى، وهى محال، بل الممكن أن يرى رؤية منزهة عن الكيفية، وذلك للمؤمنين فى الآخرة ولأفراد من الانبياء فى بعض الاحوال فى الدنيا. قيل جاءت نار من السماء فأحرقتهم. وقيل صيحة. وقيل جنود سمعوا بحسيسها فخروا صعقين ميتين يوماً وليلة.

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ما أصابكم بنفسه أو أثره.

ترجمہ:

وَاِذْ قُلْتُمْ یا مُوسی لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے۔

"لک" کا معنی ہے تمہارے کہنے کی وجہ سے، یعنی تمہارے کہنے کی وجہ سے ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔، یا یہ معنی ہیں کہ ہم تمہارا اقرار نہیں کریں گے۔ "جھرۃ" کا معنی ہے آنکھوں سے دیکھنا، دراصل یہ لفظ "جھرت بالقراءت" کا مصدر ہے جس کا معنی ہے با آوازِ بلند قرات کرنا، مجازاً مشاہدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور اس کا نصب مفعول مطلق ہونے کی بناء پر ہے، کیونکہ یہ روئت کی ایک قسم ہے، یا یہ "نری اللہ" کے فاعل یا اس کے مفعول بہ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

اور ایک قرات جھرۃ بفتح الہاء بھی ہے اس صورت میں غلبۃ کے وزن پر مصدر ہے یا جمع ہے جیسے "کتبۃ" جمع ہونے کی صورت میں حال ہوگا، اور "حتی نری اللہ جھرۃ" کہنے والے وہ ستر (70) آدمی ہیں جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میقات کے لئے منتخب کیا تھا اور اور بعض کہتے ہیں کہ یہ لوگ قومِ موسیٰ کے دس ہزار (10000) ادمی تھے۔ اور "لن نومن لک" کا "موٴمَن بہ" "ان اللہ الّذی۔۔۔الخ" ہے۔ یعنی انہوں نے جس چیز پر ایمان لانے کی نفی کی تھی وہ یہ بات تھی کہ اللہ کریم نے آپ کو توریت عطا کی ہے، اور آپ سے کلام کیا ہے۔ یا یہ کہ آپ نبی ہیں۔

فاخذتکم الصاعقة

تو تمہیں کڑک نے آلیا۔

کڑک کا آلینا، تمہاری انتہائی ہٹ دھرمی، دشوار کوش اور محال طلبی کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ اللہ کریم اجسام کے مشابہ ہے لہٰذا انہوں نے اللہ کریم کی رؤیت کا اس طرح مطالبہ کیا کیسے اجسام کی رؤیت ہوتی ہے کہ وہ رائی کی جہت اور اس کے سامنے کے حیز میں ہوتے ہیں۔ اور اللہ کریم کا اس طرح مرئی ہونا محال ہے۔ بلکہ ممکن یہ ہے کہ اللہ کریم کی رؤیت اس طرح حاصل ہو کہ وہ کسی قسم کی کیفیت سے پاک ہو، اور آخرت میں مومنین کو یہ رؤیت حاصل ہوگی اور بعض اوقات دنیا میں انبیاء کرام کو اس طرح کی رؤیت حاصل ہو جاتی ہے۔

"صاعقہ" نے آلیا۔ بعض نے کہا کہ صاعقہ آسمان سے آنے والی ایک آگ تھی جس نے ان سب کو جلا دیا، اور بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک چنگھاڑ تھی، اور بعض نے کہا کہ لشکر تھے جن کے آنے کی انہوں نے آواز سنی اور بے ہوش و بے جان ہو کر زمین پر گر گئے اور ایک دن و ایک رات یوں ہی پڑے رہے۔

وانتم تنظرون

اور تم دیکھ رہے تھے۔

بعینہٖ اس چیز کو دیکھ رہے تھے جس نے تم کو پکڑ لیا تھا، یا اس کے آثار و نشانات کو دیکھ رہے تھے، پھر ہم نے تم کو تمہارے مرنے کے بعد زندہ کیا۔ یہ موت بجلی کی کڑک کی وجہ سے ہوئی تھی اور "بعث" کو موت کے ساتھ اس لئے مقیّد کیا کہ بعث کبھی بے ہوشی یا نیند کی وجہ سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ہے۔

تحقیق لفظِ الرؤیته:

الرؤیته (Dream)

کے معنی کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا کے ہیں۔ اور قوائے نفس (قوائے مدرکہ) کے اعتبار سے رؤیۃ کی چند قسمیں ہیں۔

اقسام رؤیت:

(1) حاسہ بصر یا کسی ایسی چیز سے ادراک کرنا۔

جو حاسہ بصر کے ہم معنی ہے جیسے قرآن میں ہے:

"لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ" (سورۃ التکاثر آیت نمبر 6۔7)

تم ضروری دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے پھر (اگر دیکھو گے بھی تو غیر مشتبہ) یقینی دیکھنا دیکھو گے۔

(2) وہم و خیال سے کسی چیز کا ادراک کرنا۔

جیسے۔ اری ان زیدا منطلق۔ میرا خیال ہے کہ زید جا رہا ہوگا۔ قرآن میں ہے:

"وَلَوْ تَرٰى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا " (سورۃ الانفال آیت نمبر 50)

اور کاش اس وقت کی کیفیت خیال میں لاؤ جب کافروں کی جانیں نکالتے ہیں۔

(3) کسی چیز کے متعلق تفکر اور اندیشہ محسوس کرنا

جیسے فرمایا: " اِنِّیْ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ " (سورۃ الانفال آیت نمبر 48)

میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔

(4) عقل وبصیرت سے کسی چیز کا ادارک کرنا۔

جیسے فرمایا: " مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى "(سورۃ النجم آیت نمبر 11)

دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا۔

جہر کا معنیٰ:

(ج ہ ر) الجهر (ف)

اس کے اصل معنیٰ کسی چیز کا حاسہ سمع یا بصر میں افراط کے سبب پوری طرح ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں چنانچہ حاسہ بصر یعنی نظروں کے سامنے کسی چیز کے ظاہر ہونے کے متعلق کہا جاتا ہے رایتہ جھرا کہ میں نے اسے کھلم کھلا دیکھا قرآن میں ہے:

"لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 55)

کہ جب تک ہم اللہ کو سامنے نمایاں طور پر نہ دیکھ لیں تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

"اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً" (سورۃ النساء آیت نمبر 153)

ہمیں نمایاں اور ظاہر طور پر خدا دکھا دو۔

التفصیل الآخر للفظ الاخذ:

(ا خ ذ) الاخذ

کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو حاصل کر لینا جمع کر لینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

" مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ "(سورۃ یوسف آیت نمبر 79)

خدا کی پناہ کہ ہم لیں مگر اسی کو جس کے پاس ہمارا مال ملا۔

اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں جیسے فرمایا:

" لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 255)

نہ اس پر اونگھ غالب آسکتی اور نہ ہی نیند۔

الصاعقة کی تحقیق مع صقع اور صعق میں فرق:

(ص ع ق) الصاعقة (Explosion,A Crash)

اور صاقعہ دونوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ہولناک دھماکہ۔ لیکن صقع کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور صعق اجسام علوی کے بارے میں۔

اقسام صاعقة:

بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ صاعقہ تین قسم پر ہے۔

اوّل:

اول بمعنی موت اور ہلاکت،

جیسے فرمایا: "فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّماوات وَمَنْ فِي الْاَرْضِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 68)

تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب کے سب مر جائیں گے۔

"فَاَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 153)

سو تم کو موت نے آ پکڑا۔

دوم:

دوم بمعنی عذاب جیسے فرمایا: "اَنْذَرْتُكُمْ صاعِقَةً مِثْلَ صاعِقَةِ عادٍ وَثَمُودَ" (سورۃ فصلت آیت نمبر 13)

میں تم کو مہلک عذاب سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر وہ (عذاب) آیا تھا۔

سوم:

سوم بمعنی آگ (اور بجلی کی کڑک)

جیسے فرمایا: "وَيُرْسِلُ الصَّواعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشاءُ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 13)

اور کڑک بھیجتا ہے تو اسے ڈالتا ہے جس پر چاہے۔

لیکن یہ تینوں چیزیں دراصل صاعقہ کے آثار سے ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو فضا میں سخت آواز کے ہیں پھر کبھی تو اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے یعنی دراصل وہ ایک ہی چیز ہے اور یہ سب چیزیں اس کے آثار سے ہیں۔

نوٹ: قول، ایمان، اللہ اور نظر کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2) : الآیت 56]

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

''پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو''۔

متن:

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ بسبب الصاعقة، وقيد للبعث لأنه قد يكون عن إغماء، أو نوم كقوله تعالى: ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ.

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ نعمة البعث، أو ما كفرتموه لما رأيتم بأس الله بالصاعقة.

ترجمہ:

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ

پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا۔

"بعث" کو موت کے ساتھ اس لئے مقید کیا کہ بعث کبھی بے ہوشی یا نیند کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ اور زندہ اس لئے کیا کہ تم اس نعمت کا شکر ادا کرو۔ یا جس چیز کا تم نے انکار کیا تھا اس پر ایمان لانے کا شکر ادا کرو، کیونکہ بجلی اور کڑک کی صورت میں تم نے اللہ کریم کی طاقت کا کچھ اندازہ کر لیا ہے۔

تحقیق لفظِ بعث:

(ب ع ث) البعث (ف) (Bring to Life)

اصل میں بعث کے معنی کسی چیز کو ابھارنے اور کسی طرف بھجنا کے ہیں اور انبعث در اصل مطاوع ہے بعث کا مگر متعلقات کے لحاظ سے اس کے معنی مختلف ہوتے رہتے ہیں مثلا بعثت البعیر کے معنی اونٹ کو اٹھانے اور آزاد چھوڑ دینا کے ہیں اور مردوں کے متعلق استعمال ہو تو قبروں سے زندہ کر کے محشر کی طرف چلانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

" وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 36)

اور ان مردہ دلوں کو اللہ اٹھائے گا۔

" يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا " (سورۃ المجادلۃ آیت نمبر 6)

جس دن اللہ ان سب کو جلا اٹھائے گا۔

" زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ " (سورۃ التغابن آیت نمبر 7)

" وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ " (سورۃ التغابن آیت نمبر 7)

جو لوگ کافر ہوئے ان کا اعتقاد ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

"مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ" (سورۃ لقمان آیت نمبر 28

تمہارا پیدا کرنا اور جلا اٹھانا ایک شخص کے پیدا کرنے اور جلانے اٹھانے کی طرح ہے۔

بعث کی اقسام:

پس بعث دو قسم پر ہے۔

بعث بشری:

یعنی جس کا فاعل انسان ہوتا ہے جیسے بعث البعیر (یعنی اونٹ کو اٹھا کر چلانا) کسی کو کسی کام کے لئے بھیجنا)

بعث الٰہی:

یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں اول یہ کہ اعیان، اجناس اور فواع کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ قسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس پر کبھی کسی دوسرے کو قدرت نہیں بخشی۔

دوم مردوں کو زندہ کرنا۔ اس صفت کے ساتھ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بھی سرفراز فرما دیتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ہم مثل دوسری انبیاء کے متعلق مذکور ہے اور آیت کریمہ:

"فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ" (سورۃ الروم آیت نمبر 56)

اور یہ قیامت ہی کا دن ہے۔

بھی اسی قبیل سے ہے یعنی یہ حشر کا دن ہے اور آیت کریمہ:

"فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 31)

اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کریدنے لگا۔

میں بعث بمعنی قیض ہے۔ یعنی مقرر کر دیا اور رسولوں کے متعلق کہا جائے۔ تو اس کے معنی مبعوث کرنے اور بھیجنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا" (سورۃ النحل آیت نمبر 36)

اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا۔

جیسا کہ دوسری آیت میں

"اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 44)

فرمایا ہے اور آیت:

"ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا" (سورۃ الکھف آیت نمبر 12)

پھر ان کو جگا اٹھایا تا کہ معلوم کریں کہ جتنی مدت وہ (غار میں) رہے دونوں جماعتوں میں سے اس کو مقدار کس کو خوب یاد ہے۔

میں بعثنا کے معنی صرفۃ نیند سے) اٹھانے کے ہیں اور اس میں بھیجنے کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

"وَیَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا" (سورۃ النحل آیت نمبر 84)

اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے خود ان پر گواہ کھڑا کریں گے۔

"قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 65)

کہہ دو کہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے عذاب بھیجے۔

"فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 259)

تو اللہ نے اسے مردہ رکھا سو برس پھر زندہ کر دیا۔

اور آیت کریمہ: "وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ (سورۃ الانعام آیت نمبر 60)

اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے۔

میں نیند کے متعلق توفی اور دن کو اٹھنے کے متعلق بعث کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 46)

لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا (اور نکلنا) پسند نہ کیا۔

میں انبعاث کے معنی جانے کے ہیں۔

نوٹ: موت، لعل اور شکر کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): الآیت 57]

وَظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ○

"اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا اور تم پر من اور سلویٰ اتارا کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں، اور انہوں نے

کچھ ہمارا نہ بگاڑا ہاں اپنی ہی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے"۔

متن

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ سخر الله لهم السحاب يظلهم من الشمس حين كانوا في التيه.
وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى الترنجبين والسماني. قيل كان ينزل عليهم المن مثل الثلج من الفجر إلى الطلوع، وتبعث الجنوب عليهم السماني، وينزل بالليل عمود نار يسيرون في ضوئه، وكانت ثيابهم لا تتسخ ولا تبلى.
كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ على إرادة القول.
وَمَا ظَلَمُونَا فيه اختصار، وأصله فظلموا بأن كفروا هذه النعم وما ظلمونا.
وَلٰكِنْ كَانُوا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ بالكفران لأنه لا يتخطاهم ضرره.

ترجمہ:

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ

اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا۔

جس وقت بنی اسرائیل میدانِ تیہ میں بھٹک رہے تھے اس وقت اللہ کریم نے ان کے لئے بادلوں کو حکم دیا کہ ان پر دھوپ سے سایہ کریں۔

"من" سے مراد ترنجبین اور "سلویٰ" سے مراد آسمانی پرندہ جو بٹیر کی مثل ہوتا ہے لیکن اس سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ طلوعِ فجر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک پالے اور برف کی طرح ان پر "من" اترتا تھا اور جنوبی ہوا ان کے لئے آسمانی پرندے لاتی تھی اور رات کے وقت روشنی کا ستون اترتا تھا جس کی روشنی میں چلتے تھے، اور ان کے کپڑے نہ میلے ہوتے تھے اور نہ ہی بوسیدہ ہوتے تھے۔

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ

کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں۔

اس سے پہلے قول کا کلمہ مراد ہے یعنی "قلنا" مقدر ہے۔ "وما ظلمونا" اس ترکیب میں اختصار ہے۔ اصل عبارت یوں ہے،

فظلموا بان كفروا هذه النعم وما ظلمونا

تو انہوں نے ظلم کیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ ان نعمتوں کی ناشکری کی اور انہوں نے ہمارے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود

اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے کیونکہ ناشکری کر رہے تھے۔ کیونکہ ناشکری کا وبال ان پر ہی پڑنے والا تھا۔ ان سے ہٹ کر کسی اور پر نہیں پڑنے والا تھا۔

لفظ ظلل کا مفہوم:

(ظ ل ل) الظل (Shade,Shadow)

سایہ یہ الضح (دھوپ) کی ضد ہے اور فیی سے زیادہ عام ہے کیونکہ مجازا الظل کا لفظ تورات کی تاریکی اور باغات کے سایہ پر بھی بولا جاتا ہے۔

ظلل اور فئی میں فرق:

ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے اسے ظل کہہ دیا جاتا ہے مگر فیی ءصرف اس سے سایہ کو کہتے ہیں جو زوال آفتاب سے ظاہر ہوتا ہے اور عزت وحفاظت اور ہر قسم کی خوشحالی کو ظل سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"" اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ "(سورۃ المرسلات آیت نمبر 41)

بے شک ڈروالے سایوں اور چشموں میں ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ پرہیزگار ہر طرح سے عزت وحفاظت میں ہوں گے۔

لفظِ غم کی تحقیق:

(غ م م) الغم (ن) (Grief,Sorrow)

کے بنیادی معنی کسی چیز کو چھپا لینے کے ہیں اسی سے الغمی ہے جس کے معنی غبار اور تاریکی کے ہیں۔ نیز الغمی جنگ کی شدت الغمام کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانپ لیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

" يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 210)

اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔

اسی سے غم الھلال (چاند ابر کے نیچے آگیا اور دیکھا نہ جا سکا۔ ویوم غم سخت گرم دن ولیلۃ غمۃ وغمی (تاریک اور سخت گرم رات) وغیرہا محاورات ہیں کسی شاعر نے کہا ہے:

لیلۃ غمی طامس ھلالھا

تاریک رات جس کا چاند بے نور ہو۔

اور غمۃ الامر کے معنی کسی معاملہ کا پیچیدہ اور مشتبہ ہونا ہیں، قرآن پاک میں ہے:

" ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً "(سورۃ یونس آیت نمبر 71)

پھر تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ رہے۔

یعنی پھر وہ معاملہ تمہارے لئے قلق واضطراب کا موجب نہ ہو اور غم وغمۃ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حزن وکرب جیسے کرب وکربۃ اور غمامۃ اس چیتھڑے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کی ناک اور آنکھوں پر باندھ دیا جاتا ہے تاکہ کسی چیز کو دیکھ یا سونگھ نہ سکے اور ناصیۃ غماء پیشانی کے لمبے بال جو چہرے کو چھالیں۔

مَنّ وسلویٰ کیا تھا؟:

اس میں چند اقوال ہیں:

بعض نے کہا ہے: منۃ بالقول بھی اسی سے ہے کیونکہ احسان جتلانے نے نعمت کو قطع کر دیا تھا اور شکر گزاری کی انقطاع کو مقتضی ہے اور آیت کریمہ:

"وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 57)

اور تمہارے لئے من سلوی اتارتے رہے۔

میں من سے شبنمی گوند مراد ہے جو رات کو درخت کے پتوں پر جم جاتی تھی اور سلویٰ ایک پرندہ کا نام ہے بعض نے کہا ہے کہ من اور سلوی سے احسانات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کئے تھے اور یہ دونوں اصل میں ایک ہی چیز سے عبارت ہیں؛ لیکن ان پر احسان کرنے کے لحاظ سے اسے من کہا ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ نعمت ان کے لئے باعث اطمینان تھی اسے سلویٰ فرمایا ہے جو کہ تسلی سے ماخوذ ہے۔ اس سے ذوی العقول مراد ہوتے ہیں اور غیر ذوی العقول پر اس کا اطلاق یا تو اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ ذوی العقول کے ملتبع مراد ہوں مثلا رایت من فی الدار کہہ کر گھر کے لوگ اور بہائم دونوں مراد لئے جائیں۔ اور یا اس وقت جب اہل نطق کے ساتھ شامل کر کے پھر ان کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔

جیسے فرمایا: "وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

(سورۃ النور آیت نمبر 45)

تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔

اور یہ تنہا غیر ذوی العقول کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔

اکل کا معنیٰ:

(ا ک ل) الاکل (To Eat, To Suffer)

کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً اکلت النار الحطب کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا ڈالا۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے اسے اکل بضم کاف وسکونا کہا جاتا ہے ارشاد ہے،

"اُكُلُهَا دَآئِمٌ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 35)

اُس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

مفہوم طاب:

(ط ی ب) طاب (ض) (Chioce,Liking)

الشئی یطیب طیبا فھو طیب (کے معنی کسی چیز کے پاکیزہ اور حلال ہونے کے ہیں) قرآن میں ہے،

" فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ " (سورۃ النساء آیت نمبر 3)

توان کے سوا عورتیں تم کو پسند ہوں ان سے نکاح کرلو۔

"فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ " (سورۃ النساء آیت نمبر 4)

ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے تم کو چھوڑ دیں۔

اصل میں طیب اسے کہا جاتا ہے جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی اور شریعت کی رو سے الطعام الطیب اس کھانے کو کہا جائے گا جو جائز طریق سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہ سے جائز انداز کے مطابق لیا جائے کیونکہ جو غذا اس طرح حاصل کی جائے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگوار ثابت ہوگی ورنہ دنیا کی خوشگوار چیزیں آخرت میں نقصان دہ ثابت ہونگی اسی بنا پر قرآن طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

" كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 172)

جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اور ان کو کھاؤ۔

نوٹ: نزل، رزق، ظلم اور نفس کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2): آية 58]

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ○

’’اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ، پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے داخل ہو، اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے کہ نیکی والوں کو اور زیادہ دیں‘‘۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ يعني بيت المقدس، وقيل أريحا أمروا به بعد التيه.

فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا واسعاً، ونصبه على المصدر، أو الحال من الواو.

وَادْخُلُوا الْبَابَ أي باب القرية، أو القبة التي كانوا يصلون إليها، فإنهم لم يدخلوا بيت

المقدس في حياة موسى عليه الصلاة والسلام.

سُجَّداً متطامنين مخبتين، أو ساجدين لله شكراً على إخراجهم من التيه.

وَقُولُوا حِطَّةٌ أي مسألتنا، أو أمرك حطة وهي فعلة من الحط كالجلسة. وقرء بالنصب على الاصل بمعنى: حط عنا ذنوبنا حطة. أو على أنه مفعول قُولُوا أي قولوا هذه الكلمة.

وقيل معناه أمرنا حطة أي:

أن نحط في هذه القرية ونقيم بها.

نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ بسجودكم ودعائكم. وقرأ نافع بالياء وابن عامر بالتاء على البناء للمفعول.

وخطايا أصله خطايئ كخطائع، فعند سيبويه أنه أبدلت الياء الزائدة همزة لوقوعها بعد الالف، واجتمعت همزتان فأبدلت الثانية ياء ثم قلبت ألفاً. وكانت الهمزة بين الالفين فأبدلت ياء. وعند الخليل قدمت الهمزة على الياء ثم فعل بهما ما ذكر.

وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ثواباً. جعل الامتثال توبة للمسيء وسبب زيادة الثواب للمحسن، وأخرجه عن صورة الجواب إلى الوعد إيهاماً بأن المحسن بصدد ذلك وإن لم يفعله، فكيف إذا فعله. وأنه تعالى يفعل لا محالة.

ترجمہ:

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ

اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ۔

قریہ سے مراد بیت المقدس ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مراد اریحا ہے، اس میں داخلہ کا حکم میدان تیہ کے بعد ہوا۔

فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَداً

پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ۔

"رغداً" کے معنی وسعت کے ہیں، یعنی وسعت کے ساتھ کھاؤ، یہ مفعول مطلق ہے اسی وجہ سے منصوب ہے۔ یا "کلوا" کی ضمیر مخاطب واؤ سے حال واقع ہے۔ "وادخلوا الباب سجّدا" یہاں باب سے مراد باب القریہ ہے یا باب القبلہ ہے جس کی طرف رخ کر کے وہ لوگ نماز پڑھتے تھے۔ اس لئے کہ بیت المقدس میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات مبارکہ میں داخل ہو سکتے تھے۔ "سجّدا" یعنی تواضع کرتے ہوئے، جھکے ہوئے، یا میدان تیہ سے نکالنے کے شکریہ میں اللہ کریم کا

شکریہ ادا کرتے ہوئے۔ "حطة" کا معنیٰ ہے "مسئلتنا حطة" ہماری درخواست یہ ہے کہ ہمارے گناہ معاف فرمادے، یا معنیٰ ہیں "امرک حطة" اے اللہ کریم تیری شان عفو کی ہے، اور حطۃ مشتق ہے فعلة سے، یعنی اسم ہیئت سے ہے۔ جیسے جِلسة بمعنیٰ ہیئتِ جلوس، اور ایک قرات "حطةً" نصب کے ساتھ ہے یہ اصل تقدیر کی بنیاد پر ہے۔ معنیٰ ہوں گے،

حط عنّا ذنوبنا حطّة

ہمارے گناہوں کو ہمارے اوپر سے اتار دیجئے، معاف فرمادیجئے۔ یا یہ منصوب ہے "قولوا" کا مفعول بہ ہونے کی بنا پر یعنی "قولوا ھذہ الکلمة" اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ معنیٰ میں "امرنا حطة" یعنی ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اسی بستی میں اتریں اور اس میں قیام کریں۔

نغفر لکم خطایاکم

ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے۔

یعنی تمہارے سجدوں اور تمہاری دعا کی وجہ سے ہم تمہاری خطاؤں کو معاف فرمادیں گے۔ نافع کی قرات "یغفر لکم" یاء کے ساتھ بصیغہ مجہول ہے۔ اور ابن عامر نے "تغفر لکم" صیغہ مجہول مؤنث کے ساتھ قرات کی ہے۔ ان دونوں قراتوں کی روشنی میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ بخش دی جائیں گی تمہارے لئے تمہاری خطائیں۔

"خطایا" اصل میں خطایِی بروزن فعالل، بتقدیم یاء علی الھمزہ تھا کیونکہ یہ جمع ہے خطیئة کی جس میں یاء ہمزہ پر مقدم ہے، جیسے خضایع جمع ہے خضیعة کی (بمعنیٰ جانور کے پیٹ کا گڑگڑانا) کی یاء الف کے بعد واقع ہے۔ اس لئے ہمزہ سے تبدیل ہوگئی خطائیی ہوا ہمزہ ثانیہ کو ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے یاء سے بدل دیا خطائی ہوا ہمزہ خود حرفِ ثقیل ہے، مزید برآں یہ کہ اس پر کسرہ جیسی ثقیل حرکت اس پر مستزاد یہ کہ بعد میں کسرہ کی ہم جنس یاء بھی ہے، گویا ثقل در ثقل ہے لہٰذا کسرہ کو فتحہ سے بدل دیا "خطاءا" ہوگیا۔ اب ہمزہ دو الفوں کے درمیان ہے اور ہمزہ اور الف مشابہ ہیں تو گویا تین الف جمع ہوگئے لہٰذا ہمزہ کو الف سے تبدیل کردیا خطایا ہوگیا۔ حاصل یہ کہ سیبویہ کے قول کے مطابق اس میں پانچ تغیرات ہوئے:

1۔ یاء زائدہ کو ہمزہ سے تبدیل کرنا۔

2۔ ہمزہ اصلیہ کو یاء سے تبدیل کرنا۔

3۔ کسرہ کو فتحہ سے تبدیل کرنا۔

4۔ یاء اصلی کو الف سے بدل دینا۔

5۔ ہمزہ زائدہ کو یاء سے بدلنا۔

خلیل نحوی کے نزدیک خطایا کی اصل "خطائیِ" بتقدیم ہمزہ ہے اس کے بعد اس میں وہی تعلیل ہوئی جو ابھی ذکر ہوئی۔

وسنزید المحسنین

اور قریب ہے کہ نیکی والوں کو اور زیادہ دیں۔

یعنی مزید ثواب عطا کریں گے اللہ کریم نے امتثالِ امر کو گنہگاروں کے لئے توبہ اور مغفرت قرار دیا۔ اور نیکوں کے لئے زیادتِ اجر کا باعث قرار دیا۔ اور یہ ترکیب جوابِ امر کے طور پر نہیں ہے اگرچہ جواب امر ہوتا تو "نغفرلکم" کی طرح مجزوم ہوتا اور یوں فرمایا جاتا۔ "ونزد محسنین" غرض کہ جواب کی صورت سے نکال کر اس کو مستقل وعدہ قرار دیا یہ خیال دلانے کے لئے کہ کون نکوکار اس زیادتِ اجر کے درپے ہے، اس کو یہ اجر کی زیادتی مل کر رہے گی اگرچہ وہ امتثالِ امر نہ کرے، اس سے اندازہ کیجئے کہ جب وہ امتثالِ اجر کرے گا اس کے اجر کا کیا عالم ہوگا۔ اور یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ امتثالِ امر ضرور کرے گا۔ امتثالِ امر سے مراد ہے باب القریہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔ اور "حطّۃ" کہنا اللہ کریم نے مغفرت کو تو "قولوا" اور "ادخلوا" پر موقوف کیا ہے، جس کی معنیٰ یہ ہیں کہ اے بدکارو! اے گنہگارو! اگر تم باب القریہ سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوئے اور تم نے "حطّۃ" کی صدائیں لگائیں، تو ہم تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ یہاں تک کہ امر و جوابِ امر کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب نئے سرے سے نیک لوگوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔

وسنزید المحسنین

اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محسنین کو زیادتِ اجر کا ملنا سابقہ امتثالِ امر پر موقوف نہیں ہے۔ گو ان سے توقع یہی ہے کہ وہ امتثالِ امر کریں گے۔

دخول کی تحقیق:

(د خ ل) الدخول (ن) (Entered)

یہ خروج کی ضد ہے۔ اور مکان و زمان اور اعمال سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ دخل مکان کذا، فلاں جگہ میں داخل ہوا۔

قرآن میں ہے: "اُدْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 58)

کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔

قریہ کی تعریف:

(ق ر ی) القریة (Town)

وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر آباد ہو جائیں تو بحیثیت مجموعی ان دونوں کو قریہ کہتے ہیں اور جمع ہونے والے لوگوں اور جگہ انفراد پر بھی قریہ بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 82)

بستی سے دریافت کرلیجئے۔

میں اکثر مفسرین نے اہل کا لفظ محذوف مان کر قریہ سے وہاں کے باشندے مراد لئے ہیں۔

حیث کا استعمال:

(ح ی ث) حیث

یہ ظرف مکان مبنی بر ضم ہے اور مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 144)

اور تم جہاں ہوا کرو۔

تحقیق لفظِ باب:

الباب (Door, Gate)

ہر چیز میں داخل ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ دراصل امکنہ جیسے شہر، مکان، گھر وغیرہ میں داخل ہونے کی جگہ کو باب کہتے ہیں۔ اس کی جمع ابواب ہے۔ قرآن میں ہے:۔

"وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 25)

اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور عورت نے اس کا کُرتا پیچھے سے چیر لیا اور دونوں کو عورت کا میاں دروازے کے پاس ملا۔

"لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 67)

ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔

اور اسی سے (مجازاً) علم میں باب کذا کا محاورہ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ یعنی یہ علم فلاں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"أنا مدينة العلم وعلي بابها" یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

أتيت المروءة من بابها تم نے جوانمردی کو اسی کی جگہ سے حاصل کیا۔

قرآن میں ہے: "فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 44)

تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

"بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ" (سورۃ الحدید آیت نمبر 13)

جس میں ایک دروازہ ہوگا جو اس کی جانب اندرونی ہے اس میں تو رحمت ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابواب جنۃ اور ابوب جہنم سے مراد وہ باتیں ہیں جو ان تک پہنچنے کا ذریعے بنتی ہیں قرآن میں ہے:

"فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 29)

کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

مزید فرمایا:

"حَتَّى إِذَا جَاؤُهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 73)

یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو اُس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ تو اُس کے داروغہ ان سے کہیں کہ تم پر سلام۔

اور جو چیز کسی کام کے لئے صلاحیت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ یہ اس کے مناسب ہے اس کی جمع بابت ہے خلیل کا قول ہے کہ بابۃ کا لفظ حدود (اور حساب میں) استعمال ہوتا ہے بوبت بابا: میں نے دروازہ بنایا۔ نے بنے ہوئے دروازے قائم کئے ہوئے دروازے۔ البواب دربان تبوبت بابا میں نے دروازہ بنایا۔ باب اصل میں بوب ہے اور اس میں الف واؤ سے مبدل ہے۔

تعریف سجدہ:

(س ج د) السجود (ن) (Prostration,Prayer)

اس کے اصل معنی عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس کی عبادت کرنے کو سجود کہا جاتا ہے اور یہ انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔

اقسام سجود:

سجود کی دو قسمیں ہیں۔

سجود اختیاری:

جو انسان کے ساتھ خاص ہے اور اسی سے وہ ثواب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"فَاسْجُدُوا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوا" (سورۃ النجم آیت نمبر 62)

سو اللہ کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

سجودِ تسخیری:

جو انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهاً وَّظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ"

(سورۃ الرعد آیت نمبر 15)

اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے خواہ مجبوری سے اور ان کی پرچھائیاں ہر صبح و شام۔

لفظ حط کا مفہوم:

(ح ط ط) الحط (ن)

کے معنی کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے حططت الرحل (میں نے سواری سے پالان اتار کر نیچے رکھ دیا) جاریته محطوطته المتن دوختر پست شکم کہ پشت دی دراز و ہموار باشد اور آیت کریمہ:

"وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 58)

اور حطتہ کہنا میں بنی اسرائیل کو یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا جس کے معنی ہیں اے اللہ ہمارے گناہ ہم سے اتار دے بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی قولوا صوابا کے ہیں یعنی صحیح بات کہنا۔

لفظِ غفر کا معنیٰ:

(غ ف ر) الغفر (ض) (Forgivenwss)

کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینے کے ہیں جو اسے میل کچیل سے محفوظ رکھ سکے اسی سے محاورہ ہے اغفر ثوبک فی ولوعاء اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ میں ڈال کر چھپا دو۔ اصبغ ثوبک فانہ اغفر لوسخ کپڑے کو رنگ لو کیونکہ وہ میل کچیل کو زیادہ چھپانے والا ہے اللہ کی طرف سے مغفرۃ یا غفران کے معنی ہوتے ہیں بندے کو عذاب سے بچالیا۔ قرآن میں ہے:

"غُفْرَانَكَ رَبَّنَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 285)

اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں۔

تحقیق لفظِ خطا:

(خ ط ء) الخطاء (Mistake)

والخطاءۃ کے معنی صحیح جہت سے عدول کرنے کے ہیں۔

اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

پہلی صورت:

کوئی ایسا کام بالارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔

یہ خطا تام ہے جس پر مواخزہ ہوگا اس معنی میں فعل خطئی یخطاء خطاء و خطاء بولا جاتا ہے قرآن میں ہے۔

"اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيراً" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 31)

کچھ شک نہیں کہ ان کا مارڈالنا بڑا سخت جرم ہے۔

"وَاِنْ كُنَّا لَخَاطِئِيْنَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 91)

اور بلاشبہ ہم خطا کار تھے۔

دوسری صورت:

ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہو جائے۔

کہا جاتا ہے: وهٰذا قد أصاب فی الإرادة وأخطأ فی الفعل

اس میں اس کا ارادہ وہ تو درست ہوتا ہے مگر اس کا فعل غلط ہوتا ہے۔

اسی قسم کی خطا کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"رفع عن أمّتی الخطأ والنسیان"

میری امت سے خطا اور نسیان اٹھائے گئے ہیں۔ نیز فرمایا: وبقوله

من اجتهد فأخطأ فله أجر

جس نے اجتہاد کیا۔ لیکن اس سے غلطی ہوگئی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن میں ہے:

"وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِناً خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ" (سورۃ النساء آیت نمبر 92)

اور جو غلطی سے مومن کو مارڈالے تو ایک تو غلام کو آزاد کردے۔

تیسری صورت:

غیر مستحسن فعل کا ارادہ کرے لیکن اتفاق سے مستحسن فعل سرزد ہو جائے۔

اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے مگر ارادہ غلط ہے لہٰذا اس کا قصد مذموم ہوگا مگر فعل ہے لہٰذا اس کا قصد مذموم ہوگا مگر فعل بھی قابل ستائش نہیں ہوگا۔

الخطیئة:

یہ قریب قریب سیئة کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ہے:

" وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـَٔتُهٗ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 81)
اور اُس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں گے۔ لیکن زیادہ تر خطئة کا استعمال اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جو بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کا ارادہ اس کے صدر کا سبب بن جائے۔

مفہوم احسان:

(ح س ن) الحسن (Favour, Kindness)

الاحسان (افعال)

احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کرنا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے لہٰذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اور انسان پر عدل وانصاف سے کام لینا تو واجب اور فرض ہے مگر احسان مندوب ہے۔ اسی بنا پر فرمایا:

" وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ " (سورۃ النساء آیت نمبر 125)
اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے اللہ کا حکم قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔

اور فرمایا: " وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 178)
اور پسندیدہ طریق سے (قرارداد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خونبہار) کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لئے بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

" وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ " (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 69)
اور اللہ تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

" اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 195)
بیشک اللہ نیکی کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

" مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ " (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 91)
نیکوکاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔

" لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ " (سورۃ النحل آیت نمبر 30)
جنہوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے بھلائی ہے۔

نوٹ: قول، اکل، رغد، شئی، دخل اور زیادہ کا معنی زر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 59]

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلاً غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزاً مِنَ السَّماءِ بِما كانُوا يَفْسُقُونَ ○

”تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا، تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا بدلہ ان کی بے حکمی کا“۔

متن:

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ بدلوا بما أمروا به من التوبة والاستغفار بطلب ما يشتهون من أعراض الدنيا.

فَأَنْزَلْنا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا كرره مبالغة في تقبيح أمرهم وإشعارًا بأن الإنزال عليهم لظلمهم بوضع غير المأمور به موضعه، أو على أنفسهم بأن تركوا ما يوجب نجاتها إلى ما يوجب هلاكها.

رِجْزاً مِنَ السَّماءِ بِما كانُوا يَفْسُقُونَ عذاباً مقدراً من السماء بسبب فسقهم، والرجز في الاصل: ما يعاف عنه، وكذلك الرجس. وقرء بالضم وهو لغة فيه والمراد به الطاعون. روي أنه مات في ساعة أربعة وعشرون ألفا.

ترجمہ:

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلاً غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ

تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا۔

یعنی جس توبہ و استغفار کا ان کو حکم دیا گیا تھا انہوں نے اس کے بدلے میں وہ چیزیں طلب کیں جن کی ان کے نفس میں خواہش پیدا ہوئی یعنی سامانِ دنیا۔

فَأَنْزَلْنا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا

"الّذین ظلموا" کو مکرر ذکر کیا گیا ہے تا کہ ان کے معاملات کی قباحت کے اظہار میں زور پیدا ہو اور یہ معلوم ہوا کہ ان پر عذاب کا نازل کرنا ان کے اس ظلم کی وجہ سے تھا کہ انہوں نے اپنی جانوں پر یہ ظلم کیا تھا کہ جو امور ان کی نجات کا سبب۔ تھے ان کو چھوڑ کر ایسے امور اختیار کئے تھے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔

رِجْزاً مِنَ السَّماءِ بِما كانُوا يَفْسُقُونَ

آسمان سے ان پر عذاب اتارا بدلہ ان کی بے حکمی کا۔

یعنی ایسا عذاب جس کا آسمان سے نزول طے ہو چکا تھا اور یہ سب ان کے فسق کی وجہ سے تھا۔ "رجز" درحقیقت وہ چیز ہے جس سے ناگواری ہو اور "رجس" بھی اسی معنی میں ہے۔ اور "رُجز" راء کے ضمہ کے ساتھ اسی کی ایک لغت ہے۔ اور "رجز" سے مراد طاعون ہے۔

چوبیس ہزار ہلاک:

منقول کے کہ ایک لمحہ میں چوبیس ہزار (24000) آدمی مر گئے تھے۔

لفظِ بدل کی عمدہ تحقیق:

(ب دل) الابدال والتبدیل والتبدل الاستبدال (To Change,To Exchange)
کے معنی ایک چیز کو دوسری کی جگہ رکھنا کے ہیں۔ یہ عوض سے عام ہے کیونکہ عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لینا شرط ہوتا ہے لیکن تبدیل مطلق تغیر کو کہتے ہیں۔ خواہ اس کی جگہ پر دوسری چیز نہ لائے قرآن میں ہے۔

"فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 59)

تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا۔

"وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً" (سورۃ النور آیت نمبر 55)

اور ضرور ان کے اگلے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

اور آیت: "فَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 70)

تو ایسوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔

کے معنی بعض نے یہ کئے ہیں کہ وہ ایسے نیک کام کریں جو ان کی سابقہ برائیوں کو مٹا دیں اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمادیگا اور ان کے نیک عملوں کا انہیں ثواب عطا کریگا۔

"فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 181)

تو جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے۔

"وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ" (سورۃ النحل آیت نمبر 101)

جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں۔

"وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ" (سورۃ سبأ آیت نمبر 16)

اور ان کے باغوں کے عوض دو باغ انہیں بدل دیئے۔

" ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ "(سورۃ الاعراف آیت نمبر 95)
پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔ اور آیت کریمہ:

" يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ "(سورۃ ابراھیم آیت نمبر 48)
کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی موجودہ حالت تبدیل کر دی جائے گی۔

" اَنْ يُبَدِّلَ دِيْنَكُمْ " (سورۃ غافر آیت نمبر 26)
کہ وہ (کہیں گی) تمہارے دین کو (نہ) بدل دے۔

"وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 108)
اور جس شخص نے ایمان چھوڑ کر اس کے بدلے کفر اختیار کیا۔

" وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ " (سورۃ محمد آیت نمبر 38)
اور اگر تم منہ پھرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئیگا۔

اور آیت کریمہ: "مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ " (سورۃ ق آیت نمبر 29)
ہمارے ہاں بات بدلا نہیں کرتی۔

کا مفہوم یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتا پس اس میں تنبیہ ہے کہ جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وقوع پذیر ہوگی وہ اس کے علم کے مطابق ہی وقوع پذیر ہوگی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس کے وعدہ میں خلف نہیں ہوتا۔ اور فرمان باری تعالیٰ:

" وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ "(سورۃ الانعام آیت نمبر 34)
قوانین خداوندی کو تبدیل کرنے والا نہیں۔

"لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ "(سورۃ الروم آیت نمبر 30)
فطرت الٰہی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔

بھی ہر دو معانی پر محمول ہو سکتے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اس آخری آیت میں خبر بمعنی امر ہے اس میں اختصاء کی ممانعت ہے الا ابدال وہ پاکیزہ لوگ کہ جب کوئی شخص ان میں سے مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا قائم مقام فرما دیتے ہیں؟ درحقیقت ابدال وہ لوگ ہیں۔ درحقیقت ابدال وہ لوگ ہیں جنہوں نے صفات ذمیمہ کی بجائے صفات حسنہ کو اختیار کر لیا ہو۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف آیت:

"فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ "(سورۃ الفرقان آیت نمبر 70)
تو ایسوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔

میں ارشاد فرمایا ہے۔

البادلہ کسے کہتے ہیں؟:

البادلۃ گردن اور ہنسلی کے درمیان کا حصہ اس کی جمع بادل ہے قول شاعر،

ولا رهل لباته وبآدله

اس کے سینہ اور بغلوں کا گوشت ڈھیلا نہیں تھا۔

لفظِ غیر کی تعریف:

(غ ی ر) غیر (Alien,Beside)

اور محض نفی کے لئے یعنی اس سے کسی دوسرے معنی کا اثبات مقصود نہیں ہوتا جیسے مررت برجل غیر قائم یعنی میں ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو کھڑا نہیں تھا۔ قرآن میں ہے:

"وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ" (سورۃ القصص آیت نمبر 50)

اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

تحقیق لفظِ رجز:

(ر ج ز) الرجز

اس کے اصل معنی اضطراب کے ہیں اور اسی سے رجز البعیر ہے جس کے معنی ضعف کے سبب چلتے وقت اونٹ کی ٹانگوں کے کپکپائی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے ہیں ایسے اونٹ کو ارجز اور ناقہ کو رجزاء کہا جاتا ہے۔

راجز، رجاز اور رجازۃ:

شعر کے ایک بحر کا نام بھی رجز ہے جس میں شعر پڑھنے سے زبان میں اضطراب سا معلوم ہوتا ہے اور جو قصیدہ اس بحر میں کہا جائے اسے ارجوزۃ کہا جاتا ہے اس کی جمع اراجیز آتی ہے اور رجز فلان وارتجز کے معنی بحر رجز پر شعر بنانے یا ارجوہ پڑھنے کے ہیں اور رجز گو شاعر کو راجز، رجاز اور رجازۃ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

"عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ" (سورۃ سبأ آیت نمبر 5)

(ان کے لئے) عذاب دردناک کی سزا ہے۔

میں لفظ رجز زلزلہ کی طرح عذاب سے کنایہ ہے۔ اور فرمایا:

"اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 34)

ہم ان پر ایک آسمانی آفت نازل کرنے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ: "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ "(سورۃ المدثر آیت نمبر 5)

اور نجاست سے الگ رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رجز سے بت مراد ہیں۔ بعض نے اس سے ہر وہ عمل مراد لیا ہے جس کا نتیجہ عذاب ہو اور گناہ کو بھی مآل کے لحاظ سے عذاب کہا جا سکتا ہے جیسے ندی بمعنی شحم آ جاتا ہے اور آیت:

"وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ"

(سورۃ الانفال آیت نمبر 11)

اور آسمانوں سے تم پر پانی برسا رہا تھا تا کہ اس کے ذریعہ سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی کو تم سے دور کرے۔

میں رجز الشیطان سے مراد خواہشات نفسانی ہیں جیسا کہ اس کے محل میں بیان کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے کفر بہتان طرازی فساد انگیزی وغیرہا گناہ مراد ہیں جن کی کہ شیطان ترغیب دیتا ہے۔

رجازة کسے کہتے ہیں؟:

رجازة وہ کمبل جس میں پتھر وغیرہ باندھ کر اونٹ کے ہودہ کا توازن قائم رکھنے کے لئے ایک طرف باندھ دیتے ہیں اس میں بھی حرکت و اضطراب کے معنی ملحوظ ہیں۔

لقی کی تحقیق:

(ل ق ی) لقیہ (س) (To be Mixed,Mingled)

یلقاہ لقاء کے معنی کسی کے سامنے آنے اور اسے پالینے کے ہیں اور ان دونوں معنی میں سے ہر ایک الگ الگ بھی بولا جاتا ہے اور کسی چیز کا حس اور بصیرت سے ادراک کر لینے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"'لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 143)

اور تم موت (شہادت) آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے اور ملاقات الٰہی سے مراد قیامت کا بپا ہونا اور اللہ تعالٰی کے پاس چلے جانا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے: "وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُلاقُوْهُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 223)

اور جان رکھو کہ ایک دن تمہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے۔

رجع اور رجوع میں فرق:

(ر ج ع) الرجوع (To Return Back)

اس کے اصل معنی کسی چیز کے اپنے مبدا حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور

خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جز کے اور یا باعتبار فعل کے ہو الغرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رجع کے معنی لوٹانے کے۔

نوٹ: ظلم، قول سماء، فسق اور لفظ رب کا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 60]

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْناً قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو فوراً اس میں سے بارہ چشمے بہ نکلے، ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا کھاؤ اور پیو خدا کا دیا اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو“۔

متن:

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوسٰى لِقَوْمِهٖ لما عطشوا في التيه.

فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ اللام فيه للعهد على ما روي أنه كان حجرا طوريا. مكعبا حمله معه، وكانت تنبع من كل وجه ثلاث أعين، تسيل كل عين في جدول إلى سبط، وكانوا ستمائة ألف وسعة المعسكر اثنا عشر ميلاً. أو حجراً أهبطه آدم من الجنة، ووقع إلى شعيب عليه السلام فأعطاه لموسى مع العصا. أو الحجر الذي فر بثوبه لما وضعه عليه ليغتسل وبرأه الله به عما رموه به من الادرة. فأشار إليه جبريل عليه السلام بحمله. أو للجنس وهٰذا أظهر في الحجة. قيل لم يأمره بأن يضرب حجراً بعينه، ولكن لما قالوا:

كيف بنا لو أفضينا إلى أرض لا حجارة بها؛ حمل حجراً في مخلاته، وكان يضربه بعصاه إذا نزل فينفجر، ويضربه بها إذا ارتحل فييبس، فقالوا: إن فقد موسى عصاه متنا عطشاً. فأوحى الله إليه لا تقرع الحجر وكلمه يطعك لعلهم يعتبرون. وقيل كان الحجر من رخام وكان ذراعًا في ذراع، والعصا عشرة أذرع على طول موسى عليه السلام من آس الجنة ولها شعبتان تتقدان في الظلمة.

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا متعلق بمحذوف تقديره: فإن ضربت فقد انفجرت، أو فضرب فانفجرت، كما مر في قوله تعالى: فَتَابَ عَلَيْكُمْ. وقرء »عَشِرَة« بكسر الشين

وفتحها وهما لغتان فيه.

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ كل سبط. مَشْرَبَهُمْ عينهم التى يشربون منها. كُلُوا وَاشْرَبُوا على تقدير القول:

مِنْ رِزْقِ اللهِ يريد به ما رزقهم الله من المن والسلوى وماء العيون. وقيل الماء وحده لأنه يشرب ويؤكل مما ينبت به. وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ لا تعتدوا حال إفسادكم، وإنما قيده لأنه وإن غلب فى الفساد قد يكون منه ما ليس بفساد، كمقابلة الظالم المعتدى بفعله، ومنه ما يتضمن صلاحاً راجحاً كقتل الخضر عليه السلام الغلام وخرقه السفينة، ويقرب منه العيث غير أنه يغلب فيما يدرك حساً. ومن أنكر أمثال هذه المعجزات فلغاية جهله بالله وقلة تدبره فى عجائب صنعه، فإنه لما أمكن أن يكون من الاحجار ما يحلق الشعر وينفر عن الخل ويجذب الحديد، لم يمتنع أن يخلق الله حجراً يسخره لجذب الماء من تحت الارض، أو لجذب الهواء من الجوانب ويصيره ماء بقوة التبريد ونحو ذلك.

ترجمہ:

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ان کو میدانِ تیہ میں پیاس لگی تھی، "الحجر" اس میں لام عہدِ خارجی کا ہے، یعنی "الحجر" سے ایک معیّنہ پتھر مراد ہے جو کوہِ طور سے لیا گیا تھا، اس کے چار (4) کونے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ پتھر اپنے ساتھ لے لیا اس سے تین چشمے نکلتے تھے۔ ہر چشمہ ایک نالی کی صورت میں ایک خاندان تک پہنچتا تھا۔ بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ (600000) تھی، اور لشکر کی وسعت بارہ (12) میل پر پھیلی ہوئی تھی، یا اس سے وہ پتھر مراد ہے جو حضرت آدم علیہ السلام جنّت سے لے کر آئے تھے، پھر وہ حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا، پھر حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا کے ساتھ یہ پتھر بھی عنایت فرمایا، یا یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بوقتِ غسل کپڑے رکھے تھے اور وہ کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عیب سے بری کرنا چاہتا تھا جس کی بنی اسرائیل نے آپ علیہ السلام پر تہمت لگائی ہوئی تھی۔ یعنی انتفاخِ خصیتین، یعنی جب وہ پتھر کپڑے لے کر بھاگ گیا تو لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ لیا کہ وہ اس عیب سے پاک ہیں۔ اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے یہ مشورہ دیا کہ اس کو اٹھا لیجئے اور اپنے ساتھ رکھیے۔

یا "الحجر" کا لام تعریفِ جنس کے لئے ہے یہ توجیہہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے حجّت پوری طرح قائم ہو جاتی ہے۔ اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پانی کا پھوٹ نکلنا کسی خاص پتھر کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ خالص معجزۂ نبی تھا۔

قیل لم یامرہ ان یضرب حجراً بعاینه

وہ پتھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس حیثیت سے نہیں لیا تھا کہ معیّن طریقہ پر اسی کو لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ بلکہ اس لئے تھا کہ جنسِ حجر کا وہ بھی ایک فرد ہے۔ بنی اسرائیل جب حجر کے بارے میں مطمئن ہوئے تو انہوں نے عصا کے بارے میں اندیشے ظاہر کرنا شروع کر دیئے، کہنے لگے اگر عصائے موسیٰ گم ہوگیا تو ہم پیاس سے مر جائیں گے تو اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ پتھر کو مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے صرف کہہ دو وہ تمہاری اطاعت کرے گا۔ شاید بنی اسرائیل اس سے ہدایت حاصل کریں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر پتلا سا تھا ایک ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ چوڑا تھا، اور عصا دس (10) ہاتھ کا تھا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد جتنا تھا۔ یہ جنّت کے درخت مورد کی لکڑی کا تھا اس میں دو (2) شاخیں تھیں جو رات کو روشن ہو جاتی تھیں۔

"فانفجرت" کا تعلق جملہ محذوفہ سے ہے تقدیرِ عبارت یہ ہوگی،

فان ضربت فقد انفجرت

یعنی اگر تم نے عصا کو پتھر پر مارا۔ تو بس ادھر مارا اُدھر چشمہ پھوٹ پڑا۔ یا تقدیرِ عبارت ہے،

فضرب فانفجرت

یعنی موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا اور چشمے پھوٹ نکلے۔ یہ محذوفات و مقدرات ایسے ہی ہیں جیسا کہ اللہ کریم کا فرمان "فتاب علیکم" میں بیان ہوئے ہیں اور عشرہ کا لفظ جب اثنان یا ثالثہ وغیرہ کے ساتھ مرکب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔ تو اس کے شین میں دو لغتیں اور بھی ہیں۔ سین کا کسرہ اور شین کا فتحہ۔ اور قراء نے ان دونوں لغات کے ساتھ پڑھا ہے۔

"کل انیس" سے مراد بنی اسرائیل کا ہر قبیلہ اور خاندان ہے۔ "مشربھم" یعنی وہ چشمہ جس سے اس خاندان کو پانی پینا ہے۔ "کلوا واشربوا" اس سے پہلے "قلنا لھم" مقدر ہے۔ "من رزق اللّٰہ" رزق سے مراد وہ رزق ہے جو اللہ کریم نے ان کو عطا کیا تھا، یعنی من وسلویٰ اور چشموں کا پانی، پس کلوا متوجہ ہے من وسلویٰ کی جانب اور اشرکوا متوجہ ہے ماء العیون کی جانب، یعنی من وسلویٰ کھاؤ اور چشموں کا پانی پیو۔ بعض کے نزدیک رزق سے مراد صرف پانی ہے کیونکہ خود پانی پیا جاتا ہے اور پانی سے جو کچھ اگتا ہے اس کو کھایا جاتا ہے لہٰذا کلوا واشربوا کا امر اس تفسیر پر بھی منطبق ہے۔

ولا تعثوا فی الارض مفسدین

اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو۔

"لا تعثوا" کے معنی ہیں کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ اور مفسدین "لا تعثوا" کی ضمیر فاعل سے حال واقع ہے لہٰذا ترجمہ ہوگا کہ تم اپنے فساد کرنے کی حالت میں حد سے تجاوز نہ کرو، شاید مقصود یہ ہے کہ نہ فساد کرو اور نہ حد سے تجاوز کرو۔ اور "لا تعثوا" کو مفسدین کے ساتھ مقیّد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ "عثیٰ" جس سے "لا تعثوا" مشتق ہے۔ اگرچہ فساد کے معنی میں

اس کا استعمال غالب ہے لیکن کبھی ایسی چیز پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جو فساد نہیں ہوتی۔ جیسے ظالم متعدی کے بدلہ میں اس پر اعتداء کرنا باوجودیکہ فساد نہیں ہے لیکن اس پر عثاء کا لفظ بولا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس صورت میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جس میں صلاح کا پہلو غالب ہو جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا لڑکے کو قتل کرنا، اور کشتی میں شگاف ڈالنا، پس مفسدین کے ساتھ مقید کرنے کے معنی یہ ہیں کہ مخاطبین کو اس چیز سے منع کرنا مقصود ہے جس میں صرف فساد ہی کے معنی ہیں کوئی دوسرا پہلو اس میں نہیں ہے۔

ومن أنکر أمثال هذه المعجزات

عصا کا سانپ بن کر دوڑنے لگنا، چھوٹے سے پتھر سے بارہ چشمے نکلنا، وغیرہ معجزات ہیں۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ان معجزات کے منکر ہیں۔ لیکن یہ انکار اس پر مبنی ہے کہ منکر اللہ کریم کی شان سے جاہل ہیں اور اس عجیب وغریب مخلوقات میں اس نے بہت کم غور کیا ہے۔ لیکن جو لوگ فاعلِ مختار کے وجود کا اعتقاد رکھتے ہیں یہ شبہات ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتے اور جو قادر مختار کے وجود پر ایمان نہیں رکھتے ان کے اوپر جہل اور غباوت کی ظلمت چھائی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ یہ غور کرسکتے ہیں کہ جب ہمارے سامنے پتھروں کی ایک ایسی قسم موجود ہے جن کو بالوں پر رکھ دیا جائے تو بال غائب ہو جائیں، اسی طرح ایک قسم پتھروں کی ایسی ہے جس کی طبیعت سرکہ کے منافی ہے، اس کو سرکہ میں ڈالئے تو اچھل کر باہر آجائے گا۔ ایک پتھر ایسا ہے جو مقناطیسی خاصیت رکھتا ہے اور لوہے کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے جب اللہ کریم نے ہمارے سامنے ایسی چیزیں رکھ دیں تو کیا اس قادر وتوانا کے یہاں یہ بعید ہے کہ ایسا پتھر پیدا فرما دے جو پانی کو زمین کے نیچے سے کھینچ لے یا اپنے چاروں طرف سے ہوا کو جذب کر لے، اور قوتِ تبرید یا اس جیسی مخفی تدبیر سے اس کو پانی بنادے۔

استسقاء کا معنیٰ:

الاستسقاء (Ask for Water)

کے معنی کسی سے پانی طلب کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔

"وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 60)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو۔

لفظِ ضرب کی عمدہ تحقیق:

(ض ر ب) الضرب (Struck.Beat)

کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر واقع کرنا یعنی مارنا کے ہیں اور مختلف اعتبارات سے یہ لفظ بہت سے معانی میں استعمال

ہوتا ہے۔ ہاتھ لاٹھی تلوار وغیرہ سے مارنا۔ قرآن میں ہے:

"فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 12)

ان کے سر مار کر اڑا دو اور ان کا پور پور مار کر توڑ دو۔

"فَضَرْبَ الرِّقَابِ" (سورۃ محمد آیت نمبر 4)

تو انکی گردنیں اڑا دو۔

"فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 73)

تو ہم نے کہا کہ اس بیل کا سا ٹکڑا مقتول کو مارو۔

"أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 160)

اپنی لاٹھی پتھر پر مارو۔

"فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 93)

پھر ان کو داہنے ہاتھ سے مارنا اور توڑنا شروع کیا۔

"يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ" (سورۃ محمد آیت نمبر 27)

ان کے مونہوں پر مارتے ہیں۔

اور ضرب الارض بالمطر کے معنی بارش برسنے کے ہیں۔ اور ضرب الدراھم (دراہم کو ڈھالنا) کا محاورہ الضرب بالمطرقۃ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے۔ اور ٹکسال کے سکہ میں اثر کرنے کے مناسبت سے طبع الدرھم کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر انسان کی عادت کو ضریبۃ اور طبیعۃ بھی کہہ دیتے ہیں۔ ضرب فی الارض کے معنی سفر کرنے کے ہیں۔ کیونکہ انسان پیدل چلتے وقت زمین پر پاؤں رکھتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 101)

اور جب سفر کو جاؤ۔

"وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 156)

اور ان کے مسلمان بھائی جب خدا کی راہ میں سفر کریں تو ان کی نسبت کہتے ہیں۔

"لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 273)

اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اور یہی معنی آیت:

"فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 77)

اوران کے لئے دریا میں سوکھا راستہ نکال دے۔

یعنی انہیں سمندر میں خشک راستے سے لے جاؤ۔

ضرب الفحل ناقة (نر کا مادہ سے جفتی کرنا) یہ محاورہ ضرب بالمطرقة (ہتھوڑے سے کوٹنا) کی مناسبت سے طرق الفحل الناقة کا محاورہ بولا جاتا ہے۔ ضرب الخیمة خیمہ لگانا کیونکہ خیمہ لگانے کے لئے میخوں کو زمین میں ہتھوڑے سے ٹھونکا جاتا ہے اور خیمہ کی مناسبت سے آیت:

"ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 112)

اور آخر کار ذلت ان سے چمٹا دی گئی۔

میں ذلۃ کے متعلق ضرب کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی کہ ذلت نے انہیں اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا جیسا کہ کسی شخص پر خیمہ لگا ہوا ہوتا ہے اور یہی معنی آیت:

"وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 112)

اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے۔

کے ہیں اور آیت:

" فَضَرَبْنا عَلَى آذانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَداً " (سورۃ الکهف آیت نمبر 11)

تو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے کئے برس تھپکا۔

نیز آیت کریمہ: " فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ " (سورۃ الحدید آیت نمبر 13)

پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائیگی۔

میں ضرب کا لفظ ضرب الخیمة کے محاورہ سے مستعار ہے۔ ضرب العود والنای والبوق عود اور نے بجان یا نرسنگھے میں پھونکنا۔

ضرب اللبن:

اینٹیں چننا، ایک اینٹ کو دوسری پر لگانا ضرب المثل کا محاورہ ضرب الدراھم ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی بات کو اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے۔

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا "(سورۃ الزمر آیت نمبر 29)

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے:

" وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا"(سورۃ الکهف آیت نمبر 32)

اور ان سے قصہ بیان کرو۔

" ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِنْ اَنْفُسِكُمْ " (سورۃ الروم آیت نمبر 28)
وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

" وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ " (سورۃ الروم آیت نمبر 58)
اور ہم نے ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔

" وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا " (سورۃ الزخرف آیت نمبر 57)
اور جب مریم (علیہ السلام) کے بیٹے (عیسٰی) کا حال بیان کیا گیا۔

" مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا " (سورۃ الزخرف آیت نمبر 58)
انہوں نے عیسٰی کی جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

" وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا " (سورۃ الکہف آیت نمبر 45)
اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کردو۔

" اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا " (سورۃ الزخرف آیت نمبر 5)
بھلا (اس لئے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو) ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے۔

مضاربۃ:

المضاربۃ ایک قسم کی تجارتی شرکت (جس میں ایک شخص کا سرمایہ اور دوسرے کی محنت ہوتی ہے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں) المضربۃ (دلائی رضائی) جس پر بہت سی سلائی کی گئی ہو۔ التضریب اکسانا گویا اسے زمین میں سفر کی ترغیب دی جاتی ہے۔

اضطراب:

الاضطراب کثرت سے آنا جانا حرکت کرنا یہ معنی ضرب الارض سے ماخوذ ہیں۔ استضرب الناقۃ سانڈھے نے ناقہ پر جفتی کھانے کی خواہش کی۔

لفظِ عصا کا معنیٰ:

(ع ص ی) العصا (Mace)
(لاٹھی) یہ اصل میں ناقص وادی ہے کیونکہ اس کا تثنیہ عصوان جمع عصی آتی عصوتہ میں نے اسے لاٹھی سے مارا۔ عصیت بالسیف تلوار کو لاٹھی کی طرح دونوں ہاتھ سے پکڑ کر مارا۔ قرآن میں ہے:

"وَاَلْقِ عَصَاكَ" (سورۃ النمل آیت نمبر 10)

اپنی لاٹھی ڈال دو۔

"فَاَلْقٰی عَصَاہُ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 107)

موسیٰ نے اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دی۔

"قَالَ هِيَ عَصَايَ" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 18)

انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے۔

"فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 44)

تو انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں۔

القی فلان عصاہ کسی جگہ پڑاؤ ڈالنا کیونکہ جو شخص سفر سے واپس آتا ہے وہ اپنی لاٹھی ڈال دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

والقت عصاها واستقربها النوی

فراق نے اپنی لاٹھی ڈال دی اور جم کر بیٹھ گیا۔

عصی عصیانا کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں دراصل اس کے معنی ہیں اس نے لاٹھی (عصا) سے اپنا بچاؤ کیا۔ قرآن میں ہے:

"وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 121)

اور آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ نہ پائی۔

"وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" (سورۃ النساء آیت نمبر 14)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔

"آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ" (سورۃ یونس آیت نمبر 91)

کیا اب اور پہلے سے نافرمان رہا۔

اور اس شخص کے متعلق جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے اسے کہا جاتا ہے فلان شق لعصا۔

حجر کی تعریف:

(ح ج ر) الحجر (Stone)

سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع احجار و حجارۃ آتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 24)

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

تعریفِ فجر:

(ف ج ر) الفجر (Dawn,Morning)

کے معنی کسی چیز کو وسیع طور پر پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں جیسے محاورہ ہے فجر الانسان السکری اس نے بند میں وسیع شگاف ڈال دیا فجرتہ فانفجر تہ فتنفجر شدت کے ساتھ پانی کو پھاڑ کر بہایا قرآن میں ہے:

"وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا "(سورۃ القمر آیت نمبر 12)

اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے۔

"وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا "(سورۃ الکھف آیت نمبر 33)

اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو۔

"تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا "(سورۃ الاسراء آیت نمبر 90)۔

جب تک کہ ہمارے لئے زمین میں سے چشمے جاری (نہ) کر دو۔

اور ایک قرآت میں تفجر (بصیغہ تفعیل) ہے۔

فجر کی وجہ تسمیہ:

"فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 60)

تو پھر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اور اسی سے صبح کو فجر کہا جاتا ہے۔

کیونکہ صبح کی روشنی بھی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے،

"وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ "(سورۃ الفجر آیت نمبر 1۔2)

فجر کی قسم اور دس راتوں کی۔

"اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا "(سورۃ الاسراء آیت نمبر 78)

کیونکہ صبح کے وقت قرآن پڑھنا موجب حضور (ملائکہ) ہے۔

فجر کی اقسام:

بعض نے کہا ہے کہ فجر دو قسم پر ہے ایک فجر کاذب جو بھیڑیے کی دم کی طرح سیدھی روشنی سی نمودار ہوتی ہے دوم فجر صادق جس کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ احکام تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے،

" حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى

اللَّيْلِ "(سورۃالبقرۃ آیت نمبر 187)

یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو۔

تحقیق بالتفصیل للفظ العین:

(ع ی ن) العین (Person)

اور عین کے معنی شخص اور کسی چیز کا محافظ کے بھی آتے ہیں اور فلان بعینی کے معنی ہیں۔ فلاں میری حفاظت اور نگہبانی میں ہے جیسا کہ ھو بمرای منی و مسمع کا محاورہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا" (سورۃالطور آیت نمبر 48)

تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔

وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی۔

"وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ "(سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 39)

اور اس لئے کہ تو میری نگاہ کے سامنے تیار ہو۔

اور اسی سے عین اللہ علیک ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت اور نگہداشت فرمائے یا اللہ تعالیٰ تم پر اپنے نگہبان فرشتے مقرر کرے جو تمہاری حفاظت کریں اور اعین و عیون دونوں عین کی جمع ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَلَا اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْ اَعْيُنُكُمْ "(سورۃ ھود آیت نمبر 31)

اور میں انہیں نہیں کہتا جن کو تمہاری نگاہیں حقیر سمجھتی ہیں۔

"رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ "(سورۃالفرقان آیت نمبر 74)

اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما۔

اور استعارہ کے طور پر عین کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو مختلف اعتبارات سے آنکھ میں پائے جاتے ہیں۔

پہلا معنی:

مشکیزہ کے سوراخ کو عین کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہیئت اور اس سے پانی بہنے کے اعتبار سے آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ پھر اس سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے۔

دوسرا معنی:

سقاء عین و معین پانی کی مشک جس سے پانی ٹپکتا ہو عین قربتک اپنی نئی مشک میں پانی ڈالوا تاکہ تر ہو کر اس میں سلائی کے سوراخ بھر جائیں، جاسوس کو عین کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دشمن پر آنکھ لگائے رہتا ہے جس طرح کہ عورت کو فرج اور سواری کو ظہر

کہا جاتا ہے کیونکہ ان دونوں سے مقصود یہی دو چیزیں ہوتی ہیں چنانچہ محاورہ ہے،

فلان یملک کذا فرجا و کذا ظهرا

فلاں کے پاس اس قدر لونڈیاں اور اتنی سواریاں ہیں۔

تیسرا معنیٰ:

عین بمعنی سونا بھی آتا ہے کیونکہ جو جواہر میں افضل سمجھا جاتا ہے جیسا کہ اعضاء میں آنکھ سب سے افضل ہوتی ہے اور ماں باپ دونوں کی طرف سے حقیقی بھائیوں کو اعیان الاخوۃ کہا جاتا ہے۔

چوتھا معنیٰ:

بعض نے کہا ہے کہ عین کا لفظ جب ذات شے کے معنی میں استعمال ہو جیسے کل مالہ عین تو یہ معنی مجاز ہی ہوگا جیسا کہ غلام کو رقبۃ (گردن) کہہ دیا جاتا ہے اور عورت کو فرج (شرمگاہ) کہہ دیتے ہیں کیونکہ عورت سے مقصود یہی جگہ ہوتی ہے۔

پانچواں معنیٰ:

پانی کے چشمہ کو بھی عین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پانی ابلتا ہے جس طرح کہ آنکھ سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور عین الماء سے ماء معین کا محاورہ لیا گیا ہے جس کے معنی جاری پانی کے ہیں جو صاف طور پر چلتا ہوا دکھائی دے۔

اور عین کے معنی جاری چشمہ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

"عَيْناً فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا" (سورۃ الانسان آیت نمبر 18)

یہ بہشت میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے۔

"وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا" (سورۃ القمر آیت نمبر 12)

اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے۔

"فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيَانِ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 50)

ان میں دو چشمے بہ رہے ہیں۔

"عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ" (سورۃ الرحمن آیت نمبر 66)

دو چشمے ابل رہے ہیں۔

"وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ" (سورۃ سبا آیت نمبر 12)

اور ان کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا تھا۔

"فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 45)

باغ اور چشموں میں۔

"مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 57)

باغ اور چشمے اور کھیتیاں۔

عنت الرجل کے معنی ہیں. میں نے اس کی آنکھ پر مارا جیسے راستہ کے معنی ہوتے ہیں میں نے اس کے سر پر مارا فادتہ میں نے اس کے دل پر مارا نیز عنتہ کے معنی ہیں میں نے اسے نظر بد لگادی جیسے سفتہ کے معنی ہیں میں نے اسے تلوار سے مارا یہ اس لئے کہ اہل عرب کبھی تو اس عضو سے فعل مشتق کرتے ہیں جس پر مارا جاتا ہے اور کبھی اس چیز سے جو مارنے کا آلہ ہوتی ہے جیسے سفتہ ورمحتہ چنانچہ یدیتہ کا لفظ ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی میں نے اسے ہاتھ سے مارا یا اس کے ہاتھ پر مارا اور عنت البئر کے معنی ہیں کنواں کھودتے کھودتے اس کے چشمہ تک پہنچ گیا قرآن پاک میں ہے.

"اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ" (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 50)

ایک اونچی جگہ پر جو رہنے کے لائق تھی اور بہتا پانی جاری تھا۔

"فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ" (سورۃ الملك آیت نمبر 30)

تو (سوائے خدا کے) کون ہے جو تمہارے لئے شیریں پانی کا چشمہ بہالائے۔

بعض نے کہا ہے کہ معین میں لفظ میم حروف اصلیہ سے ہے اور یہ معنت سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں کسی چیز کا سہولت سے چلنا یا بہنا اور پر بھی بولا جاتا ہے اور وحشی گائے کو آنکھ کی خوب صورتی کی وجہ سے اعین دعیناء کہا جاتا ہے اس کی جمع عین سے پھر گاوان وحشی کے ساتھ تشبیہ دے کر خوبصورت عورتوں کو بھی عین کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ" (سورۃ الصافات آیت نمبر 48)

جو نگاہیں نیچی رکھتی ہوں (اور) آنکھیں بڑی بڑی۔

"وَحُوْرٌ عِيْنٌ" (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 22)

اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

شراب کی تعریف:

(ش ر ب) الشراب (To Drink)

کے معنی پانی یا کسی اور مائع چیز کو نوش کرنے کے ہیں۔ قرآن نے ہی جنت کے متعلق فرمایا:

"وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا" (سورۃ الانسان آیت نمبر 21)

اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائیگا۔

اور اہل دوزخ کے متعلق فرمایا:

"لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ" (سورۃ یونس آیت نمبر 4)
ان کے لئے پینے کو کھولتا ہوا پانی۔

شراب کی جمع اشربۃ ہے اور شربتہ شربا و شربا کے معنی پینے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:

"فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ"
تو جو اس کا پانی پیے وہ میرا نہیں اور جو نہ پیے وہ میرا ہے مگر وہ جو ایک چلّو اپنے ہاتھ سے لے لے تو سب نے اس سے پیا مگر تھوڑوں نے۔

چنانچہ انہوں نے اس سے پی لیا۔ نیز فرمایا:

"فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ" (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 55)
اور پیو گے بھی تو ایسے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔

الشراب پانی کا حصہ پینے کی باری۔

قرآن میں ہے:

"هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ" (سورۃ الشعراء آیت نمبر 155)
یہ اونٹنی ہے (ایک دن) اس کی پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین تمہاری باری۔

"كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ" (سورۃ القمر آیت نمبر 28)
ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیئے۔

المشرب کی تعریف:

المشرب مصدر پانی پینا (ظرف زمان یا مکان) پانی پینے کی جگہ یا زمانہ قرآن میں ہے:

"قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 60)
تمام لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر کے پانی پی لیا۔

الشراب تم پیالہ یا شراب کو کہتے ہیں اور مونچھ کے بالوں اور حلق کی اندرونی رگ کو شارب کہا جاتا ہے گویا ان کو پینے والا تصور کیا گیا ہے اس کی جمع شوارب آتی ہے۔ ھزلی نے گورخر کے متعلق کہا ہے۔

صخب الشوارب لا یزال کانہ
اس کی مونچھیں سخت گویا وہ۔

اور آیت کریمہ: " وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 93)

اور ان (کے کفر کے سبب) بچھڑا (گویا) ان کے دلوں میں رچ گیا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اشربت البعیر کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے گلے میں رسی باندھنے کے ہیں شاعر نے کہا ہے:

واشرب تها الاقران حتیٰ وقص تها بقرح وقد القین کل جنین

میں نے انہیں باہم باندھ لیا حتیٰ کہ قرح (منڈی) میں لا ڈالا اس حال میں کہ انہوں نے حمل گرا دیئے تھے۔

تو آیت کے معنی یہ ہیں کہ گویا بچھڑا ان کے دلوں پر باندھ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی ہے کیونکہ عربی محاورہ میں جب کسی کی محبت یا بغض دل کے اندر سرایت کر جائے تو اس کے لئے لفظ شراب کو بطور استعارہ بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ بدن میں نہایت تیزی سے سرایت کرتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

تغلغل حيث لم يبلغ شرابه ولا حزن ولم يبلغ

سرور اس کی محبت وہاں تک پہنچ گئی جہاں کہ نہ شراب اور نہ ہی حزن و سرور پہنچ سکتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر زیادہ نہیں تھی تو ہم کہیں گے کیوں نہیں؟ عجل کا لفظ بول کر ان کی فرط محبت پر تنبیہ کی ہے کہ بچھڑے کی صورت ان کے دلوں میں اس طرح نقش ہو گئی تھی کہ محو نہیں ہو سکتی تھی مثل مشہور ہے۔ اشربتنی مالم اشرب یعنی تو نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔

فساد کی تعریف:

(ف س د) الفساد (ن) (Quarrel)

یہ فسد الشئی فھو فاسد کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ قرآن میں ہے:

" لَفَسَدَتِ السَّماوَاتُ وَالْأَرْضُ " (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 71)

تو آسمان و زمین سب درہم برہم ہو جائیں۔

نوٹ: اذا، قد، ناس، اکل اور رزق

[سورة البقرة (2) : آية 61]

وَإِذْ قُلْتُمْ يا مُوسى لَنْ نَصْبِرَ عَلى طَعامٍ واحِدٍ فَادْعُ لَنا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِها وَقِثَّائِها وَفُومِها وَعَدَسِها وَبَصَلِها قالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنى بِالَّذِي هُوَ

خَيْرٌ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللهِ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ○

"اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا تو آپ اپنے رب سے دعاء کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لئے نکالے کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا اور ان پر مقرر کردی گئی خواری اور ناداری، اور خدا کے غضب میں لوٹے، یہ بدلہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے، یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا،،

متن:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نَصْبِرَ عَلَى طَعَامٍ وَاحِدٍ يريدون به ما رزقوا في التيه من المن والسلوى.

وبوحدته أنه لا يختلف ولا يتبدل، كقولهم طعام مائدة الامير واحد يريدون أنه لا تتغير ألوانه وبذلك أجمعوا أو ضرب واحد، لأنهما طعام أهل التلذذ وهم كانوا فلاحة فنزعوا إلى عكرهم واشتهوا ما ألفوه. **فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ**.

سله لنا بدعائك إياه **يُخْرِجْ لَنَا** يظهر ويوجد، وجزمه بأنه جواب فادع فإن دعوته سبب الإجابة.

مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ من الإسناد المجازي، وإقامة القابل مقام الفاعل، ومن للتبعيض. **مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا** تفسير وبيان وقع موقع الحال، وقيل بدل بإعادة الجار. والبقل ما أنبتته الارض من الخضر والمراد به أطايبه التي تؤكل. والفوم الحنطة ويقال للخبز ومنه فوموا لنا، وقيل الثوم وقرء «قُثَّائها» بالضم، وهو لغة فيه.

قَالَ أي الله، أو موسى عليه السلام. **أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَى** أقرب منزلة وأدون قدراً. وأصل الدنو القرب في المكان فاستعير للخسة كما استعير البعد للشرف والرفعة، فقيل بعيد المحل بعيد الهمة. وقرء «أدنأ» من الدناءة. **بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ** يريد به المن والسلوى فإنه خير في اللذة والنفع وعدم الحاجة إلى السعي. **اهْبِطُوا مِصْرًا** انحدروا إليه من التيه، يقال هبط الوادي إذا نزل به، وهبط منه إذا خرج منه، وقرء بالضم

والمصر البلد العظيم وأصله الحد بين الشيئين، وقيل أراد به العلم، وإنما صرفه لسكون وسطه أو على تأويل البلد، ويؤيده أنه غير مدون فى مصحف ابن مسعود. وقيل أصله مصرائيم فعرب.

فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ أحيطت بهم إحاطة القبة بمن ضربت عليه، أو ألصقت بهم، من ضرب الطين على الحائط، مجازاة لهم على كفران النعمة. واليهود فى غالب الامر أذلاء مساكين، إما على الحقيقة أو على التكلف مخافة أن تضاعف جزيتهم. وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِنَ اللهِ رجعوا به، أو صاروا أحقاء بغضبه، من باء فلان بفلان إذا كان حقيقاً بأن يقتل به، وأصل البوء المساواة.

ذٰلِكَ إشارة إلى ما سبق من ضرب الذلة والمسكنة والبوء بالغضب.

بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ

بسبب كفرهم بالمعجزات، التى من جملتها ما عد عليهم من فلق البحر، وإظلال الغمام، وإنزال المن والسلوى، وانفجار العيون من الحجر. أو بالكتب المنزلة: كالإنجيل، والفرقان، وآية الرجم والتى فيها نعت محمد صلّى الله عليه وسلّم من التوراة، وقتلهم الانبياء فإنهم قتلوا شعياء وزكريا ويحيى وغيرهم بغير الحق عندهم، إذ لم يروا منهم ما يعتقدون به جواز قتلهم، وإنما حملهم على ذلك اتباع الهوى وحب الدنيا كما أشار إليه بقوله: ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ أى: جرهم العصيان والتمادى والاعتداء فيه إلى الكفر بالآيات، وقتل النبيين. فإن صغار الذنوب سبب يؤدى إلى ارتكاب كبارها، كما أن صغار الطاعات أسباب مؤدية إلى تحرى كبارها. وقيل كرر الإشارة للدلالة على أن ما لحقهم كما هو بسبب الكفر، والقتل فهو بسبب ارتكابهم المعاصى واعتدائهم حدود الله تعالى. وقيل الإشارة إلى الكفر والقتل، والباء بمعنى مع وإنما جوزت الإشارة بالمفرد إلى شيئين فصاعداً على تأويل ما ذكر، أو تقدم للإختصار، ونظيره فى الضمير قول رؤبة يصف بقرة:

فِيهَا خُطُوطٌ مِنْ سَوادٍ وَبَلَقْ ... كَأَنَّهُ فِى الْجِلْدِ تَوْلِيعُ الْبَهَقْ

والذى حسن ذلك أن تثنية المضمرات والمبهمات وجمعها وتأنيثها ليست على الحقيقة، ولذلك جاء الذى بمعنى الجمع.

ترجمہ:

وَاِذْ قُلْتُمْ یا مُوسیٰ لَنْ نَصْبِرَ عَلیٰ طَعامٍ واحِدٍ

،،اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا۔

طعام واحد سے وہ چیزیں مراد ہیں جو ان کو میدانِ تیہ میں عطا کی گئی تھیں۔ یعنی من وسلویٰ۔ اور اس کے واحد ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ متنوع اور متبدّل نہیں ہوتا۔ جیسے کہا جاتا ہے "طعام الامیر واحد" مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس کھانے میں ایک ہی رنگ ہوتا ہے، مختلف رنگ نہیں رہتے، اور ایک رنگ ہونے کی وجہ سے وہ اکتا گئے تھے۔ یا طعامِ واحد سے مراد قسم واحد ہے۔ یعنی امیرانہ قسم کا کھانا۔ کیونکہ دونوں کھانے اہل تنعّم کے تھے جس کی معیشت ترفع ہوتا ہے وہ اس قسم کا کھاتے ہیں۔ اور یہ لوگ کاشتکار تھے، لہٰذا اپنی اصلیت کی جانب ان کی طبیعت کا ابھار ہوا اور جن چیزوں کی ایامِ زراعت میں عادت تھی۔ ان کی خواہش پیدا ہوئی۔

"فادع لنا ربّک" یعنی اپنے رب سے دعا کر کے ہمارے لئے یہ چیزیں مانگئے۔ "یخرج لنا" ہمارے لئے وہ ظاہر فرما دے، ان چیزوں کو موجود کرے۔ اور "یخرج" مجزوم اس لئے ہے کہ "فادع" کا جواب ہے اور چونکہ امر سبب ہوتا ہے جواب امر کے لئے، اس لئے یہ ترکیبِ استعمال ہوئی تا کہ واضح ہو کہ حضرت کی دعا اس قبولیت کا سبب بنی۔

"مما تنبت الارض" ارض کی جانب انبات کی نسبت مجازاً ہے اور علّت فاعلہ کی جگہ پر علت قابلہ یعنی ارض کو رکھ دیا گیا ہے۔ اور "مما" کا من تبعیض کے لئے ہے، کیونکہ وہ تمام نباتاتِ ارض کے طالب نہیں تھے، صرف بعض کے تھے۔

مِنْ بَقْلِها وَقِثَّائِها وَفُومِها وَعَدَسِها وَبَصَلِها

کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔

یہ "مما" تنبت الارض کی تفسیر اور اس کا بیان ہے اور ترکیبِ نحوی کے لحاظ سے مال کے درجے میں ہے، اور بعض نے کہا کہ باعادہِ حرفِ جار بدل ہے۔ اور بقل زمین سے اگنے والی سبزی ہے، لیکن اس سے مراد لذیز سبزیاں ہیں۔ جو کھائی جاتی ہیں۔ اور فوم گیہوں ہے اور روٹی کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک فوم لہسن ہے اور "قِثاء" میں ایک لغت قَثَاء ہے۔

قال اَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِی هُوَ اَدْنیٰ

کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو۔

"قال" کا فاعل اللہ کریم کی ذات ہے یا موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ "ادنیٰ" یعنی نیچے درجہ اور کم مرتبہ کی چیز اور "دنو" کے اصل معنی قربِ مکانی کے ہیں، پھر مجازاً خسر وحقارت کے لئے استعمال ہونے لگا جیسے کہ "بعد" شرافت اور بندیِ رتبہ کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں،

بعيد المحل، بعيد الهمه

بلند مرتبہ بلند ہمت۔ اور ایک قرات ادناء مہموز اللام کی ہے یہ "دناءة" سے مشتق ہے۔ "بالذی ھو خیر" الذی ھو خیر سے مراد من وسلویٰ ہے، کیونکہ لذت اور نفع میں بھی وہ بہتر ہے اور اس کے لئے کوشش ومحنت کی بھی ضرورت نہیں۔

"اھبطوا مصراً" یعنی میدانِ تیہ سے نکل کر شہر میں اترو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "ھبطوا وادی" جبکہ وادی میں اترے اور اس میں ٹھہرے اور "ھبط من الواد" اس وقت کہتے ہیں جب وادی سے نکل جائے۔ اور ایک قرات اُھبطو ہے ہمزہ اور باء کے ضمی کے ساتھ۔ اور مصر بڑے شہر کو کہتے ہیں اور اصل معنیٰ دو چیزوں کے درمیان حدِ فاصل کے ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ مصر علم ہے اور اس سے متعیّن شہر مراد ہے۔ اب رہی یہ بات کہ یہ منصرف کیوں ہے تو اس کی وجہ اس کا ساکن الاوسط ہونا ہے، یا یہ کہ مصر البلد کی تاویل میں ہے کہذا مذکور ہونے کی بناء پر صرف ایک سبب کا عامل ہے۔ اور علمی معنیٰ کے مراد لئے جانے کی تائید اس سے ہوتی کہ مصحف ابن مسعود میں "مصرا" بغیر تنوین کے آیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مصر دراصل مصرائیم بروزن اسرائیل تھا، پھر اس کو معرب بنا دیا گیا۔"

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ

اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری۔

یعنی ذلت اور محتاجی نے ان کے اوپر اس طرح گھیرا ڈالا کہ جیسے خیمہ اور قبہ کا گھیرہ ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس کے نیچے ہوتے ہیں اور ذلت اور محتاجی ان کے اوپر اس طرح لیپ دی گئی جیسے مٹی دیوار پر لیپ دی جاتی ہے، یہ کفرانِ نعمت کی سزا تھی جو ان کو دی گئی۔ اور عموماً وہ نسل ذلیل اور مسکون ہے یا تو حقیقتاً یا بتکلف کہ کہیں ان پر جزیہ زیادہ نہ کر دیا جائے۔

وباؤ بغضبٍ من الله

اور خدا کے غضب میں لوٹے۔

یہ باء مشتق ہے، فلان بفلان سے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب فلاں اس لائق ہو کہ اس کو فلان کے عوض قتل کر دیا جائے اور "بوء" کے اصل معنیٰ ہیں مساوی اور ہم پلہ ہونا۔

ذلك إشارة إلى ما سبق من ضرب الذلة

"ذالک" سے سابقہ اشیاء کی جانب اشارہ ہے یعنی ذلت اور محتاجی کو لازم کر دینا اور بنو اسرائیل کا غضبِ الٰہی کو لے کر لوٹنا۔

بانّهم كانوا يكفرون

یعنی یہ بسبب اس کے کہ انہوں نے ان معجزات کا انکار کیا جن میں سے بعض معجزات وہ ہیں جن کو اللہ کریم نے شمار کروایا ہے یعنی دریا کو پھاڑ کر راستہ دینا اور بادلوں کا سایہ کرنا اور من وسلویٰ کا اتارنا اور پتھر سے چشموں کا جاری ہونا، یا اس سے کتب

منزلہ کا انکار ہے جیسے انجیل، قرآن آیت رجم اور وہ آیات تورات ہیں جن میں حضرت محمد ﷺ کے اوصاف بیان [illegible] ہیں۔۔۔ اور انبیاء کرام کو قتل کرنا کیونکہ انہوں نے حضرت شعیب، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام اور ان کے [illegible] بھی انبیاء کرام کو قتل کیا، اور یہ قتل خود قاتلوں کی نظر میں بھی ناحق تھا، کیونکہ قتل کرنے والوں نے ان انبیاء میں [illegible] بات نہیں دیکھی تھی۔ جس کی بناء پر انہیں قتل کرنا جائز سمجھتے۔ قتل پہ آمادہ کرنے والی چیز صرف اور صرف خواہشات [illegible] حبّ دنیا تھی۔ جیسا کہ اللہ کریم نے خود اپنے اس قول سے اس کی جانب اشارہ فرمایا ہے:

ذٰلك بما عصوا كانوا يعتدون

یعنی ان کی معصیت شعاری اور معصیت میں حد سے تجاوز ان کو یہاں تک کھینچ لایا کہ انہوں نے اللہ [illegible] کیا اور انبیاء کو قتل کیا، کیونکہ چھوٹے گناہوں کا ارتکاب ایسا سبب ہے جو بڑے گناہوں کے ارتکاب تک پہنچا دیتا ہے جیسے۔ چھوٹی باتیں وہ اسباب ہیں جو بڑی طاعتوں کی جستجو تک پہنچاتی ہیں۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "ذالک" سے [illegible] حقیقت پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ بنی اسرائیل کو جو کچھ پیش آیا، وہ جیسا کہ کفر اور قتل کے سبب سے ہے اسی طرح [illegible] کے معصیتوں کے ارتکاب اور اللہ کریم کی حدود سے تجاوز کرنے کی وجہ سے بھی ہے۔ اور بعض کے نزدیک "ذالک" سے اشارہ [illegible] اور قتل کی جانب ہے اور "بما عصوا" کی باء بمعنی "مع" ہے اور دو یا دو زائد چیزوں کی جانب لفظ مفرد کے ذریعے اشارہ [illegible] لئے جائز ہے کہ مشار الیہ اختصار کے پیش نظر "ماذکر" یا "ما تقدم" میں موجود ہے شاعر کا قول۔

فِيهَا خُطُوطٌ مِنْ سَوَادٍ وَبَلَقٍ ... كَأَنَّهُ فِي الْجِلْدِ تَوْلِيعُ الْبَهَقِ

گھوڑے کے جسم پر سفید اور سیاہ دھاریاں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں رنگ بھورے رنگ میں [illegible] پیدا کر رہے ہیں۔

یہاں "کانّہ" کی ضمیر کا مرجع بظاہر مثنیٰ ہے۔ اور مشار الیہ کے مثنیٰ ہونے کے باوجود اسم اشارہ کو مفرد لانے کا جواز یہ ہے۔ مضمرات اور مبہمات یعنی اسمائے اشارہ و اسمائے موصولہ کا مثنیٰ اور جمع لانا اور مؤنث لانا حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ یعنی در حقیقت وہ نہ مثنیٰ ہوتے ہیں اور نہ جمع اور نہ مؤنث، یہی وجہ ہے کہ "الّذی" جمع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تعریفِ صبر:

(ص ب ر) الصبر (Patience)
کے معنی ہیں کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا۔ لہٰذا الصبر کے معنی ہوئے عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا۔

"وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 35)
صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔

اور روزہ کو صبر کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ضبط نفس کی ایک قسم ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

"صیام شهر الصّبرِ وثلاثة أيام في كلّ شهر يذهب وحر الصّدر"

ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں۔

لفظِ طعام کی بہترین تحقیق:

(ط ع م) الطعم (س) (Food,Diet)

کے معنی غذا کھانے کے ہیں۔ اور ہر وہ چیز جو بطور غذا کھائی جائے اسے طعم یا طعام کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 96)

اور اس کا طعام جو تمہارے فائدہ کے لئے۔

اور کبھی طعام کا لفظ خاص کر گیہوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ ابو سعید خدری سے روایت ہے: **"ان النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امر بصدقة الفطر صاعا من طعام اوصاعا من شعیر "**

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ فطر میں ایک صحابی طعام یا ایک صاع جو دینے کے حکم دیا۔ قرآن میں ہے:

"وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ" (سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 36)

اور نہ پیپ کے سوا (اس کے) لئے کھانا ہے۔

"طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ" (سورۃ المزمل آیت نمبر 13)

اور گلوگیر کھانا ہے۔

"طَعَامُ الْاَثِيْمِ" (سورۃ الدخان آیت نمبر 44)

گنہگار کا کھانا ہے۔

اور آیت کریمہ: **"وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ"** (سورۃ الماعون آیت نمبر 3)

اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لئے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔

میں طعام بمعنی اوطعام یعنی کھانا کھلانا کے ہے۔

"فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 53)

اور جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔

"لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 93)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اور ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی طعمت بمعنی شربت آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 249)

جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا تو وہ مجھ دے نہیں ہے اور جو شخص اس سے پانی نہ پیے گا (اس کی نسبت تصور کیا جائے گا کہ) میرا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں من لم یشربہ بجائے ومن لم یطعمہ کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح چلو بھر سے زیادہ محض پانی کا استعمال ممنوع ہے اسی طرح طعام کے ساتھ بھی اس مقدار سے زائد پانی پینا ممنوع ہے کیونکہ جو پانی کھانے کے ساتھ پیا جاتا ہے اس پر بھی طعمت کا لفظ بولا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اگر من لمیشربہ لایا جاتا تو اس سے کھانے کے ساتھ پانی پینے کی ممانعت ثابت نہ ہوتی اس کے برعکس یطعمہ کے لفظ سے یہ ممانعت بھی ثابت ہوجاتی اور معین مقدار سے زائد پانی کا پینا بہر حالت ممنوع ہوجاتا ہے۔

اور ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے زم زم کے پانی کے متعلق فرمایا،

انہ طعام طعم و شفاء سقم

کہ یہ کھانے کا کھانا اور بیماری سے شفا ہے، فرما کر تنبیہ کی ہے کہ بیر زمزم کے پانی میں غذائیت بھی پائی جاتی ہے جو دوسرے پانی میں نہیں ہے۔ استطعمتہ فاطعمنی میں نے اس سے کھانا مانگا چنانچہ اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ قرآن میں ہے:

"اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا" (سورۃ الکہف آیت نمبر 77)

اور ان سے کھانا طلب کیا۔

"وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" (سورۃ الحج آیت نمبر 36)

اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

"وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ" (سورۃ الانسان آیت نمبر 8)

اور وہ کھانا کھلاتے ہیں۔

"اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ" (سورۃ یٰس آیت نمبر 47)

بھلا ہم ان لوگوں کو کھانا کھلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا۔

"الَّذِيْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ" (سورۃ قریش آیت نمبر 4)

جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا۔

"وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 14)

وہی سب کو کھانا کھلاتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا۔

"وَمَا أُرِيْدُ أَنْ يُّطْعِمُوْنِ" (سورۃ الذاریات آیت نمبر 57)

اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھانا کھلائیں۔

اور فرمایا: "اذا استطعمكم الامام فاطعموه"

یعنی جب امام (نماز میں) تم سے لقمہ طلب کرے یعنی بھول جائے تو اسے بتادو۔

رجل طاعم خوش حال آدمی رجل مطعم جس کو وافر رزق ملا ہو مطعم نیک خورندہ۔ مطعام بہت کھلانے والا، مہمان نواز طعمة کھانے کی چیز رزق۔

تحقیق لفظ نبت:

(ن ب ت) النبت والنبات (To Grow)

ہر وہ چیز جو زمین سے اگتی ہے۔ اسے نبت یا نبات کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ تنہ دار ہو جیسے درخت۔ یا بے تنہ جیسے جڑی بوٹیاں لیکن عرف میں خاص کر نبات اسے کہتے ہیں ہیں جس کے تنہ نہ ہو۔ بلکہ عوام تو جانوروں کے چارہ پر ہی نبات کا لفظ بولتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ:

"لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا" (سورۃ النبأ آیت نمبر 15)

تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں۔

میں نبات سے مراد چارہ ہی ہے۔ لیکن یہ اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور نباتات حیوانات اور انسان سب پر بولا جاتا ہے۔ اور انبات (افعال) کا لفظ سب چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے۔

"فَأَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَائِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّأَبًّا"

(سورۃ عبس آیت نمبر 27-31)

پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارہ۔

تعریف لفظ بقل:

(ب ق ل) (Vegetable)

قرآن میں ہے: "بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

کہ ترکاری اور ککڑی بقل۔

ان سبزیوں کو کہتے ہیں۔ جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں۔ اس سے فعل مشتق کر کے بقل بمعنی نبت

استعمال ہوتا ہے اور تشبیہ کے طور پر بقل وجہ الصبی کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں لڑکے کے چہرہ پر سبزہ نمودار ہونے لگا۔ ابن السکیت کے نزدیک بقل ناب البعیر کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کے لئے نکل آئے جگہ کا سرسبز ہونا بقلت البقل میں نے سبزی کاٹی۔

المبقلة:

المبقلة (ظرف) سبزیوں کی جگہ کو کہتے ہیں۔

قثائها کی تعریف:

قثاءها

مضاف مضاف الیہ۔ قثاء اسم جنس ہے، اس کی جمع نہیں آتی۔ ککڑی یا ککڑیاں۔

فومها مضاف مضاف الیہ۔ فوم گیہوں (راغب، ابن عباس) بنو ہاشم کی زبان میں بھی فوم گیہوں کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ بعض کے نزدیک جس اناج کی روٹی پکتی ہو اسے فوم کہتے ہیں۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ اصل میں ثوم تھا۔ جس کے معنی لہسن کے ہیں۔ ثاء کو فاء سے بدل دیا ہے اور یہ جائز ہے جیسا کہ مغاثیر (مغثر کی جمع ایک قسم کی گوند ہے) مغافیر (مغفر کی جمع ایک درخت کی گوند) کہا جاتا ہے۔

عدسها مضاف مضاف الیہ عدس بمعنی مسور۔

بصلها مضاف مضف الیہ۔ بصل بمعنی پیاز۔

فوم کی تعریف:

(ف و م) **الفوم** (Garlic)

گیہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فوم اصل میں ثوم ہی ہے۔ یعنی فاء، ثاء سے بدل دی گئی ہے جیسا کہ جذف میں ہے اور اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"**وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا**" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

اور گیہوں اور مسور۔

عدس کی تعریف:

(ع د س) **العدس** (A Pakistani Pulse)

مسور کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"**وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا**" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

اور مسور اور پیاز اور عدسۃ ایک قسم کی پھنسی ہے جو مسور کی شکل پر ہوتی ہے اور عدس (اسم صوت) خچر وغیرہ کو ہانکنے کی آواز کو کہتے ہیں اسی سے عدس فی الارض وھو عدوس کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں جانے کے ہیں۔

بصل کی تعریف:

(ب ص ل) البصل (Onion)

پیاز

قرآن میں ہے: "وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

اور مسور اور پیاز اور تشبیہ کے طور پر لو ہے کے خود کو بھی بصل کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و ترکا کالبصلا ور پیاز جیسی خود۔

حرف الف کی مفصّل تحقیق:

ا: الف بامعنی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شروع کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔ تیسرا وہ جو آخر کلام میں آئے۔

(ا) وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے۔ اس کی چند قسمیں ہیں:

اوّل:

الف الاستخبار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے بجائے الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس میں عمومیت ہے جو استفہام و انکار نفی تبکیت پر زجر و توبیخ تسویہ سب پر حاوی ہے۔ چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا۔

"أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ" (سورۃ البقر آیت نمبر 30)

(انہوں نے کہا) کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے۔

اور تبکیت یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور کبھی غیر کو چنانچہ (قسم اول کے متعلق) فرمایا:

(ا) "أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ" (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 20)

تم اپنی لذتیں حاصل کر چکے۔

(2) "أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 80)

کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے؟

(3) "آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ" (سورۃ یونس آیت نمبر 91)

کیا اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟

اور غیر مخاطب کے متعلق فرمایا:

(4) " اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا "(سورۃ یونس آیت نمبر 2)
کیا لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے؟

(5) " اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)
تو کیا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں؟

(6) " اَفَاِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ "(سورۃ الانبیاء آیت نمبر 34)
بھلا اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

(7) "آلذَّ كَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ "(سورۃ الانعام آیت نمبر 143)
بتاؤ تو (خدا نے) دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادیاؤں کو۔

اور معنی تسویہ میں فرمایا:

"سَوَاءٌ عَلَيْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا "(سورۃ ابراھیم آیت نمبر 21)
اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

" سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 6)
انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے کے نہیں۔

اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل ہو تو اسے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اخرج (وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں نفی خروج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر نفی کے معنی نہ ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا۔ اور جب کلام منفی پر داخل ہو تو اسے مثبت بنا دیتا ہے۔ کیونکہ کلام منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی ہوئی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا ہے

چنانچہ فرمایا:

" اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "(سورۃ الاعراف آیت نمبر 172)
کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں (یعنی ضرور ہوں)

" اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ "(سورۃ التین آیت نمبر 8)
کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے یعنی ضرور ہے۔

" اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ "(سورۃ الرعد آیت نمبر 41)
کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں۔

"اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ "(سورۃ طه آیت نمبر 133)

کیا ان کے پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔

"اَوَلَا یَرَوْنَ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 126)

اور کیا یہ نہیں دیکھتے۔

"اَوَلَمْ نُعَمِّرْ کُمْ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 37)

اور کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی۔

دوم:

الف جو مضارع کے صیغہ واحد متکلم کے شروع میں آتا ہے اور" میں" کے معنی رکھتا ہے جیسے اسمع و ابصر یعنی میں سنتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں۔

سوم:

ہمزہ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی جیسے فرمایا:

"اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 114)

ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

"رَبِّ ابْنِ لِی عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ" (سورۃ التحریم آیت نمبر 11)

اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

چہارم:

(الف) جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے لئے آیا ہے جیسے فرمایا

"الْعَالَمِيْنَ" (سورۃ الفاتحۃ آیت نمبر 2)

تمام جہانوں۔

پنجم:

الف نداء جیسے ازید (اے زید)

(ب) وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس کی پہلی قسم الف تثنیہ ہے (مثلا رجلان) اور دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں پائی جاتی ہے مثلا مسلمات و مساکین۔

(ج) اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا ہے۔ وہ یا تو تانیث کے لئے ہوتا ہے جیسے حبلی اور بیضاء میں آخری الف یا پھر تثنیہ میں ضمیر کے لئے جیسا کہ

"اَذْهَبَا" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 36)

میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے جیسے

"وَتَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10)

"فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيلَا" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 67)

تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لئے آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے (جیسا کہ ابیات کے اواخر میں الف اشباع پڑھا دیتے ہیں)

لفظ دنی کا معنیٰ:

دنا (دنو) الدنو (ن) (Near)

کے معنیٰ قریب ہونے کے ہیں اور یہ قرب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی اور قرب بلحاظ مرتبہ سب کو شامل ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 99)

اور کھجور کے گابھے سے پاس پاس گچھے اور انگور کے باغ۔

اور آیت کریمہ: "ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى" (سورۃ النجم آیت نمبر 8)

پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔ میں قرب حکمی مراد ہے۔ اور لفظ ادنیٰ کبھی معنیٰ اصغر آتا ہے۔ اس صورت میں اکبر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ" اور نہ اس سے کم نہ زیادہ۔

اور کبھی ادنیٰ بمعنیٰ ارذل استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ خیر کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو۔

اور کبھی بمعنیٰ اول (نشاۃ اولیٰ) استعمال ہوتا ہے اور الآخر (نشاۃ ثانیہ) کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

کہ اگر اس کے پاس ایک دینا بھی امانت رکھو۔

"خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ" (سورۃ الحج آیت نمبر 11)

اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔

اور آیت کریمہ:

"وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 122)

اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔

اور کبھی ادنیٰ بمعنی اقرب آتا ہے اور اقصیٰ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی" (سورۃ الانفال آیت نمبر 42)

جس وقت تم (مدینے کے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔

الدنیا کی جمع الدنی آتی ہے جیسے الکبریٰ کی جمع الکبر و الصغریٰ کی جمع الصغر۔ اور آیت کریمہ:

"ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 108)

اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح صحیح شہادت ادا کریں۔

میں ادنیٰ بمعنی اقرب ہے یعنی یہ اقرب ہے۔ کہ شہادت ادا کرنے میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھیں۔ اور آیت کریمہ:

"ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 51)

یہ (اجازت) اس لئے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہیں۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:

"لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 220)

تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت کی باتوں میں غور کرو۔

دنیا اور آخرت کے تمام احوال کو شامل ہے کہا جاتا ہے ادنیت بین الامرین وادنیت احدھما من الاخر۔ یعنی دو چیزوں کو باہم قریب کرنا۔

یا ایک چیز کو دوسری کے قریب کرنا۔ قرآن میں ہے:

"یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 59)

کہ باہر نکلا کریں تو اپنی چادریں اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔

ادنت الفرس۔ گھوڑی کے وضع حمل کا وقت قریب آپہنچا۔ الدنی خاص کر حقیر اور ذلیل آدمی کو کہا جاتا ہے اور یہ سیئی کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: ھو دنی یعنی نہایت رزیل ہے۔ اور حومروی ہے تو یہ دون سے ہے یعنی جب کھانا کھاؤ تو اپنے سامنے سے کھاؤ۔

مصر کی تعریف:

(م ص ر) المصر (City)

ہر محدود شہر کو (جس کے گرد فصیل ہو) مصر کہتے ہیں۔ اور مصرت مصرا دو چیزوں کے مابین حد کو کہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

"اِهْبِطُوْا مِصْرًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

مصر میں داخل ہو جایئے۔

میں مصر سے مشہور شہر مصر مراد ہے۔

سوال کا معنی:

(س ء ل) السؤال

کے معنی کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کے ہیں۔ جو مودی الی المعرفۃ ہو یا مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کو بھی سوال کہا جاتا ہے جو مودی الی المال ہو پھر کسی چیز کی معرفت کی استدعا کا جواب اصل میں تو زبان سے دیا جاتا ہے لیکن کتابت یا اشارہ اس کا قائم مقام بن سکتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب اصل میں تو ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن زبان سے وعدہ یا انکار اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔

ضرب المثل:

(Proverb)

ضرب اللبن الدراھم سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں کسی بات کو اس طرح بیان کرنے کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے۔

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 29)

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا" (سورۃ الکھف آیت نمبر 32)

اور ان سے قصہ بیان کرو۔

"ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِنْ اَنْفُسِكُمْ" (سورۃ الروم آیت نمبر 28)

وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

"وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ" (سورۃ الروم آیت نمبر 58)

اور ہم نے ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔

ذلت کیا ہے؟:

(Disgrace,Insult)

بغیر تاء کے ذل اور تار کے ساتھ ذلتہ کہا جاتا ہے جیسا کہ قل اور قلتہ ہے۔ قرآن میں ہے۔

"تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ" (سورۃ المعارج آیت نمبر 44)

اوران کے مونہوں پر ذلت چھا جائے گی۔

"ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 61)

اوران پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری۔

"سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَذِلَّةٌ "(سورۃ الاعراف آیت نمبر 152)

عنقریب انہیں ان کے رب کا غضب اور ذلت پہنچنا ہے۔

اوراس قسم کی مطیع اور منقاد سواری کا ذلول (صفت فاعلی) کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 71)

کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے۔

تحقیقِ سکن:

(س ك ن) السکون (ن) (Quietness,Silence)

حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو سکون کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سکن فلان مکان کذا کے معنی ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کر لی۔ اسی اعتبار سے جائے رہائش کو مسکن کہا جاتا ہے اس کی جمع مساکن آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"لَا يُرَى إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ " (سورۃ الاحقاف آیت نمبر 25)

کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اور فرمایا: " وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 13)

اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔

"وَلِتَسْكُنُوا فِيهِ "(سورۃ یونس آیت نمبر 67)

تاکہ اس میں آرام کرو۔

تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سکنتہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اسکنتہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

" رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي "(سورۃ ابراھیم آیت نمبر 37)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد لا بسائی ہے۔

" أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ "(سورۃ الطلاق آیت نمبر 6)

عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہتے ہو اپنی طاقت بھر۔

البواء کی مفصل تحقیق:

(ب و ء) البواء

کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزا کا مساوی (اور سازگار موافق) ہونے کے ہیں۔ یہ نبو کی ضد ہے جس کے معنی اجزا کے ناہمواری (ناسازگاری) کے ہیں۔ لہذا مکان بواء اس مقام کے کہتے ہیں۔ جو اس جگہ پر اترنے والے کے سازگار اور موافق ہو۔ بوات لہ مکانا میں نے اس کے لئے جگہ کو ہموار اور درست کیا اور تبوات اس کا مطاوع ہے جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

"وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰی وَاَخِیۡهِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِكُمَا " (سورۃ یونس آیت نمبر 87)

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لئے مصر میں گھر بناؤ۔

"وَلَقَدۡ بَوَّاۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مُبَوَّاَ صِدۡقٍ " (سورۃ یونس آیت نمبر 93)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کو عمدہ جگہ دی۔

"تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 121)

ایمان والوں کو لڑائی کے لئے مورچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کرنے لگے۔

"یَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَیۡثُ یَشَآءُ " (سورۃ یوسف آیت نمبر 56)

وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے۔

ایک روایت میں ہے:

انه کان علیه السلام یتبوا لبوله کما یتبوا المنزله

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کرنے کے لئے ہموار اور مناسب جگہ تلاش کرتے جیسے کوئی شخص اقامت کے لئے جگہ تلاش کرتا ہے۔

بوآت الرمح میں نے مناسب جگہ پر نیزہ مارا۔

ایک حدیث میں ہے:

من کذا علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار جو عمدا

مجھ پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے الراعی نے اونٹوں کی صفت میں کہا ہے،

لها امرها حتی اذا ماتبوات باخفافها ماوی تبوا مضجعا

یعنی چرواہا اونٹ چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ چرنے کے لئے جگہ ہموار پالیتے ہیں تو وہ اپنی آرام گاہ پر آکر سوجاتا ہے۔

اور تبواء فلان (کنایہ) کے معنی نکاح کرنے کے ہیں جیسا کہ بنی باهلہ وغیرہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بواء کا لفظ مصاہرت یا قصاص میں برابر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

محاورہ:

چنانچہ محاورہ ہے فلان بواء لفلان۔ وہ فلان کا ہمسر ہے یعنی رشتہ مصاہرت میں اس کا کفو ہے یا قصاص میں اس کے مساوی ہے اور آیت کریمہ:۔

"بآءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللهِ " (سورۃ الانفال آیت نمبر 16)

تو وہ اللہ کے غضب میں پلٹا۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی جگہ پر اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب یعنی عقوبت ہے۔ تو یہاں بغضب موضع حال میں ہے جیسے خرج بسیفہ میں ہے اور مر بزید کی طرح مفعول نہیں ہے۔ اور بغضب پر باد لا کر تنبیہ کی ہے کہ موافق جگہ میں ہونے کے باوجود غضب الٰہی میں گرفتار ہے تو ناموافق جگہ میں بالاولیٰ اس پر غضب ہوگا۔ لہٰذا یہ فبشرھم بعذاب کی مثل ہے اور آیت کریمہ:۔

" اِنِّيْ أُرِيْدُ اَنْ تَبُوْءَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 29)

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرا اور تیرا گناہ۔

میں بتوء باثمی کے معنی یہ ہیں کہ تو اس حالت کے ساتھ ہمیشہ رہے شاعر نے کہا ہے:

انکرت باطلها وبؤت بحقها

میں نے اس کے باطل کے انکار کیا اور اس کے حق پر اقرار کیا۔

جن لوگوں نے اس کے معنی اقررت بحقها (یعنی اس کے حق کا اقرار کیا) کئے ہیں تو یہ تفسیر مقتضی لفظ کے مطابق نہیں ہے۔

الباءۃ کا معنی:

کنایہ از جماع خلف الاحمر

منقول ہے کہ حیاک اللہ وبیاک اللہ میں بیاک اصل میں بوؤک منزلا ہے جیسا کہ اتیتہ الغدایا والعشایا میں ہے یعنی عشایا کی مناسبت سے غدایا کہا جاتا ہے۔

تحقیق لفظِ نبی:

(ن ب و) النبی (Prophet)

بدون ہمزہ کے متعلق بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہموز ہے لیکن اس میں ہمزہ متروک ہو چکا ہے اور اس پر وہ مسلیمقبنی سوء کے محاورہ سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر بعض علما نے کہا ہے کہ یہ نبوۃ بمعنی رفعت سے مشتق ہے اور نبی کو نبی اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر معزز اور بلند اقداد کا حامل ہوتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

"وَرَفَعْنَاهُ مَكَاناً عَلِيًّا "(سورۃ مریم یت نمبر 57)

اور ہم نے ان کو بلند درجات سے نوازا۔

کے مفہوم سے سمجھا تا ہے پس معلوم ہوا کہ نبی بدوں ہمزہ (مہموز) سے ابلغ ہے کیونکہ ہر نبی لوگوں میں بلند قدر اور صاحب مرتبہ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کو نبی اللہ کہہ کر کر پکارا تو آپ نے فرمایا،

لست ینبی اللہ ولکن نبی اللہ

کہ میں نبی اللہ نہیں ہوں بلکہ نبی اللہ ہوں۔

النبوۃ والنباوۃ کے معنی:

النبوۃ والنباوۃ کے معنی بلندی کے ہیں اسی سے محاورہ ہے۔ نبا بفلان مکانہ کہ اسے یہ جگہ راس نہ آئی جیسا کہ قض علیہ مضجعۃ کا محاورہ ہے جس کے معنی بے چینی سے کروٹیں لینے کے ہیں نبا السیف عن لضربیۃ تلوار کا اچٹ جانا پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر نبا بصرہ عن کذا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے کراہت کرنے کے ہیں۔

لفظِ حق کا معنیٰ:

- (ح ق ق) الحق (حق) (Justice,Right)

کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آ جاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے اور لفظ ،،حق،، کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(1) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے

اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَرُدُّوا إِلَى اللهِ مَوْلاهُمُ الْحَقِّ "

پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدا تعالیٰ کے پاس واپس بلائیں جائینگے۔

(2) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔

اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُوْرًا "(سورۃ یونس آیت نمبر 5)

وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں۔

یہ (سب کچھ) خدا نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔

(3) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا۔ جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں۔ کہ باعث ثواب وعقاب اور جنت دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 213)

تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھا دی۔

(4) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے۔ اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:

"كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ" (سورۃ یونس آیت نمبر 33)

اسی طرح اللہ کا ارشاد ثابت ہو کر رہا۔

لفظ عدد کی تحقیق:

(ع د د) العدد (Number)

الاعداد تیار کرنا مہیا کرنا یہ عد سے ہے جیسے سقی سے اسقاء اور اعددت ھذا لک کے معنیٰ ہیں کہ یہ چیز میں نے تمہارے لئے تیار کر دی ہے کہ تم اسے شمار کر سکتے ہو اور جس قدر چاہو اس سے حسب ضرورت لے سکتے ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" (سورۃ الانفال آیت نمبر 60)

اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت سے) ان کے (مقابلے کے لئے مستعد رہو۔ اور جو) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اور اس نے ان کے لئے باغات تیار کئے ہیں۔

"أُولٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا" (سورۃ النساء آیت نمبر 18)

ایسے لوگوں کے لئے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔

"وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ" (سورۃ الفرقان آیت نمبر 11)

اور ہم نے جھٹلانے والوں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً" (سورۃ یوسف آیت نمبر 31)

اور ان کے لئے ایک محفل مرتب کی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اعتدت بھی اسی (عد) سے ہے اور آیت کریمہ:

" وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 185)

تم روزوں کا شمار پورا کرلو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ماہ رمضان کی گنتی پوری کرلو۔

" اَيَّاماً مَعْدُودَاتٍ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 184)

گنتی کے چند روز میں ماہ رمضان کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ:" وَاذْكُرُوا اللهَ فِي اَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 203)

اور گنتی کے دنوں میں خدا کو یاد کرو۔

میں سے عید قربان کے بعد کے تین دن مراد ہیں اور معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ایام معدودۃ سے یوم النحر اور اس کے بعد کے دو دن مراد ہیں اس صورت میں یوم النحر بھی ان تین دنوں میں شامل ہوگا۔ العداد اس مقرر وقت کو کہتے ہیں جس میں بیماری کا دورہ پڑتا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مازالت امة خیبر تعادنی

کہ خیبر کے دن جو مسموم کھانا میں نے کھایا تھا اس کی زہر بار بار عود کرتی رہی ہے عدان الشئی کے معنی کسی چیز کے موسم یا زمانہ کے ہیں۔

نوٹ: لفظ قول، دعا، رب، خرج، بدل، خیر، ھبط، غضب، لفظ اللہ، کفر، قتل، غیر اور عصا کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 62]

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هادُوا وَالنَّصارى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

”بیشک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم“۔

متن:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا

بألسنتهم، يريد به المتدينين بدين محمد صلّى الله عليه وسلّم المخلصين منهم والمنافقين، وقيل المنافقين لانخراطهم في سلك الكفرة وَالَّذِينَ هادُوا تهودوا، يقال

هادو تهود إذا دخل فى اليهودية، ويهود:

إما عربى من هاد إذا تاب، سموا بذلك لما تابوا من عبادة العجل، وإما معرب يهوذا وكأنهم سموا باسم أكبر أولاد يعقوب عليه السلام **وَالنَّصَارىٰ** جمع نصران كندامى وندمان، والياء فى نصرانى للمبالغة كما فى أحمرى، سموا بذلك لأنهم نصروا المسيح عليه السلام، أو لأنهم كانوا معه فى قرية يقال لها نصران أو ناصرة فسموا باسمها، أو من اسمها. **وَالصَّابِئِينَ** قوم بين النصارى والمجوس. وقيل أصل دينهم دين نوح عليه السلام. وقيل هم عبدة الملائكة. وقيل عبدة الكواكب، وهو إن كان عربياً فمن صبأ إذا خرج. وقرأ نافع وحده بالياء إما لأنه خفف الهمزة وأبدلها ياء، أو لأنه من صبأ إذا مال لأنهم مالوا عن سائر الاديان إلى دينهم، أو من الحق إلى الباطل.

مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صالحا

من كان منهم فى دينه قبل أن ينسخ. مصدقاً بقلبه بالمبدأ والمعاد، عاملاً بمقتضى شرعه. وقيل من آمن من هؤلاء الكفرة إيماناً خالصاً، ودخل فى الإسلام دخولاً صادقاً:

فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ الذى وعدلهم على إيمانهم وعملهم.

وَلا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلا هُمْ يَحْزَنُوْنَ حين يخاف الكفار من العقاب، ويحزن المقصرون على تضييع العمر وتفويت الثواب. **وَمَنْ** مبتدأ خبره **فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ** والجملة خبر إن، أو بدل من اسم إن وخبرها **فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ** والفاء لتضمن المسند إليه معنى الشرط، وقد منع سيبويه دخولها فى خبر إن من حيث إنها لا تدخل الشرطية، ورد بقوله تعالى: **اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ.**

ترجمہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا	بیشک ایمان والے

ایمان لائے یعنی اپنی زبان سے ایمان لائے، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دینِ محمدی ﷺ کو اختیار کیا، خواہ نفاق کے ساتھ کیا ہو، خواہ اخلاص کے ساتھ، لہٰذا اس میں منافق اور مخلص دونوں داخل ہو گئے۔ بعض مفسّرین کہتے ہیں کہ اس سے منافقین مراد ہیں کیونکہ وہ کافروں کی فہرست میں شامل ہیں، اس قول کے متشابہ ہے کہ "انّ الذین امنوا" معنی میں "انّ الذین کفروا" کے ہیں۔ اب "الّذین ھادوا" سے اس کا جوڑ اس طرح ہو گیا کہ پہلے کفار کا ذکر ہوا، پھر اہلِ کتاب کا۔ "ھادوا" یعنی جنہوں نے یہودیت اختیار کی، "ھاد" اور "تہوّد" اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص یہودیت میں داخل

ہوتا ہے۔ یہود کا لفظ اگرچہ عربی ہے تو "ھاد" بمعنی "تاب" سے ماخوذ ہوگا۔ یہود کا نام یہود اس لئے ہوا کہ انہوں نے بچھڑا کی پوجا سے توبہ کی تھی۔ اور اگر یہ لفظ غیر عربی ہے اور پھر عربی میں لایا گیا ہے تو اس کی اصل یہودا ہے یہودا سے عربی بنائی گئی تو یہود ہوگیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام یہودا تھا، گویا ان کے نام پر سارے یہودیوں کا نام رکھا گیا۔

"والنصارٰی" نصارٰی جمع ہے نصران کی جیسے ندمان کی جمع ندامٰی ہے۔ اور نصرانی کی یاء مبالغہ کے لئے ہے۔ جس کا معنی پرلے درجے کا نصرانی ہے جیسے احمری کہ گہرا سرخ، نصارٰی یا نصانی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انہوں نے نصرت مسیح کی نصرت کی تھی، یا وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ حضرت مسیح کے ساتھ ایک بستی میں رہتے تھے جس کا نام نصران یا نصرہ ہے، اگر اس بستی کا نام نصران ہے تو اسی نام کی جانب بغیر کسی تغیر کے نسبت کردی گئی اور نصرانی کہہ دیا گیا۔ اور اگر اس بستی کا نام ناصرہ ہے تو اس کے مادہ سے نصرانی بنالیا گیا۔

"والصائبین" یہ نصارٰی اور مجوس کے درمیان ایک قوم ہے اس کے عقائد و اعمال نصرانیوں اور مجوسیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے دین کی اصل بنیاد حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فرشتوں کی پوجا کرنے والے ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ ستاروں کے پجاری ہیں۔ اور یہ لفظ اگر عربی ہے تو صَبا سے ماخوذ ہے، صبا کے معنیٰ ہیں "خرَجَ" تمام قرائ نے ان کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے صرف نافع نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ نافع کی قرات کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمزہ میں تخفیف کی ہے اور اس کو حذف کر کے صابین پڑھا ہے۔ اور یا یہ وجہ ہے کہ یہ کلمہ صبا بمعنیٰ "مَالَ" سے ماخوذ ہے چونکہ یہ لوگ تمام ادیان سے اعراض کر کے اپنے وضع کردہ دین کی طرف مائل ہوئے اس لئے ان کو صابی کہا گیا، یا یہ کہ حق سے اعراض کر کے باطل کی طرف مائل ہوئے اس لئے صابی کہلائے۔

مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صالِحا

وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں۔

جو لوگ بھی اللہ کریم اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کئے یعنی اپنے دین پر اس کے منسوخ ہونے سے پہلے پر قرار رہے اور اپنے دل سے مبداء و معاد کی تصدیق کی اور اپنی شریعت کے مقتضیٰ پر عمل کیا۔ بعض حضرات "من عمل صالحاً" کی تفسیر میں یہ فرماتے ہیں کہ ان کافروں میں سے جن لوگوں نے سچا اور مخلصانہ ایمان قبول کیا اور ایمان میں سچائی کے ساتھ داخل ہوئے وہ مراد ہیں۔

فلھم اجرھم عند ربّھم

اجر سے مراد وہ اجر ہے جس کا اللہ کریم نے ایمان اور عمل کی بنیاد پر وعدہ فرمایا ہے۔

ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون.

یعنی جس وقت کفّار کا عذاب کا اندیشہ ہوگا اور کوتاہی کرنے والوں کو عمر کے ضائع کرنے اور ثواب سے محروم ہونے پر رنج

ہوگا اس وقت ان کو نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ کوئی رنج ہوگا۔ اور "من امن "الموصول صلہ مل کر مبتداء ہے اور " فلھم اجرھم "اس کی خبر ہے، پھر مبتداء خبر مل کر پورا جملہ "انّ الذین امنوا" کی خبر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ "من امن "کو "انّ" کے اسم کا بدل قرار دیا جائے، اور "فلھم اجرھم" کو "انّ" کی خبر اور خبر کے اوپر فاء کا دخول اس لئے ہے کہ اس خبر کا مسند الیہ شرط کے معنی کو متضمن ہے۔ اور سیبویہ نے "انّ" کی خبر پر "فاء" کے دخول سے منع کیا کیونکہ "انّ" جملہ شرطیہ پر داخل نہیں ہوتا لیکن اللہ کریم کا ارشاد،

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَھُمْ عَذابُ جَھَنَّمَ.

بے شک جنہوں نے ایذا دی مسلمان مَردوں اور مسلمان عورتوں کو، پھر توبہ نہ کی، ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے۔

(سورۃ البروج آیت نمبر 10)

اس قول سے سیبویہ کے قول کی تردید ہوتی ہے اس لئے کہ اس آیت کریمہ میں "انّ" کی خبر پر فاء داخل ہے۔

لفظِ یہود کا معنی:

(ہ و د) الھود (Jew)

کے معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا کے ہیں اور اسی سے التھدید (تفعیل) ہے جسکے معنی رینگنے کے ہیں لیکن عرف میں ھود بمعنی توبۃ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھادُوْا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 62)

بیشک ایمان والے نیز یہودیوں۔

بعض نے کہا ہے لفظ یہود بھی سے ماخوذ ہے یہ اصل میں ان کا تعریفی لقب تھا لیکن ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد ان پر بطور علم جنس کے بولا جاتا ہے نہ کہ تعریف کے لئے جیسا کہ لفظ نصارٰی اصل میں سے ماخوذ ہے پھر ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد انہیں اسی نام سے اب تک پکارا جاتا ہے ھاد فلان کے معنی یہودی ہوجانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

"عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ فَانْھَارَ بِہٖ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ " (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 109)

ایک گراؤ گڑھے کے کنارے تو وہ اسے لے کر جہنم کی آگ میں ڈھے پڑا۔

جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی کیونکہ کبھی اسم علم سے بھی مسمّیٰ کے اخلاق و عادات کا لحاظ کر کے فعل کا اشتقاق کر لیتے ہیں مثلاً ایک شخص فرعون کی طرح ظلم و تعدی کرتا ہے تو اس کے کے متعلق تفرعن فلان کہ فلان فرعون بنا ہوا ہے کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اسی طرح تطفل فلان کے معنی طفیلی یعنی طفیل نامی شخص کی طرح بن بلائے کسی کا مہمان بننے کے ہیں۔ تھود افی مشیہ کے معنی نرم رفتاری سے چلنے کے ہیں اور یہود کے توراۃ کی تلاوت کے وقت آہستہ آہستہ جھومنے سے یہ معنی لئے گئے

ہیں۔ ھود الرائض الدہر رائض کا سواری کو نرمی سے چلانا ھود اصل میں ھائد کی جمع ہے جس کے معنی تائب کے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کا نام ہے۔

لفظ انصاری کا معنی :

نصاریٰ (Christian)

بعض کے نزدیک عیسائیوں کو بھی نصاریٰ اس لئے کہا گیا ہے کہ انہوں نے نحن انصار اللہ کا نعرہ لگا دیا تھا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"كُونُوا أَنْصَارَ اللهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللهِ" (سورۃ الصف آیت نمبر 14)

دینِ خدا کے مددگار رہو جیسے عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کون ہے جو اللہ کی طرف ہو کر میری مدد کریں حواری بولے ہم دینِ خدا کے مددگار ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نصرانی کی جمع ہے جو نصران (قریہ کا نام) کی طرف منسوب ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَى شَيْءٍ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 113)

اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں۔

نصر ارض بنی فلان کے معنی بارش برسنے کے ہیں کیونکہ بارش سے بھی زمین کی مدد ہوتی ہے اور نصرت فلاناً جس کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں یہ یا تو نصر الارض سے مشتق ہے اور یا نصر بمعنی عون سے۔

تحقیق لفظ صبی:

(ص ب و) الصبی (Child)

نابالغ لڑکا رجل مصب عیال دار جس کے بچے نابالغ ہوں۔ قرآن میں ہے:

"قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا" (سورۃ مریم آیت نمبر 29)

(وہ بولے کہ) ہم اس سے جو کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

صبا فلان یصبو صبوا وصبوۃ کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے سے کام کرنے لگا قرآن میں ہے:

"أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 33)

تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں داخل ہو جاؤں گا۔

اصبانی فصبوت اس نے مجھے گرویدہ کیا چنانچہ میں گرویدہ ہو گیا۔

الصائبین کا معنیٰ:

الصبا۔ پروائی ہوا۔ صابیت السیف الٹی تلوار نیام میں ڈالی۔ صابیت الرمح نیزہ مارنے کے لئے جھکا دیا۔ الصابئون ایک فرقے کا نام ہے جو نوح (علیہ السلام) کے دین پر ہونے کا مدعی تھا اور ہر وہ آدمی جو ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے اسے صابئی کہا جاتا ہے صباء ناب البعیر کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کچلی نکل آئی۔ قرآن میں ہے:

"وَالصَّابِئِيْنَ وَالنَّصَارٰى" (سورۃ الحج آیت نمبر 17)

اور ستارہ پرست اور عیسائی۔

"وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 62)

اور عیسائی یا ستارہ پرست۔

اور ایک قرات میں صابین (بدون ہمزہ کے) ہے بعض نے کہا ہے کہ ہمزہ تخفیف کے لئے حزف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت:

"لَا يَأْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ" (سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 37)

جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

میں الخاطون اصل میں خاطئون ہے۔ اور بعض نے کہا نہیں بلکہ یہ صبا یصبو سے مشتق ہے جس کے معنی مائل ہونا اور جھکنا کے ہیں۔

تعریف العمل:

(ع م ل) العمل (Work)

ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃ صادر ہو یہ فعل سے اخص ہے کیونکہ فعل کا لفظ کبھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں جن سے بلا قصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے۔ مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف البقر العوامل ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لئے استعمال ہوا ہے نیز عمل کا لفظ اچھے اور بری دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے، قرآن میں:

"اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 277)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے۔

تعریف لفظ صالح:

(ص ل ح) الصالح

(درست، باترتیب) یہ فساد کی ضد ہے عام طور پر یہ دونوں لفظ افعال کے متعلق استعمال ہوتے ہیں قرآن کریم میں لفظ صلاح کبھی تو فساد کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور کبھی سیئۃ کے چنانچہ فرمایا:

"خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 102)

انہوں نے اچھے اور برے عملوں کے ملا دیا تھا۔

لفظِ اجر کی تحقیق:

(ا ج ر) الاجر و الاجرۃ (Wages, Charges)

کے معنی جزائے عمل کے ہیں خواہ وہ بدلہ دنیوی ہو یا اخروی۔ چنانچہ فرمایا:

"اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ" (سورۃ ھود آیت نمبر 29)

میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے۔

"وَآتَيْنَاهُ اَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 27)

اور ان کو دنیا میں بھی ان کا صلہ عنایت کیا اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔

"وَلَاَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا" (سورۃ یوسف آیت نمبر 57)

اور جو لوگ ایمان لائے ان کے لئے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔

الاجرۃ (مزدوری) یہ لفظ خاص کر دنیوی بدلہ پر بولا جاتا ہے اجر کی جمع اجور ہے اور آیت کریمہ:

"وَآتُوهُنَّ اُجُورَهُنَّ" (سورۃ النساء آیت نمبر 25)

اور ان کے مہر بھی انہیں ادا کردو۔

میں کنایہ عورتوں کے مہر کو اجور کہا گیا ہے پھر اجر اور اجرۃ کا لفظ ہر اس بدلہ پر بولا جاتا ہے جو کسی عہد و پیمان یا تقریبا اسی قسم کے عقد کی وجہ سے دیا جائے۔ اور یہ ہمیشہ نفع مند بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ ضرر رساں اور نقصان دہ بدلہ کو اجر نہیں کہتے جیسے فرمایا،

"لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 277)

ان کو ان کے کاموں کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گا۔

"فَاَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ" (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 40)

تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے۔

الجزاء ہر بدلہ کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی عہد کی وجہ سے ہو یا بغیر عہد کے اچھا ہو یا برا دونوں پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

"وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا" (سورۃ الانسان آیت نمبر 12)

اوران کے صبر کے بدلے ان کو بہشت کے باغات اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کریں گے۔

"فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ" (سورۃ النساء آیت نمبر 93)

اس کی سزا دوزخ ہے۔

محاورہ:

محاورہ میں ہے: اجر (ن) زید عمرا یا جرہ اجرا

کے معنی میں زید نے عمر کو اجرت پر کوئی چیز دی اور اجر عمر زیدا کے معنی ہوں گے عمرو نے زید کو اجرت دی، قرآن میں ہے:

"عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ" (سورۃ القصص آیت نمبر 27)

کہ تم اس کے عوض آٹھ برس میری خدمت کرو۔

اور یہی معنی اجر (مفاعلہ) کے ہیں لیکن اس میں معنی مشارکت کا اعتبار ہوتا ہے اور مجرد (اجرتہ) میں مشارکت کے معنی ملحوظ نہیں ہوتے ہاں مال کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ محاورہ ہے۔

اجرہ اللہ واجرہ

دونوں طرح بولا جاتا ہے یعنی خدا اسے بدلہ دے۔ الاجیرہ بروزن فعیل بمعنی فاعل یا مفاعل ہے یعنی معاوضہ یا اجرت کا پر کام کرنے والا۔ الاستیجار کے اصل معنی کسی چیز کو اجرت پر طلب کرنا پھر یہ اجرت پر رکھ لینے کے معنی میں بولا جاتا ہے جس طرح کہ استیجاب (استفعال) بمعنی اجاب آجاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:

"اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ" (سورۃ القصص آیت نمبر 26)

اسے اجرت پر ملازم رکھ لیجئے کیونکہ بہتر ملازم جو آپ رکھیں وہ ہے جو توانا اور امانت دار ہو۔

میں (استئجار کا لفظ) ملازم رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

عند کا استعمال:

(عند) ظرف (Near)

عندیہ کسی چیز کا قرب ظاہر کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے کبھی تو مکان کا قرب ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے اور کبھی اعتقاد کے معنی ظاہر کرتا ہے جیسے عندی کذا اور کبھی کسی شخص کی قرب ومنزلت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 169)

بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہے۔

خوف کی تعریف:

(خ و ف) الخوف (س) (Fear)

کے معنی ہیں قرآن وشواہد سے کسی آنے والے کا خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ کالفظ قرائن وشواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیوی اور آخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے: قرآن میں ہے:

"وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 57)

اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اگر حالات سے واقفیت کی بنا پر تمہیں اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔ اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہو جائے بلکہ خوف الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے۔ اور طاعات کو اختیار کرے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہو سکتا۔

الخویف کا معنیٰ:

الخویف (تفعیل) ڈرانا) اللہ تعالیٰ کے لوگوں کو ڈرانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو برے کاموں سے بچتے رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

"ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 16)

اس سے اللہ ڈراتا ہے اپنے بندوں کو۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے اور باری تعالےٰ نے شیطان سے ڈرنے اور اس کی تخویف کی پرواہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حزن کی تعریف:

(ح ز ن) الحزن والحزن (Grief,Sorrow)

کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔ نیز غم کی وجہ سے جو بیقراری سے طبیعت کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اسے بھی حزن کہا جاتا ہے اس کی ضد فوح ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنی معتبر ہوتے ہیں اس لئے گم زدہ ہوے کے لئے خشنت بصرہ بھی کہا جاتا ہے حزن (س) غمزدہ ہونا غمگین کرنا۔ قرآن میں ہے:

"لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 153)

تا کہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے اس سے تم اندوہناک نہ ہو۔

نوٹ: ایمان اور لفظ رب کا معنیٰ بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 63]

وَإِذْ أَخَذْنا مِيثاقَكُمْ وَرَفَعْنا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْناكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا ما فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اونچا کیا لو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں زور سے اور اس کے مضمون یاد کرو اس امید پر کہ تمہیں پرہیز گاری ملے"۔

متن:

وَإِذْ أَخَذْنا مِيثاقَكُمْ باتباع موسى والعمل بالتوراة. وَرَفَعْنا فَوْقَكُمُ الطُّورَ حتى أعطيتم الميثاق،

روي أن موسى عليه الصلاة والسلام لما جاءهم بالتوراة فرأوا ما فيها من التكاليف الشاقة كبرت عليهم وأبوا قبولها، فأمر جبريل عليه السلام فقلع الطور فظلله فوقهم حتى قبلوا. خُذُوا على إرادة القول: مَا آتَيْناكُمْ من الكتاب بِقُوَّةٍ بجد وعزيمة. وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ ادرسوه ولا تنسوه، أو تفكروا فيه فإنه ذكر بالقلب، أو اعملوا به. لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ لكي تتقوا المعاصي، أو رجاء منكم أن تكونوا متقين. ويجوز عند المعتزلة أن يتعلق بالقول المحذوف، أي: قلنا خذوا واذكروا إرادة أن تتقوا.

ترجمہ:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا۔

اس عہد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع اور تورات پر عمل کرنے کا عہد مراد ہے،

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ

اور تم پر طور کو اونچا کیا۔

اس کا معنی یہ کہ ہم نے تم سے عہد اس حال میں لیا کہ تمہارے اوپر کوہِ طور لا کر کھڑا کر دیا کہ جب تک توریت پر عمل کرنے کا پختہ عہد نہیں کرو گے اس وقت تک یہ پہاڑ تمہارے سروں کے اوپر سے نہیں ہٹے گا۔ منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب توریت لے کر آئے اور بنی اسرائیل نے اس میں مشقّت کے احکام دیکھے تو وہ کتاب ان پر شاق ہوئی اور انہوں نے اسکو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو اللہ کریم نے حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ کوہِ طور کو جڑ سے اکھاڑ کر سایہ کی طرح ان کے

اوپر لے آئیں، چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، تب انہوں نے قبول کیا۔

خذوا ما اتینا کم

اس سے مراد توریت ہے، "بقوّة" سے مراد محنت وکوشش اور عزمِ مصمم ہے، "واذکروا مافیہ" یعنی جو کچھ توریت میں ہے اس کو پڑھتے رہو۔ اور اس کو نہ بھلاؤ۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی آیات میں غور وحوض کرو کیونکہ کسی چیز میں غور وحوض کرنا اس کو دل سے یاد کرنا ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔

لعلکم تتقون

اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔

"لعل" بمعنی "کی" ہے، یعنی "لکی تتقون" تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔ اور معصیتوں سے بچ جاؤ، یا یہ کہ لعلّ ترجی کے لئے ہے اب معنی یہ ہوں گے کہ اے بنی اسرائیل تم کو کتاب دے کر اور اس کے مضامین کو یاد کرنے کا حکم دے کر ہم تم سے یہ امید کرتے ہیں کہ تم متقی ہو جاؤ۔ اور معتزلہ "لعلّ" کو ارادہ کے معنی میں لیتے ہیں۔ اور "خذوا" سے پہلے "قلنا" کو محذوف مانتے ہیں۔ یعنی،

قلنا خذوا واذکروا إرادۃ أن تتقوا.

تحقیق لفظِ فوق:

(ف و ق) فوق (Above,Up)

یہ مکان از مان جسم عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور کئی معنوں میں بولا جاتا ہے،

پہلی قسم:

اوپر جیسے فرمایا:

"وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 63)

اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا۔

"مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ" (سورۃ الزمر آیت نمبر 16)

کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے۔

"وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا" (سورۃ فصلت آیت نمبر 10)

اور اسی نے زمین میں اس کے پہاڑ بنائے۔

اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں چنانچہ فرمایا:

"قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ"
(سورۃ الانعام آیت نمبر 65)

کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔

دوسری قسم:

صعود یعنی بلندی کی جانب کے معنی میں اس کی ضد اسفل ہے جس کے معنی پستی کی جانب کے ہیں چنانچہ فرمایا:

"اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 10)

جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔

تیسری قسم:

کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جیسے فرمایا:

"فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ" (سورۃ النساء آیت نمبر 11)

اگر اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ۔

چوتھی قسم:

جسمانیت کے لحاظ سے بڑا یا چھوٹا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

"مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 26)

مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز مثلاً مکھی۔ مکڑی کی مثال بیان فرمائے۔

پانچویں قسم:

بلحاظ فضیلت دنیوی کے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 32)

اور ایک دوسرے پر درجے بلند کئے۔

اور کبھی فضیلت اخروی کے لحاظ سے آتا ہے جیسے فرمایا:

"وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 212)

لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر پر فائق ہوں گے۔

"فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 55)

کافروں پر فائق۔

پانچویں قسم:

فوقیت معنی غلبہ اور تسلط کے جیسے فرمایا:

"وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 18)

اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

"وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 127)

فرعون سے اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

لفظِ طور کی تحقیق:

(طور) (A Name of a Mountain)

طوار الدار و طوارہ کے معنی گھر کی عمارت کے امتداد یعنی لمبا ہونے اور پھیلنے کے ہیں محاورہ ہے:

عدا فلان طوارہ فلاں

اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔

لا وطوربہ میں اُس کے مکان کے صحن کے قریب تک نہیں جاؤں گا۔ فعل کذا طورا بعد طور اس نے ایک بار کے بعد دوسری بار یہ کام کیا اور آیت کریمہ:

"وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا" (سورۃ نوح آیت نمبر 14)

حالانکہ اس نے تمہیں طرح طرح بنایا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ کہ اطوار سے ان مختلف منازل و مدارج کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:

"خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ" (سورۃ الحج آیت نمبر 5)

ہم نے تم کو (پہلی بار بھی) تو پیدا کیا تھا (یعنی ابتداء میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر۔

میں مذکور ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مختلف احوال مراد ہیں جن کی طرف آیت:

"وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ" (سورۃ الروم آیت نمبر 22)

اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔

میں اشارہ فرمایا ہے یعنی جسمانی اور اخلاقی تفاوت جو کہ ہر معاشرہ میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔

الطور سے کون سا پہاڑ مراد ہے؟:

الطور (ایلہ کے قریب ایک خاص پہاڑ کا نام ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ ہر پہاڑ کو طور کہہ سکتے ہیں اور بعض کے نزدیک

طور سے وہ سلسلہ کوہ مراد ہے جو کرہ ارض کو محیط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَالطُّوْرِ وَ كِتَابٍ مَسْطُوْرٍ "(سورۃ الطور آیت نمبر 1۔2)
کوہ طور کی قسم اور کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے۔

"وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ "(سورۃ القصص آیت نمبر 46)
اور نہ تم اس وقت طور کے کنارے تھے۔

"وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ " (سورۃ التین آیت نمبر2) اور طور سینین کی۔

"وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ "(سورۃ مریم آیت نمبر 52)
اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب سے پکارا۔

"وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ "(سورۃ النساء آیت نمبر 154)
اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کر کھڑا کیا۔

نوٹ: اخذ، وثق، رفع، ما، تینا، قوۃ، تقویٰ اور لعل کی بحث گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 64]

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ○

"پھر اس کے بعد تم پھر گئے تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں میں ہو جاتے"۔

متن:

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ أعرضتم عن الوفاء بالميثاق بعد أخذه. فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ بتوفيقكم للتوبة، أو بمحمد صلّى الله عليه وسلّم يدعوكم إلى الحق ويهديكم إليه. لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ المغبونين بالانهماك فى المعاصى، أو بالخبط والضلال فى فترة من الرسل. ولو فى الاصل لامتناع الشيء لامتناع غيره، فإذا دخل على لا أفاد إثباتاً وهو امتناع الشيء لثبوت غيره. والاسم الواقع بعده عند سيبويه مبتدأ خبره واجب الحذف لدلالة الكلام عليه وسد الجواب مسده، وعند الكوفيين فاعل فعل محذوف.

ترجمہ:

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ

پھر اس کے بعد تم پھر گئے۔

یعنی تم نے پختہ عہد کر لینے کے بعد اس کو پورا کرنے سے اعراض کیا۔

فلولا فضل الله عليكم ورحمته

اللہ کریم کا تم پر فضل یہ تھا کہ اس نے تمہیں توبہ کی توفیق عطا کر دی، یا تمہارے اس عہد میں حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ جو تمہیں حق کی طرف بلاتے ہیں اور حق کی جانب تمہاری رہبری کرتے ہیں۔

لكنتم من الخاسرين

خاسرین کے معنیٰ ہیں نقصان پہنچائے ہوئے، یہ نقصان ان کو گناہوں میں انہماک کی وجہ سے پہنچایا جس مدت میں رسولوں کی آمد منقطع رہی اس زمانہ فطرت میں بھٹکتے رہنے کی وجہ سے پہونچا۔ "لَو" اس معنیٰ پر دلالت کرنے کے لئے وضع ہوا ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کے منتفی ہونے کی وجہ سے منتفی ہے۔ جب اس کے ساتھ "لَا" شامل ہو گیا تو نفی کی نفی ہونے کی بناء پر اس کے اثبات کے معنیٰ کا فائدہ دیا اب اس کا مفہوم ہوا کہ ایک چیز دوسری چیز کے وجود کی وجہ سے منتفی ہے، اور "لَو لَا" کے بعد جو اسم واقع ہے وہ سیبویہ کے نزدیک مبتداء ہے۔ اور اس کی خبر کا حذف کرنا واجب ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور "لولا" کا جواب اس کے قائم مقام ہے، پس قرینہ کے وجود کی وجہ سے اس کا حذف جائز ہوا اور قائم مقام کے موجود ہونے کی وجہ سے اس کا حذف واجب ہوا، تقدیرِ عبارت یوں ہوگی،

فلولا فضل الله موجود

کوفیوں کا کہنا ہے کہ "لو" حرفِ شرط ہے ار "لا" حرفِ نفی ہے، اور شرط اور نفی فعل کا تقاضا کرتے ہیں۔ لہٰذا "لو لا" کے بعد فعل محذوف ہے۔ اور جو اسم "لو لا" کے بعد مذکور ہے، وہ اس فعلِ محذوف کا فاعل ہے، اب عبارت یوں ہوگی،

فلو لا وُجِد فضل الله

لفظِ ولی کی تحقیق:

(و ل ی) الولاء والتوالی (Lord,Saint)

اور جب بذریعہ عن کے متعدی ہو تو خواہ وہ عن لفظوں میں مذکورہ ہوا یا مقدر وہ اس کے معنی اعراض اور دور ہونا کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ تعدیہ بذاتہ کے متعلق فرمایا:

"وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 51)

اور جو شخص تم میں ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہیں میں سے ہوگا۔

"وَمَنْ يَتَوَلَّ اللهَ وَرَسُولَهُ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 56)

اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر سے دوستی کرے گا۔ اور تعدیہ بعن کے متعلق فرمایا:

"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 63)
تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔

حرف لولا کا استعمال:

(لولا) لو لا (حرف)

اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک شے کے پائے جانے سے دوسری شے کا ممتنع ہونا اس کی خبر ہمیشہ محذوف رہتی ہے۔ اور لولا کا جواب قائم مقام خبر کے ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ" (سورۃ سبا آیت نمبر 31)
اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہو جاتے۔

دوم بمعنی ھلا کے آتا ہے۔ اور اس کے بعد متصلا فعل کا آنا ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 134)
تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا۔

وغیرہ ذالک من الامثلة

تحقیقِ فضل:

(ف ض ل) الفضل (Blessing)

کے معنی کسی چیز کے اقتضا متوسط درجہ سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے محمود جیسے علم وحلم وغیرہ کی زیادتی مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا لیکن عام طور الفضل اچھی باتوں پر بولا جاتا ہے اور الفضول بری باتوں میں اور جب فضل کے معنی ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(1) برتری بلحاظ جنس کے جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔

(2) برتری بلحاظ نوع کے جیسے نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا:

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 70)
اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

(3) فضیلت بلحاظ ذات مثلا ایک شخص کا دوسرے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی فضیلت بلحاظ جوہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلی کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا مثلا گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لئے اس کا اکتساب عین ممکن ہے

چنانچہ آیات کریمہ:

"وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ" (سورۃ النحل آیت نمبر 71)

اور اللہ نے رزق (دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

"لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ" (سورۃ الاسراء آیت نمبر 12)

تا کہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔

میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لفظ خسران کا معنیٰ:

(خ س ر) الخسر والخسران (Loss)

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔ جیسے مال و جاہ وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت و سلامتی عقل و ایمان اور ثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالیٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ"

(سورۃ الزمر آیت نمبر 15)

جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا، دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔

نوٹ: لفظِ رحم کا معنیٰ گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 65]

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ○

"اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے وہ جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی تو ہم نے ان سے فرمایا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے، تو ہم نے اس بستی کا یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کے لئے عبرت کر دیا اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت"۔

متن:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ اللام موطئة لقسم، والسبت مصدر قولك سبتت اليهود إذا عظمت يوم السبت، وأصله القطع أمروا بأن يجردوه للعبادة فاعتدى فيه ناس منهم في زمن داود عليه السلام، واشتغلوا بالصيد، وذلك أنهم

كانوا يسكنون قرية على ساحل يقال لها أيلة، وإذا كان يوم السبت لم يبق حوت في البحر إلا حضر هناك وأخرج خرطومه، فإذا مضى تفرقت فحفروا حياضاً وشرعوا إليها الجداول وكانت الحيتان تدخلها يوم السبت فيصطادونها يوم الاحد. فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ جامعين بين صورة القردة والخسوء: وهو الصغار والطرد وقال مجاهد ما مسخت صورهم ولكن قلوبهم، فمثلوا بالقردة كما مثلوا بالحمار في قوله تعالى: كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً وقوله: كُونُوا ليس بأمر إذ لا قدرة لهم عليه، وإنما المراد به سرعة التكوين، وأنهم صاروا كذلك كما أراد بهم، وقرء "قردة" بفتح القاف وكسر الراء، و"خاسين" بغير همزة.

ترجمہ:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ

اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے وہ جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی۔

اس آیت کریمہ میں لام قرینہ ہے قسم محذوف کا، اور السبت مصدر ہے۔ "سبتتِ الیہود" یعنی یہود نے یوم سبت کی تعظیم کی اور اس کے اصل معنیٰ ہیں قطع کرنا، کاٹ دینا۔ یہود کو حکم دیا گیا تھا کہ اس دن کو عبادت کے لئے خالی رکھیں تو حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد مبارک میں کچھ لوگوں نے اس مسئلہ میں حد سے تجاوز کیا اور شکار میں مشغول ہو گئے، بات یہ تھی کہ وہ ساحلِ دریا پر ایک بستی میں رہتے تھے بستی کا نام "ایلہ" تھا، اور جب شنبہ (ہفتہ) کا دن ہوتا تھا تو کوئی بھی مچھلی دریا کی تہہ میں نہیں جاتی تھی۔ بلکہ پانی کے اوپر رہتی تھی اور اپنا منہ نکال دیتی تھی۔ اور جب شنبہ کا دن گذر جاتا تھا تو منتشر ہو جاتی تھیں۔ تو ان لوگوں نے یہ کیا کہ حوض کھودے، اور حوضوں سے دریا کی جانب نالیاں بنالیں۔ وہ مچھلیاں شنبہ کے دن حوض میں آجاتی تھیں پھر یہ لوگ یک شنبہ یعنی اتوار کے دن ان کا شکار کر لیتے تھے۔

"قردة خاسئین"

یعنی ایسے بن جاؤ کہ دونوں باتیں تمہارے اندر جمع ہو جائیں، بندر بن جاؤ اور دھتکارے ہوئے، اور مجاہد نے فرمایا کہ ان کی صورتیں اور شکلیں مسخ نہیں کی گئیں بلکہ ان کے دل مسخ کئے گئے، مسخِ قلوب میں ان کو بندروں کے ساتھ تشبیہ دے دی گئی ہے جیسا کہ اللہ کریم کا ارشاد،

کمثل الحمار یحمله اسفارًا

میں گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اللہ کریم کا فرمان "کونوا" سے مقصود سرعتِ تکوین و ایجاد کو بیان فرماتا ہے۔ اور یہ ظاہر فرماتا ہے کہ اللہ کریم نے ان کے حق میں جیسا ارادہ فرمایا ویسے ہی وہ ہو گئے، اور ایک قرات "قردة" بفتح قاف

اوربکسرہ راء کی بھی ہے۔ نیز "خاسئین" بغیر ہمزہ کے بھی پڑھا گیا ہے۔

السبت کی تحقیق:

(س ب ت) السبت (ھفتہ) (Saturday)

کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں اور اسی سے کہا جاتا ہے سبت السیر اس نے تسمہ کو قطع کیا سبنت شعرۃ اس نے اپنے بال مونڈے سبت انفہ اس کی کاٹ ڈالی۔ بعض نے کہا ہے کہ ہفتہ کے دن کو یوم السبت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق اتوار کے دن شروع کی تھی اور چھ دن میں تخلیق عالم فرما کر سنیچر کے دن اسے ختم کر دیا تھا اسی سے سبت فلان ہے جس کے معنی ہیں وہ ہفتہ کے دن میں داخل ہوا۔

اور آیت کریمہ: "يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا " (سورۃ الاعراف آیت نمبر 163)

سنیچر کے دن (مچھلیاں) سینہ سپر ہو کر ان کے سامنے آجاتیں۔

میں بعض نے یوم سبتھم سے ان کے کاروں بار کو چھوڑنے کا دن مراد لیا ہے اس اعتبار سے یوم لا یسبتون کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز وہ کاروبار چھوڑتے اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ روز سنیچر نہ ہوتا ان ہر دو معنی کا مال ایک ہی ہے

اور آیت:

"اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ "(سورۃ النحل آیت نمبر 124)

میں سبت سے مراد سنیچر کے دن عمل کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سنیچر کے روز کام چھوڑنے کا حکم صرف،

"لِتَسْكُنُوا فِيهِ "(سورۃ یونس آیت نمبر 67)

اس لئے دیا گیا تھا اور آیت: " وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتاً " (سورۃ النبأ آیت نمبر 9)

اور نیند کو (موجب) راحت بنایا۔

میں سبات کے معنی ہیں حرکت و عمل کو چھوڑ کر آرام کرنا اور یہ رات کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:

"لِتَسْكُنُوا فِيهِ "(سورۃ یونس آیت نمبر 67)

تا کہ تم رات میں راحت کرو۔

میں مذکور ہے یعنی رات کو راحت وسکون لے لئے بنایا ہے

قردۃ کی تحقیق:

(ق ر د) القردۃ (Monkey)

بندر اس کی جمع قرود و قردۃ ہے اور آیات کریمہ:

" كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 65)
ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔

" وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 60)
اور جن کو ان میں سے بندر بنا دیا۔

کو بعض نے ظاہری معنی پر حمل کیا ہے یعنی انہیں سچ مچ بندر بنا دیا گیا تھا بعض نے کہا ہے کہ انکے اخلاق واطوار بندروں ایسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ سچ مچ بندر بنا دیئے گئے تھے۔

القراد کا معنیٰ:

القراد چیچڑی۔ جمع قردان۔ صرف قردا لجھی ہوئی اون (جو کاتی نہ جا سکے) اسی سے تہ بر تہ چھائے ہوئے بادل کو سحاب قردۃ کہا جاتا ہے۔

اقرد چیچڑی کی طرح زمین کے ساتھ چمٹ جانا قرد چیچڑی کی طرح ساکن ہو جانا اور قردت الابل کے معنی اونٹ سے چیچڑ دور کرنے کے ہیں مخذ جیسے قذبت ومرضت کا محاورہ ہے اور استعار کے طور پر قرد کے معنی چاپلوسی کے ذریعہ کیس کو دھوکا دینا بھی آتے ہیں چناچہ محاورہ ہے۔ فلاں مدارات سے اسے فریب دے رہا ہے اور پستان کے سرے کو قراد کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی شکل بھی چیچڑی جیسی ہوتی ہے۔

لفظ خساء کا مفہوم:

(خ س ء) (Disgrace.Insult)

خسات الکلب فخساء میں نے کتے کو دھتکارا تو وہ دور ہو گیا۔ اور کسی کو دھکتارنے کیے لئے عربی میں اخساء کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں کفار کے متعلق فرمایا۔

" اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ " (سورۃ المؤمنون آیت نمبر 108)
اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

" قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 65)
تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔

اسی سے خساء البصر کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں نظر درماندہ ہو کر منقبض ہو گئی۔ قرآن میں ہے:

" خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ " (سورۃ الملک آیت نمبر 4)
کہ وہ نظر درماندہ اور تھک کر لوٹ آئے گے۔

نوٹ: قد، عدد اور علم کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 66]

فَجَعَلْناها نَكالاً لِما بَيْنَ يَدَيْها وَما خَلْفَها وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ○

متن:

فَجَعَلْناها أي المسخة أو العقوبة. نَكالاً عبرة تنكل المعتبر بها. أي تمنعه. ومنه النكل للقيد.

لِما بَيْنَ يَدَيْها وَما خَلْفَها لما قبلها وما بعدها من الامم إذ ذكرت حالهم في زبر الاولين، واشتهرت قصتهم في الآخرين، أو لمعاصريهم ومن بعدهم. أو لما بحضرتها من القرى وما تباعد عنها. أو لأهل تلك القرية وما حواليها. أو لأجل ما تقدم عليها من ذنوبهم وما تأخر منها. وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ من قومهم. أو لكل متق سمعها.

ترجمہ:

"فجعلناھا" سے مراد یہ مسخ اور عقاب ہے۔ "نکالاً" یعنی ایسی عبرت جو عبرت حاصل کرنے والوں کو ارتکابِ جرم سے روک دے، اسی سے اخذ کر کے "نِکل" ہے جس کا معنیٰ بیڑی اور قید ہے۔

"ما بین یدیھا وما خلفھا

"ما بین یدیھا" سے مراد وہ قومیں ہیں جو اس واقعہ کے بعد پیدا ہوئیں پہلی قوموں نے جب اگلوں کے صحیفوں میں ان کا حال پڑھا تو اس سے عبرت حاصل کی اور بعد کی قوموں میں جب ان کا قصہ مشہور ہوا تو بعد کے لوگوں نے اس سے سبق لیا، یا یہ کہ "ما بین یدیھا" سے معاصرین مراد ہیں، جو اس وقت دوسری جگہوں پر موجود تھے۔ اور "وما خلفھا" سے وہ مراد ہیں جو بعد میں آئے، یا جو بستیاں قریب موجود تھیں وہ اور جو اس سے دور واقع تھیں وہ مراد ہیں۔ یا یہ کہ "ما بین یدیھا" سے خود اس بستی کے لوگ مراد ہیں۔ اور "وما خلفھا" سے مضافات کے لوگ مراد ہیں۔ یا یہ کہ "ما بین یدیھا" سے وہ گناہ مراد ہیں جو پہلے صادر ہوئے تھے اور ان کے اثرات ختم ہو گئے تھے۔ اور "وما خلفھا" سے وہ گناہ مراد ہیں جو بعد میں صادر ہوئے اور ان کے اثرات اس واقعہ کے بعد بھی باقی رہے۔

موعظة اللمتقین

یہاں متقین سے مراد ان ہی کی قوم کے متقی ہیں یا جس کسی متقی نے اس واقعہ کو سنا۔

لفظِ نکل کا مفہوم:

(ن ك ل) نكل عن الشئى (Exemplary)

کسی کام سے کمزور اور عاجز ہو جانا۔ نکلتہ۔ کسی کے پاوں میں بیڑیاں ڈال دینا۔ اور نکل۔ جانور کی بیڑی اور لگام کے لوہے کو کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بھی چلنے سے مانع ہوتے ہیں۔ اس کی جمع انکال ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا وَّ جَحِیۡمًا" (سورۃ المزمل آیت نمبر 12)

کچھ شک نہیں کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی آگ ہے۔

نکلتہ۔ کسی کو عبرت ناک سزا دینا۔ اس سے اسم نکال ہے۔ جس کے معنی عبرت ناک سزا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"فَجَعَلۡنٰهَا نَکَالًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهَا وَ مَا خَلۡفَهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 66)

اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لئے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے، عبرت بنا دیا۔

"جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ" (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 38)

ان کے فعلوں کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے۔

حدیث پاک:

اور حدیث میں ہے:

ان اللہ یحب النکل علی النکل

کہ قوی آدمی جو طاقت ور گھوڑے پر سوار ہو اللہ تعالیٰ کو پیارا لگتا ہے۔

تحقیقِ بین:

بین کا لفظ یا تو وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں مسافت پائی جائے جیسے (دو شہروں کے درمیان) یا جہاں دو یا دو سے زیادہ چیزیں موجود ہوں جیسے اور واحد کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں بین کو مکرر لانا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

"وَ مِنۡۢ بَیۡنِنَا وَ بَیۡنِکَ حِجَابٌ" (سورہ حم سجدہ آیت نمبر 5)

اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے۔

"فَاجۡعَلۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکَ مَوۡعِدًا" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 58)

تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کر لو۔

اور کہا جاتا ہے، یعنی یہ چیز تیرے قریب اور سامنے ہے۔ اسی معنیٰ میں فرمایا:

"ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 17)

پھر ان کے آگے (غرض ہر طرف سے) آؤں گا۔

"ولَهُ ما بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَما خَلْفَنَا "(سورۃ مریم آیت نمبر 64)

جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو پیچھے سب اسی کا ہے۔

"وَجَعَلْنا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا "(سورۃ یٰس آیت نمبر 9)

اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنادی، اور ان کے پیچھے بھی۔

"مُصَدِّقاً لِما بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ "(سورۃ المائدۃ آیت نمبر 46)

جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے۔

"ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنا "(سورۃ ص آیت نمبر 8)

کیا ہم سب میں سے اسی نصیحت (کی کتاب) اتری ہے۔

اور آیت کریمہ: "وَقالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْآنِ وَلا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ "

(سورۃ سبأ آیت نمبر 31)

اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن کو مانیں گے اور نہ ان کتابوں کو جو اس سے پہلے کی ہیں۔

میں سے انجیل اور دیگر کتب سماویہ مراد ہیں اور آیت کریمہ:

"فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوا ذاتَ بَيْنِكُمْ "(سورۃ الانفال آیت نمبر 1)

اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔

کے معنی یہ ہیں کہ صلہ رحمی، قرابت، دوستی وغیرہ باہمی رشتوں کا لحاظ کرو جو باہم تم سب کے درمیان مشترک ہیں اور بین کے م، العد یا الف کا اضافہ کرکے حین کے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں

خلف کا معنیٰ:

(خ ل ف) خلف (پیچھے) (Successor)

یہ قدام کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:

"يَعْلَمُ ما بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَما خَلْفَهُمْ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 255)

جو کچھ ان کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔

"لَهُ مُعَقِّباتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ "(سورۃ الرعد آیت نمبر ١١)

آدمی کے لئے بدلی والے فرشتے ہیں اس کے آگے اور پیچھے۔

لفظ وعظ کی تحقیق:

(و ع ظ) الوعظ (Preaching)

کے معنی ایسی زجر توبیخ کے ہیں جس میں خوف کی آمیزش ہو خلیل نے اس کے معنی کئے ہیں خیر کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے دل میں رقت پیدا ہو اعظۃ و موعضۃ دونوں اسم ہیں قرآن میں ہے:

"یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ" (سورۃ النحل آیت نمبر 90)
نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

نوٹ: لفظِ جعل اور تقویٰ کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 67]

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا ہُزُوًا قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ○

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں''۔

متن:

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً أول هذه القصة قوله تعالى: وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡساً فَادّٰرَءۡتُمۡ فِیۡہَا وإنما فكت عنه وقدمت عليه لاستقلالها بنوع آخر من مساويهم، وهو الاستهزاء بالامر والاستقصاء فى السؤال وترك المسارعة إلى الامتثال. وقصته: أنه كان فيهم شيخ موسر فقتل ابنه بنو أخيه طمعًا فى ميراثه، وطرحوه على باب المدينة، ثم جاءوا يطالبون بدمه، فأمرهم الله أن يذبحوا بقرة ويضربوه ببعضها ليحيا فيخبر بقاتله.

قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا ہُزُواً أى مكان هزؤ، أو أهله ومهزوءا بنا، أو الهزء نفسه لفرط الاستهزاء استبعاداً لما قاله واستخفافاً به، وقرأ حمزة وإسماعيل عن نافع بالسكون، وحفص عن عاصم بالضم وقلب الهمزة واواً. قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ لأن الهزء فى مثل ذلك جهل وسفه، نفى عن نفسه ما رمى به على طريقة البرهان، وأخرج ذلك فى صورة الاستعاذه استفظاعًا له.

ترجمہ:

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔

اس آیت کا شروع کا حصہ یہ ہے،

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْساً فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا

لیکن قصہ کو اس سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اور "واذ قال موسیٰ لقومه" کے قصہ کو مقدم ذکر کر دیا گیا ہے۔ یعنی ترکیب وقوعی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس طرح ارشاد فرمایا جاتا،

فادّرءتم فیها فقال موسیٰ لقومه انّ اللّٰه یامرکم ان تذبحوا بقرة

لیکن "قال موسیٰ لقومه" کے قصہ کو پہلے جز سے الگ کر کے مقدم ذکر کیا گیا ہے۔ اس تفریق اور تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ یہ جز و بھی مستقل ظاہر ہو اور اور بنی اسرائیل کی برائیوں کی ایک الگ نوع پر دلالت کرے ورنہ سلسلۂ قصہ میں رہتے ہوئے اس کا استقلال اور تشخص ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ قصہ کے اجزاء کے خصوصی مشتملات قصہ کے تسلسل کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اور قصہ کو پڑھنے والا ان خصوصیات کی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب قصہ کے اجزاء میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے تو ہر جز و ملتفت الیہ بذات ہو جاتا ہے

وهو الاستهزاء بالامر یعنی انہوں نے امرِ موسیٰ یا امرِ الٰہی کا استہزاء کیا اور سوال کرنے میں بہت دور تک چلے گئے اور امتثالِ امر کے لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے کو چھوڑ بیٹھے۔

مال دار بوڑھا:

وقصته: أنه كان فيهم شيخ موسر فقتل ابنه

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مال دار بوڑھا تھا، اس کی میراث اس کے بیٹے کو پہنچتی تھی اس کے بھتیجوں نے میراث کی لالچ میں آکر اس کے بیٹے کو قتل کر دیا، اور اس کی لاش کو فصیل شہر کے دروازے پر لا کر ڈال دیا اور خود اس کے خون کا مطالبہ کرنے کے لئے پہنچے۔ تو اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کو یہ حکم دیا کہ وہ ایک گائے ذبح کریں اور اس کے کسی حصہ کو لاشے کے ساتھ لگائیں تو وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کی خبر دے گا۔

قَالُوْا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا

"اتّخذ" کے دو مفعول ہوتے ہیں، اور معنوی حیثیت سے مفعول اوّل مبتداء اور مفعولِ ثانی خبر ہوتا ہے یہاں "انّا" مبتداء ہوا اور "هزو" خبر ہوا، خبر مصدر ہے اور مصدر کسی ذات کے لئے خبر نہیں ہوتا اس لئے مفسرین کے اس لفظی اشکال کو دور کرنے کے لئے "هزوا" کے معنی اور اس کی تقدیرات بیان کرنے کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں کہ "هزو" سے پہلے مکان یا اهل کا لفظ مقدر ہے، اب معنی ہوئے "انّا مکان هزو" ہم محلِ تمسخر ہیں۔ اسی کو جب "اتتخذ" کا مفعول بنا دیا گیا تو معنی ہوئے، کیا بناتے ہو تم ہم کو محلِ تمسخر، اسی طرح اهل کا لفظ جب مقدر مانا جائے تو معنی ہونگے "انّا اهل تمسخر" ہم تمسخر والے

ہیں۔ جب "اتخذ" کا مفعول بنایا جائے تو "اتتخذنا ھزو" کے معنی ہونے کیا تم ہم کو تمسخر کا اہل ٹھہراتے ہو، ایک تاویل یہ ہے کہ "ھزو" کو "مھزو بہ" کے معنی میں لیا جائے۔ مھزو بہ وہ شخص ہے جس کا مذاق اڑایا جائے۔ اب معنی ہوں گے۔ کیا ہم کو آپ مذاق اڑایا ہوا اور تمسخر کیا ہوا بناتے ہیں۔ آخری تاویل یہ ہے کہ شدت استہزاء کے اظہار کے لئے انہوں نے خود کو نفس تمسخر قرار دیا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو یہ حکم دے کر ان کا اتنا تمسخر کیا کہ وہ خود کو سراپا تمسخر سمجھنے لگے۔

آتَتَّخِذُنَا هُزُوًا

یہ انہوں نے اس لئے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ اسلام کی بات کو انہوں نے مستبعد سمجھا، یا یہ کہ نعوذ باللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استخفاف مقصود تھا۔ اور حضرت نافع سے حمزہ اور اسماعیل نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے "زاء" کے سکون کے ساتھ "ھزء" پڑھا ہے اور حفص عاصم کی قرات میں "زاء" کا ضمہ ہے، اور ہمزہ کو واؤ سے بدل دیا گیا ہے یعنی "ھزءً" کی بجائے "ھزواً" ہے۔

قَالَ اَعُوْذُ بِاللهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ

فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔

جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم مذاق نہیں کر رہے تھے، بلکہ فرمایا،

اَعُوْذُ بِاللهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر تمسخر کرنا جہل اور کم عقلی ہے۔ اس لئے جو تہمت حضرت موسی علیہ السلام پر لگائی گئی اس کی نفی استدلالی انداز میں فرمائی۔ استدلالی انداز یہ ہے کہ نفی صراحت پر نفی کنایہ کو ترجیح دی ہے۔ یہاں نفی کنائی سے ہماری مراد یہ ہے کہ کسی چیز کے اصل سبب کی نفی کر دی جائے۔ تمسخر کا اصل سبب کم عقلی اور جہالت ہے۔ اور جب اصل سبب کے سے منتفی ہو جائے تو اس پر متفرع ہونے والے تمام مسببات منتفی ہو جاتے ہیں۔ کسی کا تمسخر کرنا کسی کی مصیبت کا احساس نہ کرنا، کسی کی فریاد اور مطالبہ کو اہمیّت نہ دینا، قوم کے مسائل سے لا پرواہی برتنا وغیرہ جہل پر متفرع ہے۔ یہ سب باتیں جہل سے پیدا ہوتی ہیں۔ پس حضرت موسیٰ علیہ اہلسلام کے ارشاد کا معنی یہ ہوا کہ یہ یا اس جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور "اعوذ باللہ" یعنی استعاذہ کی صورت میں نفی کرنے میں استہزاء کی قباحت کا اظہار جیسے اردو میں کہتے ہیں توبہ توبہ استغفر اللہ ایسا ہو سکتا ہے۔

لفظِ بقر کی تعریف:

(ب ق ر) البقر (Cow)

(اسم جنس) کے معنی (بیل یا) گائے کے ہیں اس کا واحد بقرۃ ہے۔ قرآن میں ہے۔

"اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 709)

کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔

لفظ استہزاء کی تعریف:

الاستہزاء (Joke,Bunter)

اصل میں طلب ھزء کو کہتے ہیں اگر چہ کبھی اس کے معنی مذاق اڑانا بھی آجاتے ہیں جیسے استجابۃ کے اصل معنیٰ طلب جواب کے ہیں اور یہ اجابۃ جواب دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

" قُلْ اَبِاللّٰهِ وَآيَاتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ " (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 65)

تم فرماؤ کیا اللہ اور اسکی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنستے ہو۔

جہالت اور اس کی اقسام:

(ج ہ ل) الجھل (Ignorance,Blindness)

(جہالت) نادانی جہالت تین قسم پر ہے:

(1) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا اور یہی اس کے اصل معنی ہیں اور بعض متکلمین نے کہا ہے کہ انسان کے وہ افعال جو نظام طبعی کے خلاف جاری ہوتے ہیں ان کا مقتضی بھی یہی معنی جہالت ہے۔

(2) کسی چیز کے خلاف واقع یقین و اعتقاد قائم کر لینا۔

(3) کسی کام کو جس طرح سرانجام دینا چاہئے اس کے خلاف سرانجام دنیا ہم ان سے کہ متعلق اعتقاد صحیح ہو یا غلط مثلاً کوئی شخص دیا۔ دانستہ نماز ترک کردے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے آیت:

"اَتَتَّخِذُنَا هُزُواً ؕ قَالَ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 67)

فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔ میں ھزوا کو جہالت قرار دیا گیا ہے۔

نوٹ: قول، قوم، امر، ذبح، اخذ اور اعوذ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 68]

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ○

"بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے گائے کیسی کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ اوسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے"۔

متن:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ

أي ما حالها وصفتها. وكان حقهم أن يقولوا: أي بقرة هي؟ أو كيف هي؟ لأن مَا يسأل به عن الجنس غالباً. لكنهم لما رأوا ما أمروا به على حال لم يوجد بها شيء من جنسه، أجروه مجرى ما لم يعرفوا حقيقته ولم يروا مثله. قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ لا مسنة ولا فتية. يقال فرضت البقرة فروضًا من الفرض وهو القطع، كأنها فرضت سنها. وتركيب البكر للأولية ومن البكرة والباكورة.

عَوَانٌ نصف. قال شعر: نواعِمُ بينَ أبكارٍ وَعُونُ.

بَيْنَ ذَٰلِكَ أي بين ما ذكر من الفارض والبكر ولذلك أضيف إليه بين، فإنه لا يضاف إلا إلى متعدد وعود هذه الكنايات وإجراء تلك الصفات على بقرة يدل على أن المراد بها معينة. ويلزمه تأخير البيان عن وقت الخطاب، ومن أنكر ذلك زعم أن المراد بها بقرة من شق البقر غير مخصوصة ثم انقلبت مخصوصة بسؤالهم، ويلزمه النسخ قبل الفعل فإن التخصيص إبطال للتخيير الثابت بالنص والحق جوازهما، ويؤيد الرأي الثاني ظاهر اللفظ

والمروي عنه عليه الصلاة والسلام «لو ذبحوا أيّ بقرة أرادوا لأجزأتهم، ولكن شددوا على أنفسهم فشدد الله عليهم»

.وتقريعهم بالتمادي وزجرهم على المراجعة بقوله:

فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ أي ما تؤمرونه. بمعني تؤمرون به من قولهم: أَمَرْتُكَ الخَيْرَ فَافْعَلْ مَا أمرت به. أو أمركم بمعني مأموركم.

ترجمہ:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ

بولے اپنے رب سے دعاء کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے گائے کیسی۔

"ماھی" کا معنی ہے کہ اس (گائے) کا حال کیسا ہو؟ اس کی صفت کیسی ہو؟ حقیقی سوال یہ تھا بنی اسرائیل کہتے "ای بقرہ ھی کیف ھی" وہ کون سی گائے ہے یا کیسی ہے؟ اس لئے کہ عموماً "ما" کے ذریعے جنس اور حقیقت کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے لیکن چونکہ بنی اسرائیل نے مامور بہ کو ایسے حال اور ایسی صفت پر سمجھا کہ اس حال کے رہتے ہوئے مامور بہ کی جنس کا کوئی بھی فرد نہیں پایا جا سکتا، اس لئے انہوں نے مامور بہ کو اس مقام پر رکھا کہ گویا اس کی ماہیت او حقیقت کو ہی نہ پہچان سکے اور نہ اس کی مثال ان کی نظر سے گذری۔

"لا فارض ولا بکر"

یعنی نہ تو سن دراز ہوا اور نہ کم سن ہو، عرب والے کہتے ہیں "فرضت البقرۃ فرضاً" گائے اپنی عمر گزار چکی۔ یہ فرض سے مشتق ہے جو قطع کرنے کے معنی میں ہے۔ گویا گائے نے اپنی عمر کو قطع کر دیا۔ اور بکر کی ترکیب اوّلیت پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ اور اسی سے اخذ کرکے البکرۃ آغازِ صبح کو اور الباکورہ آغازِ ثمر کو کہتے ہیں۔

عوان

کا معنیٰ ہے درمیانی، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

نواعِمُ بینَ أبکارٍ وَعُونُ... بین ذالك

ذالک سے مراد جو مذکور ہوا یعنی فارض اور بکر۔ اور اسی وجہ سے بین کو ذالک کی جانب مضاف کیا گیا ہے، کیونکہ بین کی اضافت متعدد ہی کی جانب ہوتی ہے اور ان ضمیروں کا بقرہ کی طرف راجع ہونا اور ان صفات کو بقرہ پر جاری کرنا اس پر دلیل ہے کہ بقرہ سے اللہ کریم کی مراد بقرہ معینہ تھی۔ اس قول کی بناء پر یہ لازم آتا ہے کہ تفسیر و توضیح کو حکم دینے کے وقت سے مؤخر کر دیا گیا تھا۔ اور جو لوگ تاخیر بیان کے منکر ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ بقرہ سے مراد بقرہ غیر معینہ تھی، جو بقرہ کی کوکھ سے پیدا ہوئی، خواہ وہ کیسی بھی ہو۔ پھر بنی اسرائیل کے سوال کی وجہ سے وہ غیر معیّنہ، معیّنہ میں تبدیل کر دی گئی، یعنی مامور بہ اب غیر معیّنہ نہیں بلکہ معینہ ہو گئی، اس قول کی بنیاد پر نسخ قبل العمل لازم آتا ہے کیونکہ غیر محسوس کو خاص کر دینا اس اختیار کو باطل کر دینا ہے جو نص سے حاصل ہوا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں جائز ہیں۔ قولِ ثانی کی تائید قرآن حکیم کے ظاہری الفاظ سے ہوتی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے جو حدیث منقول ہے اس سے بھی قولِ ثانی کی تائید ہوتی ہے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل اگر کسی بھی گائے کو ذبح کر دیتے تو ان کے لئے کافی ہوتا لیکن انہوں نے اپنے حق میں شدّت برتی، تو اللہ کریم نے ان پر معاملہ کو شدید کر دیا، اور قولِ ثانی کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ کریم نے اپنے فرمان "فافعلوا ما تؤمرون" کے ذریعہ ان کو ان کی انتہا پسندی پر ڈانٹا ہے اور سوالات کی طرف عود کرنے سے جھڑکا ہے۔

فافعلوا ما تؤمرون

اس کے معنیٰ ہیں "فافعلوا ما تؤمرونه" اور یہ تؤمرون بہ کے معنی میں ہے، یہ استعمال شاعر کے اس شعر سے ماخوذ ہے،

أَمَرْتُكَ الْخَيْرَ فَافْعَلْ مَا أمرت به

یا یہ کہ "ما تؤمرون"، "أمرکم" کے معنیٰ میں ہے اور امرکم، مامورکم کے معنی میں ہے۔

لفظ بیان کی تحقیق:

(Explanation)

البیان کے معنیٰ کسی چیز کو واضح کرنے کے ہیں اور یہ نطق سے عام ہے۔ کیونکہ نطق انسان کے ساتھ مختص ہے اور کبھی جس

چیز کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اسے بھی بیان کہہ دیتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ بیان دو قسم پر ہے۔ ایک بیان بالتحبیر یعنی وہ اشیا جو اس کے آثار صنعت میں سے کسی حالت پر دال ہوں، دوسرے بیان بالاختیار اور یہ یا تو زبان کے ذریعہ ہوگا اور یا بذریعہ کتابت اور اشارہ کے چنانچہ بیان حالت کے متعلق فرمایا۔

" وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ "(سورۃ الزخرف آیت نمبر 62)

اور (کہیں) شیطان تم کو (اس سے) روک نہ دے وہ تو تمہارا اعلانیہ دشمن ہے۔

یعنی اس کا دشمن ہونا اس کی حالت اور آثار سے ظاہر ہے۔ اور بیان بالاختیار کے متعلق فرمایا:

"فَسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ "

اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ اور ان پیغمبروں (کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔

" وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ " (سورۃ النحل آیت نمبر 43۔44)

اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کردو۔

اور کلام کو بیان کہا جاتا ہے کیونکہ انسان اس کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے جیسے فرمایا:

" هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ "(سورۃ آل عمران آیت نمبر 138)

قرآن لوگوں کے لئے بیان صریح ہو۔

اور مجمل مبہم کلام کی تشریح کو بھی بیان کہا جاتا ہے جیسے

" ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ " (سورۃ القیامۃ آیت نمبر 19)

پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

بینہ وابنته کسی چیز کی شروع کرنا۔ جیسے فرمایا:

"لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ " (سورۃ النحل آیت نمبر 44)

تاکہ جو ارشادت لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کردو۔

" نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ " (سورۃ ص آیت نمبر 70)

کھول کر ڈرانے والا ہوں۔

"اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ " (سورۃ الصافات آیت نمبر 106)

بیشک یہ روشن جانچ تھی۔

"وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ " (سورۃ الزخرف آیت نمبر 52)

اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔

"وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 18)
اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔

نوٹ: قول، دعا اور لفظ رب کی بحث گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 69]

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ○

"بولے اپنے رب سے دعاء کیجئے ہمیں بتادے اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک پیلی گائے ہے جس کی رنگت ڈہڈہاتی دیکھنے والوں کو خوشی دیتی"۔

متن:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا الفقوع نصوع الصفرة

ولذلك تؤكد به. فيقال: أصفر فاقع كما يقال أسود حالك. وفي إسناده إلى اللون وهو صفة صفراء لملابسته بها فضل تأكيد كأنه قيل صفراء شديدة الصفرة صفرتها. وعن الحسن سوداء شديدة السواد. وبه فسر قوله تعالى: جِمَالَتٌ صُفْرٌ.

قال الاعشى:

تِلْكَ خَيلِي مِنْهُ وتلكَ رِكَابِي ... هُنَّ صُفْرٌ أولادُها كالزَّبِيبِ

ولعله عبر بالصفرة عن السواد لأنها من مقدماته. أو لأن سواد الإبل تعلوه صفرة وفيه نظر. لأن الصفرة بهذا المعنى لا تؤكد بالفقوع تَسُرُّ النَّاظِرِينَ أي تعجبهم. والسرور أصله لذة في القلب عند حصول نفع. أو توقعه من السر.

ترجمہ:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا

"الفقوع" کا معنیٰ ہے زردی کا بے میل اور خالص ہونا، اسی لئے صفرت کی شدت و قوت کو فقوع کے مشتقات کے ذریعہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اصفر "فاقع" بمعنی گہرا زرد، اسی طرح بولا جاتا ہے جس طرح اسود حالک بمعنی گہرا سیاہ بولا

جاتا ہے۔ فاقع کو لون کی طرف مسند کیا گیا ہے اور لون کو فاقع کا فاعل بنایا گیا ہے، حالانکہ وضع کے اعتبار سے فاقع وصف ہے صفراء کا، یعنی اسفر فاقع، یا صفراء فاقعة بولا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسناد الی اللون مجازاً ہے۔ اور مجاز کی وجہ یہ ہے کہ لون صفراء کا ملابس اور اس سے تعلق و اتصال رکھنے والا ہے ہے کیونکہ لون حال (حلول کرنے والا) اور بقرۃ صفراء محل (جائے حلول ہے) اور حال و محل کے درمیان اتصال ہوتا ہے۔ اس لئے لون اور صفراء کے درمیان اتصال ہے۔ اس اسنادِ مجازی میں حکمت اور بلاغت یہ ہے کہ اس سے صفرت کی مزید تاکید اور شدت ثابت ہوتی ہے۔

فاقع لونها

یہ فرمانا ایسا ہے گویا کہ یوں فرمایا گیا،

صفراء شديد الصفرة صفرتها

یعنی ایسی زرد کہ اس کی زردی کی زردی شدید ہے۔ اس تاکید کو شیخ زادہ نے اس طرح سمجھایا ہے کہ فقوح یا شدتِ صفرت پورے جسم میں سرایت کر گئی ہے، اور یہ شدت کی انتہاء ہے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں کہ صفراء کے معنی سوداء شديدة السواد کے ہیں یعنی کالی، اور انتہائی کالی اور فرمانِ باری تعالیٰ "جمالات صفر" کی یہی تفسیر لی گئی ہے یعنی کالے اونٹ۔ اعشیٰ کہتے ہیں،

تِلْكَ خَيلِي مِنْهُ وتلكَ رِكَابِي ... هُنَّ صُفْرٌ اَولَادُهَا كَالزَّبِيبِ

میرے وہ گھوڑے اور میرے وہ اونٹ معد یکرب سے حاصل ہوئے ہیں۔ اونٹوں کے بچے کشمشی رنگ کی طرح سیاہ ہیں۔

یہ شعر قیس بن معد یکرب کی تعریف میں ہے۔ اور غالباً سیاہی کو زردی سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ زردی، سیاہی کا پیش خیمہ ہے، یا اس لئے کہ اونٹوں کی سیاہی پر زردی چھائی رہتی ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو تفسیر حضرت حسن سے منقول ہے، اس میں اشکال ہے، اشکال کی وجہ یہ ہے کہ اگر صفرۃ کے یہی معنی مراد ہوتے تو اس کی تاکید کے لئے "فقوع" کا لفظ نہ آتا بلکہ سواد کی تاکید کے لئے جو لفظ ہے یعنی "حالک" وہ آتا۔

تسر النظرين

یعنی دیکھنے والوں کو گائے اچھی لگے۔ اس کا حسنِ قامت اور وفورِ صحت نظروں کو بھائے، سرور کے اصل معنی اس لذت کے ہیں۔ جو کسی نفع کے حاصل ہونے کے وقت یا کسی نفع کی توقع کے وقت دل میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ "سرّ" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ باطنی اور اندرونی لذت کا نام سرور ہے۔

تحقیق لون:

(ل و نْ) اللون (Colour)

کے معنی رنگ کے ہیں اور یہ سیاہ سفید اور ان دونوں سے مرکب یعنی ہر قسم کے رنگ پر بولا جاتا ہے۔ تلون کے معنی رنگ بدلنے کے ہیں قرآن میں ہے۔

"وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا" (سورۃ فاطر آیت نمبر 27)

اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کی دھاریاں ہیں۔ اور آیت کریمہ:

"وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ" (سورۃ الروم آیت نمبر 22)

اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف انواع و اقسام کے رنگوں اور شکلوں کے مختلف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور باوجود اس قدر تعداد کے ہر انسان اپنی ہیئت کذائی اور رنگت میں دوسرے سے ممتاز کذابی اور رنگت میں دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس سے اللہ کریم کی وسیع قدرت پر تنبیہ کی گئی۔ اور کبھی الوان سے کسی چیز کے انواع و اقسام مراد ہوتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے،

فلان أتى بالالوان من الاحاديث، وتناول كذا ألوانا من الطعام۔

اس نے رنگا رنگ کی باتیں کیں اور الوان من الطعام سے مراد ہیں قسم قسم کے کھانے۔

صفرۃ کیا ہے؟:

(ص ف ر) الصفرۃ (Yellow)

(زردی) ایک قسم کا رنگ جو سیاہی اور سفیدی کے مابین ہوتا ہے مگر اس پر چونکہ سیاہی غالب ہوتی ہے اس لئے کبھی اس کے معنی سیاہی بھی آتے ہیں۔ اسی بنا پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے آیت۔

"بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 69)

اس کا رنگ گہرا زردہ ہو۔

میں صفراء کے معنی سیاہی کے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اگر اس کے معنی سیاہ ہوتے تو اس کی صفت فاقع نہ آتی بلکہ صفراء کے بعد حالکتہ کہا جاتا ہے۔ نیز فرمایا:

"ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا" (سورۃ الزمر آیت نمبر 21)

پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے۔

اور آیت کریمہ: "كَاَنَّهُ جِمَالَاتٌ صُفْرٌ" (سورۃ المرسلات آیت نمبر 33)

گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صفرا صفر کی جمع ہے اور بعض نے کہا جاتا ہے کہ صفر ایک دھات کا نام ہے جس کے ساتھ زردی میں تشبیہ دی گئی ہے۔

نحاس، سفار، صفیر اور پیٹ کا سانپ:

اسی سے نحاس (پیتل) کو صفر اور خشک بُھس (گھاس) کو سفار کہا جاتا ہے اور کبھی صفیر کا لفظ ہر اس آواز کی حکایت پر بولا جاتا ہے جو (دور سے) سنائی دے اسی سے صفر الاناء کا محاورہ ہے جس کے اصل معنی تو اس خالی برتن کے ہیں جس سے صفیر کی سی آواز سنائی لگے ہیں خواہ وہ برتن ہو یا اور کوئی چیز اور پیٹ اور رگوں کے غذا سے خالی ہونے کی صفر کہا گیا ہے اور ان رگوں کو جو جگر اور معدہ کے مابین پھیلی ہوئی ہیں جب غذا میسر نہ ہو تو وہ معدہ کے اجزا کو چوسنے لگتی ہیں اس بنا پر جاہل عربوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ صفر پیٹ میں ایک سانپ کا نام ہے جو بھوک کے وقت پسلیوں کا کاٹتا ہے۔ حتی کہ نبی کریم ﷺ کو لاصفر کہہ کر اس عقیدہ کی نفی کرنا پڑی، یعنی پیٹ میں اس قسم کا سانپ نہیں ہوتا جس کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے:

ولا یعضّ علی شرسوفه الصَّفَرُ اورنہ اس کی پسلیوں کی صفر سانپ کاٹتا ہے۔

ماہ صفر کی وجہ تسمیہ:

اور ماہ صفر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں ان کے گھر توشہ خالی ہو جاتے تھے اس لئے اسے صفر کہتے تھے اور جو بچہ ماہ صفر میں پیدا ہوا اسے صفری کہا جاتا ہے۔

لفظ فقع کا مفہوم:

(ف ق ع) اصفر فاقع کے معنی گہرے زرد رنگ کے ہیں اور یہ اصفر کی تاکید ہے جس طرح اسود حالک میں حالک کا لفظ اسود کی تاکید بن کر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"صَفْرَاءُ فَاقِعٌ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 69)

گہرا زرد رنگ۔

فقع اور فقاع کا معنیٰ:

ایک قسم کی کھمبی ہے جس کے ساتھ ذلیل آدمی کو تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ ھواذل من فقع بقاع: وہ جنگل کی کھمبی سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ شراب کو فقاع اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس پر جھاگ ابھر آتی ہے۔

پانی کا بلبلہ:

اور تشبیہ کے طور پر پانی کے بلبلے کو بھی فقاقیع الماء بولتے ہیں۔

سرور کیا ہے؟:

(Taste,Grace)

السرور قلبی فرحت کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔

"وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا" (سورۃ الدھر آیت نمبر 11)

(تو خدا) ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔

"تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 69)

کہ دیکھنے والے (دل) کو خوش کر دیتا ہو۔

اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"وَيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 9)

اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔

اور اہل نار کے متعلق فرمایا:

"اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 13)

یہ اپنے اہل وعیال میں مست رہتا تھا۔

تو اس میں تنبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔

السریر:

السریر (تخت) وہ جس پر کہ (ٹھاٹھ سے) بیٹھا جاتا ہے یہ سرور سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں اس کی جمع اسرۃ اور سرر آتی ہے۔ قرآن نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ" (سورۃ الطور آیت نمبر 20)

تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔

"فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ" (سورۃ الغاشیۃ آیت نمبر 13)

وہاں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے۔

"وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 34)

اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنادیئے) اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔

سریر المیّت:

اور میت کے جنازہ کو اگر سریر المیت کہا جاتا ہے تو یہ سریر (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یا نیک شگون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قید خانہ سے رہائی پا کر جوار الٰہی میں خوش وخرم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے،

سجن المومن:

نبی کریم ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"الدنیا سجن المؤمن" کہ مومن کو دنیا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

نوٹ: لفظ نظر کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 70]

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ○

"بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کرے وہ گائے کیسی ہے بیشک گائیوں میں ہم کو شبہ پڑ گیا اور اللہ چاہے تو ہم راہ پا جائیں گے"۔

متن:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ تكرير للسؤال الاول واستكشاف زائد. وقوله: إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا اعتذار عنه، أي إن البقر الموصوف بالتعوين والصفرة كثير فاشتبه علينا. وقرء «إن الباقر» وهو اسم لجماعة البقر والاباقر والبواقر. ويتشابه وتتشابه بالياء والتاء، وتشابه ويشابه وتشّابه بطرح التاء وإدغامها في الشين على التذكير والتأنيث، وتشابهت وتشابهت مخففاً ومشدداً، وتشبه بمعنى تتشبه وتشبه بالتذكير ومتشابه ومتشابهة ومتشبه ومتشبهة.

وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ إلى المراد ذبحها، أو إلى القاتل،

وفي الحديث «لو لم يستثنوا لما بينت لهم آخر الابد». واحتج به أصحابنا على أن الحوادث بإرادة الله سبحانه وتعالى، وأن الامر قد ينفك عن الإرادة وإلا لم يكن للشرط بعد الامر معنى. والمعتزلة والكرامية على حدوث الإرادة. وأجيب بأن التعليق باعتبار التعلق.

ترجمہ:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ

یہ سوال اوّل کا تکرار ہے۔ اور مزید وضاحت کا مطالبہ ہے اور اللہ کریم کا ارشاد،

انّ البقر تشابہ علینا

اس سوال مکرر کی طرف معذرت ہے یعنی وہ گائیں جو عوان اور اصفر کا وصف رکھتی ہیں، بہت ہیں۔ لہٰذا مطلوبہ گائے ہم پر مشتبہ ہوگئی ہے۔ اور ایک قرات "انّ الباقر" کی ہے۔ باقر، بقر کی جماعت کا نام ہے جیسا کہ "اباقر" اور "بواقر"، اور یشابہ یا کے ساتھ اور تاء کے ساتھ ہے، اور تشابہ تاء کے حذف بھی ہے۔ اور تاء کو شین کے ساتھ مدغم کرنے کے ساتھ بھی ہے۔ یہ ادغام مؤنث کے صیغہ میں ہو تو قرات "تشابہ" ہوگی، اور اگر مذکر کے صیغہ میں ہو تو قرات یشابہ ہوگی اور تشابہت شین کی تخفیف کے ساتھ اور تشابہت شین کی تشدید کے ساتھ، اور ایک قرات تشبہ ہے جو معنیٰ میں "تتشبہ" کے ہے۔ اور ایک قرات یشبہ مذکر کے صیغہ کے ساتھ ہے اور بقیہ قرائتیں متشابة، متشابهة، متشبهة اور متشبہ ہے۔

وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ

"لمهتدون" کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اس بقرہ تک ہدایت پا جائیں گے، جس کا ذبح کرنا مقصود ہے، یا مراد یہ ہے کہ قاتل تک ہدایت پا جائیں اور حدیث پاک میں ہے کہ اگر وہ لوگ ان شاء اللہ نہ کہتے تو بقرہ کی توضیح قیامت تک نہ ہوتی۔ اور اس آیت سے ہمارے متکلمینِ اسلام نے اس پر استدلال کیا ہے کہ تمام حوادث اللہ کریم کے ارادہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ امرِ باری تعالیٰ کبھی ارادہِ باری تعالیٰ سے جدا ہوتا ہے ورنہ امر کے بعد ان شاء اللہ کی شرط کے کوئی معنی نہ ہوں گے اور معتزلہ اور کرامیہ نے ارادہ کے حادث ہونے پر استدلال کیا ہے، اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ ارادہ باری تعالیٰ پر کسی چیز کو معلق کرنا تعلق کے اعتبار سے ہے۔

لفظِ شبہ کی تحقیق:

(ش ب ہ)(Doubt,Suspicion)

الشيبة والشبة کے اصل معنی مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلاً لون اور طعم میں باہم مماثل ہونا یا عدل ظلم میں اور دو چیزوں کا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوسکیں شبهة کہلاتا ہے پس آیت کریمہ:

"وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 25)

اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے میں متشابها کے معنی یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اور مزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔

نوٹ: لفظ شاء اور اهتدا ء کی تحقیق بیان ہو چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 71]

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ○

"کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے"۔

متن:

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ أي لم تذلل لكراب الارض وسقي الحرث، ولا ذَلُولٌ صفة لبقرة بمعنى غير ذلول، ولا الثانية مزيدة لتأكيد الاولى والفعلان صفتا ذلول كأنه قيل: لا ذلول مثيرة وساقية، وقرء «لا ذلول» بالفتح أي حيث هي، كقولك مررت برجل لا بخيل ولا جبان، أي حيث هو،

وتسقي من أسقى. مُسَلَّمَةٌ سلمها الله تعالى من العيوب، أو أهلها من العمل، أو أخلص لونها، من سلم له كذا إذا خلص له لَا شِيَةَ فِيهَا لا لون فيها يخالف لون جلدها، وهي في الاصل مصدر، وشاه وشيا وشية إذا خلط بلونه لوناً آخر.

قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ أي بحقيقة وصف البقرة وحققتها لنا، وقرء «الآن» بالمد على الاستفهام، و «لان» بحذف الهمزة وإلقاء حركتها على اللام. فَذَبَحُوهَا فيه اختصار، والتقدير: فحصلوا البقرة المنعوتة فذبحوها.

وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ لتطويلهم وكثرة مراجعاتهم، أو لخوف الفضيحة في ظهور القاتل، أو لغلاء ثمنها. إذ

روي: أن شيخاً صالحاً منهم كان له عجلة، فأتى بها الغيضة وقال: اللهم إني استودعتكها لابني حتى يكبر، فشبت وكانت وحيدة بتلك الصفات، فساوموها من اليتيم وأمه حتى اشتروها بملء مسكها ذهباً، وكانت البقرة إذ ذاك بثلاثة دنانير. وكاد من أفعال المقاربة وضع لدنو الخبر حصولاً، فإذا دخل عليه النفي قيل معناه الإثبات مطلقاً. وقيل ماضياً، والصحيح أنه كسائر الافعال ولا ينافي قوله:

وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ قوله فَذَبَحُوهَا لاختلاف وقتيهما، إذ المعنى أنهم ما قاربوا أن يفعلوا حتى انتهت سؤالاتهم، وانقطعت تعللاتهم، ففعلوا كالمضطر الملجأ إلى الفعل.

ترجمہ:

"لا ذلول" یعنی وہ زمین جوتنے اور کھیتی کو سیراب کرنے کے کام میں نہ لائی گئی ہو۔ اور "لا ذلول" صفت ہے "بقرة"

کی، غیر ذلول کے معنیٰ میں ہے اور دوسرا "لا" پہلے "لا" کی تاکید کے لئے بڑھایا گیا ہے۔ اور "تثیر الارض" اور "تسقی الحرث" دونوں کے دونوں ذلول کی صفت ہیں۔ گویا یوں ارشاد فرمایا گیا،

لا ذلول مثيرة وساقية

اور ایک قرات ہے، "لا ذلول" فتحہ کے ساتھ، اس صورت میں لانفی جنس کے لئے ہوگا۔ اور خبر حیث ھی مقدر مانی جائے گی، عبارت یہ نکلے گی۔

لا ذلول حيث هي

جیسے آپ کہتے ہیں "مرت برجلٍ لا بخيل ولا جبان" یعنی "لا بخيل ولا جبان حيث هي" یہاں بظاہر ذلول کی نفی اس مقام سے ہو رہی ہے جس مقام پر "بقرة" موجود ہے۔ نیز بخل اور جبن کی نفی اس مکان اور جگہ سے ہو رہی ہے جس جگہ پر وہ آدمی موجود ہے، کیونکہ ترجمہ ہوگا کوئی ذلول اور کیری نہیں ہے۔ جہاں وہ بقرہ موجود ہے۔ یا کوئی بخیل اور بزدل نہیں ہے جہاں وہ آدمی موجود ہے۔ لیکن مقصود اس بقرہ سے ذلول کی نفی ہے، اسی طرح دوسری مثال میں مقصود بخل اور جبن کی نفی ہے خود اس شخص سے، کیونکہ جب کسے چیز کے مکان سے کوئی چیز منتفی ہے تو لازمی طور پر خود اس چیز سے بھی اس کی نفی ہوگی۔ پس ان دونوں مثالوں میں نفی بطورِ کنایہ ہے۔

وتسقي من اسقى

یعنی ایک قرات اسقِی ہے، یہ باب افعال اسقی سے فعل مضارع کا صیغہ ہے۔ "مسلمة" یعنی اس کو اللہ کریم نے عیوب سے صحیح سالم رکھا ہو، جن لوگوں کے یہاں وہ پرورش پا رہی ہے۔ ان لوگوں نے اس کو محنت سے محفوظ رکھا ہو، اس سے محنت کا کام نہ لیتے ہوں۔ یا مسلّمة کے معنی یہ ہیں کہ اس کے رنگ کو خالص رکھا گیا ہو۔ اس صورت میں یہ سلم له كذا سے ماخوذ ہوگا یہ اس وقت بولتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی شخص کے لئے خالص ہو جائے۔

لا شية فيها

یعنی اس میں کوئی دوسرا رنگ نہ پایا جاتا ہو۔ جو اس کی جلد کے رنگ کے برخلاف ہو، شية دراصل وشاہ، وشياً و شية کا مصدر ہے۔ وشاہ کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کسی کے رنگ میں دوسرے رنگ کو مخلوط نہ کر دیا جائے۔

قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ

آیت کریمہ کے اس جزو میں بقرہ کے حقیقی اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں، جن کی روشنی میں بقرہ متحقق ہو سکے اور پورے طور پر اس کا تعین ہو سکے۔ اور ایک قرات "الآن" ہمزہ استفہام کے مد کے ساتھ ہے، لیکن یہ انکار و تعجب کے لئے نہیں۔ بلکہ تقریر و تحقیق کے لئے ہے، اور ایک قرات میں الآنَ ہے۔ اس میں ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی حرکت کو لام دے دی گئی ہے۔

فذبحوها

اس تعبیر میں اختصار ہے اور اس کی تہہ میں ایک جملہ پوشیدہ ہے، اس کو ظاہر کرنے کی صورت میں عبارت اس طرح بنے گی۔

فحصلوا البقرة المنعوتة فذبحوها

یعنی ان تفصیلات کے بعد یہ ہوا کہ بنی اسرائیل مذکورہ بالا بقرہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اس کو ذبح کر دیا۔

وما کادوا یفعلون

اور وہ کرنے کے قریب نہیں تھے، کیونکہ معاملہ کو طول دے رہے تھے اور بار بار مراجعت کر رہے تھے، یا یہ وجہ تھی کہ ان کو قاتل کے ظہور میں رسوائی کا اندیشہ تھا، یا اس کی وجہ قیمت کی گرانی تھی، اس لئے روایات میں آتا ہے کہ ایک صالح بزرگ کے پاس ایک بچھیا تھی، اس کو وہ بیابان میں لے کر آیا، اور اس نے دعا کی کہ اے اللہ کریم یہ بچھیا میں تیرے پاس امانت رکھتا ہوں، تا آنکہ وہ بیٹا بڑا ہو جائے، اور وہ بچھیا جوان ہوئی اور ان اوصاف میں وہ منفرد تھی تو بنی اسرائیل نے اس یتیم اور اس کی ماں سے اس بقرہ کے سلسلہ میں بھاؤ تاؤ کیا یہاں تک کہ اس کو کھال بھر سونے کے ساتھ خرید لیا، حالانکہ کہ اس وقت گائے کی عمومی قیمت تین دینار تھی۔

وکاد من افعال امقاربه

اور "کاد" افعالِ مقاربہ میں سے ہے اور خبر کے قریب الحصول ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پھر جب اس پر حرف نفی داخل ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ مطلقاً اثبات کے ہوتے ہیں۔ مطلقاً کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ اس کا مدخول ماضی ہو، خواہ مضارع اور بعض نے کہا کہ جب کاد ماضی پر حرف نفی داخل ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ اثبات کے ہوتے ہیں۔ "ما کاد" والت کرتا ہے۔ اس پر کہ خبر حاصل ہو گئی، اور اگر مضارع پر داخل ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ اثبات کے نہیں ہوتے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ "کاد" دیگر افعال کی طرح ہے۔ جس طرح دیگر افعال پر اگر حرف نفی داخل ہوتا ہے تو فعل منفی ہوتا ہے۔ اور حرف نفی نہیں داخل ہوتا تو مثبت ہوتا ہے۔ اسی طرح کاد بھی ہے۔ اور غالباً جن حضرات نے اثبات کے معنیٰ کئے ہیں، ان کی مراد لازمی معنیٰ سے ہے، یعنی نفی داخل ہونے کی صورت میں ظاہری معنیٰ تو نفی قرب کے ہیں، لیکن لازم جو آتا ہے وہ اثبات ہے،

ولا ینافی قوله وَما کَادُوا یَفۡعَلُوۡنَ قوله فذبحوها

یہ ایک اشکال کا جواب ہے، اشکال یہ ہے کہ جب کاد دوسرے افعال کی طرح ہے تو "ما کاد" کے معنیٰ قرب کی نفی کے ہوئے۔ پس "وما کادوا یفعلون" کے معنیٰ ہوئے کہ وہ کرنے کے قریب نہیں تھے، اور فذبحوھا سے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے ذبح کر ڈالا، پس دونوں میں بظاہر منافات اور تناقض ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ دونوں جملے دو مختلف وقتوں کے بارے میں ہیں۔

"وما کادوا یفعلون" ایک ایسے وقت کے بارے میں ہے اور "فذبحوھا" دوسرے وقت کے بارے میں ہے۔ تناقض اس وقت ہوتا ہے جب دونوں کا وقت ایک ہوتا ہے، جب ان کے سوالات کا سلسلہ چل رہا تھا اس وقت کے لئے تو وما کادوا یفعلون ہے اور جب سوالات ختم ہو گئے، تو ان کو وہ کام انجام دینا پڑا، اس وقت کے لئے "فذبحوھا" فرمایا گیا۔

اسی کو امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں۔ اور اللہ کریم کا فرمان "وما کادوا یفعلون" اللہ کریم کے فرمان "فذبحوھا" کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کا وقت الگ الگ ہے۔ اس لئے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ایسا کرنے کے قریب نہیں تھے، یہاں تک کہ ان کے سوالات ختم ہو گئے اور ان کی ٹال مٹول کا سلسلہ منقطع ہو گیا، تو انہوں نے یہ کام اس طرح انجام دیا جیسا کی کوئی مضطر اور مجبور آدمی کسی کام کو انجام دیتا ہے۔

تثیر کا معنیٰ:

تثیر (To plough or Cultivate)

مضارع واحد مؤنث غائب اثارۃ (باب افعال) مصدر بمعنی برانگیختہ کرنا۔ ابھارنا۔ زمین میں جوتنے اور ہواؤں کے بادلوں کو لانے میں چونکہ یہ معنی موجود ہیں اس لئے ان دونوں کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جوتنے کے لئے آیت ہذا اور ہواؤں کے بادلوں کو لانے کے لئے

"اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ" (سورۃ روم آیت نمبر 48)

اللہ ہے کہ بھیجتا ہے ہوائیں کہ ابھارتی ہیں بادل پھر اسے پھیلا دیتا ہے آسمان میں جیسا چاہے۔

ارض کسے کہتے ہیں؟:

(ارض) الارض (Earth)

(زمین) سماء (آسمان) کے بالمقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع ارضون ہے۔ جس کا صیغہ قرآن میں نہیں ہے کبھی ارض کا لفظ بول کر کسی چیز کا نیچے کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح سماء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔

لفظ سقی کا مفہوم:

(س ق ی) السقی (Irrigated)

والسقیا کے معنی پینے کی چیز دینے کے ہیں اور اسقاء کے معنی پینے کی چیز پیش کر دینے کے ہیں تا کہ حسب منشا لے کر پی لے لہٰذا اسقاء بنسبت سقی کے زیادہ طبغ ہے کیونکہ اسقاء میں مایسقی منه کے پیش کر دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ پینے والا جس قدر چاہے اس سے نوش فرمانے مثلاً اسقیتہ نھرا کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے اسے پانی کی نہر پر لے جا کر کھڑا

کردیا چنانچہ قرآن میں سقی کے متعلق فرمایا:

"وسقاھم وَسَقَاھُمْ رَبُّھُمْ شَرَاباً طَھُوراً" (سورۃ الدھر آیت نمبر 21)

اوران کا پروردگار ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

"وَسُقُوْا مَاءً حَمِیْمًا" (سورۃ محمد آیت نمبر 15)

اوران کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائیگا۔

لفظ حرث کی تعریف وتحقیق:

(ح ر ث) الحرث (ن) (Agriculture, Field)

کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اوراسے زراعت کے لئے تیار کرنے کے پاس اور کھیتی کو بھی حرث کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

"اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَارِمِیْنَ" (سورۃ القلم آیت نمبر 22)

کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویری ہی جا پہنچو۔

اور کھیتی سے زمین کی آبادی ہوئی ہے اس لئے حرث بمعنی آبادی آجاتا ہے۔

قرآن میں ہے:

"مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ، وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ" (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 20)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طلب گار ہے اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے۔ اور جو دنیا کی کھیتی کا کوخواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اوراس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

ایک روایت میں ہے:

"اصدق الاسماء الحارث"

کہ سب سے سچا نام حارث ہے۔

کیونکہ اس میں کسب کے معنی پائے جاتے ہیں ایک دوسری روایت میں ہے۔

"اثرث فی دنیاك لآخرتك"

کہ اس دنیا میں آخرت کے لئے کاشت کرلو۔

حرث الارض (زمین کرنا) سے تشبیح بھڑکانا کے معنی کے پیش نظر حرثت النار کہا جاتا ہے میں نے آگ بھڑکائی اور جس لکڑی سے آگ کریدی جاتی ہے اسے محرث کہا جاتا ہے۔ کسی کا قول ہے۔ احرث القرآن یعنی قرآن کی خوب تحقیق سے کام

لو۔ حرث ناقتہ اونٹنی کو کام اور محنت سے دبلا کر دیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انصار سے دریافت کیا کہ تمہارے پانی کھینچنے والے اونٹ کیا ہوئے تو انہوں نے جواب دیا:

حرثناھا
یوم بدر کہ ہم نے بدر کے دن انہیں دبلا کر دیا۔
اور آیت کریمہ:

"نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 223)
تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ۔

میں استعارۃً عورتوں کو حرث کہا ہے کہ جس طرح زمین کی کاشت پر افراد انسانی بقا کا مدار ہے اس طرح نوع انسان اور اس کی نسل کا بقا عورت پر ہے۔ اور آیت کریمہ:

"وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 205)
اور کھیتی اور جانیں تباہ کر دے۔
دونوں قسم کی کھیتی کو شامل ہے۔

شیۃ کا مفہوم اور اس کی اصل:

شیۃ (Stain, Mark)

داغ۔ نشان، علامت۔ شیات جمع شیۃ اصل میں وشیۃ تھا۔ اور وشی یشی (باب ضرب) کا مصدر ہے۔ اس کی ھا واؤ محذوف کے عوض میں ہے وشی کے اصل معنی کسی چیز میں اس کی تمام رنگوں کے خلاف اور رنگ لگانے کے ہیں۔ یعنی ایسا رنگ جو سارے بدن کے رنگ کے خلاف ہو، وشی مادہ۔ لاشیۃ فیہا اس میں اپنے رنگوں کے علاوہ کوئی خلاف رنگ نہ ہو۔ یعنی بے داغ ہو، یہ صفت چہارم ہوئی بقرۃ کی۔

لفظ جاء کی تحقیق:

(ج ی ء) جاء (ض) (Arrive, Come)

جاء یجیء مجیئا والمجیء کا لاتیان کے ہم معنی ہے جس کے معنی آنا کے ہیں لیکن مجی کا لفظ اتیان سے زیادہ عام ہے کیونکہ اتیان کا لفظ خاص کر کسی چیز کے بسہولت آنے پر بولا جاتا ہے نیز اتیان کے معنی کسی کام مقصد اور ارادہ کرنا بھی آجاتے ہیں گو اس کا حصول نہ ہو۔ لیکن مجیی ء کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب وہ کام واقعہ میں حاصل بھی ہو چکا ہو نیز جاء کے معنی مطلق کسی چیز کی آمد کے ہوتے ہیں۔ خواہ وہ آمد بالذات ہو یا بالامر اور پھر یہ لفظ اعیان و اعراض دونوں کے متعلق

استعمال ہوتا ہے۔ اور اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کسی جگہ یا کام یا وقت کا قصد کرے قرآن میں ہے:

"وَجَاءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَسْعٰى" (سورۃ یس آیت نمبر 20)
اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آپہنچا۔

تعریف الفعل:

(ف ع ل) الفعل (Infinitive,Work)
کے معنی کسی اثر اندازی کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تاثیر عمدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عمدگی کے ہو اور علم سے ہو یا بغیر علم کے قصدا کی جائے یا بغیر قصد کے پھر وہ تاثیر انسان کی طرف سے ہو یا دوسے حیوانات اور جمادات کی طرف سے تو یہی معنی لفظ عمل کے ہیں۔

نوٹ: ذلت، حرف لا، الآن، حق، ذبح اور کادکا معنی بیان ہو چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 72]

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○

"اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا جو تم چھپاتے تھے"۔

متن:

وَاِذْ قَتَلْتُمْ

نَفْسًا خطاباً للجميع لوجود القتل فيهم فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا اختصمتم فى شأنها، إذ المتخاصمان يدفع بعضهما بعضاً، أو تدافعتم بأن طرح كل قتلها عن نفسه إلى صاحبه، وأصله تدارأتم فأدغمت التاء فى الدال واجتلبت لها همزة الوصل

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ

مظهره لا محالة، وأعمل مخرج لأنه حكاية مستقبل كما أعمل باسِطٌ ذِراعَيْهِ لأنه حكاية حال ماضية.

ترجمہ:

وَاِذْ قَتَلْتُمْ

یہ خطاب جمع کا ہے، کیونکہ قتل ان سب کے درمیان پایا گیا تھا۔

فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا

پھر تم اس نفسِ مقتولہ کے بارے میں جھگڑنے لگے، جھگڑنے کی سے تعبیر "ادّارئتم" سے اس لئے کی گئی کہ دو جھگڑنے والے ایک دوسرے کو دفع کرتے اور دھکیلتے ہیں۔ یا "ادّارئتم" کے معنیٰ "تدافعتم" کے ہیں کہ تم میں سے ہر ایک قتل کو اپنے اوپر سے دوسرے پر ڈال رہا تھا اور "ادّارئتم" کی اصل تدارئتم ہے تاء کو دال میں مدغم کردیا گیا اور دال ساکنہ کے لئے ہمزہ وصل سے آیا گیا۔

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ

مخرج کے معنیٰ لامحالہ ظاہر کرنے کے ہیں، اور "مخرج" کو عمل اس لئے دیا گیا کہ وہ فعلِ مستقبل کی حکایت کر رہا ہے۔ جیسا کہ باسط ذراعیہ کو اس لئے عمل دیا گیا کہ وہ حال ماضی کی حکایت کر رہا ہے،

نفس کا معنیٰ:

(ن ف س) النفس (Breath,Spirit)
کے معنیٰ روح کے آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

" اَخْرِجُوا اَنْفُسَكُمُ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 93)

کہ نکال لو اپنی جانیں۔

"وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ ما فِي اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 235)

اور جان رکھو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ کو سب معلوم ہے۔

اور ذیل کی دونوں آیتوں:

" تَعْلَمُ ما فِي نَفْسِي وَلا اَعْلَمُ ما فِي نَفْسِكَ " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 116)

اور جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے اور جو تیرے علم میں ہے میں اسے نہیں جانتا ہوں۔

" وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 30)

اور اللہ تم کو اپنے غضب سے ڈراتا ہے۔

میں نفس بمعنیٰ ذات ہے اور یہاں نفسہ کی اضافت اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرۃ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوائی سے پاک ہے بعض کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی طرف نفس کی اضافت اضافت ملک ہے اور اس سے ہمارے نفوس امارہ مراد ہیں جو ہر وقت برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔

تحقیق لفظِ درء:

(درء) الدراء (ف).

کے معنی ونیزہ وغیرہ کے ایک جانب مائل ہوجانے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کی کجی کو درست کردیا میں نے اس سے دفع کیا قرآن میں ہے:

"وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 22)

اور نیکی کے ذریعہ برائیوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔

"وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ" (سورۃ النور آیت نمبر 8)

اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے۔

حدیث پاک:

حدیث میں ہے: "ادْرَءُوا الحدود بالشّبهات"

شرعی حدود کو شبہات سے دفع کرو۔

ادارأتم کا معنیٰ:

اصل میں تدارء تم تھا تدارء (تفاعل) مصدر جس کے معنی لڑائی میں ایک دوسرے پر سے ہٹانا۔ متفق نہ ہونا۔ ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنا ای تدافع۔ تدارء تم کی تاء کو دال میں بدل کر دال مابعد میں مدغم کردیا۔ پھر ابتداء بالسکون کی دشواری کی وجہ سے شروع میں ہمزہ وصل لائے۔ ادارؤ تم ہوگیا۔ معنی یہ ہے کہ: تم ایک دوسرے پر (اس قتل کا) الزام لگانے لگے۔

لفظ کتمان کی تحقیق:

(ک ت م) کتمه (ن) (To Hide,To Cover)

کتما و کتمانا کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 140)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

"وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 146)

مگر ایک فریق ان میں سچی بات جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

"وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 283)

اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا۔

اور آیت کریمہ:

" الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ ما آتاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ "

(سورۃ النساء آیت نمبر 37)

جو آپ بخل کریں اور اوروں سے بخل کے لئے کہیں اور اللہ نے جو انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اُسے چھپائیں۔

میں کتمان فضل سے کفران نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا:

" وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا " (سورۃ النساء آیت نمبر 37)

اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ: " وَلَا يَكْتُمُونَ اللهَ حَدِيثًا " (سورۃ النساء آیت نمبر 42)

اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔ تو جھٹ سے پکار اٹھیں گے۔

"وَاللهِ رَبِّنَا ما كُنَّا مُشْرِكِينَ " (سورۃ الانعام آیت نمبر 23)

خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔

مگر اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ خدا تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپائے ہوتی حسن بصری فرماتے ہیں کہ آخرت میں متعدد واقف ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کوئی چھپا نہ سکنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

نوٹ: قول اور خرج کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2) : الآيات 73]

فَقُلْنا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِها كَذٰلِكَ يُحْيِ اللهُ الْمَوْتىٰ وَيُرِيكُمْ آياتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

''تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو، اللہ یونہی مردے جلائے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو''۔

متن:

فَقُلْنا اضْرِبُوهُ

عطف على ادارأتم وما بينهما اعتراض، والضمير للنفس والتذكير على تأويل الشخص

أو القتيل بِبَعْضِها

أى بعض كان، وقيل: بأصغريها، وقيل بلسانها، وقيل بفخذها اليمنى، وقيل بالاذن، وقيل بالعجب **كَذٰلِكَ يُحْيِ اللهُ الْمَوْتٰى**

يدل على ما حذف وهو فضربوه فحيى، والخطاب مع من حضر حياة القتيل، أو نزول الآية

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ

دلائله على كمال قدرته.

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

لكى يكمل عقلكم وتعلموا أن من قدر على إحياء نفس قدر على إحياء الانفس كلها. أو تعملوا على قضيته. ولعله تعالى إنما لم يحيه ابتداء وشرط فيه ما شرط لما فيه من التقرب وأداء الواجب، ونفع اليتيم والتنبيه على بركة التوكل والشفقة على الاولاد، وأن من حق الطالب أن يقدم قربة، والمتقرب أن يتحرى الاحسن ويغالى بثمنه. كما روى عن عمر رضى الله تعالى عنه: أنه ضحى بنجيبة اشتراها بثلاثمائة دينار. وأن المؤثر فى الحقيقة هو الله تعالى، والاسباب أمارات لا إثر لها. وأن من أراد أن يعرف أعدى عدوه الساعى فى إماتته الموت الحقيقى، فطريقُه أن يذبح بقرة نفسه التى هى القوة الشهوية حين زال عنها شره الصبا، ولم يلحقها ضعف الكبر، وكانت معجبة رائقة المنظر غير مذللة فى طلب الدنيا، مسلمة عن دنسها لا سمة بها من مقابحها بحيث يصل أثره إلى نفسه. فتحيا حياة طيبا، وتعرب عما به ينكشف الحال، ويرتفع ما بين العقل والوهم من التدارؤ والنزاع.

ترجمہ:

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ

یہ عطف ہے "ادّرانتم" پر، اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے یعنی "واللہ یخرج ما کنتم تکتمون" وہ جملہ معترضہ ہے اور "اضربوا" کی ضمیر مفعول بہ "نفسا" کے لئے ہے۔ اور یہاں اس کو مذکر اس لئے لایا گیا کہ وہ شخص کی تاویل میں ہے۔ یا "المحی علیہ" (جس پر زیادتی کی گئی) کی تاویل میں ہے۔

ببعضها

بعض سے مراد کوئی بھی جزو ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے دو چھوٹے اعضاء یعنی قلب ولسان مراد ہیں، اور بعض کہتے

ہیں کہ اس کی زبان اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی داہنی ران اور بعض کہتے ہیں کہ کان اور بعض کے نزدیک اس کی دُم کی جڑ مراد ہے۔

كذلك يحي الله الموتى

یہ ایک محذوف عبارت پر دلالت کرتا ہے، اور وہ عبارت ہے "فضربوا فحی" یعنی بنو اسرائیل نے اس کو بقرہ کا وہ حصہ لگایا، اور وہ زندہ ہو گیا۔ گویا اس عبارت کے بعد فرمایا جا رہا ہے،

كذلك يحي الله الموتى

اور یہ خطاب اُن لوگوں سے ہے جو مقتول کی حیات کے وقت موجود تھے۔ یا خطاب ان لوگوں سے ہے، جو نزولِ آیت کے وقت وہاں موجود تھے۔

ويريكم آياته

اور وہ اپنی آیات دکھاتا ہے۔ یعنی اپنے کمالِ قدرت کی دلیلیں دیتا ہے۔

لعلكم تعقلون

تاکہ تم سوچو یعنی تاکہ تمہاری عقل کامل ہو جائے، اور تم جان لو کہ جو ہستی ایک شخص کو زندہ کرنے پر قادر ہے، وہ تمام نفوس کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے، یا اس لئے کہ تم اس کے تقاضے پورے کرو۔ اور اللہ کریم نے اس مقتول کو براہِ راست زندہ نہیں کیا، اور اس کے لئے مذکورہ شرطیں رکھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تقرب یعنی مامور بہ کی ادائیگی اور واجب کو بجالانا پایا جا رہا ہے۔ نیز اس میں یتیم کی نفع رسانی اور توکل کی برکت پر تنبیہ کرنا ہے، اور اولاد پر شفقت کرنی ہے، اور یہ تعلیم دینی ہے کہ طالب پر یہ عائد ہوتا ہے کہ پہلے کائی قربت وعبادت کی چیز پیش کرے، اور جو قربانی پیش کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ عمدہ ترین چیز تلاش کرے، اور اس کی بھاری قیمت کو ادا کرے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے قیمتی اور محبوب اونٹنی کی قربانی کی جن کو تین سو (300) دینار میں خریدا تھا۔ اور یہ بھی تعلیم دینا مقصود ہے کہ مؤثر در حقیقت اللہ کریم ہی کی ذات مبارکہ ہے اور اسباب تو صرف علامات ہیں۔ ان کی تاثیر کچھ نہیں ہے، اور یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ جو شخص اپنے بدترین دشمن کو پہچاننا چاہتا ہے، ایسا دشمن جو اس کو حقیقی موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نفس کی گائے کو یعنی قوت شہوانیہ کو اس وقت ذبح کر دے جس وقت اس سے بچپن کی نیم پختگی یا حرص جا چکی ہو، اور بڑھاپے کا ضعف، اس کو لاحق نہ ہوا ہو۔ اور جس وقت وہ قوت شہوانیہ خوش نما اور خوش منظر ہو، طلب دنیا کے لئے اُس کو استعمال نہ کیا گیا ہو، وہ اپنے عیوب سے پاک ہو، اس میں قبائح شہوت کا کوئی ایسا داغ دھبہ نہ ہو جس کا اثر نفس تک پہنچتا ہو، جب بقرۂ نفس ذبح ہو جائے گی تو آدمی پاکیزہ اور ستھری زندگی بسر کرے گا اور اس کی روح سے ان چیزوں کا اظہار ہو گا جن سے حقیقتِ حال منکشف ہو جائے گی اور عقل ووہم کے درمیان جو تدافع اور نزاع رکھتا ہے وہ اٹھ جائے گا۔

لفظِ بعض کا معنیٰ:

(ب ع ض) بعض الشئی (Certain,Some)
ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اس لئے کل کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جیسے: بعضہ و کلہ اس کی جمع ابعاض آتی ہے قرآن میں ہے:
"بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 36)
تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔
نوٹ: ضرب، حيي، موت، روئت، عقل اور آیت کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 74]

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

"پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کرّے اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں"۔

متن:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ

القساوة عبارة عن الغلظ مع الصلابة، كما في الحجر. وقساوة القلب مثل في نبوه عن الاعتبار، وثم لاستبعاد القسوة مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ يعني إحياء القتيل، أو جميع ما عدد من الآيات فإنها مما توجب لين القلب. فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ في قسوتها اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً منها، والمعنى أنها في القساوة مثل الحجارة أو أزيد عليها، أو أنها مثلها، أو مثل ما هو أشد منها قسوة كالحديد، فحذف المضاف وأقيم المضاف إليه مقامه. ويعضده قراءة الحسن بالجر عطفاً على الحجارة، وإنما لم يقل أقسى لما في أشد من المبالغة. والدلالة على اشتداد القسوتين واشتمال المفضل على زيادة واَوْ للتخيير، أو للترديد بمعنى: أن من عرف حالها شبهها بالحجارة أو بما هو أقسى منها.

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰارُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ

تعليل للتفضيل، والمعنى: أن الحجارة تتأثر وتنفعل فإن منها ما يتشقق فينبع منه الماء، وتنفجر منه الانهار، ومنها ما يتردى من أعلى الجبل انقيادا لما أراد الله تعالى به. وقلوب هؤلاء لا تتأثر ولا تنفعل عن أمره تعالى. والتفجر التفتح بسعة وكثرة. والخشية مجاز عن الانقياد. وقرء إِنَّ على أنها المخففة من الثقيلة وتلزمها اللام الفارقة بينها وبين إن النافية. ويهبط بالضم.

وَمَا اللهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

وعيد على ذلك. وقرأ ابن كثير ونافع ويعقوب وخلف وأبو بكر بالياء ضما إلى ما بعده. والباقون بالتاء.

ترجمہ:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔

قساوت کا معنی ہے سختی کے ساتھ موٹا ہونا، جیسا کہ پتھر میں ہے۔ اور قلب کی قساوت تمثیل ہے، اس کے عبرت پذیری سے دور ہونے کے سلسلے میں اور "ثمّ" قساوت کو مستبعد ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

من بعد ذالك

یعنی مقتول کو زندہ کرنے کے بعد یا ان تمام نشانیوں کے بعد جو شمار کی جا چکی ہیں کیونکہ وہ نشانیاں ایسی ہیں جو واجبی طور پر نرمی پیدا کرتی ہیں۔

فهي كالحجارة

تو دل پتھر کی طرح سختی میں "او اشدّ قسوة" یا زیادہ سخت ہیں پتھروں کے مقابلے میں اور معنی یہ ہے کہ قبول سختی میں پتھروں جیسے ہیں۔ ان چیزوں جیسے ہیں جو پتھروں سے زیادہ سخت ہیں جیسے لوہا، تو مضاف کو حذف کر دیا گیا، اور مضاف الیہ کو اس کی جگہ قائم کر دیا گیا۔ اور اس معنی کی تقویّت اس سے ہوتی ہے کہ ایک قرات حالتِ جری کی ہے۔ جس میں اشدّ کو حجارۃ پر عطف کرتے ہوئے مفتوح پڑھا گیا۔ اور یہاں "اشدّ" فرمایا ہے "اقسیٰ" نہیں فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ "اشدّ" کے اندر مبالغہ ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے دونوں قساوتیں شدید ہیں۔ اور مفضل زیادتی پر مشتمل ہے اور تخییر یا تردید کے لئے ہے، بایں معنی کہ جو شخص ان قلوب کا حال جانتا ہو وہ ان کو چاہے پتھروں کے ساتھ تشبیہ دے یا چاہے تو اس چیز کے ساتھ تشبیہ

دے جو پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہے،

وانّ من الحجارة

یہاں سے قلوب کو اشد قرار دینے کی علت بیان ہو رہی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ پتھر متاثر اور منفعل ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی ابلتا ہے، اور نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کریم کے ارادہ کی اطاعت کی وجہ سے پہاڑ کے اوپر سے گر پڑتے ہیں۔ اور ان بنی اسرائیل کے دل میں کہ وہ اللہ کریم کے حکم سے منفعل اور متاثر نہیں ہوتے۔ اور "تفجر" کے معنی کشادگی اور کثرت کے ساتھ کھل جانا کے ہیں۔

اور" خشية: انقیاد کی مجازی تعبیر ہے۔ اور ایک قرات میں" اِن" بتخفیفِ نون ہے۔ اور انّ مثقلہ سے مخففہ بنا لیا گیا ہے۔ اور ان مخففہ کے لام کا ہونا ضروری ہے جو "انْ" مخففہ اور "ان" نافیہ کے درمیان فرق کرے۔ اور "یهبط" باء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

وما الله بغافلٍ عمّا تعملون

یہ کیفیّتِ مذکورہ پر وعید ہے۔ اور ابنِ نافع، یعقوب، خلف، ابوبکر اور حماد نے یعملون کے ساتھ قرات کی ہے، انہوں نے اس صیغہ کو بعد والے صیغوں کے ساتھ ملا دیا ہے، اور باقی قرّاء نے تعملون تاء کے ساتھ قرات کی ہے۔

تحقیق قست:

(ق س د) القسوة (Cruel,Stony or Hard-hearted)

کے معنی سنگ دل ہونے کے ہیں یہ اصل میں حجر قاس سے ہے جس کے معنی سخت پتھر کے ہیں۔ المقاساة سختی جھیلنا۔

قرآن میں ہے:

" ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ " (سورة البقرة آیت نمبر 74)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے۔

" فَوَيْلٌ لِلْقاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللهِ " (سورة الزمر آیت نمبر 22)

پس ان پر افسوس ہے جن کے دل اللہ کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔

"وَالْقاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ " (سورة الحج آیت نمبر 53)

اور جن کے دل سخت ہیں۔

"وَجَعَلْنا قُلُوبَهُمْ قاسِيَةً " (سورة المائدة آیت نمبر 13)

اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

ایک قرات میں قسية ہے یعنی ان کے دل خالص نہیں ہیں یہ درھم قسی سے مشتق ہے جس کے معنی کھوٹے درہم کے

ہیں جس میں (سکہ) کی ملاوٹ کی وجہ سے صلابت پائی جائے۔ شاعر نے کہا ہے:

صاح القسیات فی ایدی الصیاریف

کھوٹے درہم صرافوں کے ہاتھ میں آواز دیتے ہیں۔

قلب کا معنیٰ:

(ق ل ب) قلب الشئی (Turn ,Change)

کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسے قلب الثوب (کپڑے کو الٹنا) اور قلب الانسان کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ" (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 21)

اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

حجر کی تعریف:

(ح ج ر) الحجر (Stone)

سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع احجار و حجارۃ آتی ہے اور آیت کریمہ:

"وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 24)

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

شد کا معنیٰ:

(ش د د) الشد (Knot)

یہ شددت الشئی (ن)

کا مصدر ہے جس کے معنی مضبوط گرہ لگانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"وَشَدَدْنَا اَسْرَهُمْ" (سورۃ الانسان آیت نمبر 28)

اور ان کے مفاصل کو مضبوط بنایا۔

لفظ شق کا معنیٰ:

(ش ق ق) الشق (Lacerate)

الشق۔ شگاف کو کہتے ہیں۔ شققتہ بنصفین میں نے اسے برابر دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قرآن میں ہے:

"ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا" (سورۃ عبس آیت نمبر 26)

پھر ہم نے زمین کو چیرا پھاڑا۔

" يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا " (سورۃ ق آیت نمبر 44)

اس روز زمین (ان سے) پھٹ جائے گی۔

" وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ " (سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 16)

اور آسمان پھٹ جائے گا۔

" اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ " (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 1)

جب آسمان پھٹ جائیگا۔ اور آیت کریمہ:

"وَانْشَقَّ الْقَمَرُ " (سورۃ القمر آیت نمبر 1)

اور چاند شق ہو گیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ انشقاق قمر نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اور بعض نے انشق القمر کے معنی وضح الامر کئے ہیں یعنی معاملہ واضح ہو گیا۔

الشقۃ پھاڑا ہوا ٹکڑا۔ اسی سے محاورہ ہے۔

طار فلان من الغضب شقاقا

فلاں غصہ سے پھٹ گیا۔

جیسا کہ قطع غضبا کا محاورہ ہے۔ طارت منهم شقة۔ ان کا ایک حصہ اڑ گیا۔ یعنی غضب ناک ہوئے۔ الشق اس مشقت کو کہتے ہیں جو تنگ ودو سے بدن یا نفس کو ناحق ہوتی ہے جیسا کہ الانکسار کا لفظ بطور استعارہ نفس کی درماندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ " (سورۃ النحل آیت نمبر 7)

زحمت شاقہ کے بغیر۔

الشقۃ وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔

قرآن میں ہے:

"بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ " (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 42)

لیکن مسافت ان کو دور (دراز) نظر آئی۔

خشیۃ کی تعریف:

(خ ش ی) الخشیۃ (Fear of ALLAH)

اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہو جائے، یہ بات عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ!۔

"اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا" (سورۃ فاطر آیت نمبر 28)

اور خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

میں خشیت الٰہی کے ساتھ علماء کو خاص کیا ہے۔

غفلت کی تعریف:

(غ ف ل) الغفلتہ

اس سہو کو کہتے ہیں جو قلت تحفظ اور احتیاط کی بنا پر انسان کو عارض ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

"لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَۃٍ مِّنْ ھٰذَا" (سورۃ ق آیت نمبر 22)

بیشک تو اس سے غافل ہو رہا تھا۔

غفلت شرمندگی:

غفلت سے شرمندگی بڑھتی ہے اور نعمت زائل ہوتی ہے، خدمت کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے، حسد زیادہ ہوتا ہے اور ملامت و پشیمانی کی فراوانی ہوتی ہے۔

بڑی حسرت:

ایک نیک آدمی نے اپنے اُستاد کو خواب میں دیکھا اور پوچھا:

آپ کے نزدیک سب سے بڑی حسرت کونسی ہے؟ اُستاد نے جواب دیا غفلت کی حسرت سب سے بڑی ہے۔

روایت ہے کہ کسی شخص نے حضرتِ ذوالنون مصری رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ کو خواب میں دیکھا اور سوال کیا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھے اپنی بارگاہ میں کھڑا کیا اور فرمایا،

:اے جھوٹے دعویدار! تو نے میری محبت کا دعویٰ کیا اور پھر مجھ سے غافل رہا۔

شعر:

انت فی غفلۃ وقلبك ساھی ذھب العمر والذنوب کما ھی

تو غفلت میں مبتلا ہے اور تیرا دل بھولنے والا ہے، عمر ختم ہو گئی اور گناہ ویسے کے ویسے ہی موجود ہیں۔

حکایت:

ایک صالح آدمی نے اپنے باپ کو خواب میں دیکھ کر پوچھا:

اے ابا جان! آپ کیسے ہیں اور کیا حال ہے؟

باپ نے جواب دیا:

ہم نے زندگی غفلت میں گزاری اور غفلت ہی میں مر گئے۔

نوٹ: فجر، نہر، ماء، ھبط اور حیوان کا معنیٰ گزر چکا ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 75]

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

''تو اے مسلمانو کیا تمہیں یہ طمع ہے کہ یہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے اور ان میں کا تو ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے''۔

متن:

اَفَتَطْمَعُوْنَ

الخطاب لرسول الله صلّى الله عليه وسلّم والمؤمنين

اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ أن يصدقوكم، أو يؤمنوا لأجل دعوتكم. يعني اليهود.

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

طائفة من أسلافهم **يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ** يعني التوراة.

ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ كنعت محمد صلّى الله عليه وسلّم، وآية الرجم. أو تأويله فيفسرونه بما يشتهون. وقيل هؤلاء من السبعين المختارين سمعوا كلام الله تعالى حين كلم موسى عليه السلام بالطور، ثم قالوا سمعنا الله تعالى يقول في آخره: إن استطعتم أن تفعلوا هذه الاشياء فافعلوا وإن شئتم فلا تفعلوا. **مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ** أي فهموه بعقولهم ولم يبق لهم فيه ريبة. **وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ** أنهم مفترون مبطلون، ومعنى الآية: أن أحبار هؤلاء ومقدميهم كانوا على هذه الحالة، فما ظنك بسفلتهم وجهالهم، وأنهم إن كفروا وحرفوا فلهم سابقة في ذلك.

ترجمہ:

یہ خطاب نبی کریم ﷺ اور مومنین سے ہے "ان یومنوا لکم" کے معنی ہیں یہ کہ تمہاری تصدیق کریں گے یا یہ کہ

تمہاری دعوت کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے، ان سے مراد یہودی ہیں۔

"فریق منہم" سے مراد ان کے اسلاف کی ایک جماعت ہے۔

یسمعون کلام اللہ

سے مراد توریت ہے، "ثم یحرفونہ" تحریف کی مثال حضرت محمد ﷺ کے اوصف اور احکام رجم کی تحریف ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ وہ کلام اللہ کی تاویل کرتے ہیں اور اس کی من چاہی تفسیر کرتے ہیں اور برض کہتے ہیں یہ ان ستر منتخب لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اللہ کریم کا کلام سنا جس وقت اللہ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر کلام فرمایا۔ پھر کہنے لگے کہ ہم نے اللہ کریم کو آخر میں یہ بھی کہتے سنا ہے، اگر تم لوگ یہ چیزیں کر سکو تو کرنا اگر نہ کرنا چاہو تو نہ کرنا۔

من بعد ما عقلوہ

یعنی اس کے بعد کہ انہوں نے اسے اپنی عقلوں کے ذریعے سمجھ لیا۔ اور ان کے لئے اس کے بارے میں کوئی شک باقی نہیں رہا۔

وھم یعلمون یعنی اس بات کو جانتے تھے کہ وہ افتراء کر رہے ہیں اور باطل پر ہیں اور پوری آیت کریمہ کا مقصود یہ ہے کہ ان یہودیوں کے علماء اور ان کے اسلاف اس حالت پر تھے، تو تمہارا ان کے نیچے درجہ لوگوں اور جاہلوں کے بارے میں کیا گمان ہے؟ اور یہ بھی مقصود ہے اگر ان لوگوں نے کفر کیا، اور تحریف کی تو کیا تعجب ہے۔ اس بارے میں ان کا سابقہ ریکارڈ یہی رہا ہے۔

فریق کی تعریف:

(ف ر ق) الفریق (Class, Party)

اور فریق اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو۔ قرآن میں ہے:

"وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقاً يَلْوُونَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 78)

اور ان میں کچھ وہ ہیں جو زبان پھیر کر کتاب میں میل کرتے ہیں۔

کلام کا معنیٰ:

(ک ل م) الکلم۔ (Word, Speech)

یہ اصل میں اس تاثیر کو کہتے ہیں جس کا ادراک دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکے چنانچہ کلام کا ادراک قوت سامعہ کیساتھ ہوتا ہے۔ اور کلم (زخم) کا ادراک قوت بصر کے ساتھ۔

محاورہ:

محاورہ ہے۔ کلمتہ میں نے اسے ایسا زخم لگایا۔ جس کا نشان ظاہر ہوا اور چونکہ یہ دونوں (یعنی کلام اور کلم) معنی تاثیر

میں مشترک ہیں۔

التحریف الشیء کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک جانب مائل کر دینا۔ جیسے تحریف القلم قلم کو ٹیڑھا لگانا۔ اور تحریف الکلام کے معنی ہیں کلام کو اس کے موقع ومحل سے پھیر دینا کہ اس میں دو احتمال پیدا ہو جائیں۔ قرآن میں ہے:

" یُحَرِّفُونَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ " (سورۃ النساء آیت نمبر 46)
یہ لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔

اور دوسرے مقام پر

" وَیُحَرِّفُونَ الْکَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِہٖ " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 41)
ہے یعنی ان کے محل اور صحیح مقام پر ہونے کے بعد۔

" مِنْھُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلَامَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَہٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 75)
(حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے کچھ لینے کے بعد اس کو (جان بوجھ کر) بدل دیتے رہے ہیں۔

الحرف:

وہ چیز جس میں تلخی اور حرارت ہو گویا وہ حلاوت اور حرارت سے پھیر دی گئی ہے۔ طعام حزیف چرچراہٹ (والا کھانا)
ایک روایت میں ہے۔ کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔

نوٹ: الف، ایمان، قد، سمع، عقل اور علم کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2): الآیات 76]

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَھُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ لِیُحَآجُّوْکُمْ بِہٖ عِنْدَ رَبِّکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

"اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھولا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں کیا تمہیں عقل نہیں"۔

متن:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

یعنی منافقیهم. قَالُوْٓا اٰمَنَّا بأنكم على الحق، وإن رسولكم هو المبشر به في التوراة وَاِذَا

خَلا بَعْضُهُمْ إِلى بَعْضٍ قَالُوا أى الذين لم ينافقوا منهم عاتبين على من نافق. أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِما فَتَحَ اللهُ عَلَيْكُمْ بما بين لكم فى التوراة من نعت محمد صلّى الله عليه وسلّم، أو الذين نافقوا لأعقابهم إظهاراً للتصلب فى اليهودية، ومنعًا لهم عن إبداء ما وجدوا فى كتابهم، فينافقون الفريقين. فالاستفهام على الاول تقريع وعلى الثانى إنكار ونهى لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ليحتجوا عليكم بما أنزل ربكم فى كتابه. جعلوا محاجتهم بكتاب الله وحكمه محاجة عنده كما يقال عند الله كذا، ويراد به أنه جاء فى كتابه وحكمه، وقيل عند ذكر ربكم، أو بين يدى رسول ربكم. وقيل عند ربكم فى القيامة وفيه نظر إذ الإخفاء لا يدفعه. أَفَلا تَعْقِلُونَ إما من تمام كلام اللائمين وتقديره: أفلا تعقلون أنهم يحاجونكم به فيحجونكم، أو خطاب من الله تعالى للمؤمنين متصل بقوله: أَفَتَطْمَعُونَ، والمعنى: أفلا تعقلون حالهم وأن لا مطمع لكم فى إيمانهم.

ترجمہ:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

"لقوا" کے فاعل سے مراد منافقین یہود ہیں۔ "قالوا امنّا" ہم اس بات پر ایمان لائے کہ تم حق پر ہو، اور تمہارے رسول ہی ہیں جن کی توریت میں بشارت دی گئی ہے۔

واذا خلا بعضهم الى بعضٍ قالوا

یہاں قالوا کا فاعل وہ یہود ہیں جنہوں نے نفاق نہیں کیا، یہ ان لوگوں کو عتاب کر رہے ہیں جنہوں نے نفاق کیا۔ "بما فتح الله عليكم" یعنی جو چیزیں اللہ کریم نے تمھارے لئے توریت میں واضح فرما دی ہیں۔ جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کے اوصاف، یا قالوا کا فاعل منافقین ہیں جو اپنے بعد کے پیروکاروں سے یہ کہہ رہے ہیں تا کہ یہودیّت میں ان کی سختی ظاہر ہو اور اپنے پیروکاروں کو ان چیزوں کے اظہار سے بھی روک سکیں جن کو وہ اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔ اس طرح وہ منافق دونوں فریقوں سے نفاق کرتے ہیں۔ پس استفہام تفسیرِ اوّل کی بناء پر تفریع وتوبیخ کے لئے ہے۔ اور تفسیرِ ثانی کی بنیاد پر انکار ونفی کے لئے ہے۔

لِيُحَاجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ

تا کہ وہ لوگ تم پر اس چیز کے ذریعے حجت قائم کریں جس کو تمہارے رب نے اپنی کتاب میں اتارا ہے، کتاب اللہ کے ذریعے حجت قائم کرنے اور فیصلہ کرنے کو انہوں نے اللہ کریم کے سامنے حجت قائم کرنا قرار دیا۔ جیسا کہ بولا جاتا ہے، "عند

اللہ کذا" اور مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ بات اللہ کریم کی کتاب اور اس کے فیصلے میں ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ "عند ربّکم" کے معنی "ذکر ربّکم" کے ہیں۔ یا معنیٰ ہیں "بما عند ربّکم" یعنی اس چیز کے ذریعے جو تمہارے رب کے پاس ہے، یا معنی ہیں کہ تمہارے رب کے رسول کے سامنے، اور بعض کہتے ہیں کہ معنیٰ یہ ہیں۔ تمہارے رب کے سامنے قیامت کے دن، لیکن اس توجیہہ میں اشکال ہے کیونکہ اخفاء اس کو دفع نہیں کرسکتا۔

افلا تعقلون

یہ جملہ یا تو ملامت کرنے والوں کے کلام کا جز و ہے اور تقدیرِ عبارت کچھ اس طرح ہے،

افلا تعقلون انّھم یحاجّونکم ہ فیحجّونکم

کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ وہ تمہارے اوپر اس کے ذریعے حجت قائم کردیں گے۔ پھر تم کو مغلوب کردیں گے۔ یا یہ کہ اللہ کریم کی طرف سے مومنین کو خطاب ہے، اور اس کا "افتطمعون" سے تعلق ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوں گے، کیا تم ان کے حال میں غور نہیں کرتے اور یہ نہیں سوچتے کہ تمہارے لئے ان کے ایمان کے سلسلہ میں کوئی توقع کی چیز نہیں ہے۔

خلاء کی لغوی واصطلاحی تحقیق:

(خ ل و) الخلاء (Empty,Cavity)

خالی جگہ جہاں عمارت و مکان وغیرہ نہ ہو اور الخلو کا لفظ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ میں مضی (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت خلا الزمان کے معنی زمانہ گزر گیا کرلیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

" وَما مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ قَدۡخَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ " (سورۃ آل عمران آیت نمبر 144)

اور محمد تو ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول ہو چکے۔

" وَقَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمُ الۡمَثُلٰتُ " (سورۃ الرعد آیت نمبر 6)

حالانکہ اس سے پہلے عذاب (واقع) ہو چکے ہیں۔

" تِلۡكَ أُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 141)

یہ جماعت گزر چکی۔

تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں۔

" اِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيۡرٌ " (سورۃ فاطر آیت نمبر 24)

مگر اس میں ہدایت کرنے والا گزر چکا ہے۔

" مَثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 214)

تم کو پہلے لوگوں کی سی۔

"وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 119)

اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: "يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 9)

پھر ابا کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔

کے معنی یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے۔ رہ جائے گی۔ خلا الانسان۔ تنہا ہونا۔ خلا فلان بفلان کسی کے ساتھ تنہا ہونا۔ خلا الیہ کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔ قرآن میں ہے:

"وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 14)

اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔ خلت فلانا کے اصل معنی کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ فرمایا:

"فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 5)

تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

ناقۃ خلیۃ۔ اونٹنی کو دودھ دوہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔ امراءۃ خلیۃ مطلقہ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد چھوڑ دی اور جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی ہو اسے بھی خلیۃ کہا جاتا ہے۔ الخلی جو غم سے خالی ہو۔ جیسا کہ مطلقۃ کا لفظ سکون واطمینان کے معنی میں آجاتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا۔

تطلقۃ طورا طورا تراجع

میں (کسی اسے سکون ہو جاتا ہے اور کبھی وہ دوعود کر آتی ہے) میں تطلقۃ کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ الخلاء۔ خشک گھاس۔ کہا جاتا ہے: خلیت الخلاء۔ میں نے خشک گھاس کاٹی۔ خلیت الدابۃ۔ جانور کو خشک گھاس ڈالی۔ سیف یختلی۔ تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

حدوث کی تعریف:

(ح د ث) الحدوث (ن) (To be Produced to grow)

کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے نہ ہو عام اس سے کہ وہ جوہر ہو یا عرض اور احداث صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ محدث (صیغہ صفت مفعول) ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئی ہو اور کسی چیز کا احداث کبھی تو نفس شے کے اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی اس شخص کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ جسے وہ حاصل ہوئی ہو۔ جیسے۔ احدثت ملکا میں نے نیا ملک حاصل کیا، چنانچہ آیت کریمہ:۔

"مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 2)

ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی۔

میں اسی دوسرے معنی کے اعتبار ذکر کو محدث کہا گیا ہے اور ہر وہ قول وفعل جو نیا ظہور پذیر ہوا ہو اسے بھی محدث کہہ دیتے ہیں۔

قرآن میں ہے: "حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا" (سورۃ الکھف آیت نمبر 70)

جب تک میں خود ہی پہل کر کے تجھ سے بات نہ کروں۔

"لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا" (سورۃ الطلاق آیت نمبر 1)

شاید اللہ اس کے بعد کوئی نیا حکم بھیجے۔

ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعہ پہنچے اسے حدیث کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہو یا بحالت بیداری، قرآن میں ہے:

"وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا" (سورۃ التحریم آیت نمبر 3)

اور جب نبی نے اپنی ایک بی بی سے ایک راز کی بات فرمائی۔

لفظ الفتح کی عمدہ تحقیق:

(ف ت ح) الفتح (Victtory,Success)

کے معنی کسی چیز سے بندش اور پیچیدگی کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ ازالہ دو قسم پر ہے ایک وہ جس کا آنکھ سے ادراک ہو سکے جیسے۔ فتح الباب (دروازہ کھولنا) اور فتح القفل (قفل کھولنا) اور فتح المتاع اسباب کھولنا قرآن میں ہے:

"وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 65)

اور جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔

"وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ" (سورۃ الحجر آیت نمبر 14)

اور اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ ان پر کھولتے۔

دوم جس کا ادراک بصیرت سے ہو جیسے: فتح الھم (یعنی ازالہ غم) اس کی چند قسمیں ہیں،

قسم اوّل:

وہ جس کا تعلق دنیوی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے جیسے مال وغیرہ دے کر غم واندوہ اور فقر واحتیاج کو زائل کر دینا۔ جیسے فرمایا:

"فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 44)

پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی۔ فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

یعنی ہر چیز کی فراوانی کر دی۔ نیز فرمایا:

"لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 96)

تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔

یعنی انہیں ہر طرح سے آسودگی اور فارغ البالی کی نعمت سے نوازتے۔

قسم دوم:

علوم و معارف کے دروازے کھولنا جیسے محاورہ ہے۔

فلان فتح من العلم بابا مغلقا

فلاں نے علم کا بند دروازہ کھول دیا۔ یعنی شہادت کو زائل کر کے ان کی وضاحت کر دی۔ اور آیت کریمہ:

"إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا" (سورۃ الفتح ایت نمبر 1)

بے شک ہم نے تمہارے لئے روشن فتح دی۔

میں بعض نے کہا ہے یہ فتح کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ اس سے علوم و معارف اور ان ہدایات کے دروازے کھولنا مراد ہے جو کہ ثواب اور مقامات محمودہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے غفران ذنوب کا سبب ہے۔

الفاتحہ کسے کہتے ہیں:،

الفاتحۃ ہر چیز کے مبدء کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ اس کے مابعد کو شروع کیا جائے اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کو فاتحۃ الکتاب کہا جاتا ہے۔

"افتتح فلان کذا فلاں" نے یہ کام شروع کیا فتح علیہ کذا کسی کو کوئی بات بتانا اور اس پر اسے ظاہر کر دینا قرآن میں ہے:

"أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 76)

جو بات خدا نے تم پر ظاہر فرمائی ہے وہ تم ان کو بتائے دیتے ہو۔

"مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ" (سورۃ فاطر آیت نمبر 2)

جو لوگوں کے لئے کھول دے فتح۔

القضیۃ فتاحا یعنی اس نے معاملے کا فیصلہ کر دیا اور اس سے مشکل اور پیچیدگی کو دور کر دیا۔ قرآن میں ہے:

"رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ" (سورۃ الاعراف آیت نمبر 89)

اے ہمارے پروردگار ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے

والا ہے۔

اسی سے: " اَلْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ " (سورۃ سبا آیت نمبر 26)

ہے یعنی خوب فیصلہ کرنے والا اور جاننے والا۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

وانی من فتاحتکم غنی

اور میں تمہارے فیصلہ سے بے نیاز ہوں۔ بعض نے نزدیک فتاحۃ فا کے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ صحیح ہے اور آیت کریمہ:

"اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ " (سورۃ النصر آیت نمبر 1)

جب اللہ کی مدد آ پہنچیں اور فتح حاصل ہو گئی۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الفتح سے نصرت، کامیابی اور حکم مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ علوم و معارف کے دروازے کھول دینا مراد ہو۔ اسی معنی ہیں میں فرمایا:

"نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ " (سورۃ الصف آیت نمبر 13)

جو تمہیں پیاری ہے اللہ کی مدد اور جلد آنے والی فتح۔

"فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ " (سورۃ المائدۃ آیت نمبر 52)

تو قریب ہے اللہ فتح بھیجے۔

"وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ " (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 28)

اور کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا۔

" قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ " (سورۃ السجدۃ آیت نمبر 29)

کہہ دو کہ فیصلے کے دن۔

یعنی حکم اور فیصلے کے دن بعض نے کہا ہے کہ الفتح سے قیامت بپا کر کے ان کے شک وشبہ کو زائل کرے کا دن مراد ہے اور بعض نے یوم عذاب مراد لیا ہے۔ جسے وہ طلب کیا کرتے تھے۔

لفظ حاجّہ کی تحقیق:

الحاجہ (جھگڑنا) (Quarrel,Dispute)

اس جھگڑے کو کہتے ہیں جس میں ہر ایک دوسرے کو اس کی دلیل اور مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ: أَتُحَاجُّونِّي فِي اللهِ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 80)

اوران کی قوم ان سے بحث کرنے لگی توانہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں کیا بحث کرتے ہو۔

"فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 61)

پھر اگر یہ عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت الحال تو معلوم ہو ہی چکی ہے۔

"لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 65)

تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔

"هَا أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ"

(سورۃ آل عمزان آیت نمبر 66)

دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا جس کا تمہیں کچھ علم تھا بھی مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو کچھ بھی علم نہیں۔

"وَإِذْ يَتَحَاجُّونَ فِي النَّارِ" (سورۃ غافر آیت نمبر 47)

اور جب وہ دوزخ میں جھگڑیں گے۔

لفظ حج کا معنیٰ:

حج (Pilgrimage to MAKKAH)

اور حج کے معنی زخم کی گہرائی ناپنا بھی آتے ہیں شاعر نے کہا ہے:

یحج مامومة فی قعرها لجف

وہ سر کے زخم کو سلائی سے ناپتا ہے جس کا قعر نہایت وسیع ہے۔

عند کا استعمال:

۱ (عند) ظرف (Near,with)

عندیہ کسی چیز کا قرب ظاہر کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے کبھی تو مکان کا قرب ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے اور کبھی اعتقاد کے معنی ظاہر کرتا ہے جیسے عندی کذا اور کبھی کسی شخص کی قرب و منزلت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

"بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 169)

بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔

نوٹ: اذا، لعلی، حرف ما اور عقل کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 77]

اَوَلا يَعْلَمُونَ اَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَما يُعْلِنُونَ ○

''کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے''۔

متن:

اَوَلا يَعْلَمُونَ

يعني هؤلاء المنافقين، أو اللائمين، أو كليهما، أو إياهم والمحرفين.

اَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَما يُعْلِنُونَ ومن جملتهما إسرارهم الكفر وإعلانهم الإيمان، وإخفاء ما فتح الله عليهم، وإظهار غيره، وتحريف الكلم عن مواضعه ومعانيه.

ترجمہ:

اَوَلا يَعْلَمُونَ

کیا نہیں جانتے یہ منافقین یا ملامت کرنے والے یا دونوں، یعنی منافقین بھی اور ان کو ملامت کرنے والے بھی، یا یہ دونوں اور نیز تیسرا طبقہ تحریف کرنے والوں کا۔

اَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَما يُعْلِنُونَ

ان کی چھپانے کی چیزوں میں سے ایک کفر ہے۔ اور ان کے اظہار کی چیزوں میں سے ایک ایمان ہے اور جو چیزیں اللہ کریم نے ان پر توریت میں واضح فرمائی تھیں، ان کا اخفاء اور ان کے علاوہ دوسری باتوں کا اظہار مراد ہے۔ اور کلمات کو ان کے صحیح استعمال اور ان کے اصلی معانی سے پھیر دینا بھی مراد ہے۔

تحقیقِ اسرار:

(س ر ر) الاسرار (Secret)

کسی بات کو چھپانا یہ اعلان کی ضد ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"سِرًّا وَعَلانِيَةً "(سورۃ إبراھیم آیت نمبر 31)

اور پوشیدہ اور ظاہر۔

اور فرمایا: "وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ "(سورۃ التغابن آیت نمبر 4)

جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو معلوم ہے۔

"وَاَسِرُّوا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوا بِهِ "(سورۃ الملک آیت نمبر 13)

اورتم (لوگ) بات پوشیدہ کہو یا ظاہر۔

اوراس کا استعمال اعیال ومعانی دونوں میں ہوتا ہے السر۔ اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں پوشیدہ ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

"يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى "(سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 7)
تو وہ تو بھید کو جانتا ہے اور اسے جو اس سے بھی زیادہ چھپا ہے۔

نیز فرمایا:

"اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰاهُمْ "(سورۃ التوبۃ آیت نمبر 78)
کہ اللہ ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے واقف ہے۔

سارۃ کا معنی:

سارۃ (مفاعلہ) کے معنی ہیں کسی بات کو چھپانے کی وصیت کرنا اور تسار القوم کے معنی لوگوں کا باہم ایک دوسرے کو بات چھپانے کی وصیت کرنے یا باہم سرگوشی کرنے کے ہیں اور آیت۔

"وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ "(سورۃ یونس آیت نمبر 54)
(پچھتائیں گے) اور ندامت کو چھپائیں گے۔

تو یہاں اسروا کے معنی چھپانے کے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی ظاہر کرنا بھی کئے ہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے:

"يَالَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيَاتِ رَبِّنَا "(سورۃ الانعام آیت نمبر 27)
اور کہیں گے اے کاش ہم پھر (دنیا میں) لوٹا دیے جائیں تا کہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں۔

لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ آیت مذکور میں جس ندامت کے چھپانے کا ذکر ہے اس سے وہ ندامت مراد نہیں ہے جس کے اظہار کی طرف آیت یالیتنا میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اسررت الی فلان حدیثا کسی سے پوشیدہ طور پر راز کی بات کہنا۔

چنانچہ قرآن میں:

"وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ "(سورۃ التحریم آیت نمبر 3)
(اور یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔

اور آیت: "تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ "(سورۃ الممتحنۃ آیت نمبر ۱)
اورتم ان کی طرف پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں اپنی پوشیدہ دوستی سے آگاہ کرتے ہو۔ اس بنا پر بعض نے یہاں تسرون کے معنی تظهرون کئے ہیں اور یہی معنی صحیح معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اسرار الی الغیر (کسی سے بھید کی بات کہنا) جس طرح دوسروں سے اخفا کو مقتضی

ہے اسی طرح اس شخص کے سامنے اظہار کو متلزم ہے جس سے وہ بھید کہا جاتا ہے لہٰذا اسررت الی فلان (یعنی دوسرے سے راز کی بات کہنا) میں من وجہ اخفا اور من وجہ اظہار کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیت:

"وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَاراً" (سورۃ نوح آیت نمبر 9)

(ظاہر) اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔ بھی اس معنی پر محمول ہے۔ اور کنایہ کے طور پر السر کے معنی نکاح (جماع) کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چھپ کر کیا جاتا ہے اور ستر خالص چیز کو کہتے ہی جیسے کہا جاتا ہے۔ ھو من سرّ قومه: وہ اپنی قوم میں سب سے بہتر ہے اور اسی سے سِرُّ الوادی وسِرَارَتُهٗ ہے جس کے معنی وادی کے بہتر حصہ کے ہیں۔

سرۃ البطن کا معنیٰ:

سرۃ البطن (Navel)

ناف کا وہ حصہ جو قطع کرنے کے بعد باقی رہ جاتا ہے اور یہ چونکہ بطن میں مخفی رہتا ہے اس لئے اسے سرۃ البطن کہتے ہیں اور وہ چیز جو ناف سے قطع کی جاتی ہے اسے سر و سرر کہا جاتا ہے ہتھیلی کی لکیروں کو اسرۃ الراحۃ کہتے ہیں اسی طرح پیشانی کے خطوط کو اساریر الجبھۃ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مہینہ کی آخری تاریخ جس میں چاند ظاہر ہوتا اسے سرار کہا جاتا ہے۔ السرور قلبی فرحت کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔

"وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا" (سورۃ الانسان آیت نمبر 11)

(تو خدا) ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔

"تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 69)

کہ دیکھنے والے (دل) کو خوش کر دیتا ہو۔

اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"وَيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 9)

اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔ اور اہل نار کے متعلق فرمایا:

"اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا" (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 13)

یہ اپنے اہل وعیال میں مست رہتا تھا۔ تو اس میں تنبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔ السریر (تخت) وہ جس پر کہ (ٹھاٹھ سے) بیٹھا جاتا ہے یہ سرور سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں اس کی جمع اسرۃ اور سرر آتی ہے۔ قرآن نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ" (سورۃ الطور آیت نمبر 20)

تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔

"فِیْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ " (سورۃ الغاشیۃ آیت نمبر 13)

وہاں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے۔

"وَلِبُیُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّكِـُٔوْنَ " (سورۃ الزخرف آیت نمبر 34)

اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنا دیئے) اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔ اور میت کے جنازہ کو اگر سریر المیت کہا جاتا ہے تو یہ سریر (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یا نیک شگون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قید خانہ سے رہائی پا کر جوار الٰہی میں خوش وخرم ہے جس کی طرف نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

الدنیا سجن المومن:

کہ مومن کو دنیا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

لفظ علانیہ کی تعریف:

(ع ل ن) العلانیہ (Visible)

ظاہر اور آشکارا، یہ سر کی ضد ہے اور عام طور پر اس کا استعمال معانی یعنی کسی بات ظاہر ہونے پر ہوتا ہے اور اجسام کے متعلق بہت کم آتا ہے علن کذا کے معنی میں فلاں بات ظاہر اور آشکار ہوگئی اور اعلنتہ انا میں نے اسے آشکار کر دیا قرآن میں ہے:

" اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا " (سورۃ نوح آیت نمبر 9)

میں انہیں برملا اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔

" مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ " (سورۃ القصص آیت نمبر 69)

جو کچھ ان کے سینوں میں مخفی ہے اور جو یہ ظاہر کرتے ہیں علوان الکتاب جس کے معنی کتاب کے عنوان اور سرنامہ کے ہیں ہوسکتا ہے کہ یہ علن سے مشتق ہو اور عنوان سے چونکہ کتاب کے مشمولات ظاہر ہوتے ہیں اس لئے اسے علوان کہہ دیا گیا ہو۔

نوٹ: لفظ علم کا معنی گزر چکا ہے۔

[سورۃ البقرۃ (2) : الآیات 78]

وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (78)

''اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ نرے گمان میں ہیں، تو خرابی ہے ان کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے

عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے"۔

متن:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ

جهلة لا يعرفون الكتابة فيطالعوا التوراة، ويتحققوا ما فيها. أو التوراة إِلَّا أَمَانِيَّ استثناء منقطع. والاماني: جمع أمنية وهي في الاصل ما يقدره الإنسان في نفسه من مني إذا قدر، ولذلك تطلق على الكذب وعلى ما يتمنى وما يقرأ والمعنى لكن يعتقدون أكاذيب أخذوها تقليداً من المحرفين أو مواعيد فارغة. سمعوها منهم من أن الجنة لا يدخلها إلا من كان هوداً، وأن النار لن تمسهم إلا أياماً معدودة. وقيل إلا ما يقرءون قراءة عارية عن معرفة المعنى وتدبره من قوله:

تَمَنَّى كِتَابَ اللهِ أَوَّلَ لَيْلِهِ ... تَمَنِّي دَاوُدَ الزَّبُوْرَ على رِسْلِ

وهو لا يناسب وصفهم بأنهم أميون.

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ

ما هم إلا قوم يظنون لا علم لهم، وقد يطلق الظن بإزاء العلم على كل رأي واعتقاد من غير قاطع، وإن جزم به صاحبه: كاعتقاد المقلد والزائغ عن الحق لشبهة.

ترجمہ:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ

یعنی ایسے جاہل ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے کہ توریت کا مطالعہ کریں اور جو کچھ توریت میں ہے اس کا تحقیقی علم حاصل کریں۔ "اِلَّا امانی" استثناء منقطع ہے۔ امانی، امنیۃ کی جمع ہے۔ امنیۃ درحقیقت وہ چیز ہے جس کو انسان اپنے دل و دماغ میں سوچتا ہے، یہ منیٰ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں اس سے اندازہ باندھا اسی لئے اس لفظ کا اطلاق کذب پر اور آدمی جو آرزو کرتا ہے، اس پر اور جو کچھ پڑھتا ہے اس پر بھی ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کتاب کا علم تو کچھ بھی نہیں رکھتے، البتہ کچھ جھوٹی اور فرضی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ جن کو انہوں نے تحریف کرنے والوں سے کسی کی تقید میں حاصل کرلیا ہے۔ یا کچھ فرضی وعدوں کا اعتقاد رکھتے ہیں جن کو تحریف کرنے والوں سے سن رکھا ہے کہ جنت میں صرف یہودی ہی داخل ہوں گے۔ اور دوزخ کی آگ ان کو چند ایام کے سوا کبھی نہیں چھوئے گی۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ وہ کتاب کو نہیں سمجھتے مگر ہاں قرات اور تلاوت کرلیتے ہیں۔ جو معنی کی معرفت اور تدبر سے خالی ہے اور یہ مفہوم شاعر کے اس شعر سے لایا گیا ہے،

تَمَنّٰی کِتَابَ اللہ اَوَّلَ لَیْلِہ... تَمَنّٰی دَاوٗدَ الزَّبُوْرَ علی رِسْلِ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اپنی شہادت کی رات کے اوّل حصہ میں ٹھہر ٹھہر کر اللہ کریم کی کتاب کی قرات کر رہے تھے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام زبور کی قرات کیا کرتے تھے۔

یہ معنی اس وصف سے میل نہیں کھاتے کہ وہ امی تھے۔

وان هم الّا یظنون

یعنی وہ نہیں ہیں مگر ایسی قوم جس کے پاس صرف ظن ہے، یقین نہیں ہے۔ اور کبھی علم کے مقابلہ میں ظن ہر اس رائے اور اعتقاد پر بولا جاتا ہے جس پر کوئی دلدل قطعی قائم نہیں ہے اگر یہ صاحب ظن اس کا یقین رکھتا ہو، جیسے مقلّد کا اعتقاد اور اس شخص کا اعتقاد جو حق سے کسی شبہ کی بناء پر پھرا ہوا ہو۔

لفظ امّی کی تحقیق:

الامی۔

وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو، اور نہ وہ کتاب میں سے پڑھ سکتا ہو چنانچہ آیت کریمہ؛۔

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" (سورۃ الجمعۃ آیت نمبر 2)

وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتے ہیں اور انہیں پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب وحکمت کا علم عطا فرماتے ہیں۔

میں امیین سے یہی مراد ہے قطرب نے کہا ہے کہ امیۃ بمعنی غفلت جہالت کے ہے اور اسی سے امی ہے کیونکہ اسے بھی معرفت نہیں ہوتی چنانچہ فرمایا؛۔

"وَمِنْهُمْ أُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 78)

اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا خدا کی کتاب سے واقف نہیں ہیں۔

یہاں الا امانی کے معنی الا ان یتلی علیھم کے ہیں یعنی مگر یہ کو انہیں پڑھ کر سنایا جائے۔

فرّاء کا نظریہ:

فراء نے کہا ہے کہ امیون سے مراد ہیں جو اہل کتاب نہ تھے اور آیت کریمہ؛

"اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ"

(سورۃ الأعراف آیت نمبر 157)

وہ جو غلامی کریں گے اس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی جسے لکھا ہوا پائیں گے اپنے پاس توریت اور انجیل میں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اُمّی اس امت یعنی قوم کی طرف منسوب ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو جس طرح کہ عامی اسے کہتے ہیں جو عوام جیسی صفات رکھتا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اُمّی کہنا اس بنا پر ہے کہ نبی کریم ﷺ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھتے تھے۔ بلکہ وحی الٰہی کے بارے میں اپنے حافظہ اور اللہ کریم کی اس ضمانت پر کہ

"سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسٰى" (سورۃ الأعلیٰ آیت نمبر 6)
ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے۔

اعتماد کرتے تھے یہ صفت آپ کے لئے باعث فضیلت تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ام القریٰ یعنی مکہ کی طرف نسبت ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ:

اُمّی کا ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بے پڑھے کیا ہے۔

یہ ترجمہ بالکل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشاد کے مطابق ہے اور یقیناً اُمّی ہونا آپ ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کہ دنیا میں کسی سے پڑھا نہیں اور کتاب وہ لائے جس میں اوّلین و آخرین اور غیبوں کے علوم ہیں۔

(خازن، سورۃ الاعراف، تحت الآیۃ: ۱۵۷، ۲/۱۴۷)

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، شعر،

ایسا اُمّی کس لئے منت کشِ استاد ہو کیا کفایت اس کو اِقْرَاْ رَبُّکَ الْاَکْرَمْ نہیں

قرآن مجید میں ہے،

"يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ" (سورۃ الأعراف آیت نمبر 157)
اسے یہ (اہلِ کتاب) اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔
یعنی اپنے پاس توریت و انجیل میں آپ کی نعت و صفت اور نبوت لکھی ہوئی پاتے ہیں۔

التمنی کی تحقیق:

التمنی۔ (Wish)
کے معنی دل میں کسی خیال کے باندھے اور اس کی تصویر کھینچ لینے کے ہیں پھر کبھی یہ تقدیر محض ظن و تخمین پر مبنی بر حقیقت مگر عام طور پر تمنی کی بنا چونکہ ظن و تخمین پر ہی ہوتی ہے اس لئے اس پر جھوٹ کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر طور پر تمنی کا لفظ دل میں غلط آرزو میں قائم کر لینے پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

" اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی "(سورۃ النجم آیت نمبر 24)
کیا جس چیز کی انسان آرزو کرتا ہے وہ اسے ضرور ملتی ہے۔

" فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 94)
توموت کی آرزو تو کرو۔

"وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗ اَبَدًا "(سورۃ الجمعۃ آیت نمبر 7)
اور یہ ہرگز نہیں کریں گے۔

امنیہ کا معنیٰ:

کسی چیز کی تمنا سے جو صورت ذہن میں حاصل ہوتی ہے اسے امنیۃ کہا جاتا ہے۔ اور کذب چونکہ کسی غیر واقعی چیز کا تصور کر کے اسے لفظوں میں بیان کر دینے کو کہتے ہیں تو گویا تمنی جھوٹ کا مبداء ہے، لہٰذا جھوٹ کو تمنی سے تعبیر کرنا بھی صحیح ہے۔

قول عثمان غنی رضی اللہ عنہ:

اسی معنی میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

ما تغنیت ولا منذ اسلمت

کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں نہ راگ گایا ہے اور نہ جھوٹ بولا ہے۔

اور امنیۃ کی جمع امانی آتی ہے چنانچہ فرمایا:

" وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ اِلَّا اَمَانِیَّ "(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 78)
اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت۔

مجاہد نے الا امانی کے معنیٰ الا کذبا یعنی جھوٹ کئے ہیں اور دوسروں نے امانی سے بے سوچ سمجھے تلاوت کرنا مراد لیا ہے کیونکہ اس قسم کی تلاوت بھی اس منیۃ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے جس کی بنا تخمینہ پر ہوتی ہے اور آیت کریمہ:

" وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰی اَلْقَی الشَّیْطَانُ فِیْ اُمْنِیَّتِهٖ "
(سورۃ الحج آیت نمبر 52)

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر کبھی یہ واقعہ گزرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔

میں امنیۃ کے معنیٰ تلاوت کے ہیں اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تمنی ظن و تخمین سے بھی ہوتی ہے۔ اور مبنی بر حقیقت بھی۔ اور چونکہ نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر روح الامین جو وحی لے کر اترتے تھے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی تلاوت

کے لئے مباورت کرتے تھے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آیت،

"لا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ" (سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 114)

اور "ولا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ" (سورۃ القیامۃ آیت نمبر 16)

جب بھی نہ سنا جائے گا تم یاد کرنے کی جلدی میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔

کے ذریعہ منع فرما دیا گیا۔ الغرض اس وجہ سے آپ کی تلاوت کو تمنی سے موسوم کیا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ ایسی تلاوت میں شیطان کا دخل غالب ہوجاتا ہے۔

اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے،

"ان العاجلة من الشيطان"

کہ جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔

منیتی کذا کے معنی فریب دہی سے جھوٹی امید دلانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے شیطان کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ" (سورۃ النساء آیت نمبر 119)

اور ان کو گمراہ کرتا اور امید دلاتا رہوں گا۔

ظن کا معنیٰ:

(ظ ن ن) الظن (Presumption)

اور ظن چونکہ عام طور پر برا ہوتا ہے اس لئے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

"وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا" (سورۃ یونس آیت نمبر 36)

اور ان میں کے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

نوٹ: حرف لا اور کتب کے معانی بیان ہوچکے ہیں۔

[سورة البقرة (2) : الآيات 79]

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ○

متن:

فَوَيْلٌ

اى تحسر وهلك. ومن قال إنه واد أو جبل فى جهنم فمعناه: أن فيها موضعًا يتبوأ فيه من جعل له الويل، ولعله سماه بذلك مجازاً. وهو فى الاصل مصدر لا فعل له وإنما ساغ الابتداء به نكرة لأنه دعاء.

لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ

يعنى المحرفين، ولعله أراد به ما كتبوه من التأويلات الزائغة. بِأَيْدِيهِمْ تأكيد كقولك: كتبته بيمينى

ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا

كى يحصلوا به عرضاً من أعراض الدنيا، فإنه وإن جعل قليل بالنسبة إلى ما استوجبوه من العقاب الدائم.

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ

يعنى المحرف. **وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ** يريد به الرشى.

ترجمہ:

فَوَيْلٌ

یعنی اظہار حسرت اور ہلاکت ہے، اور جس نے یہ کہا کہ "ویل 'ایک وادی جہنم ہے، یا دوزخ میں ایک پہاڑ ہے، تو اس کی راد یہ ہے کہ دوزخ میں ایک مقام ہے جہاں اس شخص کا ٹھکانہ ہوگا جس کے لئے "ویل" یعنی حسرت و ہلاکت لازم کر دی گئی ہے۔ اور شاید اس جگہ کو اس نام سے مجازاً موسوم کر دیا گیا ہے، اور "وَیل" دراصل مصدر ہے، جس کا کوئی فعل نہیں آتا، اور "وَیل" کو نکرہ ہونے کے باوجود مبتداء بنانا اس لئے جائز ہے کہ یہ دعا کے موقع پر ہے۔

للذین یکتمون الکتاب

یہاں پہ الکتاب سے مراد محرف ہے، اور غالباً مقصود وہ گمراہ کن تفسیریں ہیں جو انہوں نے لکھی تھیں،

بایدیھم

یہ تاکید ہے جیسے عرب کا قول "کتبتہ بیمینی" میں بیمینی تاکید ہے۔

لیشتروا بہ ثمناً قلیلا

تا کہ اس تحریف کے ذریعے اموال دنیا میں سے کچھ مال و متاع حاصل کریں، اسلئے کہ دنیاوی مال و متاع خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اس عذاب دائم کے مقابلہ میں کم ہے جس کے وہ مستحق ہوئے۔

مما کتبت ایدیھم

اس میں "ماکتبت ایدیھم" سے مراد تحریفات اور تحریف شدہ کلام ہے۔ "ممایکسبون" میں "مایکسبون" سے مراد رشوتیں ہیں۔

ویل اور ویس کی تحقیق:

(و ی ل) الویل

اصمعی نے کہا ہے کہ ویل برے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور حسرت کے موقع پر ویل اور تحقیر کے لئے ویس اور ترحم کے ویل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 79)

ان پر افسوس ہے اس لئے کہ بے اصل باتیں اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے اس لئے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

"وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ" (سورۃ ابراھیم آیت نمبر 2)

اور کافروں کے لئے سخت عذاب کی جگہ خرابی ہے۔

"فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" (سورۃ الزخرف آیت نمبر 65)

سو لوگ ظالم ہیں ان کی خرابی ہے۔

"وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ" (سورۃ المطففین آیت نمبر 1)

ناپ تول میں کمی کرنیوالا کے لئے خرابی ہے۔

"وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ" (سورۃ الھمزۃ آیت نمبر 1)

ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغلخور کی خرابی ہے۔

"يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا" (سورۃ یس آیت نمبر 52)

ہائے ہماری خرابی کس نے ہمیں سوتے سے جگا دیا۔

"يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ" (سورۃ الانبیاء آیت نمبر 46)

ہائے شامت بیشک ہم ظالم تھے۔

"يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ" (سورۃ القلم آیت نمبر 31)

ہائے شامت ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے۔

الید کا معنیٰ:

(ی د ی) الید (Hand)

کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں یہ اصل میں یدی (ناقص یائی) ہے کیونکہ اس کی جمع ایدو یدی اور تثنیہ یدیان

اور آیت کریمہ:

" فَرَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ " (سورۃ ابراہیم آیت نمبر 9)

توانہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دیئے۔

قلّت کا مفہوم:

(ق ل ل) القلة (Shortage)

والکثرۃ بلحاظ اصل وضع کے صفات عدد سے ہیں جیسا کہ عظم اور صغر صفات اجسام سے ہیں بعد کثرت وقلت اور عظم وصغر میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ بطور استعارہ استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ:

" ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا " (سورۃ الاحزاب آیت نمبر 60)

پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔

میں قلیلا سے عرصہ قلیل مراد ہے۔

لفظِ کسب کی تحقیق:

(ک س ب) الکسب

اصل میں جلب نفع یا خوش نصیبی حاصل کرنے کے لئے کسی چیز کا قصد کرنے کو کسب کہتے ہیں جیسے کسب مال وغیرہ ایسے کام کے قصد پر بولا جاتا ہے جسے انسان اس خیال پر کرے کہ اس سے نفع حاصل ہوگا لیکن الٹا اس کو نقصان اٹھانا پڑے۔ پس الکسب ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات اور اس کے ساتھ دوسروں کے فائدہ کے لئے کرے اسی لئے یہ کبھی دو مفعولوں کو طرف متعدی ہوتا ہے جیسے کسبت فلانا کذا میں نے فلاں کو اتنا کچھ حاصل کر کے دیا۔ مگر الاکتساب ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے لہٰذا ہر اکتساب لازم نہیں ہے۔ اور یہ خبز و اختبز و شوی واشتوی، وطبخ وطبخ کی طرف ہے۔ اور آیت کریمہ:

" اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ " (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 267)

جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

قلندری لاہوری حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں:

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

حدیث پاک:

عرض کی گئی: ای الکسب اطیب

کہ کون سا کسب زیادہ پاکیزہ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

عمل الرجل بیدہ

کہ انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور نیز فرمایا:

"ان طیب ما یکل الرجل من کسبہ وان ولدہ من کسبہ"

سب سے زیادہ پاکیزہ رزق وہ ہی جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھا اور اسکی اولاد اس کے کسب سے ہے۔

قرآن میں ہے: "لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 264)

اسی طرح (یہ ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور قرآن میں نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کے متعلق یہ فعل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:

"اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 158)

یا اپنے ایمان کی حالت میں نیک عمل نہیں کیے ہونگے۔

اور آیت کریمہ: "وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر 201-202)

اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے ربّ ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔ ایسوں کو ان کی کمائی سے بھاگ ہے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

کے بعد فرمایا: انکے کاموں کا (حصہ) اور اعمال بد کے متعلق فرمایا:

"اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ" (سورۃ الانعام آیت نمبر 70)

تا کہ قیامت کے دن کوئی شخص اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔

"اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا" (سورۃ الانعام آیت نمبر 70)

یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے۔

نوٹ: کتب، ھذا، عند۔ لفظ اللہ اور ثمن کی تحقیق گزر چکی ہے۔

[سورة البقرة (2) : آية 80]

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○

''اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرمادو کیا خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ ہرگز اپنا عہد خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں''۔

متن:

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ

المس اتصال الشيء بالبشرة بحيث تتأثر الحاسة به، واللمس كالطلب له ولذلك يقال ألمسه فلا أجده.

إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً محصورة قليلة، روى أن بعضهم قالوا نعذب بعدد أيام عبادة العجل أربعين يوماً، وبعضهم قالوا مدة الدنيا سبعة آلاف سنة وإنما نعذب مكان كل ألف سنة يوماً

قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا

خبراً أو وعداً بما تزعمون، وقرأ ابن كثير وحفص بإظهار الذال. والباقون بإدغامه

فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ

جواب شرط مقدر أي: إن اتخذتم عند الله عهداً فلن يخلف الله عهده، وفيه دليل على أن الخلف في خبره محال.

أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ

أم معادلة لهمزة الاستفهام بمعنى أي الامرين كائن، على سبيل التقرير للعلم بوقوع أحدهما، أو منقطعة بمعنى: بل أتقولون، على التقرير والتقريع.

ترجمہ:

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ

مسّ کے معنیٰ ہیں کسی چیز کا جلد سے اس قدر متصل ہوجانا کہ قوّتِ لامسہ اس سے متاثر ہوجائے۔ یعنی اس اتصال کا اثر قبول کرلے۔ اور لمس نام ہے مساس یعنی چھونے کی کوشش کرنے کا۔ اور شاید اسی وجہ سے اس کا اردو ترجمہ ٹٹولنا ہے۔ چونکہ

لمس میں طلب کا مفہوم ہے اور طلب کے لئے مطلوب کا وصول ہونا ضروری نہیں اس لئے بولا جاتا ہے، "المسه فلا اجده" میں اس کو ٹٹولتا ہوں لیکن نہیں پاتا۔

اِلَّا اَیَّاماً مَعْدُودَةً

معدودہ کے معنیٰ ہیں معدود اور تھوڑے دن۔ بعض بنی اسرائیل سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کو بس اتنے دن عذب دیا جائے گا جتنے دن بچھڑا کی پوجا کی یعنی چالیس دن، اور بعض کا کہنا ہے کہ دنیا کی عمر سات ہزار (7000) سال ہے لہٰذا ہر ہزار سال کی جگہ ہم کو صرف ایک دن عذاب دیا جائے گا اس لحاظ سے ان کے عذاب کے کل سات دن ہوئے۔

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللهِ عَهْدًا

عہد کے معنیٰ یا تو خبر کے ہیں یا وعدے کے، جیسا کہ تم گمان کرتے ہو۔

آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کا تم لوگ دعویٰ کرتے ہو، کیا اس کی اللہ کریم کی طرف سے کوئی خبر ملی ہے یا اس کا اللہ کریم سے تم نے کوئی وعدہ لے رکھا ہے۔

"اتخذتم" میں ہمزہ استفہام کے آجانے سے ہمزہ وصل ساقط ہو گیا ہے۔ ذال کو ابنِ کثیر اور حفص نے مظہر پڑھا ہے یعنی تاء میں مدغم نہیں کیا ہے، ان دو بزرگو کے سوا بقیہ تمام قرّاء نے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے، ادغام کی صورت میں ذال کی آواز نہیں ظاہر ہوگی بلکہ صرف خاء اور تاء کی آواز نکلے گی۔

فَلَنْ یُّخْلِفَ اللهُ عَهْدَهٗ

فاءِ فصیحہ ہے، یعنی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے اور وہ بعد والے جملے کا سبب ہے، وہ جملہ محذوفہ جملہ شرطیہ ہے، اور "لن یخاف اللہ عہدہٗ" اس کی جزاء ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے،

ان اتخذتم عند الله عهداً فلن يخلف الله عهده

اگر تم نے اللہ کریم سے کوئی عہد لے رکھا ہے تو وہ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ "لَنْ" کے معنیٰ سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ اللہ کریم کے وعدے اور اس کی خبر کے خلاف ہونا محال ہے۔

ام تقولون على الله ما لا تعلمون

یہاں پر اَم متصلہ یا منقطعہ ہے، اگر منقطعہ ہے تو "بل" اور "لٰکن" کے معنیٰ میں ہوگا اور ہمزہ سے اس کا کوئی لفظی تعلق نہیں ہوگا۔ البتہ استفہام کے معنیٰ اس میں ملحوظ ہوں گے تو مفہوم ہوگا، بلکہ کیا تم لوگ اللہ کریم پر ایسی باتیں جوڑتے ہو جن کا تم کو علم نہیں ہے؟ اس استفہام کا مقصد ان کو ڈانٹنا بھی ہے اور ان سے اس کا اقرار بھی کروانا ہے کہ وہ لوگ بہتان طرازی کر رہے ہیں۔

اور اگر متصلہ ہے تو یہ ہمزہ استفہام کا معادل ہے یعنی اس کے جوڑ میں آیا ہے۔ "اَم" متصلہ کا مفہوم احد الامرین کی تعیین

کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ لیکن یہاں اس سے مقصود سوال واستفہام نہیں ہے، کیونکہ مستفہم یعنی اللہ کریم یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو میں سے ایک بات کا معین اور یقینی طور پر علم حاصل ہے، بلکہ مقصود مخاطب سے "احدھما" کا اقرار کروانا ہے یعنی اقرار کرو کہ ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات واقعی ہے۔ کیا تمہارا عہد دینا واقع کے مطابق ہے یا یہ بات واقع کے مطابق ہے کہ تم اللہ کریم پر بہتان طرازی کر رہے ہو۔

لفظِ مس اور لمس کی تحقیق:

(م س س) المس (Feel,Touch)

کے معنی چھونا کے ہیں اور لمس کے ہم معنی ہیں لیکن لمس کسی چیز کی تلاش کرنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز مل جل بھی جائے۔

اور مس کا لفظ ہر اس تکلیف کے لئے بول دیا جاتا ہے جو انسان تو پہنچے۔ جیسے فرمایا:

"وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُودَةً" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 80)

اور کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چھو ہی نہیں سکے گی۔

نار کی تعریف:

(ن و ر) نار (Fire,Flame)

اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"اَفَرَاَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ" (سورۃ الواقعۃ آیت نمبر 71)

بھلا دیکھو کہ جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔

آگ سے ڈرو:

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ عَزَّ وَجَلَّ یوں کلام فرمائے گا کہ اُس کے اور اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا، جب وہ بندہ اپنی دائیں جانب نظر ڈالے گا تو اسے وہی کچھ نظر آئے گا جسے اس نے آخرت کے لئے آگے بھیجا تھا اور جب وہ اپنی بائیں جانب نظر ڈالے گا تو اسے وہی نظر آئے گا جسے اس نے آگے بھیجا تھا، پھر جب وہ اپنے سامنے دیکھے گا تو اسے آگ کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا، لہٰذا آگ سے ڈرو، اگرچہ ایک ہی کھجور کے ذریعے ہو۔

(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحث علی الصدقۃ ولو بشق۔۔۔ الخ، الحدیث: 1016، ص 507)

لفظِ عہد کا مفہوم:

(ع ہ د) العہد (ض) (Promise)

کے معنی ہیں کسی چیز کی پیہم نگہداشت اور خبر گیری کرنا اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عہد کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔

قرآن میں ہے: "وَاَوْفُوا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" (سورۃ الاسراء ایت نمبر 34)

اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔

یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔

"لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ" (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 124)

کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہوسکتی۔

وعدہ خلافی کرنے والا ملعون:

نبی مُکَرَّم، نُورِ مُجَسَّم، رسول اکرم، شہنشاہِ بنی آدم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہٖ وسلم نے فرمایا:

جو کسی مسلمان سے عہد شکنی کرے، اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اور اس کا کوئی فرض قبول نہ ہوگا نہ نفل۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل المدینہ، باب حرم المدینہ، الحدیث ۱۸۷۰، ج ۱، ص ۶۱۶)

خلف کا معنی:

(خ ل ف) خُلف (Unfaithfull)

الخلف کے معنی وعدہ شکنی کے ہیں محاورہ ہے: اس نے مجھ سے وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا۔ قرآن میں ہے۔

"بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ" (سورۃ التوبۃ آیت نمبر 77)

کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اُس کے خلاف کیا۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" (سورۃ الرعد آیت نمبر 31)

بیشک اللہ خلاف وعدہ نہیں کرتا۔

نوٹ: یوم، عد، اخذ، ام، قول، اللہ اور علم کا معنی گزر چکا ہے۔

ابو عمر الدکتور محمد رضوان رضا قادری

عفی عنه

بحمد اللہ تعالیٰ عزوجل 12 مئی 2018 کو ترجمہ و شرح مکمل ہوئی۔